ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی

مرکز مطالعاتِ جنوبی ایشیا
پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ پاکستان

زوال سے اقبالؒ تک

قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر

پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی

مرکز مطالعاتِ جنوبی ایشیا

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

نام: زوال سے اقبال تک

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی

ناشر: مرکز مطالعاتِ جنوبی ایشیا، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اشاعت اوّل: ۲۰۱۱ء

اہتمام اشاعت: محمد خالد خان، ڈائریکٹر

ڈیپارٹمنٹ آف پریس اینڈ پبلی کیشنز، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

تزئین: کاشف، عمر رحمٰن خان

صفحات: ۳۸۱

تعداد: ۵۰۰

قیمت:

مرکز مطالعاتِ جنوبی ایشیا

پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ پاکستان

فون: 99231143، فیکس: 99232039

پنجاب یونیورسٹی پرنٹنگ پریس، لاہور

انتساب

بانیانِ پاکستان

حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ

اور

بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ

کی ارواحِ پاک کے نام

بصد عجز و نیاز

جنکی عقیدت کی شمع پاکستان کی نسلوں کے دلوں میں ہمیشہ روشن رہے گی

پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی

لاہور

فہرست مضامین

باب سوم

اظہارِ تشکر

بارگاہ اللہ رب العالمین میں صد بار اور بار بار سجدہ شکر بجالاتا ہوں کہ جس کی بے پایاں رحمت نے مجھے یہ تحقیق مکمل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں یہ اہلیت وصلاحیت بلکہ قابلیت ہی کہاں تھی جب کہ میری صحت بھی اس قابل نہ تھی کہ یہ محنت اور یہ کام کر گزرتا۔ یہ سراسر اللہ رب العالمین کا فضل وکرم اور حضور سرکارِ دو عالم ﷺ کی رحمت اللعالمینی کا صدقہ ہے جسے دورانِ کام میں نے اپنے اوپر سایہ فگن پایا اور محسوس بھی کیا ہے۔ یہ اعتراف حقیقت ہے اور اس عجز و نیاز کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ صرف اظہار تشکر کے لیے احساس کی دولت دار دین ہے جس کے لیے بے انتہا اور بے انت شکر ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا

پس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد کا حد درجہ ممنون ہوں کہ جن کی منصب کی مصروفیات کے باوجود میں ان سے پیہم علمی رہنمائی حاصل کر پایا۔ جبکہ پروفیسر ڈاکٹر منیر الدین چغتائی مرحوم سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا صمیم قلب سے شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ جن کی براہ راست نگرانی اور شفقت سے یہ کام اپنی تکمیل کو پہنچا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد اور پروفیسر ڈاکٹر منیر الدین چغتائی ہر دو اساتذہ کرام سے میں نے دو خلیق اور شفیق انسانوں کا سا تاثر زیادہ سمیٹا ہے جو میرے لیے ایک سعادت بھی ہے اور اعزاز بھی! ظاہر ہے کہ ان کی وجہ سے ہی میرے علم و قلم کو تحریک ملی ہے۔ اس لیے میرا دل ان کا شکر گزار ہے۔

اللہ کرے کہ یہ علمی کاوش اور کوشش کسی طور پاکستان کی آئندہ نسلوں کے کسی کام آجائے۔ یہ میرا احساس ہی نہیں، دعا بھی ہے

شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی

پیش لفظ

قومیں دین سے بنتی ہیں نہ کہ سرزمین سے، اسلام اس جہاں تاب قومیت کا علمبردار ہے۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو یہی وہ اساس ہے، جس پر مسلم ملت کا تمدنی ارتقاء وقوع پذیر ہوا ہے۔ اسلام کا اپنے مولد و مسکن......مکہ سے ہجرت مدینہ روحانی جمہوریت کا منفرد معاشرہ اور یکتا مثال ہے۔ ایک ہی خاندان ایک ہی زبان اور ایک ہی جگہ کے باسی، ابولہب اور ابوجہل آپ ﷺ کے چچا ہو کر بھی آپ کے سگے نہ ہوئے، جبکہ حضرت صہیب رومیؓ اور حضرتِ سلمان فارسیؓ ہی نہیں حبشہ کے حضرت بلالؓ آپ ﷺ کے گرد ستاروں کا ہالہ ہیں۔ ہجرت مدینہ کے بعد مواخات (باہمی بھائی چارے) کا عمل، مہاجرین وانصار کے باہم شیر و شکر ہونے کا دلآویز نمونہ اور عالمی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہی سبب ہے اقبالؒ جیسے آفاقی مفکر نے حقیقت کھول کر بتا دی کہ

"ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم ﷺ کی شخصیت کا مرہون منت ہے"

بلکہ ان کا یہ شعر تو حتمی ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے کہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر با او نرسیدی، تمام بولہبی است

ترجمہ: خود کو حضرت نبی کریم ﷺ کی بارگاہِ بے کس پناہ تک لے جاؤ، دین دراصل آپ کی ذات اطہر کا نام ہے۔

مملکت مدینہ کی بنیاد و نہاد میں یہی روحانی ربطِ مسلسل ہے جس نے آپؐ پر ایمان لانے والوں کو ایک منظم، متحد اور مکمل قوم بنا ڈالا۔ یہاں تک کہ قریش مکہ سے جنگوں کے معرکہ میں ایک دوسرے کے خونی رشتے، تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے، وجہ یہ رہی کہ مشرکین مکہ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی مسلمانوں کو چین سے نہ رہنے دیا۔ یہاں تک کہ صلح حدیبیہ جیسا من مانا معاہدہ بھی سامنے لایا گیا مگر آپؐ صلح حدیبیہ میں چپ چاپ اتر گئے، کہ یہ فی الواقع فتح مبین کا پہلا پڑاؤ تھا، پھر دنیا نے دیکھا بالآخر حق غالب آگیا، اور فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان ....رحمت العالمینؐ کے عفو و درگزر کی باران رحمت بن گیا......مگر یہ اصول سنتِ مطہرۃ بن گیا کہ مشرکین کے ساتھ مل کر، ایک قوم، ملت یا امت نہیں بنائی جا سکتی............اس لئے اقبالؒ ہی حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوب الٰہیؐ
دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

یہی وہ معرکہ دین و وطن ہے جو برعظیم جنوبی ایشیاء میں سن انیس سو بیس اور چالیس کے سیاسی عشروں میں برپا ہوا۔ اور یہ بات دینی وژن (Vision) کی قیادت کرتے ہوئے اقبالؒ ہی نے بتائی ہے کہ

''ہندوستانی (متحدہ قومیت) کا اقرار امت کے جداگانہ وجود کا انکار ہے''

ممتاز آئینی ماہر اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سابق جائنٹ سیکرٹری مولانا ظفر احمد انصاری کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ

''تحریک پاکستان اصلاً ایک دینی تحریک تھی۔ جو برعظیم پاک و ہند کے تاریخی اسباب کا لازمی نتیجہ تھی۔''

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ تاریخ کے سابق سربراہ اور ممتاز محقق پروفیسر محمد اسلم مرحوم کا یہ تجزیہ بھی اس جذبے کی عکاسی کرتا ہے کہ

''تحریک پاکستان کے پیچھے دینی عصبیت کارفرما تھی۔تحریک کے رہنما پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کا فلک شگاف نعرہ بلند کر رہے تھے۔ اس نعرے نے رنگ، نسل، علاقائیت، لسانی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو حرفِ باطل کی طرح مٹا دیا''

منیر نیازی جیسا بظاہر رومانی شاعر بھی پاکستان کے لئے روحانی استعارے میں پکار اٹھا ہے

تو بھی ہے ہجرت کدہ، شہر مدینہ کی طرح
ہم نے دوہرائی ہے اک رسم، آبا کی طرح

برعظیم پاک و ہند کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے کو جس طرح انگریزوں، ہندوؤں اور نیشنلسٹ بلکہ بعض مذہبی رہنماؤں نے اپنے نشانے پہ رکھا، آج کئی برس بعد تاریخ نے ثابت کر دکھایا ہے کہ سر سید احمد خانؒ، حضرت علامہ اقبالؒ اور حضرت قائد اعظمؒ کا موقف، برعظیم کے مسلمانوں کے لئے دینی وژن اور دینی بصیرت کا حامل تھا، مشرکوں کے ساتھ مل کر ایک قوم نہیں بنائی جا سکتی حالانکہ تاریخ نے بھی یہ ہی ثابت کیا کہ ایک ہزار سال تک بیچ دیوار کے ہمسائے ہوتے ہوئے بھی ہندو اور مسلمان ایک قوم نہ بن پائے تھے مگر اکثریت کے خمار اور اقتدار کی آڑ میں برعظیم کی مسلم ملت کو ہندوؤں نے انگریزوں کے بعد اپنا غلام بنانا چاہا......اس تاریخی اور تحریکی احوال کے سیاسی زاویوں اور روحانی زاویوں کا احاطہ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی نے اپنی کتاب زوال سے اقبالؒ تک میں کیا ہے۔ گویا یہ کتاب تحریک پاکستان کی

نظریاتی تاریخ اور روحانی و دینی تحریک کا ایک جامع جائزہ ہے جس میں حقائق کو سامنے رکھ کر نتائج کا خلاصہ پیش کیا ہے جب کہ سر سید احمد خانؒ، حضرت علامہ اقبالؒ اور بابائے قوم حضرت قائد اعظمؒ کی دینی بصیرت اور روحانی شخصیات کے معارف کا باب پہلی دفعہ کھلا ہے کہ امت مسلمہ اور خاص طور پر اسلامیان ہند کی رہنمائی مذہبی ملائیت کے بس کا روگ نہیں، یہ چنیدہ شخصیات کا ہی فیصلہ ہے۔ جو اللہ اپنی مرضی مطلق سے کرتا ہے۔ اس کتاب کا مختصراً جائزہ پیش کریں تو پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی کا یہ تجزیہ و تحقیق حاصلِ مطالعہ ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں

''مسلمان مذہبی شُدّھی سے تو بچ نکلا مگر سیاسی شُدّھی کی متحدہ قومیت کے علمبردار بعض مذہبی رہنماؤں نے آلیا......اس دامِ ہم رنگِ زمین سے برعظیم کی ملت اسلامیہ کو فی الحقیقت حضور سرکار مدینہ ﷺ کے دو فقیروں......اقبالؒ اور جناحؒ نے بچالیا۔ اور مشرکوں سے الگ ایک مسلم قوم اور ہندوستان سے علیحدہ ایک مسلم اکثریت کا ملک پاکستان لے کر دیا۔ جو دو قومی نظریے کا عصری اجتہاد ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مملکت مدینہ کے بعد یہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر ایک اصولِ قدیم کی عصری بازیافت ہے''

واقعات اور شخصیات کے حوالے سے تاریخی تجزیے کے ساتھ ساتھ روحانی پہلوؤں کا بیان ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی کے قلم اور رجحان کا اختصاص لگتا ہے۔ جس سے حقیقتِ حال کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں، میری دعا ہے کہ اللہ پاک ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی کے علم و قلم میں برکت دے اور وہ صحت و سلامتی کے ساتھ مزید علمی و قومی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ آمین!

پروفیسر ڈاکٹر عنبرین جاوید
ڈائریکٹر
مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء

پاکستان میں تقلید اور اجتہاد کی فکری کشمکش
جنگ وجدل سے قتل وغارت گری تک

چیف جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے بحیثیت ملت زوال کی تین وجوہ بیان کی ہیں: ملوکیت، ملائیت اور پیری مریدی۔ اُن کے نزدیک تاریخ میں مسلمانوں کا ملوکیت کے نظام کو قبول کرنا زمانہ جاہلیت کی طرف واپس جانا تھا۔ ملائیت سے اُن کی مراد مسلمانوں کے ''مذہبی پیشواؤں'' میں تخلیقی سوچ کا فقدان یا بانجھ پن ہے جس کے سبب نئے مسائل کا حل اجتہاد کے ذریعہ تلاش کرنے کی بجائے تقلید کی روش اختیار کرنے سے کیا گیا، جو مزید اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی تخریب کا سبب بنا۔ اور پیری مریدی سے مطلب مسلمانوں میں ایسی الٰہیات یا ایسے تصوف کا فروغ ہے جو انہیں اس دنیا کو بہتر بنانے کی بجائے عاقبت میں عافیت وسکون حاصل کرنے کی ترغیب دے۔ اقبال اُسے ''خانقاہی'' تصوف کا نام دیتے ہیں، جو شعور نبوّت کی خصوصیات سے عاری ہے۔ فرماتے ہیں: ''جو درویش ملت اسلامیہ کے مسائل کا حل نہ پیش کر سکے، وہ درویش نہیں راہب یا رشی ہے''۔

فکر اقبال کا ایک غور طلب پہلو اُن کا یہ فرمان ہے کہ اسلام کا نزول اُس وقت ہوا جب انسان کی عقلِ استقرائی یا شعور ترقی کی اُس منزل تک پہنچ چکا تھا کہ اُسے پیغمبروں، بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں جیسے سہاروں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ گویا انسان اِس قابل ہو گیا ہے کہ وحی کی تعبیر وقت کے تقاضوں کے مطابق خود کر سکے۔ اس تمہید سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلام کا اصل پیغام سلطانی جمہور کا قیام ہے۔ اور اسی بنا پر مسلم معاشرہ جس اصول پر قائم ہے وہ بقول اُن کے ''ثبات فی التغیر'' ہے۔

اگرچہ اقبال بجائے خود صاحبِ فکر تھے، اُن کی فکر حرکی ہے جسے عملی جامہ پہنانے کی خاطر کسی صاحبِ عمل کی ضرورت تھی۔ اسرار خودی کے آخر میں چند دعائیہ اشعار سے ظاہر ہے کہ اقبال نے اللہ تعالیٰ سے کسی ایسے ''ہمدم'' کے لئے دعا کی جو اُن کی تنہائی کو دور کر دے، اُن کے خوابوں کو حقیقت بنا دے۔ فرماتے ہیں: ''میں آزر کی طرح خود ہی اس بت کو تراشوں اور پھر خود ہی اُس کی پرستش کروں''

ے سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش
ہم صنم اُو را شوم ہم آزرش

سوچنے کی بات ہے، برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی تحریکیں مثلاً سید احمد بریلوی کی تحریکِ مجاہدین اور بعد میں مولانا محمد علی (جوہرؔ) کی تحریکِ خلافت، جو اسلام کے نام پر چلیں، کیوں ناکام رہیں؟ اور تحریکِ پاکستان، جو بھی اسلام ہی کے نام پر چلی، کیوں کامیاب ہوئی؟ جواب ہے، سوچ کے انداز میں فرق تھا۔ تقلیدی اندازِ فکر ناکام رہا۔ اجتہادی اندازِ فکر کامیاب ہوا۔

پروفیسر محمد جہانگیر تمیمی فرماتے ہیں کہ پاکستان دو قومی نظریے کا عصری اجتہاد ہے۔ بلکہ ریاست مدینہ کے بعد دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک اصولِ قدیم کی عصری بازیافت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ اس کتاب میں تمیمی صاحب نے پاکستان کی نظریاتی و سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ مگر مسئلہ اقبال، قائداعظم یا قیام پاکستان تک پہنچنے سے حل نہیں ہو جاتا۔ ایک نیوکلیر قوت ہونے کے باوجود نظریاتی طور پر پاکستان میں زوال کے بے شمار آثار ابھی باقی ہیں، جنہیں مٹانے کی بجائے ہم نے اُن میں اضافہ کیا ہے۔ اسی بنا پر اب اس سرزمین میں تقلید اور اجتہاد کی فکری کشمکش نے عملی جنگ و جدل یا قتل و غارت کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ ان حالات میں صاحبانِ فکر کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ مستقبل میں وہ پاکستان کی بقا کا انحصار کس نوع کی سوچ کی مقبولیت میں پاتے ہیں۔ اقبال نے فرما رکھا ہے: ''قومیں شاعروں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں اور سیاستدانوں کے ہاتھوں زندہ رہتی یا مر جاتی ہیں۔'' سیاسی قائدین کو تو اپنے حال پر چھوڑیئے۔ صاحبانِ فکر کو اقبال، خدائے اسلام کا کیا پیغام دیتے ہیں؟ جاوید نامہ کا وہ منظر اپنی نگاہوں کے سامنے لایئے جب اقبال خدا کے حضور میں کھڑے ہیں اور خداوند تعالیٰ ارشاد کرتے ہیں: ''ہر وہ جس میں قوتِ تخلیق نہیں، وہ ہمارے نزدیک کافر اور منافق ہے۔ اس نے ہمارے جمال میں سے اپنا حصہ نہیں لیا، اُس نے زندگی کے درخت کا پھل نہیں کھایا۔''

ہر کہ او را قوّتِ تخلیق نیست	پیشِ ماجز کافر و زندیق نیست
از جمالِ ما نصیبِ خود نبُرد	از نخیلِ زندگانی بر نخوُرد

جاوید اقبال

۲۵ اگست ۲۰۱۱ء

لاہور

خلاصۂ کتاب

برعظیم پاک وہند میں مسلمان کم وبیش ایک ہزار برس تک حکمران رہے یہیں رچ بس گئے مگر، مقامی ہندوقوم نے مسلمانوں سے اپنا روایتی فاصلہ برقرار رکھا اور نتیجتاً ہندوقوم اس خطے میں اکثریت کی اکثریت ہی رہی مسلمانوں میں مدغم نہ ہوئی انگریزی اقتدار کا زمانہ اس قوم کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا، کیونکہ انگریزوں نے مسلمانوں کو بطور حریف اور ہندوؤں کو بطور حلیف ساتھ ملا کر ہندوستان پر اپنے عرصۂ اقتدار کو دوام دینے کی بھرپور سعی کی، مسلمانوں کو معاشی، معاشرتی اور سرکاری سطح پر پیچھے دھکیل کر پوری منصوبہ بندی سے ہندوقوم کو آگے بڑھایا۔ جب اس خطے میں برطانیہ کا دمِ واپسیں شروع ہوا، تو ہندوقوم، انڈین نیشنل کانگریس کے ترنگے تلے، یورپ کے جمہوری اصولوں کی بنا پر پورا ہندوستان اپنے نام کرانے کے لئے انگریزوں سے پہلے تعاون...... پھر عدم تعاون، کبھی مزاحمت کبھی مذکرات کبھی سول نافرمانی، کبھی ہڑتال کبھی بھوک ہڑتال ، کبھی عدم تشدد، کبھی تشدد ہی تشدد، کبھی مذکرات میں شرکت کبھی شرکت سے انکار، غرضیکہ ہر حربہ اور ہتھکنڈہ استعمال کیا گیا، تاکہ پورے کا پورا ہندوستان کانگریس کے ہاتھ لگ جائے، کبھی ہندوستان چھوڑ دو کبھی ہند فوج کے نیتا جی سوبھاش چندر بوس بذریعہ بندوق انگریزوں سے اقتدار چھیننے کے درپے رہے۔

مگر ایک مسئلہ اور معاملہ ایسا تھا جو ہندو قیادت کے لئے بے بسی کی تصویر بن گیا کہ برعظیم کی مسلم قوم کو کیونکر ساتھ لے کر پورے کا پورا ہندوستان، ہندو اکثریت کے زیر تسلط اور زیر دام آجائے، اسی مرحلہ پر وہ تاریخی تعصب بھی بے نقاب ہو گیا جب تحریک خلافت میں ہندو مسلم اتحاد کے وقتی مظاہرے میں گاندھی کی شمولیت نے اپنا رنگ جمایا............یہیں سے کانگریس کو خلافت کے تھکے ہارے مسلم عوام، علماء اور متحرک اور فعال کارکنوں کو اپنے ساتھ ملانے کی راہ سوجھی۔ جیسے سرحد کے خدائی خدمت گار، یوپی میں جمعیت علمائے ھند اور اسکے رضا کار بلکہ پنجاب اور دہلی کی حد تک مجلس احرار بھی شریک فتنہ کونین ہو گئے اور انڈین نیشنل کانگریس کی ہمراہی اور راہنمائی ہی نہیں براہ راست قیادت میں متحدہ قومیت کا دام ہم رنگ زمین لیے تحریک پاکستان کے خلاف روایتی مذہبی ملاؤں کا ایک برسرِ منبر گروہ، جُبّہ ودستار کی فضیلت کا خراج وصول کرنے ، برعظیم کے مسلمانوں پر پل پڑا۔ اس متحدہ قومیت کے فتنہ اور فلسفہ کو حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے افکار و اشعار ہی نہیں انکے سیاسی تدبر کے شہکار نے جالیا، اور قومیں دین سے بنتی ہیں نہ کہ سرزمین سے کے اسلامی نظریہ قومیت نے مسلمانان برعظیم کو بیدار اور ہوشیار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں لندن جا بسنے کا فیصلہ کر چکے محمد علی جناح کو وطن واپس آنے پر آمادہ کرنے اور اس سے پہلے اپنے خطبہ الہ آباد کے الہام کی تعبیر کے لیے جناح کی قیادت کو ہندوستان لاکر وہ عظیم کارنامہ سرانجام دیا کہ بارہ سوبرس بعد برعظیم پاک وہند کے شمال مغربی حصے یعنی آج کے پاکستان کا الہام و پیغام، پاکستان کا قیام بن گیا۔

پاکستان کے اس خطے میں قیام اور پھر استحکام نے فی الواقع ہندومت اور اسلام کے تہذیبی جدل کو جنم دیا ہے اور وقت نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ پاکستان بھارت تعلقات کی تاریخ ان دو تہذیبوں کے مابین تہذیبی جدل کا نظریاتی معرکہ

ہے، جو کرکٹ کے میدان سے جنگ کے گھمسان میں دونوں قوموں کے عوامی اظہار سے بخوبی باور ہوتا ہے، اور اگر دینی محاذ پر معرکۂ بدر وحنین کی بات کریں تو یہ دراصل اسلام اور بت پرستی کے دنیا بھر میں واحد مشرک ملک بھارت کے مابین معرکۂ کفر واسلام ہے۔ جس کی نشاندہی احادیث نبوی ﷺ میں بھی ہوتی ہے جس میں غزوۃ الہند کا ارشاد پاک بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ غزوہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں حضور سرکار عالم ﷺ بذات خود شریک ہوں۔ قیام پاکستان کے نظریاتی پس منظر کے تاریخی جدل میں حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر بڑا حقیقت کشا ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

تقسیم بنگال ۱۹۰۵ء وہ شعلۂ جوآلہ ہے جہاں انڈین نیشنل کانگریس سے ہندو کانگریس اپنے پٹ کھولتی ہے۔ یہیں سے ہندو، ہندی، ہندوستان کا قومی شعور نمایاں ہوتا ہے۔ مسلم دشمنی اب کانگریس کے باطن سے ظاہر کے چہرے پر چیچک کی طرح چپک گئی۔

خود گاندھی نے 1908ء میں لکھا ہے:

"The real awakening of India (Hindu) took of the partition of Bengal."

بنگال کی تقسیم تو رہی دور کی بات جب انگریزی تعلیم کا حصول یونیورسٹی تک پہنچا تو کلکتہ میں مسلمانوں کے لئے گنجائش نہ رہی، اور جب 1921ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی بنی تو ڈاکٹر محمود حسین کے بقول:

''جب 1921ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو ہندو اسے مکہ یونیورسٹی کہتے تھے۔ حالانکہ اس میں قیام پاکستان تک مشکل سے 10 فیصد مسلمان اساتذہ تھے۔ اور یہ سب اس لئے کہ عربی، فارسی، اور اردو وغیرہ پڑھانے کے لئے ہندو استاد نہیں مل سکتے تھے۔''

اور تو اور معروف ہندو دانشور اور فلسفی شری اربندو گھوش تک اس تقسیم بنگال کے خلاف بڑودہ سے کلکتے آدھمکے اور ٹیررسٹ (دہشت گردی کی) سرگرمیوں کا آغاز کر دیا، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد ان ہندوؤں کی مسلم دشمن کارروائیوں میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ صوبہ سرحد سے پستول اور اسلحہ خرید کر ان مسلم دشمن دہشت گردوں کی معاونت فرماتے رہے۔ جو تقسیم بنگال کی مخالفت میں پرتشدد کارروائیاں کر رہے تھے۔

برعظیم پاک وہند میں ۱۹۲۰۔۱۹۳۰ء کے سیاسی عشرے میں تحریک خلافت کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ قیادت مولانا محمد علی جوہرؔ اور مولانا حسرت موہانی نے اپنی سیادت وقیادت کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ تو گاندھی جی جس نے جناح کی قیادت میں پہلی دفعہ ممبئی میں اپنا تعارفی جلسہ کرایا تھا جنہیں پہلے ہندوستان میں کوئی جانتا تک نہ تھا۔ تو بھی گاندھی نہ صرف تحریک خلافت میں کود پڑے، بلکہ مولانا محمد علی جوہرؔ کے مرشد اور مولانا حسرت موہانی کے مرشد زادے

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محل (سلسلہ عالیہ قادریہ) کی صحبتِ خاص میں جا گھسے اور انہیں اپنا سیاسی پیر تک کہنے لگ پڑے بس یہیں سے تحریکِ خلافت میں گاندھی کا مذہبی شخصیت کا روپ ہندو بلکہ مسلم عوام تک میں بہروپ بننا شروع ہوگیا۔اب

''فتویٰ مولانا عبدالباری فرنگی محل اور حکم مہاتما گاندھی کا''

کے اشتہار تحریکِ خلافت کا روز بازار ہوگئے۔مگر ۱۹۲۴ء میں تحریکِ خلافت کے خاتمہ کے ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کا وقتی اہتمام بھی دم توڑ گیا۔بلکہ حقیقت بے نقاب ہوگئی۔اس کی کوکھ سے شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکوں نے ہندو عوام کو تشدد اور تحریکوں کے ذریعے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی ترغیب کی راہ پر لا ڈالا۔اور شدھی تحریک کے بانی سوامی شُردھانند،جن سے دو سال قبل تحریکِ خلافت کے جلسہ میں دہلی کی جامع مسجد کے صحن میں مکبر اذان کے چبوترے پر کھڑا کر کے تقریر کرائی گئی اس نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کا اہتمام کیا۔اُسے گستاخی اسلام کی بنا پر جب ایک مسلمان نے واصلِ جہنم کیا تو ہندو مسلم اتحاد کے وقتی جلوے دیکھنے والے شہر اور قصبات ہندو،مسلم فسادات کی لپیٹ میں آ گئے۔جسے انڈین نیشنل کانگریس ہندو،مسلم بلوے کہتی رہی......چھوٹے،موٹے ہندو لیڈر تو کیا،خود گاندھی ہی نے مسلمانوں پر طعن کرنے سے کہیں آگے بڑھ کر اسلام تک کو اپنی اھنسا کی سان پر کس لیا۔وہ یہاں تک بول اٹھے کہ''اسلام تلوار کا مذہب ہے۔یہ تشدد کا مذہب ہے۔''

بلکہ 1929ء میں اس سطح پر اتر آئے کہ وہ کامل آزادی کے نام پر ہندو اکثریت کے ہندوستان پر بلا شرکت غیرے کانگریس راج اور آریہ سماج کے قیام پر مسلمانوں کو للکارنے لگے انہوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے لکھا کہ:

''میں آزادی کی جنگ لڑوں گا،تم ساتھ آؤ تو تمہیں ساتھ لے کر تم نہ آؤ تو تمہارے بغیر اور تم مزاحمت کرو تو تمہاری مزاحمت کے باوجود...........ان کے الفاظ تھے

"With or Without You or Despite of You"

مولانا محمد علی جوہر سے ٹکرانے کے بعد 1930ء میں پہلی گول میز کانفرنس لندن کو گاندھی گول کر گئے جہاں مولانا محمد علی جوہر کا لندن میں انتقال ہوگیا۔اور انہیں بیت المقدس میں دفن کیا گیا کہ لندن کانفرنس میں ان کا یہ اعلان ان کی وصیت بن گیا کہ:

''میں ایک غلام ملک میں نہیں جاؤنگا،یا تو آزادی کا پروانہ مجھے دینا ہوگا،یا پھر آزاد ملک میں مجھے دفن کرنا ہوگا۔''

اب مسلمان قوم یا اس کے مستقبل پر کوئی بات کہاں؟ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ نے لکھنؤ پیکٹ ۱۹۱۶ء کے طے اور تسلیم شدہ مسلم قوم اور قومیت اور اس کی جداگانہ سیاسی نمائندگی کے حق کو بھی یکسر مسترد کر دیا جس کی وجہ سے ہی جناح بھی سیاست اور کانگریس سے بد دل ہو کر لندن جا بسے تھے۔دوسری گول میز کانفرنس (۳۳-۱۹۳۲ء) میں حضرت علامہ اقبالؒ کو شرکت کا موقع ملا،جہاں انہوں نے جناح کو واپس ہندوستان آنے اور مسلمانوں کی بلکہ مسلم لیگ کی

قیادت کرنے پر آمادہ کر لیا۔اب گاندھی اور کانگریس، ہندوستان کے واحد وارث اور واحد قوم (متحدہ قومیت) کے پرچارک بن کر بعض مسلم مذہبی رہنماؤں کو ساتھ لیے مسلم عوام اور انگریز حکمران دونوں کے سامنے ہندوستانی قومیت کے ترجمان بن گئے، سچ تو یہ ہے کہ مسلمان مذہبی شُدھی سے تو بچ نکلا مگر سیاسی شُدھی کی آکاس بیل کے بعض مذہبی مدرسین نے آلیا۔اس دامِ ہمرنگ زمین سے برعظیم کی مسلم ملت کو امر واقعہ یہ ہے کہ حضور سرکار دو عالم ﷺ کے دو فقیروں اقبالؒ اور جناحؒ نے بچالیا۔اور ہندوؤں سے الگ ایک مسلم قوم اور ہندوستان سے الگ ایک مسلم اکثریت کا ملک پاکستان لے کر دیا۔جو دو قومی نظریہ کا عصری اجتہاد بھی ہے اور مملکتِ مدینہ کے بعد دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک اصولِ قدیم کی عصری بازیافت بھی!

حضرت علامہ اقبالؒ کا خطبہ الہ آباد 1930ء ہندوستان کے اندر ایک مسلم مملکت کے قیام کی تجویز (نوید) تھی، وہیں لندن کی دوسری گول میز کانفرنس میں محمد علی جناح کو واپس ہندوستان آکر مسلمانوں کی قیادت پر آمادہ کیا۔یہاں تک کہ اپنی عمر مستعار کے بقیہ آٹھ برس حضرت علامہ اقبالؒ نے برعظیم کی ملت اسلامیہ کے مستقبل کے لئے پنجاب میں عملاً چھ برس تک مسلم لیگ کے براہ راست صدر تک رہے۔بلکہ 23 مارچ 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کے مجوز اور محرک بھی حضرت علامہ محمد اقبالؒ ہی تھے۔تاریخ کی تجزیاتی زبان میں بات کریں تو یہ ماننا پڑے گا کہ 1930ء کے خطبہ الہ آباد کی آئینی منزل کا دوسرا نام دس برس بعد قرار دادِ لاہور ہے۔جس کا حاصل پاکستان ہے، یہی سبب ہے اس قرارداد کی منظوری کے دوسرے دن 24 مارچ 1940ء کو حضرت قائد اعظم محمد علی جناح نے فرمایا:

''آج اقبالؒ زندہ نہیں ورنہ وہ بہت خوش ہوتے آخر ہم نے وہی کر دکھایا ہے، جو وہ چاہتے تھے۔''

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کو یہ شرف تا قیامت حاصل رہے گا کہ انہوں نے بیسویں صدی میں زوال آشنا ملت اسلامیہ ہند کی بقا اور سلامتی کے لئے عملاً کارزار سیاست میں عیار ہندو اور مکار انگریز کے چنگل سے مسلمانانِ برعظیم کو اسلام ایک دین حیات و کائنات اور اسلام کا انسان مطلوب مردِ مومن کا راز آشکار کیا، اور ساتھ میں اس کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک دارالسلام کا نظریہ بھی پیش کیا اور ان کا قائد اور بانی بھی چن کر دیا، الہیات میں اسے اصطفٰی (Selection) کہتے ہیں یعنی

چُن لیا میں نے تجھے سارا جہاں رہنے دیا

حضرت علامہ اقبالؒ کا فکر و عمل جہاں انہیں بانیان پاکستان (Founding Fathers) میں سرعنوان قرار دیتا ہے۔وہاں پاکستان کے لئے یہ شرف اور اعزاز کیا کم ہے کہ اس کا نظریہ؛ اس کا بانی یہاں تک کہ اس کا جغرافیہ تک بھی اقبالؒ سے منسوب ہے۔حقیقتاً اقبالؒ ہی پاکستان کے مرشد اولین اور مُبشرِ اولیٰ ہیں۔جن کی دینی بصیرت نے مسلم ایشیا میں ایک اور مسلم مملکت کے قیام کو یقینی بنایا۔قائد اعظمؒ کی رفاقت و رہنمائی بھی انہیں کے حسن تدبر کا اعجاز ہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کی معروف کتاب کا نام ہے تلاشِ ہند (Discovery of India) امر واقع کی زبان

میں بات کریں تو پاکستان اور بانی پاکستان دونوں اقبالؒ کی دریافتیں ہیں جسے انگریزی میں

Both the Idea and the Leadership for Pakistan are the Discoveries of Iqbal.

یا اسے اردو میں

جناحؒ، اقبالؒ کے مردِ مومن بھی کہہ سکتے ہیں۔

اسلام ایک زندہ قوت..............زوال سے اقبالؒ تک

عالم اسلام کو یہ خوش بختی نصیب ہوئی ہے کہ گذشتہ چودہ سو برسوں میں حضور سرکار دو عالم ﷺ کے دو علماء دین و فقرا ایسے ہیں جنہیں رہتی دنیا تک دین و دل کے ابلاغ کو عالمی اور انسانی معیارِ مطلوب کی پکار کہنا ہوگا۔ ایک نے تو آج سے ٹھیک سات صدیوں پہلے معتزلہ کے عقل آور دور میں عقل و خرد کے تارِ عنکبوت کے مد مقابل دین و دل کی برتری کا میدان بدر برپا کیا۔ یعنی حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ! جبکہ ان کے ٹھیک سات صدیوں بعد مغرب کے مادی فکر و فلسفہ کو الہیات کی لگام دی ہے حضرت علامہ اقبالؒ نے، یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ بیسوی صدی میں ہی کیا اکیسویں صدی کے بھی ترجمانِ حقیقت ہیں۔ بلکہ آئندہ زمانوں میں جن کا نہیں کوئی نام میں بھی اقبالؒ حیات و کائنات اور حاصلِ حیات کے ترجمانِ حقیقت بنے رہیں گے، ایسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں یہ کائنات پر فضلِ باری تعالیٰ کا خصوصی انعام ہوتے ہیں، جو فی الواقع حضور سرکار دو عالم ﷺ کا روحانی پیغام ہوتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ ان کی نظم و نثر ہی کیا خطبات و خطوط، ارشادات ان کی مجلس روز و شب کے ملفوظات کا روزنامچہ ایک جہانِ تازہ ہے۔ جس کے گلوں کی خوشبو انسانیت کی مشامِ جان کو سدا معطر رکھے گی۔ اس برعظیم پاک و ہند میں انہیں حیات مستعار کا وقت عطا ہوا تھا تاہم فکری اور روحانی جہتوں پر اقبالؒ کے افکار و اشعار ابھی پردہ اسرار میں ہیں جب اور جس لمحے یہ صورتِ ابلاغ و اظہار میں آئے تو دنیا زندگی کے حقائق پر نظریں جمائے، جادہ و منزل دونوں کو پالے گی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اقبالؒ ترجمانِ حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ حضور سرکار دو عالم ﷺ کی سدا بہار صدا ہیں۔ اس لئے خود بتاتے ہیں کہ

اقبالؒ بھی اقبالؒ سے آگاہ نہیں ہے

تاریخ کے آئینے اور رسالت ﷺ کے دربار سے آنکھیں اشک بار ہوں تو پھر یہ کہنے میں کیا باک ہے کہ اقبال بلالِ رسول اللہ ہیں، جو اللہ کی توحید اور رسالت کے محاذ پر اذان بلکہ اذانِ وقت ہیں۔

اس سطح کا انسانِ عظیم جس برعظیم میں خود شاہدِ حالاتِ امت ہو بھلا اس کے درد و سوز اور نالۂ نیم شبی اور سحر خیزی کا عالم کیا ہوگا؟ خود اس کے اشعار و افکار اور ارشادات و خطبات کا الہیاتی، روحانی اور فکری پہلو، اہل دل اور اہل دانش دونوں کی متاعِ بے بہا ہے، لیکن سوز و آرزو مندی کا اقبالؒ برعظیم کیا پوری ملتِ اسلامیہ کے زوال کا جس قدر نوحہ خواں ہے۔ وہاں

اس سے کہیں بڑھ کر کاشف المسائل انسان بھی ہے اس نے نورِ نبوت سے مستنیر شعور سے یہ باور کرایا کہ مسلم ملت یا ملت اسلامیہ کا دینی اور روحانی شعور تا قیامت جس ذات اطہر ﷺ کے گرد طواف جاں کرتا رہے گا، وہ ذات رسول ﷺ ہے۔ وہ حتمی اور کامل نمونۂ حیات ہیں۔ نبوت کے الٰہی ادارہ کا فیض و فیضان آپ ہی کی ذات اطہرؐ پر جا کر تکمیل پذیر ہوا ہے۔ گویا دین وحیات بھی مکمل اور نمونہ بھی کامل! فی الجملہ یہ قوم درحقیقت حضرت رسول کریمؐ کے نام پر ایک ساتھ دل دھڑکنے کا نام ہے۔ جن کے دل بنامِ مصطفیٰؐ ایک ساتھ دھڑکیں وہ ایک قوم ہے ملت ہے یہ ہی دوقومی نظریہ ہے۔ اس لئے اقبالؒ ہی بتاتے ہیں:

''کہ دین تو اللہ کی طرف سے عطا ہوا ہے، بطور سوسائٹی اور قوم ہم حضور سرکار دو عالم ﷺ کے مرہون منت ہیں۔''

باقی بتانِ آزری

O

باب اول

قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر

ابتدائیہ

برعظیم جنوبی ایشیاء میں ہندو مسلم تہذیب کی آویزش (Clash of civilizations) کا ایک ہزار سالہ تاریخی رویہ یہ شہادت فراہم کرتا ہے کہ ہندوؤں نے کبھی بھی اپنے تہذیبی تشخص سے دستبرداری قبول نہیں کی بلکہ وقت کے دھارے میں بہاؤ کے سنگ، رواں دواں رہ کر وقت کی رفتار اور حالات کی پکار کا بڑی دُور اندیشی کے ساتھ' ساتھ دیا ہے، ساتھ نبھایا ہے اور یہی ہندومت کا تاریخی کردار بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہندو قوم نے اس خطے میں مسلمانوں سے لیکر انگریزوں کے عہد تک کے دورِ حکمرانی میں بھی ظاہری لباس و اطوار اور زبان تک تو ضرور بدلی مگر بباطن ہندو کی ہندو ہی رہی جسے بظاہر جاندار روایت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ نتیجہ ہوتا بردباری کا' حُسن تدبیر کا یا پھر وقتی ٹکراؤ سے بچاؤ کا تو بھی مثبت طرزِ عمل کا سارا سود اور منافع ہندو قوم کے اجتماعی بیوپار کے کھاتے میں جا گرتا مگر بدیہی المیہ بلکہ ہندومت کا تاریخی اور فکری المیہ یہ ہے کہ یہ خود کو دیوتاؤں کی اولاد گردانتا ہے اور ان کے ہاں دیگر بنی نوع انسان کے مقابل میں احساس برتری اور نسلی تفوق کا خناسِ نفس موجزن ہے۔ اس کی وجہ سے ہی ہندو معاشرے میں ذات پات کا نظام (ورن وودستھا) کا مستقل بندوبست کر دیا گیا ہے جو صدیوں سے قائم دائم ہے۔ اس میں برہمن' کھتری' ویش اور شودر چار درجے کا حتمی نظام ہے اور یہ ہی ان کے سماج کی حتمی صورت گری ہے البتہ برہمن کے نسلی برتری کے احساس نے انہیں یہ خناسِ نفس دے کے چھوڑا ہے کہ وہ دیگر بنی نوع انسان پر حکم چلانے اور ان پر حکمرانی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہیں دیگر بنی آدم ناپاک (ملیچھ) اور کبھی راکھشش (خبیث) نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ خود ہندوؤں کے اپنے داخلی ذات پات کے نظام اور سماج میں یہی روش اور وطیرہ ہندو ذہنیت (Hindu mentality) کا تاریخی چلن بن چکا ہے۔ گویا ہندو تہذیب بت پرستی کی تجسیم اور ذات پات کی تقسیم کا مذہب نہیں' سماج ہے' روایت ہے اور رواج ہے، اور یہی ہندومت ہے یا ہندوؤں کی مت ہے۔

برعظیم میں مسلمان کم و بیش ایک ہزار برس تک حکمران رہے، یہیں رچ بس گئے مگر ہندوؤں نے اپنا روایتی فاصلہ برقرار رکھا اور نتیجتاً ہندو اکثریت ہمیشہ ہی رہی البتہ تاریخ کی کُتب میں مسلمان حملہ آور کو نفرت اور مسلمان حکمران پر نفرین بھیجنے کا تاریخی عناداب ہندو اکثریت کا مزاج بن چکا ہے۔ یہی طریقہ کار تھا انگریزی دور حکمرانی میں ہندو کانگرس کا! اس خطے میں ہندوؤں نے انڈین نیشنل کانگرس کے ترنگے تلے انگریزوں سے اقتدار چھیننے کے لیے کبھی مزاحمت، کبھی مذاکرات، کبھی سول نافرمانی، کبھی ستیہ گرہ، کبھی ہڑتال، کبھی بھوک ہڑتال، کبھی عدم تشدد، کبھی تشدد ہی تشدد، کبھی مذاکرات میں شمولیت، کبھی انکار، کبھی فرار غرضیکہ ہر حربہ، ہر طریقہ یہاں تک کہ وسیلہ

اور وسائل کی بھی انتہا کردی۔ مگر ایک مسئلہ وہ تھا جو ان کی بے بسی کی تصویر بن گیا کہ برعظیم کی مسلم قوم کو کیونکر ساتھ لیکر پورے کا پورا ہندوستان' ہندو اکثریت کے زیر دام آ جائے۔ اسی مرحلہ پر وہ تاریخی عناد ہی ہندو مسلم فساد بن کر ظاہر ہوا جب تحریک خلافت میں ہندو مسلم اتحاد کے وقتی مظاہرے میں گاندھی کی شمولیت نے اپنا رنگ جمایا تھا۔ یہیں سے کانگرس کو خلافت کے تھکے ہارے مسلمان علماء اور عوام میں متحرک اور فعال عناصر کو اپنے ساتھ ملانے کی راہ سوجھی۔ جیسے سرحد کے خدائی خدمتگار' یو پی میں جمعیت العلماء ہند اور اسکے کے رضا کار اور پنجاب و دہلی سے مجلس احرار' ہندوؤں کو انڈین نیشنل کانگریس کی ہمراہی اور ہمنوائی میں میسر آئے تو متحدہ قومیت کا دام ہمرنگ زمین لیے تحریک قیام پاکستان کے خلاف روایتی مذہبی ملاؤں کا ایک برسر منبر گروہ جبہ و دستار کی فضلیت کا خراج وصول کرنے مسلم عوام پر پل پڑا۔ اول اول تو یہ آویزش علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جدید علوم سے آشنا یا انگریزی خواندہ نسل اور مذہبی مدرسہ یا دیو بند مسلک (School of thought) کا گروہی شاخسانہ قرار پائی مگر آخر میں اس آویزش نے نظریاتی مباحث کا حتمی دروازہ کھول کر کفر و اسلام کی حدیں چھولیں۔ مسلمانان برعظیم میں متحدہ قومیت کے علمبردار بعض علمائے دیوبند، وہ بھی (پورے کے پورے نہیں) جبکہ مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے ہم خیال مولانا شبیر احمد عثانی" ' مولانا ظفر احمد عثانی" 'اور مولانا مفتی محمد شفیع" 'جیسے دارالعلوم دیوبند کے فاضل اساتذہ نے اس نظریاتی آویزش میں دیو بند سے اپنا رشتہ توڑ لیا بلکہ راستہ بدل لیا اور وہ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ برعظیم میں اقتدار کے بعد اس خطے میں امت مسلمہ کا مستقبل کیا ہو؟ کے سوال پر" قومیں سرزمین سے بنتی ہیں'' کہ نظریہ متحدہ قومیت کے مقابلے میں ہی نہیں بلکہ مدِ مقابل آ کر" قومیں سرزمین سے نہیں دین سے بنتی ہیں'' کے علمبردار بن گئے جنہوں نے جناحؒ کی قیادت کو اپنی قوت مان لیا اور یوں ۱۲ صدیوں بعد برعظیم کے ایک گوشے میں مسلم مملکت پاکستان قائم ہوئی تو اس تحریک نے انڈین نیشنل کانگرس کے متحدہ قومیت کے پرچار کو دوقومی نظریہ اور پاکستان کے قیام سے عملاً لا چار کر دیا جسے وقتی طور پر ہندوستان (اب بھارت) نے وقت کا فیصلہ نہیں سمجھا بلکہ ایک وقتی اور عارضی معاملہ سمجھا۔ مگر جیسا ہی کٹا پھٹا پاکستان' بھارت کے مقابل قائم ہو گیا تو اسے توڑنے کی تدبیر بھارت کی خارجہ پالیسی میں پاکستان کو ایک محرک(Factor) بنائی گئی جس سے صرف نظر نہ کرنا ہندوؤں کی تاریخ کا کابوس (Night mare) ثابت ہوا ہے۔ یہی المیہ ہے اس تسلسل کا جو پاک بھارت تعلقات (Indo-Pak Relations) کا تعمل ہی نہیں تاریخ بھی ہے۔ باہمی تعلقات کا تناؤ، کشیدگی بلکہ تین جنگوں(1948-1965 اور 1971) سے مملو مسائل بھی اسی بارودی گھٹا کا نوشتۂ تاریخ ہے۔ بھارت کو اس خطے میں پاکستان کا قیام اور دوام دونوں کیوں قبول نہیں۔ یہ ہندو مزاج(Mentality) اور ہندو سماج(Society) کا نفسیاتی پہلو ہے جسے جانے بغیر یہ حقیقی مطالعہ ہو نہیں سکتا کہ بھارتی مزاج میں پاکستان ایک مسئلہ کیوں ہے اور کیا ہے۔ اسے برعظیم جنوبی ایشیاء

میں مسلمانوں کے دورِ حکومت، سلاطین دہلی اور مغل عہد (۷۱۲ء تا ۱۸۵۷ء) سے عناد ہے تو کیوں اور پھر اس ایک ہزار سالہ تاریخ (Histroy) سے اثر پذیر ہو کر قیام پاکستان کی تحریک (Movement) سے بغض وعناد ہی کیا ہندو مسلم فساد بلکہ فسادات اور گذشتہ کم وبیش نصف صدی سے پاک بھارت جنگوں کی نوبت تک کی تہہ میں کیا ہے۔ بنابریں یہ کسی بھی مطالعہ وتحقیق کا وہ لازمی عنصر اور سفر ہے جس سے گزرے بغیر پاک بھارت تعلقات کی تاریخ کا تاریخی المیہ یا اس برعظیم پاک و ہند میں اسلام اور ہندومت کی تہذیبی آویزش اور باہمی ٹکراو (Clash of civilzations) کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہی وہ تدبیری اور سیاسی ہتھکنڈہ تھا جس نے مسلمانوں کی اس خطے میں اقتدار وحکومت کی ایک ہزار سالہ تاریخ (History) کو جب وقت نے تحریکِ قیامِ پاکستان کی شکل عطا کی تو ہندوؤں کی تنظیم انڈین نیشنل کانگرس کی چالیں سوا ہو گئیں اور مسلمانوں کے ہجوم سے ''دارلعلوم'' کے ماحول کو ہوا دیکر ساتھ ملا لیا جو تاریخ کے رومانی تخیل کا تصور لیے متحدہ قومیت میں ماضی کا مزار ہو گئے۔ حضرت علامہ اقبالؒ جنھوں نے پاکستان کا نظریہ (خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء) عطا کیا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کو لندن سے یہاں برعظیم کے مسلمانوں کی قیادت کرنے پر آمادہ کیا پھر مشاورت سے بھی نوازا جس کا ثبوت جناحؒ کے نام اقبالؒ کے خطوط ہیں۔ یہی اسلام کی روحانی تحریک میں روحِ عصر ہے۔ یہ عربی زبان کے دو الفاظ احیاء اور اصطفیٰ کا وہ عصری اجتہاد ہے جو نظریہ پاکستان اور بانیِ پاکستان کا وجود اور شہود ہے۔ جس بصیرت میں نورِ خدا ہو اس کے شواہد بھی حقیقی ہوتے ہیں، ترجمانِ حقیقت نے خود یہ راز کھولا ہے بلکہ شعر ونغمہ میں ارشاد رسول ﷺ کا ترجمہ فرمایا کہ

اتقوفراست المومن فانه' ینظر بنور الله (الحدیث)

تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

یہی سبب ہے کہ ہندومت کی تاریخی رفتار اور اس کے تہذیبی افکار سے اس برعظیم جنوبی ایشیا میں برسر پیکار سراسر مسلمان یا اسلام ہی ہے۔ اس کی عصری جھلک اگر بھارت کی خارجہ حکمت عملی میں پاکستان ایک محرک (Factor) ہے تو اس کی تاریخی جھلکیوں میں اس خطے میں مسلم اقتدار کا ایک ہزار سال اور پھر اسی اقتدار اور مسلمانوں کی حکومت کے لیے پاکستان کا قیام اور استحکام بھارت کا اس خطے برعظیم جنوبی ایشیاء میں بالادستی کا تہذیبی اور تاریخی الجھاؤ ہے۔ اس لئے برعظیم جنوبی ایشیا پر مسلم دور کے ایک ہزار سال اور ہندو تاریخ کا چہرہ تاریک کیوں ہے اور پھر مسلم اقتدار کیلیے ایک آزاد مسلم اکثریت کا ملک پاکستان کی تحریک ہندو کانگرس کی ناکامی کیونکر ٹھہری۔ اس ایک ہزار سالہ مسلم تاریخ (Histroy) اور قیام پاکستان کی تحریک (Pakistan Movement) کے گرد بھارتی خارجہ حکمت عملی میں پاکستان ایک محرک (Factor) بن کر اس لئے ایک مستقل صورتحال ہے۔ اس خطے میں مسلمان اور

پاکستان کے ساتھ بھارت کا یہ سلوک تاریخ میں گہری جڑیں (Roots) رکھتا ہے۔ یہ کوئی وقتی صورتحال یا لمحاتی اتار چڑھاؤ نہیں جس نے بھارت کی خارجہ حکمت عملی کی بنیادوں میں پاکستان کو ایک محرک (Factor) بنا رکھا ہے، بلکہ ہندومت کے ایک ہزار سال، مسلم عہد سلطنت اور مغل دور دونوں میں کیا حیثیت رکھتے ہیں، یہ ودوانوں (ماہرین) یا ہندو مورخین سے پوچھیں تو یہاں تعصب و تنگ نظری کی تاریک گلیاں ہیں جو ہندو سماج کا اپنا ر ہائش اور بود و باش کا تنگ و تاریک منظر ہے۔ یہاں تک کہ بھارتی خارجہ حکمت عملی کے واضعین (Founders) تک بھی اس تاریخ (History) اور تعصب و تنگ نظری سے باہر نہیں آ سکے جبکہ جواہر لعل نہرو کے بعد بھارتی خارجہ حکمت عملی میں ڈپلومیسی کے بانی کے۔ایم پانیکر بھی ہندو دائرے کے ایک ہزار سال کو مسلم اقتدار کے اجالے سے دور اندھیروں میں سمیٹے دکھائی دیتے ہیں۔ برعظیم جنوبی ایشیاء میں ہندو معاشرے بلکہ ہندو سماج کو آریہ سماج بنانے کے لئے مسلمانوں کو شدھی کرنے کی مذہبی تحریک کا بانی سوامی دیانند سرسوتی ہے مگر مسلمانوں کی سیاسی شدھی کرنے اور انہیں اقتدار و آزادی سے مستقل محروم کر کے اپنا غلام بنانے کا اہتمام صریحاً متحدہ قومیت کا سیاسی گاندھی ہے اس کے ہندو رہنما ہونے میں تو کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے۔خود متحدہ قومیت کے حامی علمائے ہند، مولانا ابوالکلام آزادؒ سمیت کے ساتھ کیا ہاتھ ہوا ہے وہ متحدہ قومیت کے زیرعنوان اگلے باب کی تشریح و تحقیق اپنے نتائج لے آئی ہے۔ برعظیم میں مسلمان یا پاکستان بلکہ سچ تو یہ ہے کہ برعظیم میں بھارت اور پاکستان یا ہندو یا مسلمان کے دو ہی بنیادی عوامل (Factor) جنہیں

اولاً:۔ مسلم ہندوستان اور ہندو تاریخ

ثانیاً:۔ مسلم پاکستان اور ہندو تحریک

کا گیرائی اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیے بغیر پاکستان کے قیام کی نظریاتی بنیادیں معلوم نہیں ہونگی اور یہی پاک بھارت تعلقات کا تاریخی تسلسل ہے جو جنگوں تک کا متحمل بھی ہے اور تعمل بھی۔

مسلم ہندوستان (Medieval India) اور ہندو تاریخ، برعظیم پر مسلم عہد حکمرانی کا یہی دورانیہ ہے جس سے نفرت اور عناد ہندو قوم کا تاریخی مزاج بن گیا ہے۔ یہی حقیقت تھی کہ جب انگریزی عہد سلطنت کا دم واپسیں شروع ہوا تو ایک مسلم مملکت کا ایک بار پھر قیام یعنی پاکستان کے قیام کو نا کام اور ناممکن بنانا ہندو کانگرس کا اہتمام ہی نہیں اعلان ہو گیا۔ اور پاکستان بن گیا، تو اسے عدم استحکام سے دو چار کرنا بھارتی سفارت کاری اور بھارتی ضرب کاری بن گیا اور یقیناً یہی بھارتی خارجہ حکمت عملی میں پاکستان گویا ایک محرک (Factor) ہے جسے انگریزی زبان میں

"Indian Foreign Policy -- The Pakistan's Factor."

بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان تاریخی رویوں نے ان حقائق کو جنم دیا ہے ۔پاکستان کے اس خطے میں قیام اور پھر استحکام نے اسلام اور ہندومت کے تہذیبی جدل کو جنم دیا ہے۔ وقت نے یہ نصف صدی میں ہی ثابت کر دکھایا ہے۔ پاک بھارت تعلقات کی سفارتی تاریخ دو تہذیبوں کے عصری رویوں کا نظریاتی معرکہ ہے جو کرکٹ کے میدان سے جنگ کے میدان تک دونوں قوموں کی عوامی امنگوں کے واشگاف اظہار سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ اگر فکر و نظر کے معرکۂ وجود میں بات کریں تو فی الواقعہ یہ اسلام اور بت پرستی کے واحد مُشرک ملک کے مابین معرکۂ کفرو اسلام ہے۔ یہاں تک کہ احادیث نبوی میں غزوۃ الهند کا ارشاد ہے اور ظاہر ہے کہ غزوہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں حضور سرکارِ دو عالم ﷺ بذاتِ خود شریک ہوں۔ قیام پاکستان کے نظریاتی پس منظر کے تاریخی جدل میں تا حال اقبالؒ کا یہ شعر بڑا حقیقت کشا ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بو لہبی

☆☆☆☆☆

برعظیم جنوبی ایشیاء پر مسلم حکمرانی کے ایک ہزار سال

پاکستان قائم ہو گیا تو جنوبی ایشیا پر بالادستی کے عزائم بھارت کے اقدامات بن گئے۔ اس بارے میں خارجی اور داخلی پالیسی کے محاذ پر بڑے نام اور کام اس کا بدیہی ثبوت ہیں بلکہ یہاں تک کہ بھارتی خارجہ حکمت کے واضعین(Founders) میں مصنف' مدبر اور منتظم کے طور پر جو نام نمایاں ہے وہ کے ایم پانیکر(K.M.Panikkar) کا ہے۔ وہ بھارتی سفارت کاری (Diplomacy) کے بانی مبانی قرار پائیں' تو بے جانہ ہو گا۔ داخلی محاذ پر وہ بھارتی پارلیمنٹ کے رکن ہی نہیں بھارت کی انتظامی تنظیم نو اور داخلی ہیئت حاکمہ(State-structure) کے معمار بھی ہیں' البتہ جو کام انہیں نمایاں کیے ہوئے ہے وہ بھارت کی خارجہ حکمت عملی کے فکری ہی نہیں عملی محاذ پر بھی رہنا ہے۔ عوامی جمہوریہ چین' فرانس اور مشرق وسطی میں بھارت کے سفارت کار کے اولین تقاضے نبھانے کی ذمہ داری ان کے سر رہی' مگر ان کے اپنے سر میں بھارت کو جنوبی ایشیاء میں ایک بڑی طاقت(Regional Power) کا کردار ادا کرنے کیلئے فکری اور عملی طور پر یہ سودا ایسا سمایا کہ ان کے قلم سے بھارت کی خارجہ حکمت عملی کے باب میں متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں۔ جن میں خاص طور پر بحر ہند(Indian Ocean) پر بھارتی بالا دستی کا عزم وعندیہ' خود علاقے میں بھارتی بالادستی کے عزائم ہی نہیں اقدامات کا ایک تحریری لائحہ عمل بلکہ منشور قرار پاتا ہے۔

پاکستان کے بارے میں بھارت کے تعلقات(Indo-Pak Relations) ہی نہیں' ان تعلقات کی بنیاد کیا ہے یہی وہ تاریخی روایت ہے جو روایتی ہندو مزاج کا روگ ہے۔ یہ ہندومت' عام کا ہو کہ خاص کا' مدبر کا ہو یا سیاستدان کا' فنکار کا ہو کہ صنعت کار کا پاکستان ان کی دھیمی طبیعت کا نکتہ اشتعال کیوں ہے؟ اس کی وجہ عناد کیا ہے؟ اسے دھیمے لہجوں کی تحریر اور دھیمی طبیعت کے سفیر بھی بظاہر چھپائیں' تو چھپتا نہیں ہے۔ اس امر میں برعظیم پاک و ہند کی ایک ہزار سال کی تاریخ کا ہندو ورثہ ایک ریت و روایت ہے جو نفرت و کدورت اور بغض وعناد کا اثاثہ لیے پاکستان کے ساتھ وجہ فساد اور خود بھارت کے اندر مسلمانوں کے ساتھ فسادات کی تاریخ بن گیا ہے۔ یہ تقسیم برعظیم کا نہ سبب ہے نہ نتیجہ، یہ تو ماضی قریب کا امر واقعہ ہے۔ اس امر واقعہ کو ناکام اور ناممکن بنانا بھی وہی تاریخی عناد کا ہندو ہتھکنڈہ تھا، حربہ تھا جو تحریک قیام پاکستان کے دوران متحدہ قومیت کے دام ہمرنگ زمین اور وہ بھی بعض علماء دین کے ہاتھوں استعمال میں لایا گیا مگر ہندو کانگرس کی یہ جدوجہد بھی نامراد ہوئی اور پاکستان اللہ کے فضل سے قائم ہو کے رہا! یہ پاکستان کیا ہے؟ خود متحدہ قومیت کے دو نامور علماء مولانا ابوالکلام آزاد ؒ کا ارشاد یہ ہو کہ بقول عبداللہ شملویؒ:

''پاکستان بن گیا یہی مشیت الٰہی کو منظور تھا'' (۱)

اور جمعیت علماء ہند کے سربراہ مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کا ارشاد یہ ہو کہ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں پاکستان کے خلاف مہم میں سلہٹ پہنچے' رات جس مرید کے گھر قیام تھا اسے تہجد کے وقت بتایا کہ:

''آج رات عالم بالا میں ہند کی تقسیم ہو کر پاکستانی ریاست کے وجود میں آنے کا فیصلہ ہو چکا''۔ مسترشد (مرید) نے عرض کیا کہ جب یہی کچھ ہے تو اب پاکستان کے خلاف مہم میں حصہ لینے سے کیا فائدہ؟ حضرت مرحوم کا جواب تھا کہ ''یہ فیصلہ تقدیر کا ہے ہم اپنی تدبیر میں مسلسل لگے رہیں گے''۔ (۲)

اقبالؒ تو خیر اس معرکہ میں خود سرخیل ہیں البتہ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی خدمت میں دلی کے میر تقی میر کا کلام پیش کیا جاسکتا ہے کہ

ع   اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

بحمد للہ! پاکستان کا قیام کانگرس کی مخالفت' جمعیت علماء ہند کی مخاصمت اور انگریز کی عداوت کے باوجود ظہور میں آیا' تو زمینی حقائق' ظاہری مخالفت اور تین طاقتوں کے مزاحم ہونے کے علی الرغم یہ قائم ہو کر رہا تو یہی وقت کا حتمی فیصلہ' خدا کا حکم اور یہی تقدیر الٰہی تھی' ہے اور رہے گی۔ خود اس کا بانی پاکستان کا قیام ایک ''معجزہ'' کہے تو تقدیر کا فیصلہ تدبیر کی ناکامی ہے البتہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی ؒ کا خواب ایک حقیقت ہے مگر ان کا ارشاد ایک نقطہ نظر ہی تو ہے اور یہی تقدیر تھی کہ وہ پاکستان کی مخالفت کریں! یہی کہہ کر یہاں سے گذرا جاسکتا ہے' لیکن اس کا کیا کیجئے کہ:

نسخۂ آزمودہ اک اور بھی ہے گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے، رسوائی تدبیر دیکھ

ظاہر ہے جس خواب کی حقیقت کا منبع الہام ہو' وہاں ترجمان حقیقت حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ ارشاد ہی اس کی عملی تعبیر ہے بلکہ آج کے پاکستان کے جغرافیے کی تصویر ہے جو خطبہ الٰہ آباد میں ارشاد فرمایا گیا تھا، یہاں تک کہ وہ برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ کے دو روایتی ترجمان مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنی ؒ کا پاکستان کیلئے ابطال ہے، مخالفت ہے۔ مگر اسلام اور حقیقت کے ترجمان کا حال یہ ہے کہ اس مرحلہ تاریخ پر خود تاریخ بنا رہے ہیں' فرمایا:

''مادیات سے گذر کر روحانیت میں قدم رکھیے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے۔ ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے۔ یہ ہے۔ یہ صرف اسلام

تھا جس نے آڑے وقت میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو۔
اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اوراس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو
آپ کی منتشر اور پراگندہ قومیں ازسرنو جمع ہو جائیں گی۔ اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی
سے محفوظ ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک
پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس واحد کا۔''(۳)

اس خطبہ الہ آباد میں جہاں حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی خواہش کولفظوں کا جامہ پہنایا وہیں پاکستان کے جغرافیہ کی تصویر بھی پیش کی'' کہ میری خواہش ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ہی ریاست بنا دیا جائے'' لیکن یہ ان کا خواب نہیں حقیقت ہے۔ جو انہیں نظر آئی اور فرمایا کہ'' مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمالی مغربی ہندوستان (آج کا پاکستان) کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔''(۴)

یہ نظر بہ ظاہر مومنانہ بصیرت ہے جو دل کی آنکھ ہے، کہہ کون رہا ہے وہ حکیم الامتؒ جس کا ارشاد ہو کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے
(اقبالؒ)

حقیقتاً اس ملک پاکستان کو قائم کرنے میں کارفرما قوت حقیقی تو ذات باری تعالیٰ ہے۔ یہی وہ قوت حقیقی ہے جسے کلام پاک میں فعال لما یرید کہا گیا ہے۔ کہ اس کائنات میں کارفرما اور حیات کے تمام امور کی کارفرما ذات اللہ پاک کی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے''اور جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا''(۵)

اس کے ارادہ و اختیار میں کسی حکومت کے منصوبے، کسی پارٹی کی کاوشیں، کسی جھتے کے مِتے (قراردادیں) بلکہ تمام فرعون و قیصر اور ہامان ونمرود بلکہ یزید و یہود کیا حقیقتاً تمام ہنود و نصاریٰ نے بھی اکٹھے ہو کر دیکھ لیا ہے مگر آخر میں جو فیصلہ ہوا وہ ہی تقدیر کا فیصلہ ہے، جو حتمی ہے، اٹل ہے جوابدی ہے اور وہ فیصلہ وقت کا ہے جو توحید مطلقہ ہے۔ لاتسبو الدھر کہ زمانے کو برامت کہو کہ میں خود وقت ہوں (الحدیث ترمذی شریف) کا ارشاد پورا ہوا۔ منشاء ایزدی اور مشیت ایزدی نے جو چاہا' وہی صادر ہوا' ظہور میں آیا اور تحریک پاکستان میں امت مسلمہ کا یہ نعرہ حقیقت کی تفسیر بن گیا کہ

پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ

گویا پاکستان کا مطلب سراسر اللہ پاک کی مرضی اور طاقت کا اظہار ہے۔ یہی وقت کا فیصلہ اورروح اقبالؒ کا فرمان ہے کہ قومیں سرزمین سے نہیں دین سے بنتی ہیں ۔ یہی شعور کا نوری نکتہ اور خودی کا اظہار ہے جس نے بالآخر نام

لیکراور مدرسے کا مقام باور کرا کر یہ فرمادیا کہ

حسین احمد ز دیوبند این چہ بوالعجبی است؟

اور زندگی کے آخری سال میں بستر علالت سے اپنے مضمون میں حضرت علامہ اقبالؒ نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے شرعی دلائل اور قوم، ملت اور امت کی منطقی بحث تک کا جواب لکھا۔ یہاں تک کہ ان کے تمام عمر کے کلام میں سے انہوں نے کبھی اپنا شعر بطور مدعا نہیں لکھا مگر مولانا مدنی کے جواب میں اپنے مضمونِ آخر میں خاتمۂ کلام اپنے اس شعر پر کیا کہ

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا

یہی پاک بھارت تعلقات کی تاریخ اور خود بھارت کے کروڑوں مسلمانوں کی تاریک زندگی کا بدیہی ثبوت اور واضح شہادت ہے۔ گویا پاکستان اور بھارت کا مسلمان ایک تقابل ہے۔ یہی ایک بات کہہ کہ یہ امر واضح کیا جاسکتا ہے کہ متحدہ قومیت کی جنم بھومی خود بھارت میں نیشنلسٹ رہنماؤں کی اولادیں اور جائیدادیں تو بڑھی اور پھلی پھولی ہیں وہاں مسلم ملت اور نسل کا کیا حال ہوا ہے بلکہ کیا حال ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو برعظیم جنوبی ایشیاء میں مسلم دور حکمرانی (۷۱۲ء۔۱۸۵۷ء) کے کم و بیش ایک ہزار سال کا انتقام اور پھر قیام پاکستان کی سزا کی سان پر کسی اور بھارت بھر میں پھنسی ملت اسلامیہ کا جمعیت العلماء ہند کی زبان میں یہی منظر نامہ نہیں تو اور کیا ہے:

> ''یہ بات پورے فخر اور ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کے خلاف کئی سازشوں کا انکشاف ہوا۔ لیکن ان میں کبھی کوئی مسلمان ملوث نہیں تھا۔ وہ وقت گذر چکا کہ اگر پاکستان کی جانب سے ہندوستانی مسلمانوں کا قضیہ کہیں اور کسی وقت اٹھایا جاتا تو ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے زیادہ ذمہ دار تنظیم جمعیت العماء ہند، پاکستان سے اٹھنے والی اس آواز کو اپنے آہنی پنجوں سے ان کے گلوں میں ہی دبا دیتی۔ ہر سال سعودی عرب موسم حج میں جانے والا مسلمانوں کا وفد پاکستان کے اس پروپیگنڈہ کا مکمل جواب دے کر آتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان تباہ و پامال کیے جارہے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ فرقہ پرست پارٹیاں (پہلے برسر اقتدار کانگرس اب بھارتیہ جنتا پارٹی) آج ان مسلمانوں سے غیر مشتبہ وفاداری کا سر ٹیفکیٹ مانگتی ہیں۔''(۶)

بات نہ جمعیت علماء ہند کی نہ حکومت ہند کی بات سراسر اسلام اور ہندو مت کی ہے جس کی آویزش کا دو تہذیبی ٹکراؤ (Clash of Civilizations) گذشتہ ایک ہزار برس سے ہندو اکثریت کے ہندوستان کے تاریخی

چہرے پر نفرت کا داغ بن گیا ہے۔ پھر ۱۹۴۷ء میں بھارت ماتا بلکہ تب گاؤ ماتا کے ٹکرے ہوئے' بٹوارا ہوا، جس کے نتیجے میں مسلم اکثریت کا پاکستان بن گیا' پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا' بلکہ ہندوستان کے مقابل برعظیم میں مسلم قوت اور مسلم امت کا سرمایہ اور سمبل بن گیا اور یہی بھارت کو قبول نہ تھا' منظور نہ تھا۔ یہی وہ تاریخی روگ ہے جو پاک' بھارت تعلقات میں مستقل روک اور رکاوٹ ہے۔ یہی ایک ہزار سال کے ہندو مزاج کی داخلیت کے دھیمے لہجے میں ارتعاش لاتا ہے، انتقام یاد دلاتا ہے۔ اسی انتقام کا انجام پاکستان کے ساتھ بھارت کی سفارتی تاریخ اور فوجی اقدامات کی تحریک ہے۔ جیسے بھارت کے پالیسی سازوں کے بیان میں پاکستان ان کی ایک ہزار سالہ تاریخ کا مستقل دردِ سر ہے۔ اس ایک ہزار سال کو سیاسی نیتاؤں یا ہندو رہنماؤں سے سننا کوئی نئی بات نہ ہوگی خاص طور پر قیام پاکستان کی تحریک کے دوران یہ اظہار واعلان ہندو قوم کے باطن اور رویہ اس کی معنویت پر صاد کرتا ہے۔ متحدہ قومیت کے علماء اور خود مولانا ابوالکلام آزادؒ کانگرس کے اندر مستقبل کے سیاسی نقشے میں مسلمانوں کیلئے جب بھی کوئی دستوری تحفظات کی بات کرتے تو کانگرسی نیتا بالکل ہندو ہو جاتے۔ افسوس کہ یہ روش کانگرس کے اندر تقسیم برعظیم ۱۹۴۷ء تک ہی جاری نہ تھی بلکہ مولانا آزادؒ کی حیات ظاہری اور سوانح حیات (India Wins Freedom) میں صاف طور پر عیاں بھی ہے اور بیان بھی۔ مگر ان کی وصیت کے مطابق تیس سال بعد اس کتاب کے بقیہ تیس صفحات کی اشاعت کے بعد ''ان کا یہ احساس مزید مایوسی کا مظہر ہے''(۷)

آخر ایسا کیوں نہ ہوتا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ مسلمان ہی نہیں ایک عالم اور ادیب بھی تھے۔ ان کے معاصر کوئی بھی ہند ونیتا یہاں تک کہ نہرو بھی ان کے ہم پایہ کہاں۔ گویا مولانا آزادؒ کا ہندو تجربہ بھی مسلمانان برعظیم کے ہندو قوم سے ایک ہزار سالہ سکونتی رفاقت کے تجربے سے مختلف نہ نکلا اور یہ کہ مسلم دشمنی ہندو قوم کا تہذیبی ورثہ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ پانیکر جی بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"Indian society, at least during the last thousand years, has, broadly speakinhg, been static". (8)

گذشتہ ایک ہزار برس میں ہندو سماج کیوں منجمد اور مقفل ہوا ہے؟ اس کی وجہ پانیکر ہی منجملہ خود بتاتے ہیں بلکہ وضاحت کرتے ہیں۔ آگے چل کر انہوں نے لکھا ہے کہ:

"During the period of Muslim Authority begining with the thirteenth century, Hindu society was on the defensive, and consequently greater improtance was attached to the maintanance of old forms, and to an unreasoning loyalty to inherited traditions". (9)

گویا برعظیم جنوبی ایشیاء پر مسلم حکمرانی کے ایک ہزار برس ہندو سماج کے دفاع کا دورانیہ ٹھہرا ہے۔ مگر بیسوی صدی کے نصف آخر میں برطانوی سامراج سے شکست کھائے شکستہ حال مسلمان اپنے دفاع کیلئے ہی دوقومی نظریہ اپنا مستقبل بنالیں' تو ہندو اپنی ایک ہزار سالہ تاریخ کے اس عملی رویہ پر معترض کیوں؟ یہی سبب ہے ہندو' مسلم دور حکومت میں اکثریت میں تھے اور اب بھی اکثریت میں ہیں۔اب ہندوستان میں براجمان بلکہ پردھان منتری (وزیراعظم) ہیں۔ دوقومی نظریۂ برعظیم کی تاریخ کا ماضی ہی نہیں حال بھی ہے اور مستقبل بھی! مگر پانیکر سے پوچھنا ہوگا' کہ مسلم دور حکمرانی کا ایک ہزار سال ہندوقوم کیلئے بےثمر کیوں ہے؟ جبکہ ہندو' دوسری قوموں سے اخذ واستفادہ کرنے کی تہذیب کہلاتی ہے۔ کے ایم پانیکر بھارت کی ریت اور روایت تو یہ بیان کرتے ہیں کہ دوسری قوموں سے علم وفن میں اخذواستفادہ ہی ہندوتاریخ کا طرہ امتیاز ہے۔ انہیں کے اپنے الفاظ میں:

"This is in the genuine spirit of Indian tradition, which has, in all the great period of Indian history, freely borrowed and assimilated knowledge and ideas from other". (10)

اوراس سلسلے میں برطانوی سامراج سے کم وبیش ۱۹۰ برس کی غلامانہ رفاقت میں بھارت جیسا ملک اور ہندو ایک منظم قوم لیکر پانیکر جی جب آزاد ہوئے تو وہ برطانوی ہند میں اس روایت کے تحت اخذواستفادہ کا حاصل یہ بتاتے ہیں کہ:

"The two essential characteristics of modern Indian, which are shaping its future, are its attitude to the doctrine of change and its appraoch to the new sciences". (11)

آگے چل کروہ دوسرا گرجواخذواستفادہ کی ہندوتاریخ اورریت (Tradition) کی کمائی بتائی گئی وہ ہے:

"Apart from her approach to modern sciences, the most important result of British rule in India is the change it has brought about her conception of defence-" (12)

آزاد بھارت اوراس کی قومی تشکیلِ نو جو کچھ ہے دراصل برطانوی ہند (۱۹۴۷ء۔۱۸۵۷ء) کا حاصل اور ثمرہ ہے بلکہ ہندو روایت کی زبان میں بیان کرنا مقصود ہو' تو معاصر بھارت' برطانوی ہند کا اصل زرمع سوددرسود ہے۔

اس کا بدیہی ثبوت گویا بھارت کا علاقائی انداز (Regional Power) سے عالمی آواز تک (Mini-Super Power is Rising) کے معنوی اور مطلوبہ طرزِ عمل سے ہی واضح اور مترشح ہے بلکہ بھارت نے باضابطہ سرکاری سطح پر 2020ء تک عالمی طاقت بن جانے کا اعلان کر دیا ہے۔

حیران کن امر یہ ہے کہ کے ایم پانیکر نے اخذ و استفادہ اور اس کے حاصل ثمرات کو صرف برطانوی استعمار کے ایک سو نوے سالہ دورِ غلامی (۱۹۴۷ء۔۱۸۵۷ء) تک کا حاصل تاریخ و تجربہ بتایا ہے کہ جس میں انہیں اور ان کی ہندو قوم کو یہ حکومت اور ریاست (بھارت) صدیوں بعد ملی ہے' یہ برطانیہ تیرا شکر یہ نہیں تو اور کیا ہے اس لئے کہ برطانوی سامراج سے پہلے ہندوستان پر کم وبیش گیارہ صدیاں (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) مسلمانوں کی موروثی بادشاہت رہی' جیسے عام طور پر سلاطین دہلی کا عہد (۱۵۲۶ء۔۷۱۲ء) اور مغل عہد (۱۸۵۷ء۔۱۵۲۶ء) کے دورانیہ تاریخ سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بھی پانیکر نے خود بیان کی ہے، بلکہ صدیوں بعد کی وضاحت ان کی اپنی دانست میں یہ ہے جو بار دیگر دیکھیں تو سمجھ آ ئے گا' پانیکر جی کیونکر مسلم عہد کا اخذ واستفادہ ''گول'' کر گئے ہیں کہ:

"During the period of Muslim Authroity begining with the thirteenth curntry, Hindu soceity was on the defensive, and consequently greater importance was attached to the maintenance of old forms, and to an unreasoning loyalty to inherited traditions".(13)

مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) کے دورانیہ تاریخ پر سیکولر اور جمہوری بھارت کے فکری نمونے کا یہ قومی نقطہ نظر' اپنی وضاحت آپ ہے! یہ مزاجاً ہندو ذہنیت کا روایتی انداز ہے کہ سیکولر طبیعت کا اعجاز ہے اس پر مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے برعظیم میں مسلم حکمرانی کی گیارہ عملی صدیاں عملاً ورثے' فنی ترکے' تہذیبی قوت اور تمدنی صولت کے ہر اعتبار سے بانجھ ہوں یا پھر اس دور میں ہندومت کی تاریخی روایت اخذ واستفادہ کی تاریخی چال بھول گئی ہو، نہیں ایسا ہرگز نہیں! پانیکر خود بول اٹھے کہ ہندو سماج خود میں سمٹ گیا تھا:

"Indian soceity, at last during the last thousand years, has broadly speaking been static." (14)

ہندو معاشرے کے ایک ہزار سال

گویا ہندو معاشرے نے ایک ہزار سال تک اپنے دروازے مکمل طور پر بند کر لیے کہ باہر کی ہوا نہ لگنے پائے! یہ علمی فضا کا اعتراف ہے کہ سیاسی گھٹا سے احراز ہے۔ معاف کیجئے یہی تو ہندومت ہے' پانیکر جی پروہت تو نہیں' مگر ان کا اپنا ہندومت چھپائے نہیں چھپتا! چلیے مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) کے تہذیبی ترکے اور علمی ورثے

سے یہ احراز و انکار اگر بھارت (جدید) کے دانشورانہ افکار ہیں! مگر بھارت کی سرزمین پر وقوعاتی اور واقعاتی شہادتوں کے احوال و آثار بلکہ ظواہر ہی کو دیکھ لیتے تو گیارہ صدیوں کی مسلم تاریخ کو اپنے ذہن کے ساتھ ساتھ زمین سے بھی صاف کر لیتے کہ جغرافیہ کا بت اُن کی متحدہ قومیت اور کانگرس کے نیشنلزم کا ادعا ہے یہاں تک ہندوٗ جغرافیائی باشندے کا دوسرا نام بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان کا ہر باسی ہندو ہے اور یہی معاصر ہندوستان کے احوال وآثار ہیں۔ جسے اب ''ہندتو'' کی ثقافت کہا جاتا ہے۔

مسلم عہد حکمرانی کے تہذیبی جلوے

سلاطین دہلی (۱۵۲۶ء۔۱۲ء) کا دور ہو کہ مغل شہنشاہوں (۱۸۵۷ء۱۵۲۶ء) کا ہندوستان! آج بھی بھارت کی سرزمین، ماحول اور جغرافیہ بدستوران آثار واقدار کی جلوہ گاہ ہے اور یہی پرانی دلی اور برطانوی ہند نئی دہلی تک کا ماحولیاتی اور تعمیراتی فرق ہے۔ صرف دالحکومت (راجدھانی) دہلی کی حد تک' ایک تبصرہ کانگرس نیتاؤں کے جماعتی اور ذاتی طور پر قریب اور ممتاز ومعروف ادیب وخطیب کے قلم سے یہ ہے کہ:

> ''تاریخ کے اس معمرترین شہر کو زمانے نے یادوں کا ایک خزانہ سپرد کر رکھا تھا۔ مسلمانوں نے اس شہر کو تاریخ کو پوری توانائی سے مالا مال کیا۔ انسان اپنے ماضی سے محبت کرتا ہے۔ یہ شہر اس قول کی دلیل تھا۔ مسلمانوں کے نوسوسال اس شہر میں دفن ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی سلطنت کا چراغ بھی اس شہر میں گل ہو گیا۔ تب یہاں بیسیوں کھنڈر تھے' جہاں قبریں بولتی تھیں' مینار جھانکتے تھے، مسجدیں پکارتی تھیں، گمشدہ جلال چلاتا تھا اور قلعہ کی رونقیں دھاڑتی تھیں، دیوان خانوں میں آگ لگ رہی تھی۔ کھنڈروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور قافلے پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ آبروئیں قصابوں کی دکانوں پر لٹکا دی گئیں تھیں ۔ اور عزتوں کا نیلام چکایا جا رہا تھا۔'' (15)

مسلم ہند کے تہذیبی' علمی اور فکری نیز تمدنی ورثے سے کما حقہ اخذ واستفادہ سے' پانیکر کا یہ احراز وانکار بہر حال علمی دیانت کا غماز ہر گز نہیں ہے۔ صرف اور صرف ایک سو نوے برس کی برطانوی علمداری (۱۸۵۷ء۔۱۹۴۷ء) سے جدید ہندو قوم کا ارتقاء اور اس کے نتیجے میں بھارت (جدید) ملک کا انعام حقیقتاً ایک انقلاب سہی! مگر صدیوں کی رفاقت سے مکر جانے کے لیے کوئی ڈھنگ چاہیے کہ یہ ان کی قومی جدوجہد آزادی کی تنظیم انڈین نیشنل کانگرس کے فلسفہ قومیت کی تکذیب بھی ہے۔ یہ الگ بات کہ تاریخ اور جغرافیہ کے فلسفہ سے ایک قوم بنائی نتیجہ یہ کہ گذشتہ ۶۲ برس سے جگ ہنسائی کے باوجود یہ خود تاریخ اور جغرافیہ بلکہ اس کی واقعاتی شہادت پانیکر کا پلو نہیں چھوڑتی کہ برطانوی ورثہ کا اخذ واستفادہ جو تہذیبی طور پر بھارتی قوم کا رویہ اور رجحان بنا' وہ یہ ہے کہ:

"..........Its attitude to the docrine of change and its approach to new sceiences". (16)

مگر مسلم ہند سے محض زبان و ادب' لباس و اطوار بلکہ حصہ اقتدار تک سے چھوت چھات کر دیتے تو بھی بات بن جاتی مگر جغرافیہ کی قوم کا دارالحکومت خود جس تاریخی جغرافیے کی زد میں ہے اس کی تصویر کشی متحدہ قومیت کے تب حامی ایک نامور مصنف کا حسنِ بیان ہے کہ

''یہی دہلی تھی جس کا چپہ چپہ کہانیوں کی گذرگاہ اور تاریخ کی اقامت گاہ تھا۔ ہر بڑی چیز جس کا صدیوں کے ساتھ تصور کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اہل اللہ اور ان کے مزار، فرمانروا اور ان کے آثار، تاریخ اور اس کے نقش ونگار، تہذیب اور اس کے برگ وبار، زبان اور اس کا بیان و اظہار سب کچھ یہاں موجود ہے۔''(۱۷)

مسلم ہند کی گیارہ صدیاں (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) ہندو معاشرے نے خود اختیاری اور داخلی جبر کو کیونکر روا رکھا ہے اور کمپنی بہادر کی آمد ہند اور ازاں بعد تاج برطانیہ کے زیر تسلط، کھلے در ودیوار بلکہ دل ودماغ کا ہندو انہیں کیونکر میسر آیا ہے اس کیلئے ماضی بعید کی بجائے ماضی قریب ہی دیکھ لیں تو انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل، ارتقاء اور مقاصد کی تکمیل تک کا مطالعہ بھی یہی باور کراتا ہے۔

پانیکر ہی کہتے ہیں کہ:

".......... The Indian National Congress (founded in 1885) was also a dominantly Hindu Movement, though from its earlier days it endeavoured to unite all the communities under one banner". (18)

کانگرس میں مقتدر اکثریت ہندوؤں کی تھی تاہم دیگر قوموں کو اس کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا کام کانگرس کی تحریک تھی۔

خود بھارت کی معروضی اور معاصر پہچان کیا ہے اس کی ماحولی صورتیں تا حال اینگلو انڈین تمدن کا نقش و عکس ہیں کہ نہیں ہے۔ نرادسی چوہدری جیسے ممتاز مصنف نے ۱۹۵۱ء میں اپنی خودنوشت کا انتساب بھی ''تاج برطانیہ کی یادیں'' ویسے ہی نہیں کیا، بلکہ ساتھ یہ اعتراف واقرار بھی ہے کہ آج جو کچھ اور جیسا بھی ہندوستان ہے اس کی تمام تر صورت گری اور ترفع بلکہ ترقی، برطانوی ہند ہی کا ثمر ہے۔'' (۱۹)

چلیں! مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) کے پورے عہد کو تہذیبی اعتبار سے ہندو قوم کیلئے بے ثمر مان بھی لیں تو بھارت (قدیم) کے اولین دور ویدک عہد اور قانونی عہد سے پھر مسلم عہد کے آغاز (۷۱۲ء) تک کے دورانیہ

(۳۳۰ء تا ۷۱۲ء) کو ایک تاریخ، ایک روایت اور ایک تجربہ تو باور کیا جاسکتا ہے اسے برطانوی ہند (۱۹۴۷ء۔ ۱۸۵۷ء) سے باہم مربوط کر کے اس میں مسلم ہند کی گیارہ صدیاں خارج اور فارغ کر کے اسے بھارت (جدید) کا ماضی قریب بنالیں تو پانیکر مہاراج کا مطلب ومدعا تو پورا ہو جائے گا، یہ الگ بات کہ تاریخ کا اپنا چہرہ ادھورا ہو کر رہ جائے گا۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ آریوں کی آمد ہند سے برطانوی سامراج کی رخصتی ہند تک کے دوران صرف مسلم گیارہ صدیاں ہی روک اور رکاوٹ کیوں ہیں؟ مگر افسوس کہ تاریخ عقیدہ تو نہیں ہے، تجزیہ اور تعبیر ہے۔ اسے اپنے مقاصد ومطالب کی تفسیر بنالینا آسان ہے کہ مخصوص جذبات سے مملو مسائل اور اس کے لیے دلائل کے انبار تو ہیں حقائق کا اظہار ہرگز نہیں ہوتے ہیں، اس طرح کی جذباتی تاریخ بنانے سے خود تاریخ فتنہ بن جاتی ہے۔ بلکہ عقیدہ بھی!

جبکہ قانونی عہد سے مسلم عہد تک کے دورانیہ تاریخ (۷۱۲ء۔۳۳۰ء) کو بھی ہندومت کی روایت بنانے سے اس کا تسلسل اور تعمل بھی مسلسل اور مربوط ہو جاتا ہے۔ مگر کیوں نہ مسلمانوں کی آمد ہند سے پہلے کا ماحول و منظر ملاحظہ کریں۔

تاریخ میں ہندو۔۔۔ہندوستان (مسلمانوں کی آمد ہند اور حملہ سندھ)

برعظیم پاک وہند کی تاریخ میں ہندو تحریک کا تحقیقی جائزہ لیں تو یہاں پر مسلمانوں کی آمد سے پہلے تک کوئی سا ہندوستان یا مرکزی حکومت کا نظام موجود نہ تھا۔ صرف چھوٹی بڑی چند ریاستیں موجود تھیں۔

مگر یہ تاریخی حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اِس دورانیہ تاریخ برِعظیم میں کسی مرکزی، مستحکم اور مضبوط حکومت کا وجود عنقاء ہے۔ البتہ یہاں ہندوراجاؤں کی ریاستوں (Princely States) کا ایک ہندوستان ضرور تھا جو جغرافیائی وجود کی حد تک صرف پنجاب (ملتان) راجپوتانہ (الوراوراجمیر) اور جنوب میں گولکنڈہ اور مغرب میں چتوڑ کے کسی قدر مستحکم ہندوراجاؤں کا آریہ سماج تھا۔ گویا بھارت (قدیم) کے دوسرے عہد قانونی دور کے بعد یہ ایک طرح کی علاقائی ہندوریاستیں تھیں جو باہم متحد نہیں بلکہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتیں تھیں۔

"Although various Hindu Kingdoms were formed from time to time in both the North and the South, they were never able to establish their control over the entire sub-continent of India. Most of their Kingdoms wrere reginonal in nature, and the founders were unable to build a type of Governmnent that could survive the demise of the ruling dynasty".(20)

مگر دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ ریاستیں باہم دیگر خود بھی دست وگریبان رہتی تھیں ۔ یقیناً یہی سبب ہے کہ ہندومت کی پوری تاریخ کے اس دور (۷۱۲ء۔۱۳۳۰ء) خود ہندو مورخین کے اپنے ہاں پدرم سلطان بود کا نسلی تفاخر تو میسر ہے مگر بطور فکری نمونہ یا سیاسی اسلوب واثاثہ کے کوئی سے مدرکات حاصل نہیں ! وجہ بھی یہی ہے کہ اس عہد کے مایوس نتائج کا فطری مداویٰ فی الواقعہ وہ بیرونی حملہ آور ہیں جنہیں ہندوستان پر حملہ زن ہونے کیلئے پے در پے مواقع بھی اکثر مقامی زیردست راجہ کی دعوت واعانت ایک سبب بنا تھا۔اس امر کی شہادت خود تاریخ کی اجلی شاہراہ پر باآسانی موجود ہے۔جس پر مورخین کا اجماع ہے کہ:

"By the end of tenth century A.D. Hindu Civilization had last its dynamism and creativity. Hindu society had become stagnant and rigid. The rulers of the various Hindu Kingdoms displyed no sense of nationalism or patriotism and were unable to withstand the onslaught of hardly muslim invaders from the north west". (21)

ہندو بالا دستی کے تاریخی حربے

مگر یہ مسلم ہی کیوں آئے ؟ وجہ یہ تھی کہ بھارت (قدیم) کے تب گردوپیش کی موثر اور معاصر علاقائی طاقتیں (Regional Powers) عربوں کی خلافت عباسی اور ایران وافغانستان کی منظم حکومتیں تھیں ۔ نتیجہ یہ کہ طاقت کے عدم توازن کے اس مقامی اور ہندوستانی خلاء کو گرد کے بیرونی دباؤ نے اس کا فطری توازن عطا کیا۔لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اس دور کی ان متفرق اور منتشر ہندو ریاستوں اور ان کے پڑوسی ممالک اور اقوام سے تعلقات کا جائزہ لیں تو ہندو خارجہ حکمت عملی اپنی تاریخی روایت اور اپنے داخلی ماحول کے تقاضوں کے ساتھ اس عہد میں بھی کارفرما نظر آتی ہے کہ داخلی حالات ہی خارجہ حالات کا عصری عکس ہوتے ہیں۔

یہ الگ بات کہ ہمسایوں سے باہمی تعلقات کے سلسلے میں تب ہندو خارجہ حکمت عملی ان فطری نتائج اور قدرتی عواقب سے بچ نہ سکی ، جو مفاداتی اور مادی روش سے عقلی منصوبہ بندی کی نامراد جدوجہد کا حاصل بن کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً

اولاً یہ کہ سندھ کے راجہ داہر کی بحری راستوں کی ناکہ بندی اور دیبل پر قزاقی کی براہ راست سرپرستی پر خلافت عباسی کو اپنی تمام تر سفارت کاری کی ناکامی کے بعد مجبوراً اور بالآخر حرکت میں آنا پڑا! کیا یہ واقعہ بلا سبب تھا؟ محمد بن قاسم کی آمد سندھ ایک واقعہ اور تاریخ کا نمایاں باب ہے۔مگر آمد کا سبب یہ حملہ تھا کہ سرکوبی مہم کے اسباب اور واقعات کے نتائج پر تبصرہ ہی اپنی وضاحت خود ہے۔

ثانیاً یہ کہ چھٹی ، ساتوں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں اور ازاں بعد افغان اور ترک مسلمانوں کی آمد ہند کو ہندوودانوں (ماہرین) نے جن ناموں اور عنوانوں سے تاریخ کے ایوانوں میں سجایا ہے، اس میں بھی قوم پرستی سے مملوجذبات پر بند نہیں باندھا جاسکا! نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) کے بارے میں تاریخ نویسی کا ذخیرہ بھی تین مختلف اور متخالف نقطہ سے مندرج اور مغلوب ہے۔ اس میں (۱) ہندو ودوان (۲) مسلم تاریخ دان اور (۳) برطانوی مورخین شامل ہیں جو دور سلاطین دہلی (۱۵۲۶ء۔ ۷۱۲ء) اور پھر مغل عہد (۱۸۵۷ء۔۱۵۲۶ء) ہر دو کے بارے میں تجزیہ و تاریخ رقم کرنے میں اپنے قومی احساس کی موثر نمائندگی کے نقاش وعکاس ہیں ۔ جو فی الحقیقت نہ تجزیہ ہے نہ تحقیق جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ قوم پرستی کے جذبات سے مملو تاریخ و تحریر میں علمی دیانت کو سیاسی ضرورت لاحق ہو کے رہتی ہے ۔ اور اعتدال و توازن کا دامن ہے کہ چھوٹ چھوٹ جاتا ہے ۔یہی سبب ہے کہ تاریخ نویسی کے علمی شعبے میں اس دور کے بارے میں خود بھارت (جدید) کے مورخین اور فرقہ واریت

"Historian of Modern India and communalism".

بہ نفسہٖ ، ایک مصنفانہ نہیں ایک منصفانہ موضوع تحقیق بن چکا ہے ۔جس کے تجزیہ سے یہ امر بصراحت سامنے آتا ہے کہ مسلم ہند کے بارے میں علمی ذخیرہ جس نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کا حاصل ہے اس میں

اولاً:۔ ہندوودانوں کے نقطہ نظر سے مسلمان برعظیم میں جن القابات اور انعامات سے نوازے گئے ہیں ان میں صریحاً لٹیرے، حملہ آور ، خون آشام ، مال وزر کے حریص ، خونخوار اور راکھشش (ناپاک) بلکہ ملیچھ (خبیث) اور بیرونی قرار پاتے ہیں جبکہ

ثانیاً:۔ مسلم تاریخ دان ، جن کے ہاں سلاطین دہلی کا دور ہو کہ مغل شہنشاہوں کا عہد حکومت ان مسلمانوں اور مقتدر مسلمانوں کے دور حکومت میں مقامی رعایا (ہندوؤں) سے حسن سلوک اور فلاح و بہبود ، نیز علمی اور تہذیبی ترقی کے تذکرے اور تبصرے کے علاوہ ان مسلم بادشاہوں کی ہندو نوازی اور ہندو سرفرازی کا ایک تجزیہ میسر ہے۔جس میں ہندو مشیر اور وزیر اس کا کھلا ثبوت ہے۔

ثالثاً:۔ یورپی مورخین کا اندازہ ، جو نظر بہ ظاہر، متوازن اور معتدل اور ظاہراً غیر جانبداری سے مملو ہے اسے علمی سہولت و صلاحیت کو سیاسی ضرورت کیلئے استعمال کرنے کی تخلیق وتخلیق کا ایک ذہین ذخیرہ کہتے ہی بنے گی کہ یہ علمی اور سیاسی غلبہ کی حامل قوم کے حوالہ جات ہیں ۔ جن کی زبان (انگریزی) اور بیان (طرز تحقیق و اشاعت) آج کا اور ترقی یافتہ ہونے کی سند ٹھہرا۔یہ حوالہ جات ایک لائبریری بھی ہے اور لیبارٹری بھی کہ یہ مقتدر انگریزوں کی تصانیف تھیں۔

نتیجۃً برعظیم پاک و ہند کے مقتدر مسلمان اور ان کی رعایا ہندو قوم اپنے پورے سیاسی اور تاریخی وجود کے ساتھ ان کے حوالے تھیں۔ ظاہر ہے کہ ہندو مسلم مشترکہ تاریخ کے صدیوں پرانے تنازعات اور نزاعات میں مصنف (عالم) کی بجائے خود منصف (ثالث) کا سا تجزیہ وتخاطب بیک وقت ان تواریخ کی زبان اور بیان ہے۔ اور اس حقیقت میں کیا شبہ ہے کہ برسر اقتدار طبقے اور حکمران گروہ (کے ہم وطن اور ہم نسل ہی کیا ہم مذہب مورخین) اپنی رعایا کے دو فریقوں کے مابین اگر علم وقلم سے یہ مدبرانہ اور معروضی انداز تحقیق وتحریر اختیار نہ کرتے تو یہ بذات خود تاریخ کا خون کرنے والی بات ہوتی! کہ تاریخ کے کھنڈرات میں حکمرانوں کی علمی کاوش اور عملی ورش سے نشہ قوت بصورت تواریخ اور لٹریچر ٹپکا کیے ہے۔ اور یہی تاریخ کی شاہراہ کے بجری پتھر ہیں۔ البتہ مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) کے بارے میں یہ رویہ وتصدیق اور تجزیہ وتحقیق پر ہندو انگریز اتحاد جس معنوی عروج پر ہے نتیجۃً اس میں مسلم دشمنی کا سیاسی درد مشترک یکساں احساسات دے گیا جس کی ٹیسیں قوم پرستی (Nationalsim) کے جذبات بن کر، تاریخی واقعات کی تشریح، اور وقوعات کی تصریح ہوگئی، اور حاصل یہ ہے کہ برعظیم کے مسلم باب پر ایک ہی طغریٰ سجانے کی سعی نامشکور، یورپی اور ہندو مورخین کی سطور ہیں کہ مسلم ہند کیا تھا گویا مختصراً یہ کہ

ع آغا بھی رسوائی، انجام بھی رسوائی

یہی درد مشترک آگے چل کر ہندو انگریز اتحاد کی وہ مستقل روش اور رویہ کی صورت تاریخ سے لیکر انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک تک روبہ عمل نظر آتی ہے۔ اسے معروضی رخ سے زیادہ ان دونوں قوموں کے ہاں شعور قوم اور پھر ان کے عزائم کا ادراک غرور بھی یکساں کیوں ہے؟ وجہ یہ کہ انہیں ''آورش اور آشاؤں'' کے پیمانے اس لئے میسر ہیں کہ غلبہ واقتدار کا خمار یہی افکار عطا کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہ برعظیم پاک وہند میں مسلم عہد کا خاتمہ گویا ہند وقوم کیلئے کیالایا، یہی کہ نہ صرف آزاد وخودمختار ملک بھارت بلکہ اس خطے (Region) سے برطانوی سامراج کے انخلاء کے خلاء کو پُر کرنے کا موقع اور مقام ملا ہے جو بذات خود ایک ملک وقوم اور پھر برطانیہ کا قائمقام بھی! جس کی رفتار کو تیز تر کرنے کا پیٹرول وہ تاریخی روایت اور داخلی ماحول کے تقاضے کا اصلی نام اور مقام ہے، جو محض آگ دکھانے کا توشئہ تاریخ ہے اور پھر توسیع پسندانہ عزائم اور واقعاتی ہی نہیں علاقائی اور جغرافیہ مزاحمت کا نام مسلم قوم یا مسلم خوف بن گیا ہے! کے ایم پانیکر سے معلوم کریں تو اس علاقے میں بھارت (جدید) کی خارجہ حکمت عملی کا جو فلسفہ وہ پیش کرتے ہیں اس میں روک اور رکاوٹ کی باصلاحیت قوت (مسلم قوم) ہی ٹھہری ہے کہ اسے جوع الارض (Hegemonistic) کے توسیع پسندانہ اقدامات کی راہ میں حائل دیوار بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ بات کوئی غیر منطقی تو نہیں کہ ہندو قوم کو برطانوی سامراج کے انخلاء سے یہاں اپنا ملک آزاد بھارت ملا اور وہ بھی بقول پانیکر ہی صدیوں بعد جبکہ مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) کے پورے دورانیہ میں بقول پانیکر ہی

ہندو معاشرے کو اپنی پڑ گئی تھی۔ یہ بات علم اور حلم دونوں سے بے نیازی کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔ افسوس کہ تاریخ نویسی کے عملی شعبے میں بھی ایک طرح سے ہندو انگریز اتحاد، سیاسی نوعیت کا ہے، وگرنہ واقعات نویسی کا رواج مسلم عہد کے برعظیم میں حکومت کی سرپرستی ہی نہیں، خود حکمرانوں کا ذاتی، قلمی اور علمی مشغلہ رہا ہے۔ ان تواریخ اور خود نوشت تزک ھائے بابری اور جہانگیری کے علاوہ دیگر مصنفین اور معاصرین میں بھی ہندو مسلم دونوں قوموں کے مولفین تک شامل ہیں۔ مگر عجیب حادثہ ہے کہ نہ ان کے معاصر نہ ان کے بعد کوئی سی تاریخ بلکہ روایت، نہ متصادم، نہ متخالف سرے سے عنقاء رہی کہ تجزیہ تبصرہ کو تصادم تک لانے میں اُن مورخین کا ہاتھ ہے جنھیں ''جدید ہندوستان کے مورخین اور فرقہ واریت'' کا عارضہ لاحق ہے کہ مسلمانوں کی یہ تزک اور تواریخ بلاشبہ واقعات نگاری (Narration) ہے۔ تجزیہ وتبصرہ (Analytical) نہیں! البتہ سیاسی اور قومی مفاد کو یہ پہچان، بس ذرا کمپنی بہادر کا نفوذِ ہند ہوا ہی تھا کہ ہندو ودوانوں کا ایک ملازم طبقہ اور ہندو تاریخ دان کا بظاہر ایک سرکاری گروہ نئے حکمرانوں سے مفاد اٹھانے اور ان کی مفتوح مسلم قوم پر پل پڑے کہ قلم وقرطاس سے کالی سیاہی سارے مسلم عہد کو بھی سیاہ دھبہ بنا گئی اور حد یہ کہ اپنی تاریخ بنانے اور اس میں ہیرو تراشنے بلکہ بدلے ہوئے حالات میں اپنے جذباتی بت تراشنے میں ایسے منہمک ہوئے کہ اپنے بونے اونچے کرنے کی تاریخ نویسی کا نام ہندو قوم پرستی بلکہ تاریخ پرستی ہو گیا۔ یہی اس قوم پرستانہ اور مذہبی احساسات سے مملو نقطہ نظر بنا ڈالتا ہے۔ اور نتیجہ یہ کہ معاصر بھارت کا یہ نیشنلزم اپنی سرزمین اور اس کی تاریخ سے مسلمانوں کی گیارہ صدیاں گویا ناگفتنی کہہ کر

ع   چھوڑ یئے رات گئی، بات گئی

قرار دیتا ہے۔ مانا کہ آنے والوں کی مدح اور جانے والوں کی قدح، ہندو قوم کا مفاد سہی، مگر اپنے نیشنلزم کا بھرم تو نہ کھولیں کہ یہ صدیوں کی رفاقتی اور سکونتی قوم اور تاریخ سے احراز وافکار بلکہ سراسر فرار ہے۔ وجہ کیا ہے؟ مت (سوچ) کی ہے کہ ادھر یورپی غلامی کا کلاوہ، برعظیم کے گلے میں کیا آن پڑا کہ اس گورے اُجالے میں اپنی سرزمین کی گیارہ صدیوں کی تاریخ یکسر تاریک ہو گئی کہ جمہوری اکثریت کا ہندو مستقبل (بھارت) نظر آنے لگا تھا۔ اب وہ پہلے سے دن اور پہلے سی راتیں کہاں، باتیں کہاں بلکہ اس دھرتی ماتا (بھارت) کے مقدس استھان پر اب ناپاک ملیچھ اور راکھشس مسلمان کا نام اور عنوان ہو گیا۔ مسلمانوں کو مہاراج کہنے والا ہندو اب خود آریہ سماج ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے حملے، غزنوی کی ڈکیتیاں، غوری کی جارحیت، ابدالی کا شب خون اور نتیجتاً سلاطین دہلی کی غارت گری، تغلقوں کی بدمعاشی، سادات کی عیاشی، مغلوں کا فتنہ وفساد بلکہ بہ حیثیت مجموعی ان سب کا جبر وجہاد اب ہندو قوم کا تاریخی عناد ہو گیا۔

یہاں تک کہ حالتِ جنگ اور فتح کے جشن اور اس کے جذباتی ماحول بلکہ تاراج تک کو پورا دورِ حکومت

اور مسلم عہد ثابت کرنے کی فرقہ پرستی کا نام بھارتی نیشنلزم ہو گیا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ گیارہ صدیاں موروثی سلطنتوں کا تسلسل ایک اقلیت (مسلم قوم کا راج، جمہوری اکثریت پر ایک تاریخی ظلم بن گیا تھا) کہ جس میں یہ مسلمان، خون آشام، لٹیرے، بیرونی اور ناپاک تو قرار پائے ہی تھے مگر حاصل تاریخ کیا نکلا یہی کہ گیارہ صدیوں کی مسلسل حکمرانی اور مقتدر بادشاہی اور ظلم کے باوجود مقامی آبادی کو عملاً مسلمان بنایا نہ شودر، بلکہ اسکا واقعاتی اور تاریخی نتیجہ یہ کہ برعظیم کی غالب آبادی ہندو کی ہندو ہی رہی! کہ جن کی جمہوری اکثریت کا جدید نام بھارت اور اس کی قوم ہے جہاں

ہندو، ہندی، ہندوستان

کا نیشنلزم ایک شعلہ جوالہ بلکہ شوالہ بن چکا ہے۔ تاریخ کو عقیدہ وعقیدت یا قوم پرستی کی روایت بنالینا بلاشبہ ایک غیر علمی اور تکلیف دہ انسانی کمزوری واقع ہوئی ہے۔ اس پر تبصرہ بذات خود جواب آں غزل کا مقام ہوگا۔ لیکن واقعاتی شہادت کا یہ سوال تاریخ ہی کا جواب نہیں بلکہ امر واقعہ ہے، کہ گیارہ صدیوں میں ان مسلمان حکمرانوں کی کابینہ کے سینئر وزیر، وزیر اعظم، وزارے خزانہ، مشیر، منصب داری، ہفت اور دس ہزاری، درباری خود ہندو عمائدین تھے کہ نہیں۔ افسوس کہ ان میں کوئی پانیکر نہ ہوا کہ ساری قوموں کو عملاً متحدہ قومیت کے دھارے میں مدغم کر دینے کا مشورہ عطا کرتا۔ اور تو اور متعدد ہندو سپوت اور راجپوت، راجاؤں کی کنیائیں داخلِ حرم بھی ہوئیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی جہانگیر جنایا شاہجہان۔ حادثہ یہ ہے کوئی شیواجی ننھیال پر نہ گیا تھا بلکہ اورنگ زیب، ددھیال کی لاج کیوں ٹھہرے۔ آخر یہ سارا مسلم دور اور اس کے جبر و جہاد کا سارا زور کیسا تھا؟ بات یہاں تک رہتی تو بھی اسے تاریخ کا خون یا پھر ہندو نقطۂ نظر سے تاریخ نویسی میں پانی پت کا میدان سمجھ کر گذرا جا سکتا تھا۔ مگر ہندو مت عالم کا ہو کہ عامی کا، اپنا رنگ وروپ چھپائے بھی تو چھپتا نہیں کہ قوم پرستی کے فطری مدعا کا اظہار خود مت کو مار دیتا ہے۔ پانیکر، ایک مفکر اور شہ دماغ کے طور پر بھارتی خارجہ حکمت عملی اور داخلی سیاست کے حد درجہ اعلیٰ مرتبے اور تذکرے کی شخصیت ہیں۔ ان جیسے سیکولر مزاج کے ادعاء کا حاصل مطالعہ بھی اگر ہندو ہو جائے تو گنگادھر تلک کانگرس کے اولین نیتا ہی تو تھے جنہوں نے شیوا جی کا جذباتی ہیرو تراش کر، میلوں کے انعقاد سے مسلم کش فساد کی نیو اٹھائی۔ آج اسی مہاراشٹر میں شیوا جی سے شیو سینا ہو جائے تو یہ بھارت کی جمہوری اکثریت کا قومی اتہاس (تاریخ) ہے۔ مگر افسوس اور حیرت اس امر پر ہے کہ مسلم خاندانوں کی بادشاہت تھی مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) کو اسلام کی حکمرانی بنا کر دین اسلام تک کو زیر بحث ہی نہیں ! زیر عتاب لایا گیا جبکہ حقیقتاً ایسا ہے نہیں، کیوں کہ مسلمان اور وہ بھی حکمران تو خود برعظیم میں اسلام کے مغضوب ومعتوب قرار پاتے ہیں ۔ سلاطین دہلی کا دور (۱۵۲۶ء۔۷۱۲ء) ہو کہ مغلیہ عہد (۱۸۵۷ء۔۱۵۲۶ء) یہ بہر طور حال اور بہر مسلمانوں کی موروثی بادشاہت اور سراسر ملوکیت

(Dynasties) تھیں۔ اصولی طور پر شریعت یا اسلام کی شرعی حکومت (Doctrine) ہرگز نہ تھیں۔ لیکن پورے مسلم ہند کی تصویر کشی کرتے ہوئے خون کی ندیاں اور گنگا کا اشنان باہم یک رنگ کر کے اس پر یہ لکھ لینا کہ جیسے

ع   بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

جذبات نگاری تو ہے، تاریخ کا واقعہ اور تجزیہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ نفسیاتی کوڑھ ہے۔

خود پانیکر ہی برطانوی ہند سے پہلے ایک ہزار سال تک ہند و معاشرے کو بے بس کیوں کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ بدھ مت اور جین مت کی طرح حقیقتاً مسلمان شدھی نہ ہو سکا اور برعظیم کی صدیوں پرانی تاریخ میں صرف مسلم تہذیب ہی اپنی الہامی کیفیت اور دینی نوعیت کے اعتبار سے اس قدر سخت جان بلکہ سخت روح واقع ہوئی کہ مت کا اس کے سامنے ٹھہرنا ممکن ہی نہ تھا کہ یہ من کی دنیا تھی۔ نتیجہ یہ کہ ہند و مت کے تاریخی کردار اور افکار دونوں بقول پانیکر کے اپنی رفتار بھول گئے۔ وجہ یہ نہیں کہ مسلمانوں کی حکومت یا حکمرانوں نے اس کا اہتمام یا انتظام کیا بلکہ بقول اقبالؒ حقیقت یہ ہے کہ ''خود اسلام نے مسلمانوں کی حفاظت کی۔''

اس کی خبر نہ مسلم حکمران کو ہوئی نہ ہند و سیاستدانوں اور ودوانوں کو، کہ یہ اسلام فی الواقعہ سرزمین کا حملہ آور نہیں ہوتا بلکہ دین تو دل کا حیات آور ہوتا ہے۔ اس کے مدمقابل عقل عیار عرف ہندومت، ٹھہرتی بھی تو کیسے کہ دین ودل کے ہنگاموں سے یہ بچاری ہمیشہ بے خبر رہی ہے، کہ یہ اندرونی کیفیات ہیں، مت اور عقل کے بیرونی مدرکات نہیں! زمانے اور وقت کی گواہی اگر مسلم ہند میں سمجھ نہیں آ سکی تھی تو خود بھارت (جدید) کے ۶۲ برس کے قومی دھارے (National Main Stream) ہی سے جان لیا جائے! کہ اکثریت اور اقتدار، اقلیت کو ہڑپ تو کر سکتا ہے مگر جذب نہیں! کہ جذب وشوق دل کے جذبات ہیں، عقل کے معاملات نہیں۔ اس لئے ترجمان حقیقت اقبالؒ کا یہ ارشاد اس مرحلے پر اس حقیقت ہی کا بیان ہے۔

ع   زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادارک

بنیاد پرستی ہی تو قوم پرستی ہے، جس سے مذہب کی پہچان بہت آسان ہو جاتی ہے کہ دوسرے مذہب یا اس کے پیروؤں پر اظہار خیال میں آدمی انصاف کرے، تو کیونکر کہ جو شخص جس مذہب کا خود پیرو ہے اس کے مخالف یا دیگر مذہب کے ساتھ وہ یہ انصاف کر ہی نہیں سکتا، لیکن اپنا مذہب (اپنے لئے پکا) اور دوسرے مذاہب کیلئے سیکولر (لامذہب) ہونے کا ٹھپہ عملاً خود تجربوں کی زد میں آ کر مذہبی ہو گیا کہ قومی دھارے کے رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ، جغرافیہ کے حصار اور اکثریت کے اقتدار کے باوصف جڑے نہ تو سماجی بندھن کی رسی سے جکڑنا ہی تدبیر ہے کہ نتیجۃً یہ پھول (اقلیتیں) سوکھ کر برباد ہو جائیں، اور یہی معاشی اور معاشرتی رویہ ہے بھارت میں مسلمانوں،

عیسائیوں اور سکھوں کے ساتھ۔ وجہ اس کی وطنی ہے کہ علاقائی، قومی ہے کہ لسانی، نسلی ہے کہ اصلی مگر مذہب ہی مابہ الامتیاز وجہ کیوں ہے؟ ہندوقومی نقطہ نظر سے مسلم ہند کو اس سے زیادہ بھیانک اور تاریک تر کر کے ہدف تنقید بنانا اس سے زیادہ اور کیا ممکن ہوتا کہ مسلم ہند کی سرکاری روش کا ایک تاریخی مصرع ہے

ع مرے کو مارے شاہ مدار

ہندو، مورخین اور سیاسین کا مسلم عہد پر یہ قومی نقطہ نظر اگر درست بھی ہو کہ

سرزمین ہند کے حملہ آور، محمد بن قاسمؒ ہوں کہ محمود غزنویؒ، شہاب الدین محمد غوریؒ ہو، کہ ابدالیؒ، یہ سب ہند وقوم کے مجرم بلکہ ایک گالی! مگر دین اور دل کے حیات آور کا انکار کیونکر ہوسکتا ہے کہ جس کے ہادی برحق حضور سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مجھے ہند سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے (الحدیث)

علامہ اقبالؒ کی نسبت روحانی کا وطن ملاحظہ ہو کہ

میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یہ دین و دل کے حیات آور کون ہیں جو مالِ غنیمت اور کشور کشائی سے مکمل پرہیز (تقوی) کا حقیقی اور اصلی نمونہ ہیں۔ یہ تمام قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ، طریق وسلوک کے اربابِ قلب ونگاہ کی تشریف آوری کا ہی حال ہے جہاں ''ہندی، ہندوا ور ہندوستان'' کہنے والے یہ کہہ اٹھے تھے کہ

کرپا کرو۔۔۔۔۔مہاراج!

ان کی لہلہاتی فصلوں کو مقامی اور ہندوؤں کا قبول اسلام کہیں، تو نتیجۃً آج مسلمان بھارتی ہو کہ پاکستانی، بنگلہ دیشی ہو کہ کشمیری، ان کی اصل ایک ہے۔ البتہ ان کا جغرافیہ اور نسل یہاں تک کہ زبان اور شکل بھی الگ ہو، تو کوئی بات ہی نہیں! کہ یہ بھارتی، پاکستان، بنگلہ دیشی اور کشمیری ممالک اور جغرافیہ کے باشندے(Citizen)ہیں لیکن حقیقتاً اسلام کے نمائندے (Symbol) ہیں اور اس مملکت دین و دل کیلئے کسی پاسپورٹ یا ویزا کی پابندیاں اور شہری ہونے کی جغرافیائی جکڑبندیاں مانع نہیں ہوتیں۔ کہ یہ تو اسلام کی فصل ہے۔ اور یہی اسلام (ملا کا نہیں صوفیاء کا) کے وجود اور شہود کی وحدت کا حاصل بلکہ موجود ہے جو سورج کی طرح روشن ہے۔

جسے وقت اور اس کی متحرک قوتیں بلکہ روح عصر، جغرافیائی تشکیل و تحلیل سے صورت گری کریں بھی تو یہ ممالک بن جاتے ہیں اور بات وہی کس قدر بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی حددرجہ بلیغ ہے کہ

''پاکستان اس دن بن گیا تھا، جس روز برعظیم کا پہلا شخص مسلمان ہوا تھا''

کہ اس حاصل اسلام کو اپنا جغرافیہ بنانے اور بگاڑنے سے زیادہ مملکت دل کا خیال رہتا ہے کہ دین، دل

کا حیات آور ہے، سرزمین کا حملہ آور نہیں! اس لئے جغرافیہ کی قوم کو اُن کے جغرافیہ ہی سے دیکھایا جائے تو آج بھی راجستھان کے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ ہوں کہ یوپی کلیر شریف (سہار نپور) کے حضرت علاؤ الدین علی احمد صابرؒ، کرناٹک میں حضرت خواجہ گیسودرازؒ ہوں کہ حضرت خواجہ بختیار کا کیؒ یا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ ہوں کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ، پنجاب (سرہند) کے حضرت مجدد الف ثانی ؒ ہوں کہ ہریانہ (پانی پت) کے حضرت بوعلی قلندرؒ، اتر پردیش کی ترائی میں بہرائچ کے حضرت سالار مسعود غازیؒ ہوں کہ راجستھان کے حضرت حمید الدین ناگوریؒ، بنگال و آسام کے سہروردی بزرگ ہوں کہ کشمیر کے بخاری اولیاء، کرناٹک سے کالی کٹ تک کن کن صوفیاء اور بزرگوں کا شمار کیا جائے کہ ان کے افکار و کردار ایک یاد نہیں بلکہ آج بھی یادگار ہیں۔ ان کے مقابر و مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں، جہاں دستوری سیکولرازم کے مقابل ایک جمہوری سیکولرازم ہے جو ہر مذہب کے پیروانسانوں کا دلی اجتماع کہیں تو یہ دلی کا احتجاج بن سکتا ہے۔

ے تیرے در سے کوئی نہ خالی گیا
جھولیاں بھر کے ہر اک سوالی گیا

کا منظر و ماحول ہے۔

بھارت میں مسلم روحانی مراکز

جغرافیہ پرست قوم ہندوؤں کے اپنے ملک بھارت کی سرزمین بلکہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ دین سے، کو بھی دیکھیں تو لال قلعہ دہلی، تاج محل آگرہ، فتح پور سیکری، لکھنو کا قیصر باغ، ہمایوں کا مقبرہ، شیر شاہ سوری کا قلعہ اور قطب مینار، جون پور کے قلعے، جگہ جگہ مقابر، مزارات، مساجد اور ان کے گنبدو مینار بھارت کے محکمہ آثار قدیمہ کا کاروبار سہی کہ یہ سیاحوں کے شوق کی مہمیز اور آمدنی کا ذریعہ بلکہ بیوپار ہیں مگر مسلم اوقاف اور سیکولر انصاف کے پیسوں سے یکسر بے نیاز اسلام کے یہ علماء (صوفیاء کرام) اور ان کے مزارات فی الحقیقت آج بھی باشندگان ہند کی آمد اور آمدنی کے محتاج نہیں کہ یہ تو بے سکون اور بے نوا، بلکہ بے آسرا اور گدا، ہر طرح کے لوگوں کی روحانی اور مادی غذا اور احتیاج کا مبداء فیض وفیضان ہیں۔ سچ یہ ہے کہ بھارت کی امیر حکومت کے غریب عوام کی روز و شب کی روٹی، روزی اور رونق کے لئے یہ مقابر و مزارات بیک وقت ایسا فریضہ انجام دے رہے ہیں کہ جو سرکار اور اقتدار کے جتن سے بھی ممکن نہ ہوسکا، کہ یہاں تو بہ تصرف ادنی یہ ماحول بھی ہے کہ

ع تیری سرکار ﷺ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اور ظاہر ہے کہ یہ دین و دل کا جہان ہے، ہندومت اور اس کی اکثریت کا ہندوستان نہیں کہ جہاں مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی کو شدھی (Convert) کرنے کا سیاسی اور صحافتی نام قومی دھارے میں ایکتا

(National Main Stream) میں ضم ہونا کہتے ہیں۔ باقی رہے مسلم ہند کے دو شریعت مآب حکمران اورنگ زیب عالمگیرؒ اور محمد تغلق کہ ان کے معاملے میں ہندو مورخ کیا خود سیاستدان تک اپنی قوم پرستی کے دھارے میں بہہ کر اس قدر بے ہوش ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے سیکولرازم کا ہوش تک نہیں رہتا! ان کے اپنے سیکولر اور جمہوری دیش بھارت کے صوبے اتر پردیش میں ضلع فیض آباد کی (اجودھیا) بستی میں تاریخی بابری مسجد سے رام جنم بھومی تک کے مسائل معاصر بھارت کا داخلی مسئلہ اپنے اقتدار کی محض ۶۲ سالہ تاریخ میں سیکولر جمہوری اور آئینی تجربے کے ہندو برگ و بار اپنی متحدہ قومیت اور اس کی جنم بھومی (بھارت) کی جدید تاریخ کا خیال ہی نہ کر سکے بلکہ جغرافیہ بھی تباہ کر ڈالا۔ جس کی وجہ سے ان کی متحدہ قومیت کی بنیاد بلکہ اس کی بنیاد پرستی تک ہل کر رہ گئی۔ کیونکہ معاملہ مندر کی تعمیر کا نہیں اس جگہ کی ملکیت کا ہے یہ اور یہ جگہ مسجد کی ملکیت ہے۔ اور یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسجد ہی رہتی ہے۔

بھارت (جدید) کے نامور اور قومی ہیروز (Heroes) میں اور نہیں تو مسلم قوم ہی سے کوئی ہیرو بھی بنا لیتے، مگر نہیں ایسا نہیں ہوا ہے مذہب کی آڑ میں یہ شعبہ دلچسپ مگر سیاسی آرٹ کا شکار دکھانا ہو، تو ہندو ذہانت اور ذہنیت یہ ہے کہ بھارت کے قومی اور سرکاری سطح پر تسلیم شدہ مشاہیر (Heroes) میں بابا گورونانک کی بجائے گورو گوبند سنگھ جی دسویں سکھ گرو جی بھگتی تحریک کے کبیر کی جگہ آریہ سماج کے بانی سوامی شردھانند اور تلسی داس کی بجائے گنگادھر تلک یہاں تک کہ مہاتما گاندھی کی جگہ جواہر لعل نہرو زیادہ مقبول اور موثر ہو جائیں بلکہ مقبولیت کا حظ اٹھائیں، تو اپنے رشیوں اور منیوں (Saints) کو قومی اور عملی زندگی سے فی الحقیقت اور عملاً خارج کر دینے کے اس وطیرے اور چلن کا نام ہی تو صریحاً ہندومت ہے کہ بصیرت کی رہنمائی کیلئے یہ رشی اور منی (Saints) صرف عقیدت ہیں جبکہ زندگی اور اس کی فرمانروائی میں ان سے مکمل اغماض کہ یہ انس و انسانیت اور مذہب و روحانیت کے داعی ہوتے ہیں جنہیں اپنے معاصر علماء اسلام (صوفیائے کرام) کی صحبت و محبت کا فیض اور کرشمہ چکا گیا۔ ادھر روز مرہ کا عالم یہ کہ ان کا نام جپنے، کلام گانے اور ان کی تصاویر سجانے تک کی محض عقیدت ہی ہندومزاج کیوں ہے عملاً ان کی پیروی کیوں نہیں کی جاتی ہے۔ یہی فی نفسہٖ مذہب سے نزاع اور دوئی بلکہ دوری کا اصل نام ہے۔ اور آخر ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ سراسر مت ہی مت ہے من نہیں کہ اپنی دنیا برباد کرنا عقلمندوں کا شیوہ نہیں، فرزانگی اور دیوانگی کا چلن ہے۔ مگر سیاست ہو، تو ایسی ہو کہ بابا گورونانک جی کے کلام بلاغت نظام میں حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے دسویں جانشین حضرت ابراہیم فرید ثانیؒ کے ملفوظات کو سکھ دھرم جانتا اور مانتا ہے مگر ہندوؤں کو گوردوگھر سے دلچسپی کیا ہے، کیوں ہے۔ گورو گوبند سنگھ جی سے عقیدت سکھی کی معراج سہی، انہیں سیکولر بھارت کے مشاہیر میں شامل و داخل بتانے کا مقصد کیا ہے؟ یہی کہ نہ عقیدہ، نہ عقیدت بلکہ نری سیاست کہ یہ گورو، اپنے وقت کے مسلم حکمرانوں سے برسر پیکار بتائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر ان کے والد گرامی اور سکھوں کے نویں گورو تیغ بہادر جی کی

''شہیدی'' کا مبینہ طور پر الزام عالمگیر اورنگ زیبؒ کے سر جو بیس گنج کی صورت ایک دکھی داستان کا بیان لیے سکھ عقیدت کی کر بلا مچا گیا کہ جس کے یزید کے طور پر اورنگ زیب کا مضبوط کندھا ہی ملتا ہے۔ حالانکہ کے اس سازش کی تہہ میں اورنگزیب کے درباری رام رائے ہی شریک فتنہ تھے جنہوں نے کشمیری پنڈتوں کے ذریعے گرو جی کو دہلی لا کھڑا کیا تھا۔

حقائق سے روگردانی کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ عقل کی تدبیر اپنے ہیرو تراشنے پر اتر آئے، تو مصنوعی تاریخ کا ڈھول ڈھپہ کچھ زیادہ دیر اثر انداز نہیں ہوتا اور تاریخ اپنا چکر پورا کر کے حقائق کو ان کے مقام پر لا کر نسلوں کے لیے اجالا بن جاتی ہے۔ جن مرہٹوں اور خاص طور پر شیوا جی کو ہندو نیشنلزم کا جذباتی ہیرو بتاتے بتاتے انہیں مغلوں سے ٹکراتے ٹکراتے مسلمانوں کا دشمن بنا کر اسلام کا مخالف بنا ڈالا حالانکہ حقیقت کا رنگ وروپ کچھ اور بتا رہا ہے کہ

> ''مرہٹہ تاریخ کے ضمن میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیوا جی کا دادا مسلمان پیروں کا بڑا معتقد تھا اور حضرت شاہ شریف کا مرید تھا جو احمد نگر میں مدفون ہیں۔ اپنے مرشد کے نام پر اس نے اپنے بیٹوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے، جو فی الحقیقت مسلمانوں کے نام ہیں۔''(۲۲)

مسلم ہند میں صوبائی اور علاقائی بغاوتوں کو ہندو مسلم فسادات کی تاریخ باور کرانے کا مقصد مذہبی نہیں سیاسی ہے ورگرنہ سیکولر ازم کی لاج رکھی جانی چاہیے مگر ایک حقیقت بدیہی اور عقلی ہے کہ مسلمانوں کی گیارہ صدیاں غیر اور بیرونی بنانے کے بعد بھارت کی تاریخ اور جغرافیہ میں بچا ہی کیا ہے اور بھارت کا نیشنلزم اس دوراہے پر کھڑا، اگر اس صورت حال سے دوچار ہو کہ

ع اب کسے رہنما کرے کوئی

تو اورنگ زیب نہیں تو اکبر ہی کو ہیرو بنا لیتے، افسوس کہ اسے ہندو مورخین اور قائدین دونوں مسلمان کر کے مارتے ہیں۔ تو ایسے مرحلے پر مرہٹوں میں شیوا جی بمقابلہ اورنگ زیب ایسا دھرم یدھ (مذہبی جنگ) بنائی گئی کہ خرد کا نام جنون اور جنون کا نام خرد رکھنے کی دلچسپ مثال ہے ہی یہی! ورنہ، سر پی سی رائے کے حوالے سے ڈاکٹر ایس ایم اکرام یہ نتیجہ تحقیق سامنے لائے ہیں کہ

> ''جو لوگ شیوا جی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا مقصد ہندو دھرم کا احیاء تھا اور وہ مغلوں کیخلاف قومی جدوجہد کا رہنما تھا وہ غلطی پر ہیں''۔(۲۳)

چلیے! گرو گوبند سنگھ جی کا مجسمہ نہ سہی، دربار صاحب امرتسر پر ۱۹۸۴ء کا بھارتی افواج کا اپریشن بلوسٹار، بھارت کے سیکولر ازم اور نیشنلزم کا دستوری، جمہوری اور داخلی معاملہ ہے کہ اس پر تبصرہ سیاسیات کی تاریخ کا معروضی

اور عصری مسئلہ بنے گا مگر اس دربار صاحب (امرتسر) کی بنیاد بلکہ سنگ بنیاد ہی تو فساد کی جڑ ہے جو حضرت میاں میر قادری لاہوری علیہ الرحمۃ کے دست مبارک کا اعجاز ہے۔ بلکہ ماضی قریب کے جدید ہندورشی اور مہاتما جناب موہن داس کرم چند گاندھی، بھارت کے بابائے قوم (باپو جی) تو ہیں ہی، ہندوستان مراجعت کے بعد ان کے آغاز سیاست کی پہلی تحریک، لاتعاون (Non-Cooperation) ولا تعانو اعلی الأثم والعدوان کے جس اصول وعمل کا اعجاز ہے اس کی تہہ میں ستیہ گرہ (Soul Power) نفس کشی کا فلسفہ کیا ہے؟ روحانیت ہے کہ رہبانیت، نہیں تو شرعی اصطلاح میں استدراج کہیں گے لیکن مان جایئے کہ مولانا عبدالباری فرنگی محل کی صحبت خاص کا روحانی فیض ہی تو ہے کہ خود گاندھی جی انہیں ایک زمانے میں اپنا سیاسی پیر کہتے رہے ہیں۔ فارسی زبان کا ایک تلمیحی مصرع اور واقعہ، ماضی بعید سے روایت ہے کہ:

ع   بہ خال ہندواش بخشم، سمرقندو بخارا را

مگر ماضی قریب میں مولانا عبدالباری فرنگی محل کا گاندھی جی کیلئے یہی مصرع بہ تصرف ادنی۔ یوں کہا جائے کہ

ع   بہ خال ہندواش بخشم، ہنود و ہندوستان سارا

تو یہ سلسلہ سمجھ میں آ سکتا ہے، مگر ہوا یہ کہ گاندھی جی نے اپنے ان سیاسی پیر سے بھی سیاست کر ڈالی اور اسے کہتے ہیں درویشی میں عیاری۔

مولانا فرنگی محل کا گاندھی کے لئے سرمدؒ کا یہ شعر کس کیف وکیفیت کا حال وقال ہے۔ اہل نظر کی نذر ہے کہ وہ اس کے مفہوم ومطالب سے آگاہ ہیں کہ

عمرے کہ بہ آیات واحادیث گذشت   رفتی و نثار بت پرستی کردی

(سرمد شہیدؒ)

یہ ایک واضح سی بات ہے تاہم اہل علم وعرفان سے اس شعر کی معنویت اور بلاغت یکسر مخفی نہیں رہ سکتی البتہ مولانا فرنگی محل کی اس سادگی کا سادہ سا ترجمہ یہی ممکن ہے کہ میری ایک عمر جو قران والحدیث میں محو اور قیل و قالہ سے مملو تھی وہ غفرلہ ہوگئی ہے کہ اس ہندو (گاندھی جی) کی بھینٹ چڑھ گیا ہوں۔

مان لیجئے، سیاست میں منصف مزاجی مل جاتی ہے مگر درویشی میں عیاری تو ایک ایسی بیماری ہے کہ اہل دل اور صاحب نظر تک پکار اٹھیں کہ

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

(اقبالؒ)

گاندھی جی کے اولین سیاسی پیرمولانا محمد علی جوہرؒ کے مرشد اور مولانا حسرت موہانیؒ کے مرشد زادہ تھے، اور ایک عرصہ تک گاندھی کا رہن، سہن اور اٹھنا، بیٹھنا تک بھی حضرت فرنگی محل کے ہاں رہا۔ یہاں تک باہر آنے جانے میں حضرت کی معیت اختیار کرنا باعثِ فخر وثواب تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا جب رہا ہوکر بمبئی پہنچے، تو ان کی ملاقات کے لیے مولانا فرنگی محل تشریف لائے تو ہمراہ گاندھی جی بھی تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی ؒ کا بیان ہے کہ

''بمبئی کے دورروزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل مرحوم ہی قیامگاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاست حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ اس اثناء میں مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت سے گفتگو کی۔'' (۲۴)

تاہم ایک بات طے ہے کہ ان صحبتوں کے مراحل سلوک سے گذرکر ہی مہاتما بن جایا کرتے ہیں کہ مولانا فرنگی محلؒ کی نظر کرم کا یہ عالم کہ ان کے مرید خاص مولانا محمد علی جوہرؒ بھی ان گاندھی جی کے زہد وتقویٰ کی میزبانی ہی نہیں نگرانی کیا کرتے تھے۔ دیوان سنگھ مفتون کا کہنا یہ ہے کہ

''مہاتما گاندھی نے مولانا محمد علی مرحوم کے مکان کو چہ چیلاں دریا گنج پر اکیس روز کا فاقہ شروع کیا، اس فاقے کے شروع ہونے سے چند روز پہلے اور فاقہ شروع ہونے کے بعد چندروز تک مرحوم مولانا محمد علی جوہر مہاتما جی کو سیر کیلئے شام کے وقت موٹر پر لے جاتے۔'' (۲۵)

باپو جی کے روحانی فیوض وبرکات کا نام کون جانے ہے البتہ اُن کے مادی وجود کو بھارت دیش کہتے ہیں حالانکہ ان فیوض وبرکات کے اقرار کا ایک رُخ سیاست کے نازک مزاج سے بھی میسر ہے کہ مسز سروجنی نائیڈو نے کہا کہ

''عربوں نے صرف ملک اور زمین فتح نہیں کی، بلکہ دل اور دماغ بھی فتح کیے ہیں۔ مسلمان بھائیو! ہمارے خواب وخیال (فلسفہ) کو حقیقت کا جامہ تمہی نے پہنایا اور ہمارے افکار وتخیل میں حرکت اور جان تمہی نے ڈالی۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا میں علوم وفنون کی کیا خدمت جلیلہ کی ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی طرح بخل روا نہیں رکھا۔'' (۲۶)

برعظیم میں مسلمانوں کے عہد حکمرانی پر اخذ واستفادہ کا یہ رومانی اور روحانی اعتراف کم ہے یا زیادہ ہے مگر ہے نازک خیالی، جو سفارت کاری اور ڈپلومیسی کا پانیکر نہیں ہے کہ مسلم دور پر انکا تبصرہ حقیقتاً مسز سروجنی نائیڈو کا آخری جملہ ہی تو ہے کہ ''مسلمانوں نے ہندوؤں کی طرح بخل روا نہیں رکھا۔'' ان تہذیبی اور روحانی فیوض وبرکات

کے بدیہی انکار کا حاصل ہی تو ہند و مت ہے کہ جس کے ہاں روحانی تجربات اور بصیرت کے اخذ وفلسفہ کو بھی عملاً یہ تشریح ملی کہ

''انسان تارک الدنیا اور تمام علائق سے منقطع ہو کر، جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں میں تنہائی کی زندگی بسر کرے، یہی سبب ہے مدنیت اور جمہوریت کی قابل ذکر مثالیں، ہندوستان کی قدیم تاریخ میں موجود نہیں۔ ہندوؤں کی چھوت چھات اور برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کی تقسیم ہندوؤں کے سیاسی، اخلاقی اور روحانی تنزل کا سب سے بڑا سبب ہے۔''(۲۷)

غالباً کیا یقیناً یہی وجہ اور سبب تھا کہ آزادی کے معاً بعد گاندھی جی کو عملاً مفلوج اور پھر عمداً قتل کا باعث یہی روحانی تنزل ہی تو ہے کہ ایک رشی اور منی (Saint) کا دنیاوی کاروبار اور حکومت کے اختیار سے کیا سروکار ہے۔ اگر پھر بھی باز نہ آئے، اور بولے بلکہ ''کوکے'' تو پھر نتھو رام گارڈ کا فائر باپو جی کے اس خون ناحق پر نہرو خاندان کی بادشاہی (Dynasty) کا تسلسل رہے تو پھر بھارت (جدید) کیلئے مصور پاکستان علامہ اقبالؒ ہی سے گاندھی جی کیلئے دہائی دلوائی جائے کہ:

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
(اقبالؒ)

وجہ یہ کہ باپو جی، مسلم اقلیت کے خون اور مسلم پاکستان کے اثاثوں پر بولا تو کیونکہ اس لئے یہی ہندو مت کا بھی تسلسل ہے کہ فکری اور تاریخی طور پر اس میں مذہبی احساسات کہاں ہوتے ہیں اور اگر کوئی نسلی، عقلی اور شکلی طور پر ہندو کسی صاحب نظر کی محبت سے صاحب حال ہو بھی تو وہ یکسر دنیاوی امور اور خاص طور پر اقتدار واختیار سے الگ رکھنے یا الگ کر کے رکھ دینے کے لائق ہے البتہ مت (حکمت عملی) کے طور پر مذہب یا مذہبی (شخصیت) کو نظریہ ضرورت (Doctrine of change and necessity) کے تحت استعمال کرنا یا اشتعال میں لانا ہی تو ہندو مت کے ہاتھوں فی نفسہٖ مذہب کے استحصال کا دوسرا نام ہے جو بھارت (قدیم) کی سیاسی تاریخ اور اس کا فکری عمق ہے۔ مسلم ہند کی گیارہ صدیوں کو تجاہل عارفانہ کہہ کے ساتھ چھو کر گذرنا بھی شکلی، نسلی اور عقلی روایت کا ہندو مزاج اور اس کے داخلی ماحول کے تقاضوں کا آریہ سماج ہی بنا ہوا ہے۔ اور یہ بلا سبب بھی نہیں کہ ۱۷۱۲ء سے پہلے کی ہندو ریاستوں کی ہیئت حاکمہ کا جائزہ لیں تو بنیادی سوال یہی ہے کہ آخر گردو پیش کی حکومتوں (مسلمانوں) کو ہندوستان کا رُخ کیوں کرنا پڑا تھا۔ یہ امر پہلے ہی زیر بحث آیا کہ ہندو ودوان انہیں حملہ آور اور مسلم مورخین سرکوبی کے نام سے ان واقعات کی وکالت ودلالت کا سماں باندھے ہوئے ہیں۔ تاہم ایک

بات جو تب گویا وابستہ تحریک (Alignment Movement) کے زمرے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ گردو پیش کی مسلم حکومتوں کے باغی گروہوں کی مسلح جدو جہد کو دامے ، درمے ، قدمے اور سخنے تو کیا خود اسلحہ کی فراہمی کے اقدامات تک ایک تاریخی حقیقت ہے جنہیں ، قرامطہ اور ملاحدہ کے تاریخی ادوار میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ سری لنکا کے تب تامل باغی یا پاکستان میں اب طالبان ہی سمجھے جائیں کہ ان کیلئے ہند و ریاستوں اور راجاؤں کی طاقتیں بہر حال شریک فتنہ وفساد تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کی سرکوبی نے وہ فطری اور منطقی نتیجہ بھی پالیا کہ یہ تصرف ادنیٰ

ع شامت اعمال ہند صورت مسلم گرفت

اور یہ گرفت اتنی سخت اور طویل ہو گئی کہ پانیکر کے الفاظ میں ایک ہزار برس تک ہندو معاشرے نے خود کو مقفل کر لیا کہ باہر کی ہوا نہ لگنے پائے ، چلئے یہ بھی بجا مگر اپنی قوم کی ایک ہزار سال پہلے کی مسلم تاریخ سے پہلے کی تاریخ کے اس رویہ کا حاصل اگر مسلم اقتدار بنا تو آخر کیوں ایسا ہوا ہے۔ اس لیے تین سوال لازم زیر بحث آئیں گے کہ

اول :۔ یہ کہ ۷۱۲ء سے پہلے کی مقامی ہند و ریاستوں کا جغرافیائی وجود اور سیاسی شہود کیا تھا؟

دوم :۔ یہ کہ اس دور میں ہند و ریاستوں کے داخلی ماحول کے تقاضے (Compulsions Domestic) کیا تھے؟

سوم:۔ یہ کہ ان ریاستوں سے گردو پیش کی مسلم حکومتوں سے آویزش کے اسباب کیا تھے؟

اور یہ مقامی حکومتیں خارجہ تعلقات کی نہج ورفتار کے اعتبار کن ہچکولوں کی زد میں تھیں کہ جس کے نتیجے میں ہند و مسلم جنگوں کو ہوا ملی اور نتیجتاً مسلمان برعظیم پر کم وبیش گیارہ صدیاں مقتدر (All powerful) حکمران ہو گئے ۔ تاہم ایک بات نتیجہ کے طور پر سامنے آتی ہے کہ ریاستیں (Hindu kingdoms) اپنی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے توسیع پسندانہ عزائم اور بالادستی کے اس عروج پر تھیں کہ باہر کی طاقتوں کو بار بار سرکوبی کیلئے ادھر کا رُخ کرنا پڑا۔ مسلم ہند کے بارے میں متضاد تجزیہ و تاریخ کے باوصف بدیہی طور پر سوالات کا ایک دائرہ ہے کہ جس میں تب ہندو ہیئت حاکمہ کے داخلی ماحول کے تقاضوں (Domestic Compulsions) کا عیاں اور بیان ہے۔ یہ ایک طرح کا استفہام واستفسار بھی ہے اور کسی حد تک اس کا جواب بھی کہ ایک فاضل مصنف نے یہ سوال و جواب کا آئینہ مقابل رکھا ہے کہ:

> ''اگر محمد بن قاسمؒ کا سندھ پر حملہ آور ہونا، ہندوستان اور ہندو قوم کیلئے نقصان رساں تھا تو اس نقصان کی ذمہ داری محمد بن قاسمؒ پر نہیں ، راجہ داہر پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح سلطان محمود غزنویؒ کا ہندوستان پر حملہ آور ہونا اگر برا تھا تو اس برائی کا باعث محمود غزنویؒ نہیں بلکہ

راجہ جے پال اور اسکا بیٹا انند پال تھا۔ سلطان شہاب الدین غوریؒ کی حالت بھی ان پہلے دو فتح مندوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اگر تھانیسر وغیرہ کا علاقہ جو پنجاب میں شامل تھا اور سلاطین غزنی کی حدود مملکت میں داخل چلا آتا تھا، پرتھوی راج زبردستی اپنے قبضہ میں رکھنے کی کوشش نہ کرتا، تو شہاب الدین غوریؒ کیلئے خوارزم شاہیوں سے نبرد آزما رہنے اور خراساں وترکستان وغیرہ کی طرف اپنی حکومت کے وسیع و مستحکم کرنے کے کافی مشاغل موجود تھے۔ جس طرح سلطان محمود غزنوی کو قرامطہ کی وجہ سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا اس طرح سلطان شہاب الدین غوریؒ کو بھی ملاحدہ کے سبب اس طرف آنے کی ضرروت پیش آئی۔'' (۲۸)

اور اس کا منطقی نتیجہ یہ کہ ان قرامطہ اور ملاحدہ کو دامے، درمے، قدمے سخنے امداد واعانت کی ہندو قوم اپنے کیے دھرے کا انجام پالے تو اعتراض کیسا ہے کہ سزا صورت مسلم گرفت ہے۔ اس سیاست اور طاقت کے معرکوں کو مذہبی جنگ (دھرم یدھ) بنا کر پیش کرنا تاریخ تو نہیں عقیدہ ہے۔ اس لئے محمود غزنویؒ کے سومنات پر حملے کا جوابِ آں غزل گویا کعبتہ اللہ پر انگشت نمائی ہے۔ پانی پت کے میدان سے مات کو جہاد پر نفرین ہے۔یہی وہ نفرتوں کے دو متوازی دھارے ہیں کہ جہاں ہندو مسلم تاریخ کی گیارہ صدیاں، صدیوں کی رفاقت و یکجائی کے باوصف دو متخالف کناروں اور دو قوموں کے علیحدہ تشخص اور وجود کو ممیز اور ممتاز کیے دیتے ہیں۔ یہاں مذہب کی بنا پر خود جغرافیہ تو کیا ہے نسل وشکل تک امتیازی ہو کے رہتی ہے کہ بیرونی اور مقامی کی آویزش بلکہ سکونتی زعم (مقامی) اور نسلی برتری کا تفاخر تک بھی باہم دست و گریباں ہو جاتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کے اس پیہم اور واقعاتی دو قومی نظریہ کو قلمی معرکہ اور علمی جدل کے میدان میں اسلام بمقابلہ ہندومت تک بنا ڈالا گیا، جبکہ یہ مذاہب کا معرکہ (دھرم یدھ) ان انسانیت دشمن ہندو راجاؤں کی فطری سزا کا نام ہے جو نتیجۃً مسلمان حکمران ثابت ہوا ورنہ ہند وحکومت چھن جانے کی حسرت کو قومی غیرت بنانا ہی تو ہندومت ہے۔ افسوس کہ فطرت کی تعزیروں سے بے خبری کا نام ہی تو مت (عقل) ہے۔ خواہ یہ کسی کی ہی ہو جس کیلئے صرف طاقت کا عدم توازن سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور فطرت اسی سے توازن برقرار کر کے رہی۔ اس کا واقعاتی، سیاسی اور مصالحانہ حل یہ ہے کہ یہ چونکہ بھارت (قدیم) کی تاریخ دو قومی نظریے کی مغائرت و آویزش ہے اس لیے بھارت (جدید) کے ماضی قریب کی متحدہ قومیت سے فتویٰ لیا جائے، اس لیے بھی کہ مسلم ہند کی نسلی، شکلی اور عقلی وراثت کا ممتاز ومعروف بلکہ مذہبی اتھارٹی کا ایک معتدبہ حصہ ہندو نیتاؤں اور کانگرسی رہنماؤں کے ہاں قابل تکریم بھی ہے اور شامل تنظیم بھی۔ اس دور پر ان کی رائے کو ہندو قوم عام اور عالم دونوں کو تعظیم تو روا رکھنا ہو گی۔ بلکہ بھارت کے بابائے قوم

(باپو جی) مہاتما گاندھی کا یہ اقرار کہ

''مولانا ابوالکلام آزاد ایشیاء میں اتہاس (تاریخ) کے سب سے بڑے عالم ہیں اور میں ان سے تاریخ سیکھتا ہوں۔''(۲۹)

ویسے بھی مولانا ابولکلام آزادؒ اپنے علمی مقام، اور سیاسی اور ادبی نام کے باعث لائق ''تذکرہ'' ہیں۔ مسلم ہند پر ان کی رائے فتویٰ سے کم نہیں ہوسکتی، لہٰذا ان کے پاس مسلم ہند کا مقدمہ فیصل ہوتا ہے کہ وہ نسلی طور پر ہرات وغزنی ہی کے ہیں اور ان کے بزرگ بابر کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا خاندان ویسے بھی مسلم ہند کے آخری دور میں اشرفیہ (Elite) میں شامل ہے۔ باقی رہا علم و تاریخ میں ان کی اصابت رائے اور تبحر علمی تو اس میں کسی کو بھی کلام نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک ان کی سیاسی سوچ اور وابستگی کا تعلق ہے تو کم از کم وہ ہندو نیتاؤں یا کانگرسی رہنماؤں ہی کیا خود ہندو عوام میں بجا طور پر قابل احترام ہونے چاہئیں کہ ان کی رائے، جو تاریخ کے بارے میں ہے اور خود گاندھی جی بھی ان کی تاریخ دانی کے معترف ہوں تو پھر مسلم ہند کی صدیوں کی تاریخ کے دو قومی نظریہ کو با آسانی متحدہ قومیت تک لانے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور انڈین نیشنل کانگرس ہم آہنگ ہوں اور مولانا ابوالکلام آزادؒ تاریخ اور سیاست میں بھی بیک وقت مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) کے بارے میں کانگرس میں یکجا اور یک آواز ہوں تو ایک پنتھ دو کاج کا محاورہ یقیناً اس علمی شہادت پر صادق آتا ہے۔ مولانا آزادؒ صرف ۱۹۴۶ء تک انڈین نیشنل کانگرس کے بار بار صدر بنائے جاتے رہے۔ ۱۹۴۶ء کے سالانہ اجلاس میرٹھ کے موقع پر کانگرس کے ساٹھ سال (Years of Congress Sixty) کے نام سے ایک کتاب ڈائمنڈ جوبلی کے سلسلے میں شائع کی گئی ہے جس کے مولفین میں ڈاکٹر ستیہ پال اور مسٹر پر بودھ چندر جیسے نامور نیشنلسٹ اور کانگرسی رہنما شامل ہیں اس کتاب میں مسلم ہند کو (The Mohammadan Period) کے نام سے باقاعدہ ایک باب (سوم) کی صورت شائع کیا گیا ہے۔ جس کے آغاز پر مولانا ابوالکلام آزادؒ ہی کی تصویر ہے۔ اس میں مسلم عہد کی جو تصویر ہے وہ مولانا ہی کے زیر صدارت اور ان کی تصویر کے زیر عنوان ایک تحریر ہے اس میں محمد بن قاسمؒ، غزنویؒ اور غوریؒ اور دیگر مغل (مسلمان) حکمرانوں کے بارے میں جو رائے دی گئی ہے وہ متحدہ قومیت کے مولانا ابوالکلام آزاد ہی نہیں بلکہ انڈین نیشنل کانگرس کی ۱۹۴۶ء جیسے اہم سیاسی سال کے سالانہ اجلاس کی یادگاری تصنیف و تالیف اور ریکارڈ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ متحدہ قومیت کا علمی اور سرکاری (اجماع) اور کہاں سے ملے گا۔ گویا اس تاریخ پر مولانا ابوالکلام آزاد کی تائید وتصدیق اور معنوی صاد تو مسلم ہے ہی کہ اس باب میں محمد بن قاسمؒ کی آمد سندھ اور حملہ ہند کا بیان یہ ہے کہ مولانا آزادؒ صدر کانگرس اور ان کی کانگریسی جماعت کی یہ اشاعت لکھتی ہے:

"On the first invasion each city was called on as the army approached, to embrace the Mohammadan religion or to pay tribute. In case of refusal their city was attcked, all the fifty men were put to death and their families were sold as slaves".(۳۰)

گویا مسلم ہند کا آغاز محمد بن قاسمؒ کی بربریت سے ہوا اس باب میں (The Mohammadan Period) کے آغاز کے علاوہ بھی مولانا کی کل دو تصاویر اس کی زینت ہیں، ان سطور پر بلا تبصرہ گذرتے ہوئے، اس سے متصل سطور سے حملے کے بعد کا منظر اور ماحول جس طرح پیش کیا گیا کہ عربوں نے آبادیاں تاراج کر ڈالیں اور مذہبی رسومات پر پابندیاں عائد کر دیں، اور مذہبی طبقات (برہمنوں) کی مراعات اور اراضی وغیرہ اپنی تحویل میں لے لی، یہاں تک کہ راجہ داہر کی دو بیٹیوں کو بر عمال بنا کر کمانڈر کے حضور پیش کیا گیا، جنہیں دربار خلافت بجھوا دیا گیا، اور انہیں شامل حرم کر لیا گیا۔ آگے محمد بن قاسمؒ کی جو تصویر اس تحریر میں تراشی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

"They were accordingly, sent to the court and introduced into the Harm. When the eldest was brought into the presence of the Caliph, she burst into a flood of tears and exclaimed that she was now unworthy of his notice, having been dishonoured by kasim". (۳۱)

جبکہ محمود غزنویؒ کے ہند پر حملوں کو دولت کے حریص کے ساتھ ساتھ سومنات پر بت شکنی کے بعد ہیرے، جواہرات سے بھرے بتوں کا مال ومنال لوٹنے کے بعد دو ٹکڑے کر کے ایک بت کا ٹکڑا مکے اور دوسرا مدینے بجھوایا۔ محمود غزنویؒ نے جو دولت لوٹی، اسکا حتمی اور مکمل حساب اور تخمینہ تو ڈاکٹر ستیہ پال اور مسٹر پر بود چندر کی دانست میں نہیں البتہ وہ اندازاً بتاتے ہیں کہ

".......The treasure taken on this occsion exceeded all former capture. It is impossible to enumerate the maunds of gold and jewels that Mehmood took to Ghazni". (۳۲)

البتہ محمود غزنویؒ کے بعد شہاب الدین غوریؒ کا تعارف اور مقام جن الفاظ میں مقید اور متعین کیا گیا ہے اس میں غزنویؒ اور غوریؒ بیک وقت متعارف نہیں بلکہ مبغوب ومغبوض ہوتے ہیں، اور دونوں ایک ہی تان اور سان پر کسے ہوئے ہیں کہ

"Shahab-ud-Din was more sanguinary than Mehmood".(۳۴)

گویا شہاب الدین غوریؒ، محمود غزنویؒ سے زیادہ خون آشام تھا اس لئے کانگریسی ہندوؤں نے مسلمانوں سے یہ ۱۹۴۷ء میں انتقام لیا تھا اور یہ ہے مسلم حملہ آوروں کا تعارف جو ہند اور سندھ پر نازل ہوئے اور کانگرس کی باضابطہ تحریر اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تصدیق مع تصویر ہے۔ اس تاریخ کو متحدہ قومیت کی تعبیر میں جو شرعی تفسیر کا مقام بنتا ہے اس میں فتویٰ کا لفظ شاید مناسب نہ ہو البتہ ان حملہ آوروں کے نتیجے میں جو حکومتیں (بادشاہت وملوکیت) قائم ہوئیں، ان میں مسلم ہند کی گیارہ صدیاں اور اسکا طرز حکمرانی سراسر یہ خاندانی (Dynasties) کے اشرافیہ (Elite) کے ملک العلماء (سب سے بڑا عالم) نقیب الاولیاء (بلند پایہ صاحب طریقت) ملک الاطباء (شاہی طبیب) اور رکن المدرسین (وزیر تعلیم) یہ چاروں خطاب مغل دور کے اشرافیہ کے تھے جو تمام علماء و فضلاء کے سرکاری اور درباری خطابات تھے۔ جبکہ فوج، عدلیہ اور انتظامیہ میں بھی نسلی، عقلی اور شکلی مسلمانوں کا ایک مراعات یافتہ طبقہ ہمیشہ سرکار و دربار سے منسلک اور ملحق رہا ہے۔ خود مولانا ابوالکلام آزادؒ کے دادا محمد ہادی آگرہ میں قلعہ دار تھے۔ جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیر الدین کے نانا، مولانا نور الدین کے دادا قاضی سراج الدین، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان آئے، اور گورنر پنجاب (نور الدین) کے مشیر اور چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ بہر حال مسلم ہند کی شرعی اور اصولی بحث کو مولانا آزاد کے حوالے سے بات کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ مسلم ہند میں سجدے کی اجازت تھی کہ نہیں۔ البتہ اکبر کے سجدہ تعظیمی کی بحث کا تذکرہ وتبصرہ آج تک زیر بحث ضرور ہے۔ اس اکبر کو مسلمان تو کافر و فاسق بلکہ گمراہ کر کے مارتے ہیں اور کانگرس کے ساٹھ سال کی سطور میں اکبر کو ہند و مولفین مسلمان کر کے مارتے ہیں، یہ اکبر شناسی کا ہند و اعتراف ہے کہ اعتراض ہے مسلم قومیت کی روح عصر،

ع خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

بتانے والے مجتہد العصر حضرت علامہ اقبالؒ کی زبان میں اکبر گویا کہہ رہا ہے

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں
(اقبالؒ)

اکبر کے آخری لمحات کی چشم دید رپوٹ ہند و مولفین کو شاید جودھا بائی نے بتائی ہو گی اس لئے کہ نزع کے وقت حرم میں ڈاکٹر ستیہ پال اور پر بودھ چندر تو بہر حال نہیں تھے کہ یہ رپوٹ دیتے کہ

"Akbar permitted one of the cheif priests to be brought to him and in his

presecne he repeated *Kalma* and died in all the forms of a good Mussalman". (۳۴)

انڈین نیشنل کانگرس کے اندر بھی دو قومی نظریہ؟

اکبر کی مذہبی پالیسی تو گویا مغل اعظم کا ایک متنازعہ فیہ باب ہے مگر مولانا آزادؒ کو خود کانگرس کے اندر بھی گاندھی بمقابلہ سبھاش چندر بوس کانگرس کے ۱۹۳۸ء سالانہ اجلاس کے بعد تک سبھاش چندر بوس کے ہاں سے مغل اعظم کا لقب عطا ہوا ہے۔ یہ نسلی پھبتی تھی کہ مذہبی، یا سیاسی نشاندہی مگر طنز و تحقیر کا یہ پہلو ہند و تاریخ کے ذہن سے ملاحظہ کرنا ہو تو نیتا جی سبھاش چندر بوس اور آزاد ہند فوج کے بانی مبانی کے الفاظ خود مولانا ابوالکلام آزاد کیلئے شورش کاشمیری رقمطراز ہیں کہ

> ''سبھاش چندر بوس نے مہاتما گاندھی سے لڑائی کے بعد جو گرما گرم بیان دیئے، ان میں مولانا (آزاد) کو ازراہِ تعریض مغل اعظم کہا۔'' (۳۵)

حالانکہ مولانا ابوالکلام آزادؒ خود انڈین نیشنل کانگرس کے صدر کے علاوہ علمی، ادبی اور مذہبی حیثیت و شخصیت کا ایک منفرد نام اور مقام ہے۔ تحریک آزادی ہند میں ان کے سیاسی عزائم اور کارکردگی سے کانگرسی سیاست تک ان کے مورخانہ نقطہ نظر کی جماعتی سیاست کا مسلم ہند پر تذکرہ زیر بحث آیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر ہند و نقطہ نظر سے اور کانگرس کی متحدہ قومیت ۱۹۴۶ء تک بھی مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت کی آڑ اور تصویر کی باڑ میں مسلم ہند (۷۱۲ء۔۱۸۵۷ء) کے باب سوم (The Mohammadan Period) میں جو تحریر ہے وہ بالاستعاب مطالعہ کی چیز ہے۔ اور اس میں گویا محمود غزنویؒ اور شہاب الدین غوریؒ، خون آشام، لٹیرے، مال و زر کے حریص اور پلید و خبیث تھے تو ایک بات مولانا آزادؒ سے کہنے کی ہے کہ اور نہیں تو وطنی قومیت (ہرات وغزنی) کے علاوہ مسلم ہند کے مقتدر اشرافیہ سے نسلی فوقیت ہی کا عقلی اور شکلی تقاضا کیا تھا یہی کہ جب ۱۹۴۷ء میں دہلی کے مسلمان عزت و آبرو اور جان و مال بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے تو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جامع مسجد میں مسلمانوں کے ایک ''فقید المثال مگر مجروح و مضطرب اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ایک رقت آمیز اور ولولہ انگیز تقریر کی'' اور مسلمانوں کو کہا کہ

> ''وہ دیکھو جامع مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی عظیم الشان تاریخ کے پُر رونق صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جس جمنا کے کنارے پر تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا، اور آج یہاں رہتے ہوئے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے۔ کیا بھول گئے ہو کہ دلی تمہارے ہی خون سے سینچی ہوئی ہے۔'' (۳۶)

ایک طرف ہمارے یہ قافلے خون آشام لٹیرے ، مال وزر کے حریص قرار پاتے ہیں، اور ایسے خون آشام لوگوں کے باپ دادا کا تذکرہ کر کے مولانا ابوالکلامؒ کس کو آواز دے رہے ہیں؟ ان کی یہ آواز عملاً اورنتیجتۃً صدا بصحرا تو ثابت ہوئی ہی وہ خود اس صحرا کے بادیہ پیما کیوں تھے۔اس تقریر کے افتتاحیہ میں وہ پدرم سلطان بود بھی بول رہا ہے کہ مسلمانان دہلی کی ہمت بڑھاتے ہوئے فرمایا،

''اس سے بڑھ کر اندوہناک تصور کیا ہوسکتا ہے کہ دہلی کے لال قلعہ میں ہم کبھی جہاں پناہ تھے ،لیکن آج جانوروں کے دڑبوں سے پناہ مانگ رہے ہیں ،قبروں کے سینے ڈھونڈ رہے ہیں۔''(۳۷)

یہ دلدوز اور دلگداز تقریر اور خطاب جس ماحول اور گردو پیش کے جلو میں نازل ہوا ہے اس کا نقشہ شورش کاشمیریؒ نے اپنے قلم سے کھینچتے ہوئے بتایا کہ

''ہندوستان اور پاکستان کی صبح آزادی خون میں ڈوب کر طلوع ہوئی ۔ ہندو مسلم فسادات برطانوی مشن کے زمانے میں ہی شروع ہو چکے تھے۔ ابھی مشن ہندوستان میں تھا کہ اکا دکا قتل ہو رہے تھے ،مشن رخصت ہو گیا، تو نوا کھلی ، بہار، گڑھ مکیشتر ، امرتسر ، بستیوں کی بستیاں صرف اختلاف مذہب کے جرم میں تاراج کی گئیں ،عورتیں اغوا ہوئیں ، جوان قتل کر دیئے گئے ،بچوں کو ماردیا گیا، بوڑھوں کو موت چاٹ گئی ، بربادی اتنی بڑی تھی کہ انسان وحشی ہو چکا تھا۔اور پھر جب آزادی کا دن آیا تو دونوں طرف قتل عام تھا۔ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا شہر تھااور ۱۵اگست ۱۹۴۷ء کے دن بھی مسلمانوں کی تاریخ چپے چپے پر بکھری ہوئی تھی مسلمانوں کے لیے قبر کی طرح تنگ ہو گیا اور جو بازار کبھی ان کی چہل پہل سے پُر رونق تھے ، ان کیلئے چتا ہو گئے ۔مولانا نے ان دنوں دہلی کی جامع مسجد میں ایک فقیدالمثال لیکن مجروح و مضطرب اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ایک دل گداز تقریر کی۔''(۳۸)

اس دلگداز تقریر کے جس پہلو سے بحث ہے ، وہ سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے بارے میں انڈین نیشنل کانگرس کی ساٹھ سال نامی کتب میں مندرج تحریر کے بعد''بزرگوں کے قافلوں کا وضو'' اور ''جمنا کے کنارے'' اور''دہلی میں کبھی جہاں پناہ''جیسے جملے ہیں۔''خون آشام اور خونریز غوریؒ اور غزنویؒ'' یہ خود مولانا ابوالکلام آزادؒ کے دور صدارت کی دستاویز ہے کہ نہیں ہے۔لیکن یہاں مسئلہ مولانا آزادؒ کی فکری شخصیت اور سیاسی طور پر کانگرسی حیثیت کا نہیں ، اس ذہن اور ذہنیت کا ہے جیسے ہندو مت کے تاریخی ورثے سے مسلم ہند کیلئے ایک تذکرہ اور تبصرہ میسر آیا ہے اور وہ بھی متعصب اور تنگ نظر ہندو ودوان (ماہرین) کا نقطہ نظر نہیں بلکہ سیکولر بھارت کے دو نامور

نیشلسٹ رہنماؤں پر بودھ چند اور ڈاکٹر ستیہ پال سے جو مولانا آزادؒ کے معتقد اور آغا شورش کاشمیری کے دوست تھے۔لیکن یہ تو تاریخ کے مشترکہ اور متحدہ قومیت کے مباحث ہیں کہ مسلم ہند، مقامی رعایا (ہندوؤں) کیلئے کیا کیا تھا۔خود بھارت (جدید) کے گذشتہ ۶۲ برس مسلمانوں کے جان ومال،عزت و آبرو اور معاشی اور معاشرتی ترقی کے حوالوں سے جن ہندو مسلم فسادات کا ریکارڈ دکھاتا ہے اس کے بعد تو مسلم ہند کی گیارہ صدیاں ایک آئینہ بن کر بھارت جدید کا ایک ایسا چہرہ ہے جس پر ماتا کے کئی داغ ہیں۔ پورے مسلم ہند (۱۸۵۷ء-۷۱۲ء) میں کوئی ہند ومسلم فساد اور قتل عام کا ریکارڈ ہو تو سامنے لاتے۔ افسوس کہ بات نہ ہند ومورخین کی نہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے استدلال و اعمال کی ۔گزشتہ ۶۲ برس کے خون آشام بھارت میں مسلم اقلیت پر دانشوروں کے زاویے آج بھی جس امر کی نشاندہی کرتے ہیں اس سے ہندو ذہنیت کا عکس دیکھنے میں کوئی سی مشکل باقی نہیں رہتی کہ اور تو اور ہندو، مسلم فسادات پر بھارتی ذرائع ابلاغ کے دانشور ۱۹۹۰ء میں بھی یہ بتاتے نہیں تھکتے کہ

"......The seeds of the present day communal rancour in the country were sown in the tenth century attacks of Mohammad Ghori, where after Hindu Bharat's life was torn to pieces, the Hindus forcibly converted to Islam, their women-folk raped and their places of worship ransacded".(۳۹)

گویا اس فرقہ واریت کی بنیاد اور فساد کی جڑ غوریؒ اور غزنویؒ کے ہاں سے پھوٹتی ہے لہٰذا ذہنی طور پر اس کے جواز پر اقتدار و اختیار کے حوالے سے یہ مفروضہ بھارت میں مسلم کش فسادات کیلئے ایک علمی اور تجزیاتی بنیاد ہے۔ اس غوریؒ اور غزنویؒ کے حوالے سے اندرون بھارت مسلمان ختم کرنے قابل تو ہیں اور اس پر پاکستان کا جزبز ہونا بھی تاریخی امر ہے مگر مسئلہ پاکستان یا بھارت کا نہیں صرف اور صرف مسلمان کا ہے ۔ اس کی مزید تائید و تصدیق یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے لیے ایک امدادی ملک ہے بلکہ ۱۹۸۹ء میں بھاگل پور (بہار) کے فسادات میں اب بنگلہ دیش کا ہاتھ شامل نظر آنے لگا ہے۔ اس ضمن میں سنڈے میل کلکتہ کے ۱ فروری ۱۹۹۰ء کے شمارے میں بنگلہ دیش کے بارے میں دلی کا انگریزی اخبار ریڈئنس رقمطراز ہے:

"Bangladesh hand in the Bhagalpur holocaust of November 1988 and attributes the motive to creating a backlash in Babgladesh before election so that a large reaction of the minority there, that is expected to support the Awami League alliance is forced to leave".(۴۰)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اور مسئلہ نہ پاکستان کا ہے نہ بنگلہ دیش کا بلکہ یہ سراسر اسلام اور مسلمان کا قضیہ ہے جس کی تاریخی اور واقعاتی بنیادیں حملہ سندھ سے لیکر مسلمانوں کی حکومت ہند تک کی کم وبیش گیارہ صدیوں پر محیط ہیں۔ مسلم ہند کی یہ مقتدر گیارہ صدیاں (۱۸۵۷ء۔۷۱۲ء) ہندو اور بھارتی نقطہ سے اس لئے خارج اور فارغ قرار پارہی ہیں کہ اس عرصہ تاریخ کے دوران ہندومت گویا اپنی تاریخی چال اور فکری جال دونوں بھول گیا کہ وہ جین مت کے افکار اور بدھ مت کے اقتدار کی طرح نہ مسلمانوں کو ضم کر سکا نہ اسلام کو ختم کر سکا کہ یہ مت نہیں من کی دنیا ہے کہ جہاں عقل عیار عرف ہندومت کا گذر ممکن ہی نہیں کہ اسلام ایک دین اور سراسر دل کی دنیا ہے۔ جبکہ ہندومت محض وہم و اوہام کی دیو مالائیت (Mythology) کا عقلی، نسلی اور شکلی نگار خانہ ہے جہاں خواہشات نفس کے بت متشکل اور مادی ہو کے رہتے ہیں۔

باوجود یکہ مسلم ہند کی مذکورہ گیارہ صدیوں میں متعدد بار اس امر کی بھرپور اور منظم بلکہ متحدہ کوششیں مسلم حکمرانوں کو ہٹانے اور سازشیں انہیں مٹانے کی، کی جاتی رہیں جو اپنے طور پر حد درجہ مسلح، منظم اور موثر تھیں۔ مگر یہ محض حصول اقتدار (Power-Politick) کی جنگیں تھیں، جنہیں، اب ہندی، ہندو، ہندوستان کا نیشنلزم بنا کر قومی شناخت بنائی گئی ہے اور یہی جدید بھارت کا عصری چہرہ بن کر، کے ایم پانیکر کا ارشاد اور مولانا ابوالکلام آزاد" کا سیاسی صاد بنا پڑا ہے۔ مگر اس پورے دور میں ہندو مورخین ہی کیا خود قائدین دونوں کے ہاں سب سے زیادہ مغضوب و معتوب اورنگ زیب عالمگیرؒ ہے۔ خود مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زیر صدارت کانگرس کے ساٹھ سال نامی دستاویز میں اورنگ زیب کس قدر معتوب اعظم ہے ایک ہی جملے کی جھلک سے اس طوفان کے فکری رُخ کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ

"The Hindus were irritated by systematic discouragement and by acts of cruetly and opression".(۴۱)

یہ بات برعظیم کی مسلم تاریخ کے ہندو باب کا ایک متنازعہ پہلو تو ہے ہی، مگر ۱۹۴۶ء ایسے اہم سیاسی سال میں ہی انڈین نیشنل کانگرس کی یادگاری اشاعت کا یہ فلسفہ متحدہ قومیت یہیں ختم ہو جاتا تو چلیے، مولانا آزادؒ کا دھرم نہ سہی، بھرم تو قائم رہتا، مگر سادگی مسلم کی دیکھنا ہو، تو قومی ہیرو سبھاش چندر بوس (صدر کانگرس) اپنے عزل (نکالے جانے) پر مولانا آزادؒ کو مغل اعظم کہیں تو یہ پھبتی نہیں ایک طرح کی نشاندھی ہے جو دیگر ہندو مورخین نے بھی روا رکھی کہ اکبر اعظم پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس نے اپنی حکمت عملی سے ہندو معاشرے کے اندر جاگزیں ہو کر اثرات ڈالے ہیں کہ جس نے پانیکر کی مقفل ہندو سوسائٹی میں پہلی بار حرم میں داخلے اور دھرم میں فاصلے کو عبور کر کے ہندومت کی حصاریت میں نقب لگائی اور یہی دہائی اس خط و کتابت میں واضح ہے جو گاندھی جی کے نام

سبھاش بابو کے مرسلہ احتجاج کا ریکارڈ ہے۔

''سبھاش چندر بوس نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کی تو گاندھی جی سے ان کی جو خط و کتابت ہوئی اس میں سب سے زیادہ مطعون مولانا آزادؒ کو کیا گیا، ان خطوط میں سبھاش چندر بوس نے مولانا آزادؒ کو ہمیشہ مغل اعظم لکھا۔''(۴۲)

یہ اس متحدہ قومیت کے کس فلسفے یا ہیرو پرستی کا ادعا ہے اس سے قطع نظر منصف مزاج ہندو مورخین خود اس حقیقت کا پردہ چاک کیے دیتے ہیں کہ ڈاکٹر تارہ چند جیسے نامور مورخ اور محقق کا کہنا یہ ہے کہ ''بعض لوگوں کے نزدیک اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامی کا سبب ہوئی، بالعموم یہ خیال غلط ہے۔ ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں، اسکا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہ تھا۔ اورنگ زیب نے انہیں ہندوؤں ہی کی مدد سے فروکیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرہٹوں کے خلافت جنگ مغلیہ سلطنت کیلئے ایک بارعظیم ثابت ہوئی، لیکن بغاوت مرہٹہ کی تھی نہ کہ مذہبی۔ فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی اور دوسرے قبائل کی بغاوت سے بہت مختلف نہ تھی۔ راجپوت، سندیلے اور شیوا جی کے اپنے رشتہ دار اورنگ زیب کی خاطر شیوا جی اور ان کے جانشینوں کے خلاف لڑے اور پھر مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملے کیے اور ان کے لشکروں میں مسلمان بھی موجود تھے۔'' (۴۳)

تاہم کانگرس کی اس یادگاری دستاویز میں مغل عہد کی کہانی ڈاکٹر ستیہ پال اور پربودھ چندر کی زبانی جہاں پورے مغل عہد پر کانگرسی زعماء کا تبصرہ ہے وہاں پورے مسلم ہند پر ہندو نقطہ نظر جذباتی الاؤ کی چتا روشن ہے۔ کہتے ہیں۔

"Internal dissensions, domestic feuds and jealousies leading to factions, love of ease and luxury, 'religious fanaticism' bigotry, mutual distrust and hatred are some of the factors that brought about the dissolution and such a shock India received by this downfall that till today we are slaves in our own country and foreigners of our land".(۴۴)

مسلم ہند کے مغل دور (۱۸۵۷ء۔۱۵۲۶ء) پر یہ مجموعی تبصرہ اور تاثر، جہاں نیشنلسٹ ہندو شدہ دماغوں کی اپنی ذہنیت کا عکاس ہے، وہاں برعظیم کی غلامی کا باعث بھی مسلم حکمران ٹھہرتے ہیں۔ البتہ ایک حقیقت واضح ہے کہ مسلم ہند کی گیارہ صدیاں مقتدر مسلمان اور سلطان، بلاشبہ مقامی ہندو راجاؤں کی بغاوتوں اور سازشوں سے برسر

پیکار رہے اور اکثر اوقات مقامی ہندو راجاؤں کا متحدہ مجبوری محاذ بھی سامنے آتا رہا مگر یہ عجیب بات ہے کہ مسلم حکمرانوں کوتو مٹایا یا دبایا نہ جا سکا چہ جائیکہ اسلام کوختم کرنے کی کوئی سی سعی، کوشش یا تدبیر کامیاب ہوتی ۔ یہی وہ ایک راز ہے جو اسکی روحانی طاقت ہے جس کی وجہ سے ہی اسلام اس خطے میں ہندومت کیلئے واقعتاً ایک تہذیبی اور تمدنی بلکہ روحانی چیلنج بنا ہوا ہے ۔ وجہ اس کی تاریخی اور واقعاتی بھی ہے اور معاصراورمعروضی بھی کہ متشرقین کا ایک تجزیہ یہ بھی ہے کہ

"...... Islam, unlike other religious movements of the past, was a young, vibrant and aggressive religious force that could not be observed by Hinduism". (۴۵)

مگر ہندو، بھارت اپنی نئی نسل کو یہ بتارہا ہے، یہ پڑھا رہا ہے کہ معاصر بھارتی صوبہ گجرات کی درجہ نہم کی سماجیات کی کتاب کا ایک درس ایک ورق ملاحظہ ہو کہ

> ''محمود(آف غزنی)نے قنوج کے دس ہزار مندر مسمار کیے،اور تمام باشندوں کوقتل کر کے وہاں کی تمام دولت ہتھیا لی تھی ، یہ ظلم وستم کیوں ہوا؟ یہ ظلم اس لئے ہوا کہ اسلام صرف تشدد سکھاتا ہے۔'' (۴۶)

یہ وہی ذہنیت ہے جسکا اظہار گاندھی جی نے ۱۹۲۴ءکو ہندومسلم فسادات پر کیا تھا کہ ''اسلام تلوار کا مذہب ہے۔ اسلام تشدد کا مذہب ہے''۔

حالانکہ حقیقت اسکے برعکس ہے اسلام، سلامتی اور امن کا دین (The Way of Life) ہے۔ یہ جبر و جہاد یا فساد کا مذہب ہوتا تو برعظیم پاک وہند پر حملہ ہی نہیں ایک ہزار برس حکمرانی کے باوجودآج کا بھارت اپنی غالب اکثریت میں ہندونہیں ، سارے کا سارا مسلمان ہوتا! جہاں گذشتہ ۶۲ برس میں مسلمان ، تنگ نظر ہندو اکثریت کے ہاتھوں آئے دن تشدد کی زد میں رہتے ہیں، جہاں لگ بھگ ۴۰ ہزار مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں، جہاں مسلمان ایک سہمی ہوئی اقلیت ہیں۔

اختتامیہ

مسلم ہندوستان اور ہندو حاصل تاریخ

برعظیم جنوبی ایشیاء میں مسلم عہد حکمرانی کے ایک ہزار برس تاریخ نویسی میں ہند و انگریز اتحاد کا ایک علمی کلب ہے جو ہندوستان کی تاریخ کے عہد وسطیٰ (Medieval India) یعنی مسلم دور کو اپنے قومی تعصب کی زد میں لا کر نفرت اور کدورت ایسا قلمی جدل ہے جہاں خاص طور پر ہندو، مسلم منافرت کے تاریخی زاویے، دور حاضر کے سیاسی زائچے بن چکے ہیں۔ یہی تاریخ نویسی کا وہ بدیہی المیہ ہے جس نے برعظیم کی دو قوموں، ہندو اور مسلمان کے درمیان عداوت و نفرت کے ہمالہ جیسے پہاڑ کھڑے کر رکھے ہیں۔ یہی وہ تاریخی روش ہے جس نے مسلم ہندوستان (۱۸۵۷ء۔۱۲۰۷ء) تک کے عرصہ تاریخ کو تاریخ بنانے کا نام مورخ اور وِدوان کا کام ہو گیا ہے۔ اس پہلو سے ہندو احیاء کی جدید سیاسی تحریکوں کے نیتاؤں (رہنماؤں) کا وطیرہ اس امر کی مکمل شہادت فراہم کرتا ہے۔ یہ کانگرس کی تحریک آزادی ہو کہ آزاد بھارت کا تعلیمی تاریخ کا نصاب مسلم بیزار تاریخ اب ہند و بھارت کی تاریخ بھی ہے اور تحریک بھی جو معاصر بھارت ہی تعلیم کا بھگوا کرن کہلاتی ہے۔

مسلم عہد سلطنت (۱۲۰۷ء تا ۱۵۲۶ء) اور مغل دور (۱۵۲۶ء۔ ۱۸۵۷ء) ہند و قوم کے لئے اب شرمندگی کا عرصہ تاریخ بتایا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے دم واپسیں پر ہندوستان کی نئی تاریخ لکھنے کا سرکاری نیم سرکاری اہتمام تک سامنے آ گیا ہے۔ قبل ازیں مسلم حکمرانی خاص طور پر محمود غزنویؒ، شہاب الدین غوریؒ، علاؤ الدین خلجی، محمد بن تغلق، بابر اور اورنگ زیب، بلکہ سلطان ٹیپو تک زیر عتاب ہیں جو کہ گذشتہ ۶۲ برس سے معاصر ہندوستان کے تعلیمی اداروں کا باقاعدہ نصاب ہے۔ اس سلسلے میں مسلم دور زوال ہی سے یہ کام پہلے انگریز مصنفین (Historians) کی قلمی کاوش کا توشہ تاریخ تھا، پھر ان کے ساتھ ہندو مورخین کی روایتی چابکدستی نے اپنے قومی اتہاس (تاریخ) کا غصہ مسلم عہد حکومت (عہد وسطیٰ) پر نکالا۔ جان اسمتھ، ایلیٹ، ولیم ہنٹر کے ساتھ ساتھ سر جادو ناتھ سرکار، پی این اوک، پروفیسر بلراج مدھوک اور اب ارون شوری جیسے قلم کار اپنے سیاسی عزائم کو اپنی سیاسی تاریخ بتانے پر جت گئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تو بھارت میں باقاعدہ ادارے مثلاً

(1) Dindayal Upadhye Institute.

(2) Research Institute for Re-Writing Indian History.

اسی غرض سے کام کر رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے برعظیم پاک و ہند بلکہ بنگلا دیش میں فن تاریخ نویسی (Historiography) مسلمان یہاں لائے جبکہ پہلے ہندو صنمیات (Mythology) وضعی قصے، کہانیاں اور

خرافات عام تھیں۔ مسلمان تاریخ دان تاریخ نویس، وقائع نویس ،درباری مورخ ، تاریخ حالات و واقعات تذکرہ اور سوانح لکھتے تھے یہاں تک کہ بعض حکمران اور خاص طور پر مغلوں میں بابر اور جہانگیر کے خودنوشت تزک بھی معاصر اور معروف تاریخ ہے ۔ حادثہ یہ ہے کہ برعظیم کی تاریخ میں سلاطین کی دھلی اور مغل شہنشاہوں کو تاریک کر کے باقی بچتا ہی کیا ہے اور تو اور خود منصف مزاج ہند ومورخین کی ایک موثر تعداد ایسی بھی ہے جو خود اس تاریخ کے تعصب کو من گھڑت قرار دینے میں بخل سے کام نہیں لے رہی بلکہ اعلانیہ ان کا اظہار بھی سامنے آیا ہے۔ معروف محقق ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے نے اپنی مشہور کتاب (Islam and the Indian Culture) میں اس روش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''ایک طے شدہ پالیسی کے تحت بھارت بھر کی نصابی کتب میں یہ زہر بھرا گیا ہے کہ قرون وسطٰی (Medieval india) کی ہندوستانی تاریخ ان باتوں سے بھری پڑی ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنی ہندو رعایا پر مظالم ڈھائے تھے اور مسلم دور حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک اور برتاؤ روا رکھا گیا۔'' (۴۷)

یہاں تک کہ مسلمانوں کے خلاف ہندو حاصل تاریخ کا تعصب بھارت بھر کے تعلیمی نصاب کا حصہ اور تاریخ کا قصہ بنایا گیا۔ جس کا جائزہ تک لینے کی کمیٹی بنائی گئی ۔ مسٹر این ۔ سی ۔ سیکسینہ نے اپنی رپوٹ میں لکھا کہ

> ''بدقسمتی ہے کہ اب تک ہندوستان کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان پر مسلم دشمن رنگ چھایا ہوا ہے ۔ سکولوں میں تاریخ کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں یا ہندی زبان میں جو کتابیں نصاب میں شامل ہیں وہ نسلی اور مذہبی تعصب سے بھری ہوئی ہیں ۔'' (۴۸)

مسلم ہندوستان یا مسلمانوں کی خلافت ایک ہزار سالہ تاریخ عناد کا یہ الاؤ اپنی نئی نسلوں کو بھارت کی ہندو قوم کس طرح زہر آلود کیے دیتی ہے ۔ ۱۹۸۶ء میں ممتاز بھارتی اخبار ہندوستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر کے ایس مین نے ایک اداریے تک میں اس موضوع اور مسئلے کو اٹھایا اور لکھا کہ

> ''ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہماری مسخ شدہ تاریخ کے زہریلے اثرات کو روکا جائے جو ہمارے نوجوانوں کے دماغوں میں بھر دیئے گئے ہیں۔ بہت سے مسخ شدہ نظریات جو جان بوجھ کر انگریزوں نے ہماری تاریخ میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت بھر دیئے ہیں وہ آج بھی ہمارے دماغوں کو زہر آلود کیے ہوئے ہیں۔''(۴۹)

تاریخ نویسی کی مسلم دشمنی کی خود اپنی تاریخ کا تجزیہ کریں تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز مصنف ایلیٹ نے ۸ جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ کو ہندو مسلم تعصب کے دھارے پر بہایا۔ پھر جادو ناتھ

سرکار نے ۵ جلدوں میں اورنگ زیب کو ہندو تاریخ اور تعصب دونوں کا نشانہ بنایا جس کے صلے میں انہیں سرکا خطاب سرکار برطانیہ نے عطا کیا اور کثیر معاوضے سے بھی نواز گئے۔ پھر بینکم چٹر جی نے مسلمانوں کے خلاف اہانت آمیز ناول ''آنند مٹھ'' لکھا جس میں ہندو، مسلمانوں کو شکست دیتے ہیں اور اس فتح کے موقع پر ہندو فاتحانہ جوش میں مشرکانہ گیت بندے ماترم گاتے ہیں۔ اس ناول میں مسلمانوں کے خلافت نفرت بھری ہے اور انگریزوں کی تعریف کی گئی ہے اور ان کی مدد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ہم مسجدوں کو ڈھائیں گے اور ان کی جگہ راما مادھو کے مندر بنائیں گے، اس بینکم چٹرجی کو انگریز کی حکومت نے کلکٹر بنایا اور رائے بہادر اور سی آئی ای کے خطابات سے بھی نواز رکھا تھا۔

لیکن مسلمانوں کے ایک ہزار سال کو ہندوقوم کا تاریخی ہیجان بنانے میں انگریز کی پالیسی تو چل گئی، مگر ہندوقوم نے مسلمانوں کو اپنا مستقل غلام بنانے کا منصوبہ بنا کر یہ باور کرایا کہ وہ اپنی تاریخ کا مسلم دشمن انتقام اس صورت میں لے سکیں گے۔ یہی سبب ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس نے مسلمانوں کو اپنے ساتھ متحدہ قومیت کے فلسفہ اور نظریہ کی رو سے اپنے دام ہم رنگ زمین میں پھنسانا چاہا۔ اس کی خاطر مذہبی ملاؤں کی ایک قلمی، علمی، ادبی اور مذہبی بلکہ لسانی بلندیوں پر خطاب کی رونق بعض علماء کو اپنے ساتھ ملا کر مسلم پاکستان کے حصول کی تحریک میں رکاوٹیں ڈالیں۔ مسلم عوام کو گمراہ کرنے کیلئے مسلم عوام سے رابطہ کی مہم تک چلائی۔ جو ہو سکا کیا جو بن پڑا کام میں لائے کہ

اولاً:۔ تو پاکستان بنے ہی نہ، بن جائے تو چلے ہی نہ، چل پڑے تو چلنے نہ دیا جائے۔

ثانیاً:۔ اسے خاموش طریقہ واردات، سازشوں، سفارت کاری اور جنگوں کی ضرب کاری سے نابود کر دیا جائے۔

یہی وہ تاریخی تعصب اور عناد کا فساد ہے جو مسلم پاکستان کے قیام کی تحریک کے دوران کانگرسی نیتاؤں کی نیتوں کا فتور ہی نہیں ظہور بھی تھا۔ یہی معاصر بھارت میں مسلمانوں کے خلافت ہندو اکثریت کے روایتی تعصب کا وہ ریکارڈ ہے جسے مسلم کش فسادات کہتے ہیں اور یہی پاک بھارت تعلقات کا الاؤ ہے جو تین جنگوں کے ہولناک مراحل اور مناظر کا حاصل تجربہ ہے۔ یہاں تک کہ اپنی نئی نسلوں کو مسلم دشمنی کی تعلیم دی گئی۔ پہلے تو انگریزی دور کے بعد کانگرس دور حکومت کے تاریخی نصابوں اور کتابوں کا تذکرہ تھا مگر اس پر بھی بس ہو جاتی تو معاملہ تعصب پر مبنی مسخ شدہ تاریخ نویسی یا مسلم دشمن تاریخ نویسی کا رجحان موضوع زیر بحث رہتا۔ حالت اور نوبت بابت بااین جارسد کہ اب تو تاریخ ہند کو ہندو کرنے کا عزم و اعلان ہی نہیں اہتمام ہو گیا ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دھلی میں، آل انڈیا سٹوڈنٹس کونسل (اکھل بھارتی ودیارتھی پریشد کے) زیر اہتمام ۲ نومبر ۱۹۹۹ء میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں متعدد شرکاء نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ (Medieval India) کی تاریخ دوبارہ لکھنے پر زور دیا اور صاف الفاظ میں

اس کی وجہ یہ بیان کی کہ اس موضوع پر جو کتابیں عام طور پر ملتی ہیں ان میں صرف مسلم حکمرانوں کے کارنامے اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کتابوں میں نہ تو ہندو راجاؤں کے کارنامے سامنے آتے ہیں اور نہ قدیم ہندو کلچر کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے آنجہانی نائب صدر مسٹر کرشن لعل شرمانے تو یہاں تک کہا۔

''ہندوستان کی تاریخ پڑھتے وقت لگتا ہے کہ ہم کسی ملک کی نہیں مسلم قوم کی تاریخ پڑھ رہے ہیں۔ اس ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف اور صرف مسلمانوں نے کوششیں کی۔ ہندوؤں کا کردار ''درباری'' کی حیثیت سے نظر آتا ہے''۔(۵۰)

یہاں تک کہ دہلی کانسٹی ٹیوشنل کلب میں ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے، پروفیسر بلراج مدھوک نے کہا تھا کہ

''ہندوستان کی تاریخ کو مسلمان بادشاہوں نے موت کا خوف دِلا کر مورخین سے لکھوایا اور ہندو دشمنی کے جذبے کی وجہ سے سخت ہدایات کے تحت مورخین کو مجبور کیا گیا۔ ہندو راجاؤں اور بھگتوں کا ذکر تو کر دیا مگر سرسری ذکر ہوا۔ لہٰذا آج جب ہمارے بچے ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہندوؤں میں کوئی شاہجہان پیدا نہیں ہوا جس نے عمارتیں بنوائی ہوں تو سر شرم سے جھک جاتا ہے۔''(۵۱)

مسلم ہندوستان کو ہندو تاریخ کا تعصب جس مقام تک لے آیا اس میں مسلم دشمنی انگریز مورخین کے ساتھ ہندو مورخین کی نمایاں تعداد بھی پورے مسلم عہد کو بحیثیت مجموعی ہندو تہذیب کے دشمن، ہندو مندروں کو ڈھانے والے، جبر اور جذبہ کے ساتھ جہاد سے ہندوؤں کو مسلمان کرنے والے یہاں تک کہ عیاش اور تماش بین تک لکھ کر تعصب و عناد کی بھڑکی آگ تاحال ٹھنڈی نہیں ہوئی اور اب کانگرس کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے پارٹی کے سابق صدر اور تب الہٰ آباد اور اب بنارس (حالیہ رکن لوسبھا بنارس) سے لوک سبھا کے سابق وزیر انسانی وسائل، فزکس کے ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کے زیر اہتمام تعلیمی نصاب اور خاص طور پر ہندوستانی تاریخ کو ہندو کرنے کیلئے صوبوں کی وزارتوں تک کو دوبارہ نصاب اور دوبارہ تاریخ نویسی کے سرکاری اور مرکزی اہتمام پر لا کھڑا کیا گیا، جہاں پر بی جے پی کے مخالف تمام وزراء تعلیم نے بائیکاٹ اور احتجاج کیا تھا۔

بھارت کے پاکستان کے ساتھ خارجہ تعلقات کی بنیاد یہی عناد ہے جو مسلمانوں کی ایک ہزار سال کی برعظیم پر حکمرانی کا ہندو تعصب ہے۔ حالانکہ تاریخ نویسی کے ہندو مورخین میں بعض انصاف پسند مصنفین کی ایک موثر تعداد بھی ہے جو مسلمانوں کی مسخ شدہ تاریخ کے غیر مستند ہونے پر خود شاکی اور صحیح اور غیر متعصبانہ تاریخ نویسی

کے حامل ہیں، بلکہ انہوں نے مغلوں اور سلاطین دھلی دونوں کے بارے میں پھیلائی ہوئی وصفی اور من گھڑت تاریخ کا خود پردہ چاک کیا۔ اِن میں ڈاکٹر بی این پانڈے، پروفیسر ایشوری پرشاد، ڈاکٹر تارا چند کمار باسوا ور پنڈت سندر لال کے علاوہ کرم پرشاد دکھوسلہ، آر بی بیج ناتھ، اے این اگروال، دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر سنگھ سین اور ڈاکٹر رومیلا تھاپر جیسے معتدل اور معقول تاریخ دان خود مسلم دشمن ہندو رویے کے ناقدین میں سے ہیں اور بھارت میں مسلم دشمن تاریخ نویسی کے اہتمام کے یکسر مخالفین میں سے ہیں۔ یہی اختتامیہ بھارت کی تاریخ نویسی کی مسلم دشمن تاریخ کا ایک عصری عکس ہے۔ یہاں تک کہ اکسویں صدی میں بھی برعظیم کی تاریخ کو ہندو آنے (Indinise کرنے) کے سلسلے میں اس کی تازہ ترین مثال ایک Towards Freedom نامی کتاب کی دو جلدیں ہیں جنہیں آکسفورڈ پریس بھجوایا گیا ہے۔ اس میں برعظیم جنوبی ایشیاء میں مسلم دور حکومت کے کم وبیش ایک ہزار برس کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر مسخ کرنے اور نئی تاریخ لکھنے کا اہتمام ہے بلکہ اب تو کانگرس کی جگہ آر آر ایس بھی شریکِ حصول آزادی قرار پائے گی اور یہی بی جے پی حکومت کے سرکاری اقدامات کا ہدف رہا ہے۔ مہارشٹرا کے معروف شہر ناگپور سے ہندی زبان کے اخبار لوک مت ٹائمز ۱۷مارچ ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں اس امر کا اظہار بھی سامنے آیا ہے۔ یادر ہے کہ راشٹر سوئم سیوک سنگ (آر آر ایس) کا مرکزی دفتر بھی ناگپور ہی میں ہے جہاں پر بھارت بھر میں اس کی شاکھاؤں (برانچیں) کے سرچالک (پرچارک) سالانہ اجتماع کرتے ہیں اور ملک بھر سے نظریاتی تعلیمی اور سیاسی حکمت عملی پر اپنی ہمنوا اور ذیلی تنظیموں (Sister Organization) کے ذریعے ان پالیسیوں پر عمل درآمد کا جائزہ لیتی ہے جس میں طلبہ، مزدور، کسان، اساتذہ، صحافی اور کاروباری حلقوں کے سنگ پریوار یہاں تک کہ مذہبی مٹھوں (مراکز) کے شنکر اچاریہ اور ہندو احیاء کی تنظمیں اور سنگھٹن کے امور وا حوال بھی زیر بحث آتے ہیں۔ اس لئے حتمی طور پر یہ بات کہنا بے حد مشکل ہے کہ ہندوستان کی مسلم تاریخ تعصب سے یکسر خالی ہے۔ اس ضمن میں انگریزوں نے قابل غور کام کیا لیکن ان کی بیان کردہ تاریخ میں اپنے سیاسی مفادات کا لحاظ رکھا اور تاریخ اور سیاست دونوں کو اپنے حق میں ہموار رکھنے کا قلمی اور علمی بند باندھا۔ اسی تاریخی عناد نے مسلمانوں کے دور حکومت کے خلافت ہندو مورخین کا ایک موثر گروہ تشکیل دیا جس نے انگریز دور حکومت میں مسلمان حکمران کو اپنی تنقید کی دھیمی آنچ پر لاڈالا اور پھر نفرت و عدات کے شعلوں میں پوری مسلم قوم کی چتا تیار کر دی گئی۔ بھارت کے دھیمی لہجوں اور سفارت کاری کے، کے ایم پانیکر بھی مسلم دور حکومت کے ایک ہزار سال کو ہندو سماج کا تعصب بتائیں تو قلمی چابکدستی کے سر جادوناتھ سرکار سے لیکر ارون شوری تک جیسے قلمکار تو اب مسلمانوں ہی کیا خود اسلام تک کو زیر عتاب لائے دیتے ہیں اور شریعت مآب مسلمان حکمرانوں میں غوریؒ اور غزنویؒ کے تاراج کو پورا مسلم عہد بتانے کے بعد پھر اورنگ زیب، محمد تغلق اور اب تو سلطان ٹیپوؒ تک کی شخصیت ہندو دشمنی کا مذہبی سمبل بنائی گئی ہے۔ آزاد

بھارت کے نصاب میں مسلم عہد کے بعض مثبت اثرات کو کُھر چنے کے بعد اب اپنی تاریخ بنانے نہیں بتانے کیلئے بھارت کی سرکاری سیاسی اور قلمی کاوش نئے سرے سے اپنی تاریخ لکھے گی جس میں مسلمانوں کی گیارہ صدیاں خارج نہیں تو فارغ کرنا پڑیں گی۔ جس میں ہندو دشمنی کا مسلم الاؤ اور آگ بھڑکائی جائے گی۔ یہی رویہ اور ذہنیت ہے جس نے ہندو قوم کو مسلمان، پاکستان بلکہ اسلام تک کے تعصب کا توشہ تاریخ بنا دیا ہے۔ بنگلہ دیش کی تشکیل ۱۹۷۱ء کے بعد بھارتی پارلیمان کے ایوان زیریں لوک سبھا میں تب وزیر اعظم اندرا گاندھی نے یونہی نہیں کہا تھا کہ

"آج ہم نے اپنی ایک ہزار سالہ تاریخ کا انتقام لے لیا ہے۔" (۵۲)

اور یہی مسلم ہندوستان میں ہندو تاریخ کا دورانیہ ہے جہاں ہندو بھارت کا تب ہندوستان دم بخود کھڑا ہے۔ بلکہ ہاتھ جوڑے مسلم حکمرانوں کو مہاراج اور نمسکار کہہ رہا ہے۔ آج پھر پورے جنوبی ایشیا میں بھارت اپنے توازن ہیبت (Balance of Terror) کی ڈھاک بٹھانے میں مصروف ہے جس کی سدِ جارحیت (Detrent) کا دوسرا نام مسلم پاکستان ہے۔

اس پاکستان کو اپنے قیام کے ساتھ ہی اثاثوں کی تقسیم میں حصہ دینے سے انکار، اسکے جغرافیائی وجود کو ریڈکلف ایوارڈ کے ذریعے کاٹ کر دریاؤں کے منبع کشمیر اور فیروز پور ہیڈورکس پر قبضہ، پھر ۱۹۴۸ء ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں جنگوں کے ذریعے کمزور اور دولخت کرنے کے اقدامات پھر ۱۹۷۴ء میں پہلا اور ۱۹۹۱ء میں دوسرا ایٹمی دھماکہ (پوکھران) کے بعد اب پاکستان کے شمالی مغربی قبائلی علاقے اور سوات کے علاوہ صوبہ بلوچستان میں افغانستان کے ذریعے پاکستان میں دہشت گردی کی مسلح اور منظم مہم، اس سارے منظر اور ماحول میں بھارت ہی کے ڈھکے چھپے ہاتھ ہیں اور ساتھ ہے۔ اسے تاریخ اور تلمیح کی زبان میں

بغل میں چھری، منہ میں رام رام

کہتے ہیں۔ اسکا عملی تجربہ مسلمان کو بارہ سو برس سے ہے۔ وہ اس خطے میں حاکم، محکوم اور مجبور و مقہور کے طور پر ہندو ذہنیت کو بھگت چکے ہیں، بھگت رہے ہیں۔

حوالہ جات

باب (اول)

1۔ عبداللہ شملوی، روزنامہ نوائے وقت لاہور، 30 نومبر 1976 صفحہ 6

2۔ انظر شاہ مسعودی، نقش دوام (سوانح مولانا شاہ کشمیریؒ) مکتبہ بنوری کراچی 1997 صفحہ 243

3۔ حضرت علامہ اقبالؒ کا خطبہ آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ الہ آباد 29 دسمبر 1930 (ترجمہ سید نذیر نیازی)

4۔ ایضاً

5۔ سورہ البروج پارہ 30 آیت 16 ترجمانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ "تفہیم القرآن جلد ششم، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، 1996، صفحہ 300

6۔ مولانا انظر شاہ مسعودی، نقش دوام، حوالہ مذکور، صفحہ 218

7۔ چوہدری غلام جیلانی، مولانا ابوالکلام آزادؒ کے تاریخی انکشافات، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور، اگست 1990، صفحہ 189

8- K.m. Panikkar, *Common sense about India*, London, Victor Gallancy, 1960, P. 8

9- Ibid.

10- Ibid.

11- Ibid.

12- Ibid. P.10.

13- Ibid. P.8.

14- Ibid.

15۔ آغا شورش کاشمیری، بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل (سوانح وافکار)، لاہور، ادارہ مطبوعات چٹان، 1972، صفحات 373-374

16- K.M. Panikkar Op. Cit, P.10.

17۔ آغا شورش کاشمیری، بوئے گلہ نالہ دل دو چراغ محفل، حوالہ مذکور صفحہ 375

18- K.M. Panikkar, Op. Cit, P. 19.

19- Nirad. C. Chaudhari, The Illustrate Weekly of India, Bomboy, May13, 1990.

20- Sir Heavy Henry Eliat, *History of India as t old by its own Historian*, London (Introduction).

21- Baxter, Kenndy & Obert, *Government and Politics in S o u t h Asia*, Lahore, Vanguard.

22۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام، رود کوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1988، صفحہ 467

23۔ ایضاً

24۔ مولانا سید حسین احمد مدنی "نقش حیات (جلد دوم) کراچی، بیت التوحید،1953ء صفحہ 657

25۔ دیوان سنگھ مفتون' نا قابل فراموش' لاہور مکتبہ شعر و ادب، 1957 صفحہ 353

26۔ بابو سندر لال' بھارت میں انگریزی راج' استقلال' دیوبند 4 مارچ 1936

27۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی' آئینہ حقیقت نما (حصہ اول) کراچی' نفیس اکیڈمی' 1958 صفحہ 38

28۔ ایضاً صفحہ 264

29۔ آغا شورش کشمیری، بوئے گل، حوالہ مذکور، صفحہ 387

30- Satyapal, Probodh Chandra, *Sixty years of Congress*, Meerut, The Lion Press Lahore, 1946.P.32.

31- Ibid. P.33.

32- Ibid. P.35.

33- Ibid. P.36.

34- Ibid. P.39.

35۔ آغا شورش کاشمیری' ابوالکلام آزاد" 'لاہور ادارہ مطبوعات چٹان' 1988 ' صفحہ 65

36۔ مالک رام' خطبات آزاد" 'لاہور' اسلامک پبلشنگ ہاؤس' 1974 'صفحہ 340

37۔ آغا شورش کاشمیری' ابوالکلام آزاد" ' حوالہ صفحہ 259

38۔ ایضاً صفحہ 257

39- Sharma, Amirk Kumar, *The Public of Asia*, New Delhi, January (16-31)1990.

40- Mukarjee, Amitive, *The Radiance*, New Delhi, March (4-10)990.

41- Satyapal, Prabodh Chandra, Op. Cit., P.42

42۔ آغا شورش کاشمیری' ابوالکلام آزادؒ ' حوالہ مذکور' صفحہ 65

43۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام' رودکوثر' لاہور' ادارہ ثقافت اسلامیہ' 1988 ' صفحہ 467

44- Satyapal, Prapodh Chandra, Op. Cit., P.47

45- Palmer, Norman, *Indian Political System*, New York, 961.P.26.

46۔ سہ روزہ دعوت' نیو دہلی 19 اپریل 2000ء

47۔ ایضاً 22 مئی 1999ء

48- *The Muslim India*, New Delhi, December, 1983.

49- *The Hindustan Times*, New Delhi, February 26,1986.

50۔ سہ روزہ دعوت' نیو دہلی 28 نومبر 1999ء

51۔ ایضاً

52۔ ماہنامہ میثاق، لاہور، اکتوبر 2000ء صفحہ 13

باب دوم

تاریخ و تحریکِ پاکستان

ابتدائیہ

برعظیم جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی آمدِ ہند یا حملہ سندھ کے جو بھی اسباب، واقعات اور نتائج رہے ہوں اس کے ثمرات و اثرات کے اعتبار سے اس خطے میں مسلمانوں کا قیام اور پھر یہاں سلطنت دہلی کے سلطان (۷۱۲ء۔۱۵۲۶ء) اور مغل حکمران (۱۵۲۶ء۔۱۸۵۷ء) اپنے انتظامی اور سیاسی اقدامات، تہذیبی ورثے اور ترکے کے ساتھ اپنے عہد میں معاصر مورخین، بعض مغل بادشاہوں کی خودنوشت تزک ہائے بابری و جہانگیری نیز اکثر درباری مورخین کے قلمی اہتمام سے تاریخ نویسی کا ایک کتابی ذخیرہ میسر ہے۔ چونکہ یہ کتب روایتی انداز تحریر کی حامل ہیں جہاں بیانیہ (Narrative) تحریر کا انداز ہے، تجزیاتی (Analytical) طرز تحریر نہیں ہے جو جدید تاریخ نویسی کے علمی بنیادوں (سائنٹفک انداز) کے استدلالی طرز کا ذخیرہ کتب و تحریر ہے مگر برعظیم کے ہر دو مسلم دورِ حکمرانی کے بارے میں انگریز مورخین اور ہندو دانوں اور تاریخ دانوں کے قلمی معرکوں اور قومی جدل کا یہ طبل جنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برعظیم میں مسلمانوں کے دور حکمرانی (Rule) کے بارے میں انگریز اور ہندو مورخین کا عناد ایک طرح سے مسلمانوں پر نقد و جرح کی حد تک بھی مسیحی صلیب اور ہندو ترشول کی سولیوں پر لٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر دو قوموں کے مورخین سے مسلمانوں کی آمدِ ہند اور حملۂ سندھ سے لیکر مغلوں کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے سانحہ قید و وصال تک بھی مسیحی یورپ کی روایتی مسلم دشمنی اور ہندو مورخین کا سیاسی اور نسلی عناد، مسلمانوں کو بیرونی لٹیرے، مال و زر کے حریص، خون آشام اور خبیث ہی نہیں راکھشش اور پلید کی حد تک تو رگیدا گیا ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے تاراج کا ماحول ان کا پورا عہد بتایا گیا اور ان کا عہدِ حکومت مقامی رعایا یعنی ہندوؤں پر جزیہ و جبر یا پھر جہاد کے معرکے گویا یہاں مسلمانوں کی تاریخ ہے اور جزیہ و جبر بلکہ جہاد جس کا تاریخی نام یہ باور کرایا گیا ہے کہ

بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

تاریخ کے تحریری مواد اور موازنہ سے مسلم ہندوستان (۷۱۲ء۔۱۸۵۷ء) کے کم و پیش ایک ہزار سال ہندو، انگریز نقطہ نظر کی تشریح و تصویریں ہیں جبکہ حقیقت نگاری کا امر واقعہ یہ بتاتا ہے کہ برعظیم کی ملت اسلامیہ کو حکومتی زوال کیا آیا برطانوی استعمار نے مسلمانوں کو بطور حریف اور ہندوؤں کو بطور حلیف چن کر ہندوستان میں اپنی حکومت کو استحکام اور دوام دینے کی منظم کوششیں کیں۔ یہاں تک کہ نہ صرف مسلمانوں کو ملازمتوں سے یکسر باہر کر کے، فارسی زبان کو غیر سرکاری قرار دے کے مسلم مقتدر حلقوں کو دو وقت کی روٹی تک کا محتاج کر دیا۔ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کو معاشی، سماجی اور تعلیمی طور پر پس ماندہ رکھنے اور سیاسی طور پر بے دست و پا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ علاوہ ازیں انتظامی سطح پر ہندو، مسلم، مغائرت (Confrontation) کو ہوا دیکر ہندو قوم کی مسلم دشمنی کے الاؤ کو تیز کیا۔ اور تو اور انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل ۱۸۸۵ء بھی ایک انگریز کے حسنِ دماغ کا شاخسانہ ہے۔ جس میں برطانوی طرز حکومت اور جمہوری اصولوں کے تحت اکثریت کی بنا پر

ہندوستان پر ہمیشہ کیلئے ہندو اکثریت کا راج ایک ملک و منزل اور ایک مستقبل کی صورت اور مورت لیے ہندو قوم کا عزم اور اعلان ہو گیا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر سے جنوبی افریقہ سے برطانوی اکرام و انعام کی تصویر اور تب قیصر ہند اور اب ننگے فقیر موہن داس کرم چند گاندھی کو وہاں سے بلوایا گیا جو جنگ عظیم اول میں برطانیہ سے مستقل طور پر اقتدار لے کر اس پر متمکن ہوتا نظر آتا تھا۔ ادھر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بھی علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل مسلم قیادت، جدید تعلیم اور سیاسی بصیرت کے باعث، برعظیم کی بساط سیاست پر مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا حسرت موہانیؒ کی صورت ماحول ہی نہیں خود کانگرس تک پر پھر سے چھانے لگی تھی۔ ہندو انگریز منصوبے میں مسلمانوں کا برعظیم میں پھر سے عروج ان کیلئے خروج سے کم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کانگرس کے اولین انگریز صدور کے بعد جب ہندوستانی بلکہ ہندو صدرِ کانگرس بنے تو کیا معقول (Moderate) اور کیا مشتعل (Extrimists) تمام ہندو رہنما اس امر کی پوری دُہائی دیتے نظر آتے ہیں کہ کہیں پھر سے مسلمان بیدار نہ ہو جائیں اور ہندوستان کا اقتدار نہ لے جائیں۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ٹھیک چالیس برس بعد امراوتی میں اپنے صدارتی خطبہ میں کانگرس ۱۸۹۷ء کا پہلا مقامی اور ہندو صدر شنکر رام کا کہنا یہ تھا:

"We were always aware that with the decline of British Supermacey, we shall have anarachy, war and reprieve. The Mohammadans will try to cover their lost supermacy. The Hindu races and Chiefs will fight among the Moulvies. The only condition of our political survival is the continance of the British Raj."(۱)

اس سے اگلے برس ۱۸۹۸ء میں مدراس میں سالانہ کانگرس کے صدارتی خطبے میں انند موہن بوس کے ادھورے خوابوں کا روشن مستقبل اس بات سے وابستہ اور پیوستہ ہے کہ

"All our lightest hopes for the future and indissolubily bound up with the continuance of British Rule."(۲)

اس تسلسل کی اگلی کڑی کانگرس میں معتدل کی بجائے مشتعل (Extrimist) گروہ دَر آیا مگر یہ دیسی ذہنیت کا روایتی ہندو سفر ہے۔ اب سن ۱۹۰۰ء شروع ہے۔ کانگرس کیا تھی دراصل انگریز نے بنوائی ہی نہیں خود بنائی اور خود چلا کر دکھائی۔ پھر ہندو زعماء کی تربیت کر کے ان کی پذیرائی اور رہنمائی بھی کی۔ تب نیشنلسٹ آغا شورش کاشمیری نے کانگرس کا ایک خوبصورت مگر مغوی تعارف کرایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''انڈین نیشنل کانگرس، ہندوستان کی یورپی ذہانت اور سیاسی فطانت کا سب سے بڑا ادارہ تھی۔''(۳)

ایک قدم آگے کا کانگرسی کیا تھا؟ وہ ذیل کے رہنماؤں کا مطالبہ اور مقصد ٹھہرا کہ

"The extrimists Lala Lajpat Rai of Punjab Bal Gangadhar Tilik of Maharshtra and Bipin Chandra Pal of Bengal (Known as the famous Lal, Bale and Pal) contended that good Government is no substitute for self Government."(۴)

کہ ہندو اکثریت کے راج کا یہی خواب تھا مگر تقسیم بنگال ۱۹۰۵ء وہ شعلہ جوالہ ہے جہاں انڈین نیشنل کانگرس سے ہندو کانگرس اپنے پٹ کھولتی ہے۔ یہیں سے ہندو، ہندی، ہندوستان کا قومی شعور نمایاں ہوا۔ مسلم دشمنی اب کانگرس کے باطن سے ظاہر کے چہرے پر چیچک کی طرح چپک گئی۔ خود گاندھی جی نے ۱۹۰۸ء میں لکھا کہ

"The real awakening of India(Hindu) took of the partition of Bengal." (۵)

بنگال کی تقسیم تو رہی دور کی بات، جب انگریزی تعلیم کا چلن یونیورسٹی کے قیام تک آ پہنچا تو کلکتہ میں مسلمانوں کو پڑھانے کی گنجائش ہی نہ تھی اور جب ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی بنی تو ڈاکٹر محمود حسین کے بقول:

> ''جب ۱۹۲۱ میں ڈھاکہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو ہندو اسے مکہ یونیورسٹی کہتے تھے حالانکہ اس میں قیام پاکستان تک مشکل سے ۱۰ فیصد مسلمان اساتذہ تھے اور یہ بھی اس لئے کہ عربی، فارسی اور اردو وغیرہ کیلئے ہندو استاذ نہیں مل سکتے تھے۔'' (۶)

برعظیم ۳۰-۱۹۲۰ء کے سیاسی عشرے میں تحریک خلافت اور علی گڑھ یونیورسٹی کی پیدا کردہ نئی مسلم قیادت مولانا حسرت موہانی ؒ، مولانا محمد علی جوہر ؒ نے جب سیاست کے جوہر دکھانا شروع کیے تو گاندھی جس نے جناح کی زیر صدارت بمبئی میں اپنا تعارفی جلسہ کرایا تھا اور جنہیں پہلے ہندوستان میں کوئی جانتا تک نہ تھا مولانا محمد علی جوہر ؒ کے مرشد اور مولانا حسرت موہانی ؒ کے مرشد زادے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محل کی صحبت خاص میں جا گھسے۔ بس وہیں سے تحریک خلافت میں گاندھی کا مذہبی شخصیت کا روپ ہندو بلکہ مسلمان عوام کیلئے سروپ بننا شروع ہو گیا۔

اب ''فتویٰ مولانا عبدالباری فرنگی محل اور حکم مہاتما گاندھی کا''

کے اشتہار تحریک خلافت کا روز بازار ہو گئے مگر ۱۹۲۴ء میں تحریک خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا یہ وقتی اہتمام بھی دم توڑ گیا بلکہ اس کی کوکھ سے شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکوں نے ہندو عوام کو تشدد اور تحریص کے ذریعے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی ترغیب پر لاڈالا اور شدھی تحریک کے بانی سوامی شردھانند جن سے دو سال پہلے تحریک خلافت کے جلسہ میں دہلی کی جامع مسجد کے مکبر (اذان کے چبوترے) پر کھڑا کر کے تقریر کرائی گئی اس نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کا اہتمام کیا۔ اسے جب ایک مسلمان نے قتل کر دیا تو ہندو مسلم اتحاد کے جلوے دیکھنے والے شہر ہندو مسلم عناد نہیں فساد کے لہو سے گلگوں ہو گئے۔

انڈین نیشنل کانگریس ہندو مسلم بلوے کہتی رہی ہے۔

چھوٹے موٹے ہندو تو کیا خود گاندھی نے مسلمانوں پر طعن و تشنیع سے بڑھ کر اسلام تک کو اپنی اہنسا کی سان پر کس لیا۔ یہاں تک کہ وہ بول اٹھے کہ

''اسلام تلوار کا مذہب ہے یہ تشدد کا مذہب ہے''(۷)

بلکہ ۱۹۲۹ء تک گاندھی بھی اس سطح پر اتر آئے کہ وہ کامل آزادی کے نام پر ہندو اکثریت کے ہندوستان پر بلا شرکت غیرے کانگرس راج اور آریہ سماج کے قیام پر مسلمانوں کو للکارنے لگے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:

''میں آزادی کی جنگ لڑوں گا۔ تم ساتھ آؤ تو تمہیں ساتھ لے کر تم نہ آؤ تو تمہارے بغیر اور تم مزاحمت کرو تو تمہاری مزاحمت کے باجود۔ ان کے الفاظ تھے۔

"With and without you or despite of you."(۸)

مولانا محمد علی جوہرؒ سے ٹکرانے کے بعد ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس لندن میں گاندھی کی عدم شرکت جوہرؒ سے الجھاؤ تھا۔ وہ ۱۹۳۰ء میں کانفرنس کے دوران جب انتقال کر گئے تو اس کانفرنس میں ایک دن پہلے کا بیان ان کی وصیت بن گئی۔ انہوں نے فرمایا

''کہ میں ایک غلام ملک نہیں جاؤں گا۔ یا آزادی کا پروانہ مجھے دینا ہوگا یا پھر مجھے آزاد ملک میں دفن کرنا ہوگا۔ ان کے انتقال پر انہیں بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔''(۹)

اب مسلمانوں کی قیادت نہ رہی، نہ کوئی تنظیم۔ تحریک خلافت میں مسلمانوں کی مذہبی شخصیات اور سماجی حیثیت کے ممتاز متحرک کارکنوں کو گاندھی نے بڑے کمال فن سے کانگرس میں نہ صرف شامل کیا بلکہ کانگرس کے سالانہ اجلاس لاہور ۱۹۲۹ء میں مسلمانوں کی بعض مذہبی شخصیتوں پر مشتمل مجلس احرار اسلام کی تنظیم بھی قائم کرائی گئی جس کے محرک و مجوز مولانا ابو الکلام آزادؒ تھے۔ تحریک خلافت میں عمومی سطح کے مذہبی رہنماؤں کی یہ سیاسی کھیپ اور خدائی خدمتگار کا سرحدی تحفہ گاندھی جی کو خلافت کی تحریک میں ملا۔ جو نمایاں افراد کو جاننے اور پالینے کی صورت میں بدیہی بات ہے۔ اصل میں مسلمانوں کی تحریک خلافت سے مایوس کیفیت میں ان کے باقی ماندہ اور بچے کھچے سیاسی، معاشی اور بعض مذہبی قائدین کو کانگرس میں انفرادی طور پر شامل تنظیم کرنے کا شہکار ہے۔ پھر گاندھی ۱۹۳۲ء۔۱۹۳۳ء کی دوسری سربراہ گول میز کانفرنس میں لندن بخوشی شریک ہوئے تو انہیں برعظیم کے واحد ترجمان ہونے کا احساس گھر کر گیا کیونکہ وہ یہاں تک تو آن پہنچے تھے۔

اب مسلمان قوم یا اس کے مستقبل پر کوئی بات کہاں رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء ہی میں نہرو رپورٹ نے لکھنو پیکٹ ۱۹۱۶ء کے طے شدہ مسلم قوم اور قومیت اور اس کے سیاسی مطالبات و معاملات پر صاد کو بھی یکسر مسترد کر دیا۔ اب گاندھی انڈین نیشنل کانگرس اور اس کے بعض مسلمان مذہبی چہرے بلکہ پھر سے ہندوستان کے واحد وارث اور واحد قوم (بلکہ متحدہ

قومیت) کے اکلوتے ترجمان بن گئے۔ مسلمان مذہبی شدھی سے تو بچ نکلا مگر سیاسی شدھی کی متحدہ قومیت کے بعض مذہبی رہنماؤں نے آ لیا۔ اس دام ہمرنگ زمین سے برعظیم کی ملت اسلامیہ کو فی الواقعہ اور فی الحقیقت سرکار مدینہ کے دو فقیروں صرف اقبالؒ و جناحؒ نے بچالیا اور ہندو سے الگ ایک مسلم قوم اور ہندوستان سے الگ ایک مسلم اکثریت کا ملک پاکستان لیکر دیا جو دو قومی نظریہ کا عصری اجتہاد بھی ہے اور مملکت مدینہ کے بعد دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک قدیم اصول کی عصری بازیافت بھی ہے۔

پھر تاریخ کے جھروکے میں سچ تو یہ ہے کہ فی الاصل اسلام نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی دائمی غلامی سے بچالیا اور انہیں آزادی کے حقیقی ثمر سے بار آور کروایا وگرنہ ہندو کانگرس پوری ملت اسلامیہ ہند کو اپنے دام ہمرنگ زمین کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں کے نظریہ متحدہ قومیت میں لے اڑی تھی۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے جناحؒ کا اصطفیٰ (Selection) کر کے ملت اسلامیہ کی نظری اور نظریاتی قیادت کا وہ معرکہ مارا ہے کہ بیسویں صدی میں عالم اسلام کا یہ بلال مشرقؒ مفکر پاکستان بھی کہلاتا ہے جس نے واضح طور پر کہا ہے۔

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی ﷺ

(اقبال)

حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء ہندوستان کے اندر ایک مسلم مملکت کے قیام کی نوید تھی۔ وہیں لندن کی دوسری گول میز کانفرنس میں محمد علی جناح کو واپس ہندوستان آ کر مسلمانوں کی قیادت پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ اپنی عمرِ مستعار کے بقیہ آٹھ برس اقبالؒ برعظیم کی ملت اسلامیہ کے مستقبل کیلئے عملاً پنجاب مسلم لیگ کے چھ برس تک براہ راست صدر رہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کے مجوز بھی اور محرک بھی حضرت علامہ محمد اقبالؒ تھے۔ تاریخ کی زبان میں تجزیاتی بات کریں تو صاف کہنا پڑے گا، کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور ٹھیک ۱۰ برس قبل خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء کی آئینی منزل کا دوسرا نام ہے جسکا صلہ اور انعام پاکستان ہے۔ یہی سبب ہے اس قرارداد کی منظوری کے دوسرے دن حضرت قائداعظمؒ نے فرمایا کہ ''آج اقبالؒ زندہ نہیں ورنہ وہ بہت خوش ہوتے کہ آخر ہم نے وہی کر دکھایا ہے جو وہ چاہتے تھے۔''

متحدہ قومیت ـــــ ایک دامِ ہمرنگِ زمین

برعظیم جنوبی ایشیاء میں مسلمان کم وبیش ایک ہزار برس تک حکمران رہے۔ اس پورے عرصے میں ہندوؤں نے عملاً دو قومی نظریہ پر کار بند رہ کر اپنے تاریخی شعور کو قائم رکھا۔ اِدھر حکمران کیا، مغل بادشاہ کیا، دہلی کے سلاطین تمام کے تمام تو ہندو سازشوں بلکہ بغاوتوں تک سے نبرد آزما رہے۔ مگر یہ کیا ملّی سانحہ ہے؟ مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسا عبقری اور نابغہ مسلمان ہندو

کانگرس کا ہمنوا ہو کر متحدہ قومیت کی تشریح و تفسیر ہی نہیں مکمل تصویر بن گیا۔ اسے محض قیام پاکستان کی تحریک یا مسلم لیگ سے سیاسی اختلاف کہہ کہ گزرنا اصلاً حد درجہ ملت گریز رجحان کا حامل ہوگا۔ بارہ صدیوں بعد اس برعظیم جنوبی ایشیا کی ملت اسلامیہ کے مستقبل پر اس کے مستقل اور آزاد وجود پر مولانا آزادؒ اپنے اظہار و ابلاغ بلکہ ''الہلال'' سے لیکر ''حزب اللہ'' کی جماعت تک جس فکرِ مایوس اور رُخِ معکوس کا توشہ تاریخ ہیں، اس پر تاریخ خود دم بخود ہے۔ ان کے علمی ادبی اور فکری شعار اور بعد ازاں آخری عمر کے متحدہ قومیت کے اصرار میں جو بُعد کیا بلکہ رجعت اور پسپائی ہے وہ بذات خود ایک المیہ ہے۔ برعظیم میں اسلام کے ممتاز مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک بار ٹھنڈی آہ کے بعد اس سوال کا جواب اپنی نجی محفل میں دیا کہ ''مولانا آزاد ۱۹۲۰ء کے بعد کن وادیوں میں گم ہو گئے، کہاں یہ عالم اسلام کے اتحاد اور اسلام کے نفاذ اور ترجمان القرآن کا ابوالکلامؒ اور کہاں انڈین نیشنل کانگرس کا ترجمان ابوالکلام۔ تاہم انہوں نے شرعی زبان میں شرعی تفہیم سے بتایا کہ اس سلسلے میں ''مولانا ابوالکلام آزاد کا معاملہ اس موذن کا سا ہے جو نماز کیلئے اذان دیکر خود سو گیا''۔ لیکن یہ تو ان کے مذہبی مزاج کا استدراک تھا کہ وہ اپنے فکر و عمل کی کس منزل پر جا کر رک گئے۔ اپنے لئے امام الہند کے منصب کی عدم پذیرائی پر کہ اپنے لئے بیعت حاصل کرنے میں ممکنہ اور مجوزہ مہم کی رسوائی پر۔ مگر یہاں شخصی ملّی سانحہ یہ ہے کہ

ابوالکلام آزادؒ خود تو نام اور تخلص کے آزاد مگر مسلم قوم انگریزوں کے بعد ہندوؤں کی مستقل غلام ٹھہرے، کیوں؟ لیکن اصل سانحہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ خود بھی ہندو ذہنیت کا شکار ہیں اس وجہ سے کہ وہ خود بھی ایک طرح سے نہیں کئی زاویوں سے فی الحقیقت

اولاً: نسلی، عقلی اور شکلی طور پر مسلمانوں کی مذہبی اتھارٹی ہیں۔

ثانیاً: ان مقتدر حکمرانوں کے معنوی اور تہذیبی وارث کے طور بھی ہندو ودانوں اور سیاستدانوں کے بیک وقت ہمنوا اور پھر معتوب کیوں ہیں؟ یہ وہ المیہ ہے جس پر برعظیم میں مسلمانوں کی سرگذشت اور اسلام کی پیش رفت کا موازنہ کیے بغیر متحدہ قومیت اور دو قومی نظریہ کی فکری، روحانی اور پھر عصری آویزش کا مطالعہ و تجزیہ لابدی اور ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ نیشنلسٹ رہنما خود مسلم اقتدار کی برعظیم میں گیارہ صدیوں کو رومانی تخیل کے ساتھ پیش کرتے نظر آتے ہیں یہاں تک کہ مغل اعظم کی پھبتی پر ان کے معتقد سوانح نگار کا جواب ان کی داخلی شخصیت کا جو عکس پیش کرتا ہے، اس میں بھی حکومت کے کاروبار اور دربار کے مزاج ہی کا پرتو نمایاں ہے۔ مولانا آزادؒ کے قلمی مرید آغا شورش کاشمیری کا کہنا یہ ہے کہ

> ''سبھاش چندر بوس نے مہاتما گاندھی سے لڑائی کے بعد جو گرما گرم بیان دیئے ان میں مولانا (آزاد) کو از راہ تعریض مغل اعظم کہا۔ مولانا مغل اعظم نہ تھے لیکن ان میں مغلوں کا شکوہ، عباسیوں کا طمطراق، اُمویوں کا تفکر اور علویوں کا فقر ضرور تھا، اور یہی عناصر اربعہ تھے جن سے ان کی نفاست

پسندی کا ہیولیٰ تیار ہوا تھا۔'' (۱۰)

یہاں تک کہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ان کا مسلمانان دہلی سے جامع مسجد میں خطاب میں یہ فرمانا کہ کبھی ہم دہلی میں جہاں پناہ تھے اور آج قبروں سے پناہ مانگ رہے ہیں یا یہ کہ اسی جمنا کے کنارے ہمارے بزرگوں کے قافلوں نے وضو کیا تھا جس کے ابتدائیہ کلمات میں ارشاد ہوا کہ

''تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دئے، میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرہ کی شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔'' (۱۱)

مزید فرمایا کہ

''سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کیلئے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کونسی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے یہ تمہارے اعمال کا پھل ہے۔'' (۱۲)

یہ خطاب مسلمانان دہلی کو بظاہر سہارا دینے کے اہتمام کا شہکار ہے جو بٹوارہ کے دوران ہندو قوم کی متحدہ قومیت کے ہاتھوں عزت و آبرو اور جان و مال کی تباہی کے سبب دہلی چھوڑنے پر مجبور اور بظاہر جامعہ مسجد کے علاقے پرانی دہلی میں محصور ہو چکے تھے۔ مولانا آزاد کو اپنا طے کردہ مقام اور اپنے آشیانے کی جگہ کا تو بلاشبہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا، وہ تو پاکستان میں عافیت کے خواہاں مسلمانوں کو روکنے اور ان کی ڈھارس بندھانے کیلئے یہ ولولہ انگیز خطاب فرما رہے تھے۔

مولانا آزادؒ دہلی کے مجروح و مضروب بلکہ مایوس مسلمانوں کو جامع مسجد میں جمع کر کے انہیں جو سہارا دینے کے درپے تھے اس کی داستان خود مولانا آزادؒ کی اپنی داستان کا معکوس و مایوس نقش بلکہ عکس ہے۔ کبھی دہلی میں جہاں پناہ کے یہ معنوی وارث پدرم سلطان بُود کے خُمار رفتہ میں یوں بہے کہ یہ دلگداز اور دلدوز تقریر نہیں بلکہ وہ تصویر تحریر بھی ساتھ ہے جو

مولانا ہی کی زیرِ صدارت ''کانگرس کے ساٹھ سال'' میں ایک سال قبل ہی (The Mohammadan Period) کے زیرِ عنوان ۱۹۴۶ء کے اہم اور فیصلہ کن سیاسی سال میں چھپ کر سامنے آئی تھی۔

تاہم برعظیم میں مسلمانوں کی مقتدر گیارہ صدیوں پر یہ تبصرہ و تاثرات مولانا آزادؒ کے جماعتی (Party) نظریات تو ضرور ہیں ذاتی (Personal) خیالات ہرگز نہیں کہ وہ خود مسلم ہندو مقتدر اور ثمر آفریں گیارہ صدیوں کو نمایاں کرتے ہیں کہ

> ''ہندوستان کی بارہ سو برس کی تہذیب پر مسلمانوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس کا معاشرہ اسلامی نقش ونگار کا مرہون ہے۔ ہندوستان کے آرٹ، ہندوستان کی موسیقی، ہندوستان کے ادب، ہندوستان کی تہذیب، ہندوستان کے تمدن، ہندوستان کی ثقافت، ہندوستان کے فنِ تعمیر اور ہندوستان کی زبان میں نصف سے زاید حصہ اسلامیات سے فیضیاب ہے۔ ان کے خزانے عربی، عجمی، ترکستانی اور ایرانی مسلمانوں کی بودوباند اور رنگ و آہنگ سے لدے پھندے ہیں۔ آج ہندوستان کے تہذیبی شہر مثلاً لکھنؤ اور دہلی کن محاسن کا مجموعہ ہیں؟ کیا مسلمانوں کی تہذیب اس کی روح رواں نہیں۔'' (۱۳)

مگر اس ذاتی موقف اور جماعتی نظریہ میں اس قدر اور کھلا تضاد کیوں ہے؟ وجہ اور سبب وہ زوال ہے جو مسلمانوں کی حکمرانی کو ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شکست سے لاحق ہوا اور پورے ایک سو سال دھیرے دھیرے گھن کی طرح چاٹتا ہوا ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی و بربادی تک آ پہنچا۔ اس زوال کے ظاہری اسباب و علل کا معاملہ اپنی جگہ! اہم تر مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان اور اسلام دراصل برعظیم میں دو مختلف حیثیتوں سے وارد ہوا ہے مگر یہ امر اہم ترین ہے کہ مسلمان نہ اسلام، ہردو ہندو کی روایتی ذہنیت اور روایت سے مات نہ کھا سکے۔ ادھر مسلمانوں کو (حکومتی) زوال آیا تو ہندوؤں کی چالیں سوا ہو گئیں۔ کہ انہوں نے مسلمانوں کے محروم اقتدار طبقوں کے روایتی اشرافیہ (Elite) کو متاثر و مرعوب کر کے انہیں بظاہر اپنا مطلوب بنانے میں کس قدر جتن کیے۔ یہ ایک پیچیدہ اور حیرت مآب سرگذشت ہے۔ برعظیم میں مسلمان اور اسلام کی کہ جس کا اچھوتا عنوان مولانا آزادؒ ہی کی زیرِ صدارت مذکورہ کتاب (The Sxity Years of Congress) کا باب سوم ہے۔ اور تو اور، مولانا آزادؒ کی ذات اور ان کی جماعت کے ہاتھوں برعظیم پاک و ہند کی مسلم ملت کا سوختہ کس طرح برطانوی انتذاب و گرداب کے ساتھ ساتھ ہندو عتاب کا بیک وقت شکار ہوا اور مسلم ہند کے اشرافیہ اور ان کی باقیات سماجی پستی اور معاشی درماندگی کے باوصف سنبھلی بھی تو یہ سفر، مفسر قرآن سے امام ہند تک اور پھر صدر کانگرس سے وزیر تعلیم ہند تک کیسے طے ہوا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقریت کو تو نگل ہی گیا مگر مسلم ملت کا برعظیم میں شیرازہ ایسا بکھرا کہ شریعت مآب رہنماؤں کی ایک موثر کھیپ گاندھی جی کے چرنوں میں مولانا سمیت متحدہ قومیت کا فلسفہ اٹھائے، شریعت کو ہندو اکثریت سے ہم آہنگ بنا کر برعظیم کے کروڑوں مسلمانوں کے دکھی دلوں کی آواز پاکستان کو ناممکن بنانے پر جت گئی۔ ادھر مسلم ہند کے دیگر

اشرافیہ اور حکمرانوں کی اولادیں سبزی فروش، دھوبی اور دیگر پست پیشوں سے معاشی پستی تک اُتر آئے تھے۔ مولانا آزادؒ ایک ادبی اور علمی شخصیت ہی نہیں مسلم ہند کے اشرافیہ کے نمائندے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد سلاطین دہلی (۱۲۷۰ء۔۱۵۲۶ء) اور مغل حکمرانوں (۱۸۵۷ء۔۱۵۲۶ء) کے ہمراہ وارد ہند ہوئے تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے۔

''میرے خاندان میں تین خاندان جمع ہوئے تھے۔ ایک بابر کے زمانے میں ہرات سے آگرہ آیا تھا۔ دوسرا احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہرات سے لاہور پہنچا۔ تیسرا مکہ معظمہ کے آخری محدث وتری کا خاندان تھا۔ میری والدہ اسی خاندان سے تھیں۔ مولانا منورالدین والد کے نانا تھے۔ ان کے والد قاضی سراج الدین، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ لاہور آئے تھے۔ انہوں نے پنجاب فتح کیا تو وہ لاہور ہی میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔'' (۱۴)

مسلم ہند کے نسلی، شکلی اور عقلی نمائندہ ہی نہیں ایک حد تک مسلمانوں کی مذہبی اتھارٹی کی معراج پر متمکن مولانا ابوالکلام آزادؒ کی مسلم ہند کے بارے میں ذاتی رائے جو بھی ہو، بھارتی مفکر کے ایم پانیکر کیلئے کیسے اور کیونکر جواب آں غزل کا مقام پائے کہ یہی وہ بے بسی اور عاجزی ہے جو علمی تو کیا خود عملی طور پر بھی نمایاں ہے کہ مولانا مرحوم حصول آزادی کی جدوجہد میں کانگرس کے بار بار صدر بنائے گئے اور بالآخر آزاد ہندوستان کے ۱۲ برس تک وزیر تعلیم بھی رہے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی حلقہ نیابت نہ تھا۔ وہ پہلی دفعہ سرحد اسمبلی کے نمائندہ کے طور پر دستور ساز اسمبلی کے رکن اور ازاں بعد رامپور اور پھر گڑ گاؤں سے سرکاری اور مقتدر جماعت کانگرس کے رکن کے طور پر بھارتی پارلیمنٹ (لوک سبھا) میں پہنچے، جہاں وہ کانگرس اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر رجبکہ پنڈت جواہر لعل نہرو لیڈر رتھے۔ اسی کو کہتے ہیں،

ع کہاں کے لوگ کہاں آ کے ہو گئے ہیں تباہ

اگر تہذیبی پس منظر اور علمی افق کے ساتھ ساتھ صلاحیتوں کے ادراک کے حوالے سے پرکھا جائے تو یہ سوال جان نہیں چھوڑتا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ جواہر لعل کے پیچھے پیچھے کیوں تھے۔ یہ ان کی ذاتی اور مطالعاتی شخصیت کی انا کی تسکین ہے کہ تذلیل۔ اسے ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو پھر کہنا چاہئیے کہ کہاں مولانا محمود حسنؒ (اسیر مالٹا) کی تجویز پر امام الہند کے منصب جلیلہ پر نامزدگی کے اظہار اور علمائے فرنگی محل کی مبینہ مخالفت سے دل برداشتہ ہو کر حزب اللہ بنانے والا ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا ایڈیٹر ابوالکلامؒ ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گیا یا خاموش و مایوس ہو گیا بلکہ اپنی ذات کے گنبد میں کس قدر بند ہو گیا۔ نتیجتاً وہ عمر بھر مسلم عوام سے دور رہا اور حادثہ یہ ہے کہ مسلم عوام نے ان کے مرنے کے بعد ان کی قبر تک سے دوری اختیار کر رکھی ہے اور حالت یہ کہ جامع مسجد دہلی کے مسلم علاقے میں جامع مسجد کے عین سامنے، لان میں ان کی قبر پر عوام بہر فاتحہ بہت کم آتے ہیں، گویا مسلم ہند کے آخری تاجدار اور علامتی سرکار شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اور مسلم اشرافیہ کی یادگار مولانا ابوالکلام آزادؒ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہاں محو خواب ہیں وہاں یکساں طور پر ایک شعر کام دیتا ہے جو بہادر شاہ ظفر کی بے بسی کا اظہار بھی ہے کہ

ع پے فاتحہ یہاں آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
جو بگڑ کے بھی نہ سنور سکا میں وہ بے کسی کا مزار ہوں
(مضطر خیر آبادی)

آخر مولانا ابوالکلام آزاد مسلم ہند (۱۸۵۷ء۔۱۲۷ء) کی معنوی علامت کیوں ہیں اور پنڈت جواہر لعل نہرو روایتی ہندومت کا عصری لیڈر کیونکر بنا بلکہ دلچسپ امر یہ ہے کہ جمہوری اکثریت کے رہنما جواہر لعل نہرو کی وزارت عظمٰی میں وزیر تعلیم کے طور پر مولانا آزادؒ کس طرح کی متحدہ قومیت کا شہ کار ہیں۔اس پہلو سے تاریخ کا چہرہ، تحیر و تعجب سے دم بخود ہے۔وجہ یہ ہے کہ مسلم عوام سے بددلی اور ہندو خواص سے ہم دلی کے معنوی انجام پر تاریخ کو اپنا فیصلہ سنانے میں تیس (۳۰) سال کا انتظار نہیں کرنا پڑا کہ اظہار اور حقیقت کا اپنا وقت ہوتا ہے۔وہ جب چاہے بے نقاب ہو جائے۔اس کے باعث سیاست عذاب ہو جائے، تو چنداں مضائقہ نہیں۔یہ جس آغاز کا انجام و اختتام ہے، اس کی داستان کچھ اور ہے کہ دونوں

اولاً: تو یکجا کیسے؟

ثانیاً: ابوالکلام آزادؒ نہرو کے مقتدی کیونکر؟

یہ سیاست ہے کہ تدبر؟ اس پر اس تہہ منظر میں جھانکنے کی ضرورت ہے کہ جس کے معکوس نتائج کا نام نیشنلسٹ (Nationalists) مسلمانوں کے سیاسی زاویے اور عوام دشمن رویے ہیں جسے مطالعہ و تجزیہ سے متحدہ قومیت کی تبلیغ تحریک آزادی کہلاتی ہے اور باسٹھ برس پہلے تحریک آزادی کے حتمی مراحل میں خود مسلمانوں میں روایتی مذہبی قیادت اور عصری اور نابغہ قیادت (اقبالؒ و جناحؒ) کے مابین سیاسی اور فکری جدل کیوں کر ہوا ہے؟ یہی وہ موضوع اور عرصہ تاریخ ہے جو مسلمان کی قیادت اور اسلام کی قیادت کا فطری اور معنوی فرق کر کے حالات کی رفتار بن گیا ہے۔جہاں تدبیر و تدبر کی حکمت عملی اور نسلی تشکلی اور عقلی مذہبی اتھارٹی پدرم سلطان بُود کے تفاخر سے نیست و نابود ہوگئی ہے۔بقول اقبالؒ مسلمانوں کو بچانے کیلئے اسلام کو حرکت میں آنا پڑتا ہے'' (خطبہ الہ آباد) اور یہی تسلسل ہے اس ارشاد رسول ﷺ کا کہ

''میری امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کی مانند ہوں گے۔'' (الحدیث)

یہاں مسلمانوں کے روایتی علماء نہیں بلکہ سرکار دو عالم حضور ﷺ کے علماء مراد ہیں۔درس نظامی کا نصاب پڑھ کر حروف شناس نہیں بلکہ رسالت ﷺ سے براہ راست فیض یاب ہیں جس کا مبداء درس نظامی نہیں درگاہِ نظامیؒ ہے۔حضرت علامہ اقبالؒ حضور سرکار دو عالم ﷺ کے ان علماء کے سرخیل ہیں۔فرمایا

مرا بنگر در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنائے رومؒ و تبریزؒ است
(اقبالؒ)

ترجمہ:۔ مجھے دیکھو کہ بھرے ہندوستان میں وہ واحد شخص ہوں جو دین وفقر (رموز آشنائے رومؒ وتبریزؒ) کا دانائے راز ہوں۔کوئی دوسرا معاصر اور موجود شخص اور کوئی نہیں سوائے میرے۔

یہ زبورِ عجم کا حاصل مطالعہ شعر ہے جس کے بارے میں بارے میں خود اقبالؒ نے کہا

ع اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم

یہاں پر برعظیم میں اسلام کی پیش رفت اور مسلمانوں کی سرگذشت دو الگ الگ دھاروں' ناموں اور خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔اور فرق بڑا واضح ہے کہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اپنی سیاسی فکر اور فلسفہ کے لحاظ سے جغرافیہ کی قوم (قومیں اوطان سے ہیں) کے نقیب بنکر سامنے آتے ہیں۔حالانکہ وہ نسلی، شکلی اور عقلی طور پر مسلمان ہی نہیں بلکہ مذہبی اتھارٹی کے طور پر بھی متعارف اور محترم ہیں مگر جغرافیہ اور علاقے کی پابند قوم انہیں مدینہ منورہ کی روحانی نسبت سے اپنی خاکِ وطن کا پابند یا شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند تو بنا سکتی ہے اور صوبائی سطح پر (یو۔پی) یا پھر سکونتی طور پر دیو بندی ہیں کہ مدنی تو نسبتِ روحانی ہے۔جبکہ ان کے سیاسی بیان کی پہچان موضع الہ داد پور تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد کی یا یوپی نہیں تو ہندی تک کا تعارف قرار پائے گی جبکہ اسلام کا قبول چند پشت پہلے کے کشمیری پنڈت کے فرزند کو ہندوستان صرف روحانی نسبت سے اپنا وطن قرار پایا ہے کہ فرماتے ہیں

ع میر عرب ﷺ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن ہی ہے
(اقبالؒ)

اس لیے

ا۔برعظیم میں اسلام کی پیش رفت اور

۲۔ برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی سرگذشت یہ دو الگ موضوع اور یکسر علیحدہ عنوانات ہیں، جن کی روشنی میں تاریخ کی رفتار اور تحریک کی پکار کا موازنہ، مقابلہ اور تجزیہ بیک وقت کر کے ہی حقیقت کے قریب تر ہوا جا سکتا ہے۔یہی سبب ہے کہ اس پہلو کو خلط ملط کرنے کے باعث ہی ان آویزشوں کا بیان ممکن نہیں ہو سکا جو مسلمانوں کی سرگذشت اور اسلام کی پیش رفت کے طور پر ایک علیحدہ مملکت کے قیام کے مطالبہ اور تحریک پاکستان کے دوران دیکھنے میں آئی۔وجہ یہ ہے کہ برعظیم میں مسلم اشرافیہ کی باقیات کے روپ میں عوام کا الا نام کو متحدہ قومیت کے نام پر مسلمانوں کے شاندار مستقبل کے حوالے سے پدرم سلطان بود کے خمار میں دھکیلنے کی سعی فرمائی کہ اس شاندار ماضی کو علماء کی قربانیوں سے نتھی کر کے مزید شرعی تائید کا سہارا دیکر تب مسلم عوام کے دکھی دلوں کی دھڑکن پاکستان اور اس کے قائد، جناحؒ کے بارے میں حد درجہ شرعی دلائل اور انداز سے تعاقب کر کے براہ راست

انڈین نیشنل کانگرس کی ہمنوائی کی گئی کہ تحریک پاکستان کی یہ قیادت اور اس کے دیگر زعماء انگریزی اطوار اور تعلیم سے آراستہ بالغ نظر افراد تھے اور نتیجتہً دیوبند کے ایک گروہ علماء کے نزدیک یہ انگریزی استعمار کے گماشتے تھے، جبکہ انڈین نیشنل کانگرس کے نیتا ان کے لئے مہاراج اور مہاتما تھے۔ یہ ہندو اکثریت کے جمہوری تماشہ کو شرعی حیثیت سے سند عطا فرمانے کے اقدام کو جدوجہد آزادی میں حریت مآب پیش رفت اور قربانی کے نام سے متعارف کرانے کی مہم کو بھی مسلم عوام سے رابطہ کانگرس مہم(Muslim Mass Contact Movement) تک اُتر آئے۔ اور تو اور ۱۹۴۶ء کے فیصلہ کن انتخابات میں انڈین نیشنل کانگرس کے خرچے پر جمعیت العلمائے ہند اور مجلس احرار اسلام کے فرزندان توحید مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں بتانِ آذری سے خرچہ پانی بٹورتے نظر آتے ہیں۔ مسلم اکثریت کے صوبے پنجاب کی حد تک حال یہ تھا کہ ایک نیشنلسٹ رہنما کے اپنے قلم نے حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ

> ''کئی ایک نیشنلسٹ مسلمان کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے۔ ان کا ہار جانا یقینی تھا لیکن اس لئے کھڑے ہو گئے کہ کانگرس اپنے تئیں ایک قومی جماعت ثابت کرنا چاہتی تھی۔ ان نیشنلسٹوں میں ساری عمر کے کیونلسٹ سید حبیب، ایڈیٹر سیاست بھی تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کے چچیرے بھائی مولانا عبدالغفار غزنوی میاں افتخار الدین کے مقابلے میں امیدوار تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی دو چار نیشنلسٹ مسلمان امیدوار تھے۔ لیکن کانگرس کا روپیہ ان کی جیب تک پہنچ کر عوام میں تقسیم ہونے سے محروم ہو گیا، سب کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔'' (۱۵)

مجلس احرار اسلام کی داخلی کیفیت پر آغا شورش کاشمیری (تب جنرل سیکرٹری) کا ارشاد ملاحظہ ہو کہ

> ''قصہ کوتاہ مولانا مظہر علی اظہر مان گئے کہ انہوں نے کانگرس سے ساٹھ ہزار روپے وصول کیے ہیں۔'' (۱۶)

مولانا مظہر علی اظہر مجلس احرار اسلام کے صدر تھے۔ جنہوں نے بھرے جلسہ عام میں قائداعظمؒ کو کافرِ اعظم کہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندو کانگرس کا روپیہ بھی تو حلال کرنا تھا اور یہی ان کی کمائی تھی۔

نتیجتاً اسلام اور مسلمان برعظیم میں اپنی تاریخی رفتار کے اعتبار سے الگ نتائج اور علیحدہ عواقب کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ برعظیم میں اسلام کا تعلق نہ اقتدار سے تھا نہ دربار سے۔ اس لیے مسلمان شدھی نہ ہو سکا۔ سماجی پستی اور معاشی برتری کے دنیاوی کاروبار نے بعض علماء اور مذہبی گروہ کو اس قدر پست ہمت اور اخلاقی تنزل سے دوچار کر دیا کہ وہ ہندو کانگرس کے چندے اور دھندے سے مسلم قوم کی اجتماعی خواہش قیام پاکستان تک کے خلاف کھل کر سامنے آئے۔ اس کی وجوہات کے متعدد رُخ ہیں مگر اہم ترین رُخ یہی روحانی تنزل تھا جس نے بپھرے ہوئے بدمست برطانوی

ساانڈ سے نبٹنے ٹکرانے کو جدوہند آزادی قرار دے دیا۔ حالانکہ جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے لیکر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک ایک سو برس مغل دربار سے وابستہ اور مسلم اقتدار سے پیوستہ طبقات کہاں سوئے رہے تھے۔ بلاشبہ علماء حق کی ایک تعداد نے جہاد آزادی میں بے پناہ قربانیاں دیں، پھانسیاں پائی، درختوں پر لٹکائے گئے، مگر اس پوری کھیپ کو حصول اقتدار کی خواہاں دو قوتوں میں ایک کا حریف اور دوسرے کا حلیف بننے میں فساد اور جہاد کے پہلو سے اجتہاد کا راستہ کیوں ترک کرنا پڑا تھا۔ درآں حالیکہ دورِ زوال کے مسلم اشرافیہ اور علماء کے ہاتھ اقتدار اور دربار تک لمبے تھے۔ نتیجتاً اقتدار اور طاقت کو حق جان کر ٹکر مارنے کا حاصل کیا نکلا؟ یہی سبب ہے کہ اجتہادی اور روحانی برتری کی روش اُبھر کر سامنے نہ آسکی حالانکہ طاقت حق نہیں ہے حق طاقت ہے۔ گیارہ صدیوں کے اقتدار کے بعد جب مسلمانوں کو برعظیم میں زوال آیا، تو اسکو آخری سنبھالا دینے کیلئے باہمت مسلم عوام خواص نے علامتی سرکار شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو کندھوں پر اٹھانے اور قلعہ سے باہر لانے میں کسی حد تک کامیاب تو ہوئے مگر نتیجہ

ع خار مغیلاں و آبلہ پائی

اب بہت زیادہ دیر ہو چکی تھی اور تقدیر کو اپنا فیصلہ صادر کرنا ہی پڑا۔ حالانکہ مغل دور میں حکومت کے چار بڑے خطاب تھے

ملک العماء کا خطاب سب سے بڑے عالم کو دیا جاتا

نقب الاولیاء کسی بلند پایہ صاحب طریقت کو

ملک الاطباء شاہی طبیب کو اور

رکن المدرسین سب سے بڑے مدرس و ممتاز عالم کو

یہ ایک طرح کی وزارت تعلیم یا نظامت تعلیم تھی کہ نظم ونسق کے اعتبار سے ملک کا پورا نظام تعلیم اس کی نگرانی میں ہوتا تھا۔

یہ تمام حضرات علماء واشرافیہ تھے۔ مگر درباری اسلام ہمیشہ امت کیلئے ایک روگ اور نتیجتاً زوال کا باعث ہوا ہے کہ عوام ان کے نزدیک ہمیشہ دوسرے درجے کے انسان اور تیسرے درجے کے شہری قرار پاتے ہیں۔ علم وفن کی پذیرائی کو اقتدار مل جائے تو ایک خاص مدت کی فطری صلاحیت کے بعد خمارِ اقتدار انہیں راہ سے بھٹکا کر اقتدار میں اپنی استقامت کے ذاتی رُخ پر یکسو کر دیتا ہے۔ نتیجتاً اقتدار کی کش مکش میں یہ اہل علم وہنر اور مشیر اپنی شہرت وصلاحیت کے باوصف مغل دور کو زوال آشنا ہونے سے بچا نہ سکے، درآحالیکہ انہیں مادی اور سماجی طور پر ہر وہ سہولت اور صلاحیت میسر تھی جس سے انہیں تدبر و تدبیر اور حکمت عملی کی راہ پر بآسانی گامزن کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ اہل زر تھے اہل دل نہیں تھے۔ یہ جن کے لئے بقول اقبالؒ

ع زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

کا صاحب حال ہونا لابدی ہے۔ یہ اہل ہوس کے بے مغز اور بے عمل گروہ تھے جو زن، زر اور زمین کے ذاتی اور مفاداتی چکر کی نذر ہو گئے اور حاصل یہ کہ خود بھی مرے اور ساتھ سلطنت مغلیہ کو بھی لے ڈوبے۔ خمارِ گندم اور اقتدار ارضی کے مارے، نیند کے ماتے آنکھ ملتے ہوئے بیدار ہوئے، تو حالتِ خواب کی تعبیر ان کی تقدیر کی طرح الٹ چکی تھی، یعنی

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں میرے آیا
جب آنکھ کُھلی دیکھا، اپنا ہی گریبان تھا

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور نتیجتاً مسلمانوں کی بربادی کا نقشہ حقیقت نگاری کے سروپ میں یہ منظر پیش کرنے لگا کہ صرف دلی کا حال یہ تھا کہ

''ادھر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر جو قیامت ٹوٹی اس سے پرانی ثقافت کے درو دیوار ہل گئے۔ تمام ملک بارہ باٹ ہو گیا۔ وہ لوگ جن کے پاس بادشاہوں کے دستر خوان بچھے تھے۔ اب روزی کی لیسٹ میں مر رہے تھے۔ جنہوں نے کبھی کسی کا ہاتھ تکا نہ تھا ان کے دامن کشکول ہو گئے اور اب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پیٹ کی دُہائی دے رہے تھے۔ ادھر خاندانی شرافت فقیر کی گدڑی ہو گئی۔ ادھر ہر کوئی بے نوا کا سونا بنا پھرتا تھا۔ جن چہروں پر دہلی و لکھنو کی شرافت کا انحصار تھا وہ تتر بتر ہو گئے۔ ہر شے پر جھوٹا جھول چڑھنے لگا۔ شرفاء کی لاج بچوں کا قہقہہ بن گئی۔ دیکھتی آنکھوں ایسا انقلاب برپا ہو گیا کہ تیمور و بابر کی بیٹیاں تن ڈھانپنے کیلئے چیتھڑے ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔''(۱۷)

۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کی مکمل بربادی کے بعد مسلم اشرافیہ اور علماء نے جس قدر انگریز دشمنی کو اپنے حواس پر سوار کیا، حالات کی سنگینی نے مسلم دشمن انگریز کو اسی قدر مسلمانوں کو بے دست و پا کرنے کی راہ ملتی چلی گئی، یہاں تک کہ حالات پر ایک نظر کا معروضی جائزہ

اولاً: سر سید احمد خان اور اسکی تعلیمی تحریک ہے جو انگریز دشمنی کی بند گلی کو کھولنے کا دوسرا نام ہے۔ جو مسلم ملت کو جدید دور سے آنکھیں چار کرنے کے باعث بنی ہے۔

ثانیاً: جمعیت العلماء ہند، اور وہ بھی متحدہ قومیت کی کانگرس کا ''علماء ونگ'' ثابت ہوا ہے۔ یہ تو ۱۸۵۷ء کے سانحہ پر مسلم اشرافیہ کا ردعمل اور عمل تھا، مگر ایک ہزار برس کے مسلم اقتدار کا خاتمہ بھی بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں کی معنوی اور مکمل بربادی جیسا امر واقعہ ہو گیا۔ اور یہی تتمہ تھا برعظیم میں گیارہ سو سالہ مسلم دور اقتدار کا، بلکہ خاتمہ تھا مسلم تہذیب کے ارتقاء کا، جو بہر حال اور بہر طور بخیر نہ ہوا، کہ اخلاقی پستی میں مقتدر گھرانوں اور مغلوں کی حکمرانی کی ہی رفعت نمایاں نہ تھی بلکہ حصول زر اور منفعت نے ان میں قومی غداروں کی ایک موثر بلکہ مقتدر حلقوں سے

کھیپ پیدا کی تھی کہ

جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگ دین، ننگ ملت و ننگ وطن

ایک علاقہ اور فرد کا نہیں، ایک ذہنیت کا ظہور تھا۔ اس سلسلے میں مغلیہ دور کے زوال میں اسباب کی نشاندہی اب کوئی راز نہیں رہا۔ بات اسباب کی نہیں نتائج کی ہو رہی ہے کہ برطانوی انتداب اور حکمران نسلوں میں اخلاقی پستی کے انقلاب نے مسلم قوم کے خواص اور عوام دونوں کو اڑ نگے پر لا کر ایسی پٹخنی دی کہ عزت و آبرو تو کجا جان اور مال تک بچانا مشکل ہو گیا۔ اس پہلو سے تاریخ کا اپنا چہرہ گلگوں بلکہ گلنار ہے۔ انگریزی افواج نے گیارہ صدیوں کی مقتدر مسلم قوم اور اسکے خواص و عام کو جن جبر و استبداد اور ظلم کا نشانہ بنایا وہ بھی اب مربوط اور مرتب ہو کر بصورت لٹریچر عام سی معلومات ہیں جس کی روشنی میں مغربی غلبہ اور استیلاء کا بظاہر مہذب، مگر اندرون چنگیز سے تاریک تر چہرہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر متحدہ قومیت کے تجربے سے بھارت دیش میں متحدہ قومیت کے مولانا آزادؒ اور مولانا مدنیؒ کے زیرِ نگرانی مسلمانوں پر کیا بیتی ہے کیا بیت رہی ہے اس کا تاریخی تجزیہ یہ ہے۔

آزاد بھارت میں متحدہ قومیت

سچی بات تو یہ ہے کہ برطانوی ہند (۱۸۵۷ء۔۱۹۴۷ء) کا پورا عہد، مسلم دشمنی ہی سے عبارت ہے۔ اور اس امر کی منظم اور بھرپور کوششیں روا رکھی گئیں، جس کے نتیجے میں برعظیم کی مسلم قوم معاشی تنگ دستی اور سماجی پستی کا بیک وقت شکار ہو کر سیاسی بے حسی میں پڑ کر ختم ہو جائے، البتہ مقامی آبادی میں ہندو قوم کو بطور حلیف ساتھ لیکر، بھارت (جدید) تک لانے میں برطانوی عہد کا جو معنوی کام اور انجام سامنے آیا ہے ہندو ایک منظم قوم اور بھارت ایک وسیع و عریض جمہوری اکثریت کا بظاہر سیکولر ملک، برطانیہ کا ورثہ اور ترکہ بلکہ صحیح معنوں میں ایک طرح کی باقیات ہے جس کی خارجہ حکمت عملی کا جدید نام غیر جانبداریت، غیر وابستہ اور آزادانہ ہے۔ یہ خارجہ حکمت عملی ہے جو ہر دور میں نام اور بھیس بدل کر چلنے کی روش اور بدلنے کے عمل کا نام ہے۔

رُوبل کی مار دھاڑ میں ڈالر بھی ہے شریک

جو حقیقتاً ہندو مت ہے۔ یہ بھارت (قدیم) ہو کہ بھارت (جدید) اپنے داخلی ماحول کے تقاضوں (Domestic Compulsions) اور قومی مقاصد سے ہم آہنگ امور (National Interests) کیلئے ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں رواں رہنے کا کام ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی تھی یا انگریزوں کی، ہندو قوم اپنے تاریخی مزاج اور قومی ورثے کے عین مطابق حالات کی رفتار اور وقت کی پکار کا ساتھ نبھانا جانتی ہے۔ وہ اس ضمن میں ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے میں کس قدر تدبیر و تدبر اور بیدار مغزی سے کام لیتی ہے یہ اس کی تاریخی روش کے مطالعے اور طریق ہائے کار کے تجزیے سے بخوبی عیاں

ہے۔

اسلام سے سیکولر ڈیموکریسی تک پچاس سالہ سفر

تقسیم ہند کے بعد بھارتی ہند میں کوئی چار کروڑ مسلمان رہ گئے تھے۔ان چار کروڑ نفوس کی قیادت کے لئے اس ملک میں نامور علماء کرام، سیاسی شخصیات اور روحانی قائدین موجود تھے۔پھر ہندوستانی مسلمانوں کے اہم دینی ادارے اور معروف علمی درس گاہیں بھی اسی ہندوستان میں موجود تھیں۔دینی جماعتوں، انجمنوں اور مشائخ کے حلقے بھی منقسم طور پر ہی سہی ان کا بھی ٹوٹا بکھرا دائرہ یہاں موجود تھا۔لیکن ان تمام روحانی وعلمی شخصیات کی موجودگی کے باوجود نئے ہندوستان کی مسلم قیادت اس سوال کا کوئی واضح جواب فراہم کرنے سے قاصر رہی کہ بھارتی ہند میں مسلمانوں کا کیا مقام ہوگا اور یہ کہ آنے والے دنوں میں اس ملک میں مسلمان اپنے لئے کیا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔تب سے اب تک کوئی پچاس سال گزرنے کے بعد بھی اس سوال کا کوئی واضح جواب فراہم کیا جانا باقی ہے۔دیکھا جائے تو فطری اعتبار سے ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں نے جس نامعلوم منزل کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا تھا آج بھی وہ اسی نامعلوم منزل کی طرف گامزن ہیں۔مذہبی قائدین ہوں یا دینی جماعتیں، روحانی شخصیات ہوں یا خالص سیاسی مسلمان، ان میں سے کسی کا ذہن شاید ہی اس مسئلے پر صاف ہو کہ وہ بالآخر اس امت کے کارواں کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ان کی چلت پھرت اور دوڑ دھوپ آخر اس امت کو کس مقام پر فائز کرنے جاری ہے اور جب مسافر کو منزل کا پتہ معلوم نہ ہو اور اپنے سفر کی اہمیت کا قطعی شعور نہ ہو تو اس کے قدموں کا مختلف اور متضاد راہوں میں اٹھ جانا غیر متوقع نہیں۔

تقسیم ہند کے وقت مسلمانوں کی روحانی قیادت بڑی حد تک دارالعلوم دیوبند اور جمعیتہ العلماء سے وابستہ علماء پر مشتمل تھی اور ابوالکلام آزادؒ بڑی حد تک سیاسی قیادت کا علامیہ سمجھے جاتے تھے۔علمائے دیوبند ہوں یا ابوالکلام آزاد، ان حضرات سے امت کو بجا طور پر اس بات کی توقع تھی کہ وہ اپنے دینی علوم کی بنیاد پر امت کے لئے جو راستہ بھی منتخب کریں گے وہ کتاب وسنت سے الگ کوئی راستہ نہ ہوگا۔لیکن یہ بھی ایک عجیب اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ بھارتی ہند میں اسلامیان ہند کے کارواں کا رخ متعین کرنے میں ان حضرات کے ذہنوں پر کتاب وسنت کے بجائے گاندھی جی کے خیالات کا زیادہ غلبہ رہا۔ان بزرگوں کی تحریریں اور تقریریں پڑھ جائیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات دو وابستگیوں کے درمیان کوئی راستہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ایک طرف تو کتاب وسنت کے واضح ارشادات کا بوجھ ہے اور دوسری طرف متحدہ قومیت کے نظریئے سے نبھانے کی کوشش۔فکری طور پر تو یہ حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کے قائل ہیں البتہ عملی طور پر گاندھی جی کی روحانیت کے آگے ان کے سر جھک گئے ہیں۔ان دو وابستگیوں سے نبھانے کی کوشش میں شرعی اصطلاحات اور قیل وقال سے فکری پراگندگی کی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوگئی۔چنانچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سامنے جب یہ سوال رکھا

گیا کہ کیا آزاد ہندوستان میں جہاں مسلمان اور غیر مسلموں کے تعاون سے ایک نظام حیات تشکیل دیا جائے گا اسے اسلام کا مطلوبہ نظام کہا جا سکے گا یا نہیں اور یہ کہ اگر آزادی کے بعد قائم ہونے والا سیاسی نظام، اسلامی نظام نہیں ہوتا تو آخر کسی ایسے نظام کے قیام کی کوشش کا جواز کیا ہے؟ تو آپ نے اس سوال کا کوئی سیدھا جواب دینے کے بجائے فرمایا:

''مختلف قوموں کے اس اشتراک کی وجہ سے آزادی کے بعد ملک میں جو نیا نظام قائم ہوگا اس کی تعمیر میں مسلم و غیر مسلم دونوں شریک ہوں گے۔ یہ مشترکہ نظام اگرچہ مکمل طور پر اسلامی معیار کے مطابق نہ ہوگا تاہم اس میں مسلمانوں کا ایک اہم اور مؤثر عنصر ہوگا۔ اب یہ خود مسلمانوں کی حکمت تبلیغ پر منحصر ہے کہ وہ آنے والے نظام کو کس حد تک اسلامی معیار پر اتار سکتے ہیں۔ انہی وجوہ سے آزادی کے بعد قائم ہونے والے مشترکہ نظام کو موجودہ نظام کے مقابلہ میں ''اھون البلیتین'' قرار دیا جاتا ہے۔''

(مکتوب شیخ الاسلام، منقول اخبار نئی دنیا شیخ الاسلام نمبر، مورخہ ۹/ جنوری ۱۹۵۸ء)

مسلمانوں کی اور ہندوؤں کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں مستقبل کا جو نقشہ ترتیب پائے گا اس کا صحیح ادراک کرنے کے بجائے ساری ذمہ داری مسلمانوں کی آئندہ حکمت تبلیغ پر ڈال دی گئی اور یہ بات فرض کر لی گئی کہ آنے والے دنوں میں اچانک یہ امت جس کا شیرازہ منتشر ہے، اخلاقی حالات تباہ ہیں، کسی مشترکہ و متحدہ قیادت سے دور ہے اور جو فریضہ دعوت حق کے شعور سے پوری طرح خالی ہے وہ اچانک مبلغین کی فوج میں تبدیل ہو جائے گی۔ اگر یہ کام اتنا ہی آسان تھا اور سارا معاملہ حکمت تبلیغ کا تھا تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امت کی شیرازہ بندی کے بعد اسی حکمت تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں کو مؤثر عنصر کے مقام سے آگے بڑھا کر قیادت کے منصب پر فائز کر دیا جاتا اور اگر مسلمانوں کو انگریزی نظام کے اندر ایک مؤثر عنصر کی حیثیت سے سامنے لانا اور فیصلہ کن قوت عطا کرنا ممکن نہ تھا تو بعد کے دور میں اچانک انگریزوں کے چلے جانے سے یہ کام کیسے انجام پا سکتا تھا؟ اس سوال کا کوئی سیدھا جواب دینے کے بجائے مولانا مدنیؒ نے۔ ''اھون البلیتین'' کے فلسفے کا سہارا لیا اور اس فیصلے کی خود ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے مستقبل کے مبلغین اور ان کی حکمت تبلیغ کے سر ڈال دی۔

تو کیا مولانا حسین احمد مدنیؒ کو اس بات کی کوئی امید تھی کہ مستقبل کے ہندوستان میں رفتہ رفتہ مسلمان دوبارہ ایک فیصلہ کن قوت حاصل کر لیں گے اور آنے والے دنوں میں ان کوششوں سے ہندوستان کو دوبارہ دارالاسلام بنایا جا سکے گا؟ مولانا مدنیؒ کی تحریروں اور ان کی تقاریر سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ پھر آخر یہ حضرات چاہتے کیا تھے؟ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد سے اگر کسی دارالاسلام کے قیام کا خواب نہیں دیکھتے تھے، اگر ان کی جدوجہد کا مقصد اللہ کی شریعت کی سربلندی نہیں تھا تو خود ان کی ساری دوڑ دھوپ اور جدوجہد کی شرعی طور پر کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اس سوال پر ہم آگے بحث کریں گے۔

نئے ہندوستان میں اس بات کی شعوری کوشش کی جاتی رہی ہے کہ مسلمانوں کی ملی زندگی کی شیرازہ بندی کی جائے

اوران کوشریعت کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے مواقع فراہم کئے جائیں۔ تقسیم ہند سے قبل ہی مسلم قیادت کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ آنے والے دنوں میں دہلی کی سرزمین پر مسلمانوں کی فیصلہ کن حیثیت باقی نہیں رہ پائے گی۔ تب مضطرب مسلم ذہنوں میں یہ سوال اٹھنے لگا تھا کہ اگر نیا نظام ایک اسلامی زندگی جینے کے مواقع فراہم نہیں کرتا تو اسے شرعی بنیادوں پر کس طرح قبول کیا جائے گا۔ تب بھی ان سوالوں کا کوئی واضح جواب فراہم کرنے کے بجائے مسلمانوں سے یہ کہا گیا کہ ان کا کام صرف علماء کی پیروی کرنا ہے اور علماء میں بھی وہ لوگ جو وارث نبی ہوں، جنہیں علم لدنی اور علم معرفت دونوں حاصل ہوں اور محض وحی پر بھروسہ کرنے کے بجائے القاء ربانی اور الہام باطنی سے کام لیتے ہوں۔ علمائے اہل دیوبند کی نظر میں چونکہ خود ان کے اندر یہ شان بدرجہ اتم موجود تھی اس لئے عام مسلمانوں سے یہ توقع کی گئی کہ وہ آنکھ بند کر کے ان علماء کی پیروی کریں۔ وہ جدھر لے جانا چاہتے ہوں ادھر چلیں کہ ان کے پاس صرف کتاب وسنت کا علم ہی نہیں بلکہ وحی کے علاوہ موجودہ زمانے کی وحی یعنی القائے ربانی اور الہام باطنی بھی موجود ہے۔ مولانا قاری محمد طیب نے جمعیۃ العلماء کے ایک جلسے میں اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ بحران کی اس فضاء میں امت کی کشتی کو صرف اور صرف جمعیۃ العلماء کے علماء ہی پار لگا سکتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی قیادت کیلئے یہ شرط عائد کر دی کہ محض اس کا:

> ''عالم ہونا یا کتابوں کے درس وتدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ بایں معنی ان میں وراثت نبوت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بینی اور تر ددات سے بالاتر ہو۔ ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو، تقویٰ وطہارت اور احتیاط وحزم کی وجہ سے ان کا رویہ نہ ذاتی گمراہی کا ہو نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا ہو۔ وہ ضلوا اضلوا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں پھر جب کہ ان دونوں اوصاف انکشاف باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کرلیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔''

(اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، خطبہ صدارت بمبئی ۱۹۴۶ء قاری محمد طیب)

اور چوں کہ علماء کا یہ گروہ اپنے اتحاد کی وجہ سے عصمت کی شان بھی پیدا کر چکا تھا اس لئے اس سے کسی غلط فیصلے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا تھا۔ پھر اس نئی تشریح کے مطابق محض کتاب وسنت کے حوالے سے کسی فیصلے کو صحیح یا غلط قرار دینا ممکن نہ تھا کہ اب پرانی وحی کے مقابلے میں نئی وحی کے حاملین معصوم علمائے کرام کی فوج ظفر موج امت کو موجود بحران سے نکالنے کے لئے میدان میں آچکی تھی۔ کتاب وسنت کے مقابلے میں علمائے کرام کے قول کو ترجیح دینے کا یہی وہ رجحان تھا جس نے آنے والے دنوں میں اُہم مسائل پر غور وفکر کے لئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کا دروازہ بند کر دیا۔ اس رویے نے نہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں کے دل ودماغ پر پہرے بٹھائے بلکہ اہم سیاسی مسائل پر رہنمائی کے لئے جب بھی ضرورت پڑی امت نے علماء کی طرف دیکھنے کو کافی سمجھا اور چونکہ ان ''معصوم'' علماء کے فیصلے آپس میں مختلف اور متضاد تھے اس لئے بد دل ہو

کر عام مسلمانوں نے ان کی رہنمائی سے یکسر آنکھیں بند کر لیں۔

ہمارے لئے مسئلے کا جو پہلو فی الوقت غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ کیا بزرگوں کی یہ نسل علمائے کرام کی انجمن بنا کر واقعی یہ سمجھتی تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے کوئی شرعی زندگی جینے کا انتظام کر لے گی۔ علماء کی انجمن اور اس انجمن کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان کسی خاص عالم کو خواہ کتنا ہی اعتبار کیوں نہ حاصل ہو جائے اور وہ اپنے مریدوں کے حلقے میں خواہ کتنا ہی با اثر کیوں نہ ہو، نئے نظام کے اندر مسلمانوں کے اس امیر کی حیثیت ایک معمولی اہلکار سے زیادہ نہ تھی۔ لہٰذا جمعیتہ کے بڑے بڑے باکمال علماء خواہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں اقتدار کل کے مالک ہی کیوں نہ ہوں نئے نظام میں ان کی حیثیت کسی حاشیہ نشین سے زیادہ نہ تھی۔ خود مسلمانوں کی سب سے بڑی شخصیت ابوالکلام آزادؒ گاندھی کے ارادت مندوں میں سے تھے جن کی ساری روحانی عظمت اور ورثتہ الانبیاء کی حیثیت گاندھی کی مہاتمائی روحانی شخصیت کے آگے پھیکی پڑ گئی تھی۔ بعد کے دنوں میں بھی مختلف سطحوں پر ملک کے اندر جو شرعی نظام قائم کیا گیا یا جو لوگ امیر الہند کی حیثیت سے سامنے آئے وہ اس سیاسی نظام کے اندر امت کے لئے تو کجا اپنے لئے بھی کوئی باوقار رول دریافت نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی وراثت کا دعویٰ کرنے والی امت یا اس امت کے چیدہ افراد نظام کفر کے حاشیہ بردار کی حیثیت قبول کر لیں۔ کیا شرعی اعتبار سے کسی امیر شریعت یا امیر الہند کے لئے جائز ہے کہ وہ مسلمانوں کو نظام کفر کی معیت میں رکھ کر شرعی زندگی جینے کا فن سکھائے۔ یا وہ نظام کفر سے کوئی اعراض نہ برتے اور پھر بھی یہ دعویٰ کرے کہ اس کی جدوجہد اسے شرعی زندگی جینے اور جلانے کے لئے ہو رہی ہے۔

امت کی شیرازہ بندی کا مقصد اگر اس ملک میں شریعت کی بالادستی قائم کرنا نہیں تھا، اگر امت کو کسی دینی قیادت پر یکجا کرنے کے مقصد کے پیچھے ایک اسلامی نظام حیات کی تشکیل نہیں تھی تو آخر کون سا کام تھا جو قائدین کی پہلی نسل مسلمانوں کے اتحاد سے لینا چاہتی تھی۔ اگر موجودہ نظام کو الٹ کر اس کی جگہ کوئی نیا نظام حق قائم کرنا ان بزرگوں کے پیش نظر نہیں تھا تو آخر یہ ساری چلت پھرت، وعظ اور تقاریر، کانفرنسوں اور جلوسوں سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اپنی موت سے چند روز پیشتر مولانا حسین احمد مدنیؒ نے نئے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے جو راہ عمل تجویز کی وہ کچھ اس طرح تھی:

"ان ملکوں میں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے اور مسلمان اپنی اقلیت کی وجہ سے وہاں پر نہایت کمزور اور ان کی آواز نہایت گری ہوئی ہے، اشد ضرورت ہے کہ ان میں اجتماعی قوت اور نظام مکمل ہو۔ بالخصوص انڈین یونین (بھارت) میں تقسیم ہند کے بعد یہ ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لئے تمام مسلمانوں کا عموماً اور علمائے اسلام کا خصوصاً اہم فریضہ ہے کہ وہ جاگیں اور تحفظ بقا کی صورتیں عمل میں لائیں، اختلافات کو مٹائیں اور اجتماعی قوتوں کو بڑھا کر صحیح نظام پر گامزن رہیں۔"

موت سے چند روز پیشتر مکتوب بنام غلام محمد مصطفیٰ بحوالہ روزنامہ الجمعیۃ دہلی ص ۱۷۹ شیخ الاسلام نمبر ۱۰/فروری ۱۹۵۸ء

کل تک جن لوگوں نے امت کو اپنی رہنمائی کی صحت کا پورا پورا یقین دلایا تھا، کل تک جو لوگ حسن تبلیغ کے ذریعہ نئے نظام کو اپنی آرزوؤں کی راہ پر ڈال لینے کا ولولہ رکھتے تھے آج وہی لوگ اب اس امت کو تحفظ اور بقا کی صورتیں عمل میں لانے کو مشورہ دے رہے تھے۔ اب اقدامی عمل سے کنارہ کش ہو کر دفاعی حیثیت میں سارا کام کرنے پر زور تھا۔ گویا روز اول سے قائدین کی پہلی نسل نے امت کو جو درس دیا وہ یہ تھا کہ ''وہ اس ملک میں اپنی بقا اور تحفظ کی فکر کریں، اختلافات کو مٹائیں اور اجتماعی قوتوں کو بڑھا کر صحیح نظام پر گامزن رہیں'' لیکن یہ صحیح نظام کیا تھا اور اس پر کیسے گامزن ہوا جا سکتا تھا اس بارے میں ان کے پاس نہ تو کوئی پروگرام تھا اور نہ منصوبہ۔ اصل زور تو تحفظ پر تھا۔ صحیح نظام کا تذکرہ تو ایک نا آسودہ آرزو کی حیثیت سے گاہے بہ گاہے زبان پر آجاتا تھا اور نہ اگر اس نظام کی طرف لے چلنے کا کوئی واقعی پروگرام ہوتا تو اس کا تذکرہ محض رواروی میں چلتے چلاتے نہ ہوتا اور اس کے لئے کوئی واقعی خاکہ blue-print بھی پیش کیا جاتا۔ کچھ یہی حال آزادؒ کے یہاں بھی تھا جو اب تک اسلاف کی عظمت اور اسلامی ہند کی تاریخ سے اپنا پیچھا نہ چھڑا پائے تھے اور جو ان کے گاہے بہ گاہے مایوس خطابت کی شکل میں ڈھلتی رہتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے تو یہ بات سچ تھی کہ جمنا کے کنارے ہمارے بزرگوں نے وضو کیا تھا۔ اس خطابت سے یقیناً حوصلے کو جلا ملتی ہے لیکن حقیقت کی دنیا میں نیا نظام بزرگوں کے تمام آثار مٹانے کے درپے تھا۔ لہٰذا اب جس بات پر سب سے زیادہ زور تھا وہ یہ کہ مسلمان اپنے تحفظ کی فکر کریں۔'' (۱۸)

ہندوستانی مسلمان: منزل نامعلوم

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جب نئی صبح کا سورج طلوع ہوا تو مولانا ابوالکلام آزادؒ کو ایسا لگا جیسے یہ سورج اس سورج سے مختلف ہو جس کے طلوع کی انہیں برسہا برس سے توقع تھی اور جس کے لئے انھوں نے اپنی زندگی کی ساری توانائی جھونک دی تھی۔ نیا ہندوستان اب ایک منقسم ہندوستان تھا جس میں مسلمانوں کی عددی قوت تین حصوں میں بٹ چکی تھی۔ بعض سیاستدانوں کے لئے ۱۵/ اگست (۱۹۴۷ء) بے شمار کامیابیوں کا نقطۂ عروج تھا۔ اگر ایک طرف جواہر لال نہرو کی دیرینہ آرزو وزارت عظمیٰ کی شکل میں پوری ہو رہی تھی تو دوسری طرف محمد علی جناحؒ بھی نو تشکیل یافتہ مملکت پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اس منصب پر فائز ہو چکے تھے۔ جناحؒ ہوں یا نہرو، ان دونوں کے لئے آزادی کی نئی صبح یقیناً جشن کا دن تھا۔ لیکن آزاد اور گاندھی کو اپنا خواب کسی حد تک بکھرتا دکھائی دیتا تھا۔ گاندھی کے ہاتھ میں پھر بھی شاید کلید تھی کہ وہ اپنی زبردست عوامی مقبولیت کے باعث جب چاہیں مرن برت کی دھمکی دے کر نئے ہندوستان کے خواب کو اب بھی کسی حد تک اپنی مٹھی میں رکھ سکتے تھے۔ البتہ آزاد کا غم ایک ایسے شخص کا غم تھا جس کی کشتی طوفان نے تباہ کر دی ہو اور جسے بھنور سے نکلنے کا راستہ دکھائی نہ دیتا ہو۔

منقسم ہندوستان میں مسلم سیاست کو اب ایک نیا مرحلہ درپیش تھا۔ تقسیم نے صورت حال یکسر بدل کر رکھ دی تھی۔

آخر آخر تک آزاد کو یہ امید تھی کہ شاید ہندوستان کی ایک غیر فطری جغرافیائی تقسیم ممکن نہ ہو۔ ابتداء میں پاکستان کے فلسفہ سازوں نے متحدہ ہند میں چھوٹے چھوٹے مسلم تہذیبی وفاق کا خواب دیکھا تھا جس نے جناحؒ کی قیادت میں ایک علیحدہ ملک کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ آزادؒ کو اس بات کا یقین تھا کہ اس ملک پر ہزار سالہ حکمرانی کرنے والی امت شمالی ہند کے اہم مراکز دہلی اور آگرہ کی سیاسی تاریخی جاہ و حشمت کو خیرباد کہہ کر کسی اور طرف ہجرت نہیں کر پائے گی۔ انہیں اپنے قریبی کانگریسی رفقاء اور بالخصوص گاندھی جی، جن کے لئے متحدہ ہندوستان ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا، پر بھرپور یقین تھا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم جیسے فیصلے کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ انہیں اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اگر مسلم لیگ کے مطالبوں کو کسی حد تک تسلیم بھی کر لیا گیا تو متحدہ ہندوستان میں ان کی مرکزی حیثیت مجروح نہ ہوگی اور آنے والے دنوں میں ان کے لئے امام الہند کی حیثیت مزید اعتبار حاصل کر لے گی۔ آزاد کو اس بات کا بھی اندزہ تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت جن لوگوں پر مشتمل ہے وہ کسی عظیم مقصد کے لئے معمولی سی قربانی دینے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر مطالبہ پاکستان کی تحریک اور اس کی قیادت کسی واقعی آزمائش سے دوچار ہوتی ہے تو جناحؒ کے اردگرد جمع ہونے والے لوگ جلد ہی منتشر ہو جائیں گے۔ لیکن جناحؒ کی زبردست قوت ارادی نے ان کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت کر دیا اور انہیں سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگا جب پٹیل اور نہرو تو کجا خود گاندھی جی نے تقسیم کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ تب آزاد کو ایسا لگا جیسے ان کے قدموں سے زمین نکل گئی ہو۔ ان کے پاس کوئی سہارا نہ رہا جس پر وہ ٹیک لگاتے۔ منقسم ہندوستان کے نئے نقشہ میں اگر ایک طرف جناحؒ کو بانی ریاست کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی تو دوسری طرف نہرو کو آزاد ہندوستان کے نئے معمار کی حیثیت سے سامنے آنے کا موقع مل رہا تھا۔ آزاد جو ہمیشہ سے سیاست میں کلیدی کردار ادا کرتے رہے تھے اور جنہیں متواتر کانگریس کی قیادت کا موقع ملتا رہا تھا قوت کے نئے میزانئے میں اب ان کی Relevance بڑی حد تک ختم ہو چکا تھی۔

منقسم ہندوستان میں جب کانگریس کے دوسرے قائدین کے لئے جشن و طرب کا خاصا جواز تھا، جب پٹیل کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کا ملک محض انگریزوں کی نوے سالہ غلامی سے آزاد نہیں ہوا بلکہ صدیوں کی سیاسی غلامی سے اسے نجات ملی ہے، تب دور، بہت دور تن تنہا گوشہ تنہائی میں ابوالکلام آزادؒ کو ایسا لگا جیسے اسلاف کی اس دلی پر عظمت رفتہ کا سورج شاید اب کبھی طلوع نہ ہو سکے گا۔ عظمت رفتہ کا یہ خواب اور سخت مایوسی میں امیدواروں کے چراغ جلانے کی کوشش بالآخر خطابت کے قالب میں ڈھل گئی جسے جامع مسجد کی تاریخی معرکۃ الآراء تقریر سے موسوم کیا جاتا ہے۔

آزاد کا یہ غم ذاتی سطح پر خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو انہیں نئی صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دینا تھا۔ البتہ ایک ایسے شخص کے لئے جس کی ساری ترکیبیں ناکام ہوگئی ہوں، اندازے الٹ پلٹ گئے ہوں اور جسے ایسا لگا ہو جیسے اب اس اندھیرے سے نکلنے کے لئے کوئی راستہ ملنا مشکل ہے، اس کے لئے یہ کیوں کر ممکن ہوتا کہ وہ اب عمر کے اس مرحلے میں کسی نئے طریقہ سفر کا ڈول ڈالتا۔ دیکھا جائے تو نئے ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی

سیاسی منزل بالکل ابتدائی دنوں سے ایک بے یقینی اور بے سمتی کا شکار رہی۔ جائیں تو جائیں کہاں؟ سیاسی سفر کی حتمی منزل کیا ہونی چاہئے؟ ہم اس ملک میں سیاسی طور پر کیا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ایک شکست خوردہ سپاہی کے لئے کسی ایسے سوال کا واضح جواب فراہم کرنا ممکن نہ تھا جو نئی سمت میں سفر کی دعوت دیتا ہو۔ تب سے اب تک اس ملک میں ہمارا سیاسی قافلہ ان بنیادی سوالات کے واضح جوابات دریافت نہیں کر پایا ہے۔ گویا جس بے سمتی میں نئے ہندوستان کے مسلمان آج سے پچاس پہلے مبتلا تھا آج بھی وہ کم وبیش وہیں نظر آتے ہیں۔ یقیناً گذشتہ نصف صدی میں مسلمانوں نے سیاست میں چلت پھرت جاری رکھی ہے۔ ہمارا سیاسی قافلہ کلی طور پر جمود کا شکار نہیں رہا ہے، لیکن کسی واضح سمت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم بار بار اس دائرے میں گھومتے رہے اور اسی نقطہ پر پہنچتے رہے جہاں سے کبھی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ آج جب اس سفر کو پچاس برس پورے ہو چکے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی سابقہ پیش رفت یا بے سمتی کا انتہائی معروضی انداز ے سے جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ماضی میں اگر قافلے کے رہنماؤں سے بعض بنیادی نوعیت کی غلطیاں ہوئی ہیں تو ان کا تدارک اب کیسے کیا جائے؟ محض کسی شخص، گروہ یا رہنما کو مورد الزام ٹھہرانے سے مسئلہ حل ہوگا اور نہ ہی ماضی کی شخصیات کی تقدیس کا نغمہ گانے سے مستقبل کے لئے کوئی راستہ نکل سکے گا۔

اپنی بساط بھر ابوالکلام آزادؒ نئی صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں کو حوصلہ دلانے کے لئے جو کچھ ممکن تھا کرتے رہے۔ وہ ایک شکست خوردہ سپاہی ضرور تھے لیکن انہوں نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالا۔ البتہ تھے وہ بہر حال انسان، جسے قریب ترین رفقاء کی بے وفائی کا داغ لگا تھا۔ مایوسی اور ناکامیوں نے ان کے دل ودماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ اپنی بہت کوششوں کے باوجود وہ ایک بالکل تازہ دم سپاہی کی طرح نئے سفر کا آغاز نہیں کر پائے، کہ وہ بہر حال انسان تھے اور ہر انسان خواہ وہ کتنی ہی غیر معمولی صلاحیت کا حامل کیوں نہ ہو اس کی Limitations تو بہر حال ہوتی ہیں۔ ان کے ہر صحیح اور غلط اجتہاد کے لئے اللہ کے یہاں اجر موجود ہے، البتہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ نئے سفر کی ابتداء جسے کسی وجہ سے مولانا آزادؒ انجام نہ دے سکے، اب ہم اس سمت میں ایک منصوبہ بند پیش قدمی کا آغاز کریں۔ البتہ اس سے پہلے کہ ہم سفر کا آغاز کریں بہتر ہوگا کہ گزشتہ پچاس سالہ سیاسی سفر کا ایک ناقدانہ جائزہ لیں اور ان وجوہات کا پتہ چلانے کی کوشش کریں جس کی وجہ سے ہمارے متقدمین صحیح سمت میں نئے سفر کا آغاز نہیں کر پائے۔ گویا ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ ہم اپنے بزرگوں کے کامیاب اور ناکام تجربوں سے کیا کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ پھر اگر اس مرحلے میں بعض بنیادی غلطیوں کا پتہ لگایا جاسکا تو ہمارے لئے ممکن ہوگا کہ ہم مستقبل میں ان غلطیوں سے اپنا دامن بچا سکیں۔

"تقسیم کے فوراً بعد ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی قیادت کے لئے بنیادی طور پر جو چند افراد یا گروہ میسر آئے ان میں ابوالکلام آزادؒ کا مقام سب سے نمایاں تھا۔ بیشتر مسلمان جو جناحؒ کی سیاسی قیادت کے اسیر تھے وہ پاکستان منتقل ہو رہے تھے۔ بعض مسلم لیگیوں نے اب نئے حالات میں کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ گو کہ جنوب میں مسلم لیگ کے بعض

حلقے اب بھی لیگی سیاست کو نیا روپ دینے میں مصروف تھے، لیکن یہ حلقہ بہت مختصر تھا۔ پھر چونکہ مسلم لیگ کی ہوا منقسم ہندوستان میں اکھڑ گئی تھی اس لئے ہندوستانی مسلمان اب اگر سیاسی رہنمائی کے لئے کسی طرف دیکھتے تھے تو وہ بنیادی طور پر ابوالکلام آزادؒ کی ذات تھی۔ آزاد کے اردگرد نیشنلسٹ مسلمانوں اور جمعیۃ العلمائی مولویوں کا بھی ایک حلقہ تھا جن میں بعض سربرآوردہ شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ لیکن سیاسی اعتبار سے ان کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی بلکہ یہ سب سیاسی رہنمائی کے لئے آزاد کی طرف ہی دیکھتی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ مذہبی حلقوں میں مولوی حسین احمد مدنیؒ کے گہرے اثر ورسوخ کی وجہ سے اور پھر ان سابقہ سیاسی سرگرمیوں کے باعث بھی رہنمائی کے لئے مسلمانوں کی نگاہیں ان کی طرف اُٹھتی تھیں۔ لیکن سیاسی اعتبار سے دیوبندی علماء ہوں یا جمعیۃ العلماء سے متعلق افراد، ان سبھوں کی حیثیت آزاد کی تتمہ Extension سے زیادہ نہ تھی جو متفقہ طور پر کم ازکم القاب وآداب کی حد تک تو ابوالکلام آزادؒ کو امام الہند تسلیم کرتے ہی تھے۔ گویا نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا کام کلی طور پر آزاد کے کندھوں پر آپڑا تھا۔ آزاد اور ان کے حلقہ احباب کے لئے ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ نئے ہندوستان میں ان کا سیاسی فلسفہ پوری طرح بے محل (Irrelevant) ہو چکا تھا۔ بالکل نئے راستے پر قافلے کو لے چلنے میں یہ خطرہ تھا کہ انہیں اپنے سابقہ سیاسی نظریات کو یکسر مسترد کرنا پڑا۔ ایسا کئے بغیر نئے لائحہ عمل کی ترتیب مشکل ہی نہیں ناممکن تھی۔ آگے چل کر سید محمود نے کسی حد تک سابقہ جامد سیاسی تصورات سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی البتہ وہ کوئی واضح راستہ بنانے میں ناکام رہے۔ آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ نئے ہندوستان میں سیاسی قائدین کی پہلی نسل کو فکری اور نظریاتی سطح پر کن سوالوں سے الجھنا پڑا۔

منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے یہ تین بڑے راستے تھے۔ اولاً متحدہ قومیت کے جس راستے پر وہ اب تک گامزن تھے اور ملک کی سیاست میں غیرمسلموں کے اشتراک سے جو رول ادا کرنا چاہتے تھے اسی سابقہ رویے پر گامزن رہیں۔ ثانیاً صورت حال کے یکسر بدل جانے سے اب جب سابقہ سیاسی رویے کی فرسودگی پوری طرح واضح ہو چکی تھی اس رویے کو یکسر ٹھکرا کر ایک نئے روپ کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ثالثاً، متحدہ قومیت کا انکار یا اقرار کئے بغیر اب نئی صورت حال کے پیش نظر کتاب وسنت کی رہنمائی میں ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے لیکن ایسا کرنے میں بھی اپنی ناکامی کا اعتراف اور سابقہ سیاسی رویے سے اپنی برات کا اظہار کرنا پڑتا۔ پھر تقسیم کے بعد مسلمانوں کی جان ومال کو جو سخت خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور ہر طرف جس بڑے پیمانے پر قتل عام کا بازار سجایا جارہا تھا اس نے قائدین کو کسی نئی ابتداء کے بجائے ایک ایسے عمل پر مجبور کر دیا جس کا ماحصل صرف اور صرف یہ تھا کہ اس ملک میں زندگی کی امان پانے کے لئے کچھ جواز فراہم ہو جائے۔ لہٰذا ابتدائی دنوں میں ہماری سیاسی رہنمائی بنیادی سوالوں سے بڑی حد تک اپنا دامن بچائے رہی۔ لکھنو کنونشن ۱۹۴۷ء، جسے نئے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مسلمانوں کے پہلے سیاسی اجتماع کی حیثیت حاصل ہے، وہاں اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوا کہ چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کیا گیا کہ مسلمان اس ملک کے وفادار ہیں، لہٰذا اپنی اس وفاداری اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی خدمات کے طفیل

انہیں بھی زندگی جینے کا حق دے دیا جائے۔ جمعیۃ العلماء کے ایک سرکردہ عالم مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی وفاداری کا اعلان کچھ اس طرح کیا:

> ''بے شک ہم وفادار ہیں مگر صرف مادر وطن کے وفادار ہیں۔ کانفرنس نے تمھیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو اور کسی ایسی سیاسی جماعت میں شرکت کرو جو ہندو اور مسلمانوں کے لئے برابر ہو، میں کہتا ہوں کانگریس میں شرکت کرو کیونکہ اس بہتر کوئی جماعت ہمارے سامنے نہیں ہے مگر کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہو۔ اگر تم پناہ ڈھونڈنے کے لئے کسی جماعت میں شریک ہوتے ہو تو اس سے نہ جماعت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ تمہاری شرکت ملک کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔''

(الجمعیۃ، قومی اتحاد کانفرنس نمبر، ص۲۳)

مولانا آزادؒ جنھیں اب تک ہندوستانی مسلمانوں سے یہ شکایت تھی کہ انہوں نے متحدہ قومیت کے نعرے پر کھلے دل سے ان کا ساتھ نہیں دیا ہے اور جو نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی امید کا واحد مرکز بن گئے تھے، انھوں نے اس کانفرنس میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ مسلمان اب نئی صورت حال میں کھلے دل سے ان کا ساتھ دیں، مشترکہ سیاست میں حصہ لیں اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کا اور اہل وطن کا ہاتھ بٹائیں۔ البتہ نئے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا اس بارے میں مایوسی، خوف اور اندیشے ان کے دل و دماغ پر بری طرح طاری تھے۔ اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر تو دور کی بات اب تو انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے قریبی رفقاء اور ان کی نئی حکومت مسلمانوں سے ان کی اسلامی شناخت چھین لینے کے درپے ہے۔ مولانا کی یہی مایوسی اور خوف خطاب میں کچھ اس طرح ڈھل گئی:

> ''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔''

(ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی، فرقہ واریت مخالف کنونشن نمبر، ص۴۵)

لکھنو کانفرنس نئے ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کسی نئے سیاسی رویے کی داغ بیل نہ ڈال سکی۔ اس وقت جو مسئلہ سب سے اہم تھا وہ یہ کہ کسی طرح مسلمانوں کی جان و مال بچالی جائے، ان کا کھویا ہوا حوصلہ بحال ہو اور حکومت وقت کو یہ یقین دلایا جائے کہ ملک کے ۴ کروڑ مسلمان وفاداری میں دوسرے اہل وطن سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ اب ان کا مفاد اس ملک کے مفاد سے وابستہ ہے۔ اگر وہ اس ملک میں اپنا کوئی مستقبل دیکھتے ہیں تو یہ دوسری اقوام کے

مستقبل سے مختلف کوئی مستقبل نہیں۔حتیٰ کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ملی مفاد بھی تقسیم ہو چکا ہے اور امت مسلمہ کا وہ حصہ جو ہماری جغرافیائی سرحدوں سے باہر ہے، ہندوستانی مسلمان ان کے مسائل اور مفادات سے کچھ بھی غرض نہیں رکھتے۔ان ہی دنوں علمائے ہند کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی تقریر میں اس نکتے کی وضاحت کچھ اس طرح کی:

''تقسیم ہند نے مسلم مفادات بھی تقسیم کر دیئے ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ جو چیز پاکستانی مسلمانوں کے لئے مفید ہو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی مفید ہو بلکہ ممکن ہے کہ کوئی معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لئے مفید ہو اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہو۔ظاہر ہے کہ ہم پر پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔ہمیں ہر موقع پر وہ صورت اختیار کرنی ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ہم اسلامی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے جس قدر اس پر صحیح طور سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے اسی قدر وطن عزیز کے بہترین بہادر محافظ اور اس کے اہم ترین جز ثابت ہوں گے۔''

(الحرم میرٹھ۔مولانا حسین احمد مدنی نمبر،ص۴۱۱)

گویا سیاسی رہنماؤں کی پہلی نسل نے مسلمانوں کو جس راہ پر لے چلنے کی کوشش کی اس میں اسی بات پر زور تھا کہ وطن عزیز کے لئے بہترین اور بہادر محافظ کا کام ان سے لیا جائے۔ان کے اندر وطن پرستی اور وطن کی خدمت کا جذبہ بیدار کیا جائے تاکہ پاکستان کے بننے سے ہندوستانی مسلمانوں کے دامن پر جو داغ لگا تھا اسے کسی حد تک دھویا جا سکے۔دیکھا جائے تو پہلے دور کی سیاست بڑی حد تک اسی Complex بلکہ Guilt کی مرہون منت ہے۔ساری کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ ہم پر وطن سے بے وفائی کا جو الزام ہے، ایک علیحدہ شناخت اور علیحدہ قومیت کے قیام کا جو الزام ہے، اسے کسی طرح دھویا جا سکے۔ظاہر ہے کہ کسی ایسی مجروح ذہنیت کو باحوصلہ اور بالغ نظر قیادت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔یہی وجہ ہے کہ متحدہ قومیت کے تلخ نتائج کے سامنے آجانے کے باوجود آزاد اور ان کے رفقاء کے لئے کسی نئے راستے کی نشاندہی کا کام مشکل رہا۔رہے یہ سوالات کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی منزل کیا ہوگی؟ وہ اس ملک میں اپنے لئے کون سا سیاسی نظام پسند کرتے ہیں اور کسی ایسی منزل کے حصول کے لئے کیا کچھ کرنا ہوگا؟ تو ان سوالات کا وقتاً فوقتاً اجمالی جواب فراہم کرنے کی کوشش تو کی گئی لیکن جس انداز سے ان اہم بنیادی سوالوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی اس مسئلے کو نظری طور پر سلجھانے کی بجائے مزید الجھا دیا۔

آزادؒ ہوں یا مدنیؒ یہ دونوں حضرات عام سیاسی لوگ نہ تھے بلکہ ان کی دین اور اس کے مطالب پر بھی گہری نظر تھی۔وہ خوب جانتے تھے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان میں ان کے کرنے کا کام کیا ہے بلکہ آزادؒ نے تو اپنے کیریر کا آغاز ہی حزب اللہ جیسی انقلابی تنظیم کے خدوخال مرتب کرنے سے کیا تھا۔سابق دارالاسلام کو دوبارہ دارالاسلام

بنانے کے خواب سے وہ زندگی بھر اپنا پیچھا نہ چھڑا سکے۔ مولانا مدنیؒ ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے اہم دینی درسگاہ کے سربراہ تھے۔ انھیں ایک سیاسی Visionary کی حیثیت حاصل نہ بھی ہو پھر بھی درس وارشاد کے حوالے سے وہ داعی تو غلبہ اسلام کے ہی تھے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی منزل متعین کرنے کا سوال جب بھی آیا، ان حضرات نے اشارہ اسلام اور اسلامی اقدار کے غلبے کی طرف ہی کیا۔ البتہ راستے کی یہ نشاندہی اتنی مبہم، مجمل اور غیر واضح تھی کہ اس سے کسی واقعی سمت کا پتہ چلنا مشکل تھا۔ واضح طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات وطن عزیز کی وفاداری اور اللہ کی وفاداری کے درمیان ایک کشمکش سے دوچار ہوں۔ ایک طرف تو ان کے ذہنوں پر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا خواب چھایا ہوا تھا اور دوسری طرف خود ساختہ سیاسی نظریات بالکل مخالف سمت میں ان کے قدموں کو لئے چلتے تھے۔ اس کشمکش نے آزادؒ کو آنے والے دنوں میں سخت قنوطیت، مایوسی اور احساس شکست سے دوچار کر دیا اور حسین احمد مدنیؒ سیاست کے میدان سے بڑی حد تک کنارہ کشی اختیار کر کے درس وارشاد اور گوشہ نشینی پر مجبور ہو گئے۔ ان بزرگوں کے دل ودماغ میں خواب اور عمل کی کشمکش کس شدت کے ساتھ برپا تھی اس کا کچھ اندازہ حسین احمد مدنیؒ کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے نئے ہندوستان میں اسلام کے روشن مستقبل کے سلسلے میں کی تھی:

> ''عام شہری کی زندگی میں جو تلخی اس وقت موجود ہے وہ عارضی ہے۔ یقین ہے کہ جلدی ہی یہ تلخی خوش گوار تعلقات کی شیرینی سے بدل جائے گی۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل زیادہ شاندار اور روشن ہو تو ان کا فرض ہے کہ اپنے عمل وکردار سے اپنی اہمیت وافادیت ثابت کریں۔ انڈین یونین کے لئے وہ جس قدر زیادہ مفید ثابت ہونگے اتنی ہی ان کی عزت ووقعت ہوگی۔ جمہوری نظام حکومت میں نسل، مذہب خاندان ترقی کا مدار نہیں ہوتا بلکہ خدمت وقابلیت معیار ترقی ہوا کرتی ہے۔ ملک وملت کی خدمت کا صحیح جذبہ اور بہترین قابلیت پیدا کریں، لامحالہ کامیابی وکامرانی ان کے ہم آغوش ہوگی۔''
>
> (الحرم میرٹھ، حضرت مدنی نمبر، ص ۴۱۱)

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک ملک بھر میں منعقد ہونے والے سیاسی اور غیر سیاسی اجلاس میں جو گفتگو سننے کو ملتی ہے اس میں کم وبیش اسی قسم کی باتیں سامنے آتی ہیں۔ رہی یہ بات کہ ملک وملت کی خدمت کا صحیح جذبہ کیسے پیدا ہوگا اور خود ''خدمت'' سے دراصل کون سی خدمت مراد ہے اور سب کچھ کس ''شاندار'' اور ''روشن مستقبل'' کی طرف لے جائے گا اس کی تفصیلات سے یا تو دانستہ دامن بچانے کی کوشش کی گئی یا ان حضرات کے ذہنوں میں سرے سے کوئی واضح خاکہ موجود نہ تھا۔ لکھنو کنونشن سے بلند ہونے والی آواز نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جس سیاسی راستے کی نشاندہی کی تھی اسے مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ ملک اور ملت کے مفاد میں کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا مسلمانوں کو ملک وملت کے مفاد میں کام کرنا چاہئے۔

۲۔ مشترکہ سیاست کو واحد سیاسی لائحہ عمل کے طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی منشور کی بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اب اگر اس ملک میں کوئی سیاسی جدوجہد ہو سکتی تھی تو غیر مسلم اقوام کے ساتھ مل کر ہی۔

۳۔ ہندوستانی مسلمانوں کا مفاد اب جغرافیائی حدود میں محدود تھا اور جو کچھ ان کے حق میں مفید ہو سکتا تھا بعینہ یہی چیز ہندوستان کے باہر مسلم قوم کے لئے مضر ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کو صرف اپنے مسائل سے غرض رکھنی تھی۔ عالم گیرامت کے مفاد پر اب متحدہ قومیت غالب آ چکی تھی۔

۴۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ نظام حکومت اب لبرل ڈیموکریسی کے اصولوں پر مرتب کیا جائے گا جس میں سیکولرازم کو ایک بنیادی نظری فلسفے کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اب مسلمانوں کو اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے اپنا راستہ بنانا تھا۔

۵۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا کوئی بھی خواب دوسری ہم وطن قوموں کے مستقبل سے جداگانہ نہ ہوگا۔ نئے ہندوستان کی تعمیر کے لئے ہندو اور مسلمان مشترکہ طور پر جدوجہد کریں گے۔ گویا ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت (Destiny) اب ملک کی قسمت سے وابستہ ہوگی۔

ان بنیادی اصولوں کے تعین کے بعد لکھنو کانفرنس نے یہ اعلان کیا کہ اب اس ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی علیحدہ سیاسی پارٹی یا علیحدہ سیاسی فکر نہیں ہوگی لہٰذا جمعیتہ العلماء جسے اب تک قوم پرست مسلمانوں کے سیاسی جرگے کی حیثیت حاصل تھی اسے ایک پارٹی کی حیثیت سے تحلیل کر دیا گیا اور اس کا کام صرف یہ قرار پایا کہ وہ دینی اور ثقافتی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی تک خود کو محدود رکھے۔ البتہ جمعیتہ کے افراد انفرادی طور پر سیاست میں حصہ لینا چاہیں تو وہ کانگریس کے بینر تلے میدان میں آئیں۔ ان اعلانات سے تقسیم آزادی کا داغ مسلمانوں کے دامن سے شاید کسی حد تک دھل گیا ہو اور کسی حد تک متعصب ہندوؤں کی نظروں میں مسلمانوں کا اعتبار بھی قائم ہو گیا ہو، البتہ ان اعلانات نے آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے سیاسی عزائم پر مہر لگا دی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا خود کانگریسی حلقے کے مسلمانوں کو ایسا لگا جیسے لکھنو کانفرنس نے ان ہاتھ پیر باندھ دیئے ہوں۔ ۱۹۶۴ء میں اسی احساس کی شدت نے سید محمود کو روایتی سیاست سے بغاوت پر آمادہ کیا۔

سید محمود کو یہ احساس ستائے دیتا تھا کہ آخر مسلمان کانگریس کے ہاتھوں پے در پے ہزیمتیں اٹھانے کے باوجود اپنے آپ کو روایتی طور پر اس کا خادم کیوں گردانتے ہیں۔ اگر ملک میں دوسری سیاسی قوتیں نئے نعروں کے ساتھ سامنے آ رہی ہیں تو مسلمان ان کی حمایت کیوں نہ کریں۔ گویا ایک سابقہ سیاسی رویے میں تبدیلی کی ضرورت ناگزیر ہے۔ سید محمود پر یہ بات بھی واضح ہو چکی تھی کہ اس ملک میں کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ دوسری ملی اور دینی جماعتیں بھی سرگرم عمل ہیں جو امت

کے احیاء اور اس کی سربلندی کے لئے بھلا برا کچھ نہ کچھ پروگرام رکھتی ہیں۔ پھر کیوں نہ ان گروہوں اور جماعتوں کا بھی تعاون حاصل کیا جائے کہ کانگریس کے مکار سیاستدانوں کے مقابلے میں تو بہر حال یہ جماعتیں زیادہ قابل اعتبار تھیں اور امت کے تئیں ان کی وابستگی شکوک وشبہات سے بالاتر تھی۔ لہٰذا پہلی مرتبہ نئے ہندوستان میں مسلم لیگ کانگریس سے الگ ہو کر ملی دھارے میں شامل ہوگئی۔ سید محمود نے معروف شخصیات، علماء اور سیاست دانوں کے علاوہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو بھی مل بیٹھنے اور مشترکہ ملی لائحہ عمل تیار کرنے کی دعوت دی تھی۔ کہنے کو یہ فی نفسہ ایک بڑا اقدام تھا جس سے کانگریس کے حلقوں میں سید محمود کو تنقید کا نشانہ بننا پڑا لیکن اپنے اہداف میں نوتشکیل شدہ مسلم مجلس مشاورت سابقہ سیاسی رویے کا ہی تتمہ تھی، جس کا مقصد کسی نئے سیاسی رویے کی تشکیل نہیں بلکہ موجودہ نظام کے اندر ہی مسلمانوں کے اتحاد کے ذریعہ ان کی سیاسی قیمت میں کچھ اضافہ کر دینا تھا۔ مختلف سیاسی پارٹیوں تک سفارتیں پہنچائی گئیں اور کچھ لے دے کر مسلم ووٹوں کے عوض ملی مفادات کے حصول کی کوشش جاری رہی۔ لیکن عملی طور پر نہ تو سید محمود کسی نئے تجربے کے موڈ میں تھے اور نہ ہی اس کنونشن سے کسی واضح سیاسی راستے کی نشاندہی ہو سکی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے باحوصلہ افراد میں آزاد سیاست کا امکان روشن ہو گیا۔ اسی تجربے سے حوصلہ پا کر آنے والے دنوں میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے مسلم مجلس کا ڈول ڈالا جس کے حیرت انگیز نتائج نے محدود وقفے کے لئے ہی سہی امکانات اور امیدوں کے بند دروازے کھول دیئے۔

۱۹۴۷ء کی لکھنو کانفرنس سے لے کر ۱۹۶۴ء کے لکھنو کنونشن تک ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی سفر جن بنیادی اصولوں پر جاری رہا اسے کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

لکھنو کانفرنس ۱۹۴۷ء زیر صدارت مولانا آزاد	لکھنو کانفرنس ۱۹۶۴ء زیر صدارت سید محمود
ا۔ کانگریس مسلمانوں کی جان ومال کی محافظ ہے اس لئے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو جانا چاہئے۔	ا۔ مسلمان کانگریس کے ہاتھوں پریشان ہو چکے ہیں اس لئے دوسری پارٹیوں کو بھی آزمانا چاہئے۔
۲۔ ملک کی سیاست میں مسلمانوں کو غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کرنی چاہئے۔	۲۔ ملک کی سیاست میں مسلمانوں کو مؤثر بنانے کے لئے مسلم گروہوں اور جماعتوں کا اتحاد ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے متحدہ ووٹ کے ذریعہ کسی سیاسی پارٹی سے معاملہ کر سکیں۔
۳۔ سیکولر جمہوری نظام میں خدمت کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی حیثیت منوانی چاہئے اور اسی نظام کے اندر اپنی ترقی کا راستہ ڈھونڈنا چاہئے۔	۳۔ مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ مل کر دستور کی جمہوری اقدار کے نفاذ کی سبیل پیدا کرنی چاہئے۔
۴۔ مسلمانوں کو ملک کی ترقی کے لئے دوسروں سے کہیں بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنی چاہئے اس لئے کہ یہ ملک اتنا ہی ہمارا ہے جتنا دوسری قوموں کا۔	۴۔ مسلمانوں کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ ملک کی ثقافتی، سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی کے دھارے سے دور نہ ہو جائیں اور ملک کی ترقی میں بھرپور رول ادا کریں۔

۵۔جمعیتہ العلماء کوایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے تحلیل کیا جاتا ہے۔آنے والے دنوں میں انفرادی طور پر مسلمان کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاست کریں گے،مسلمانوں کی علیٰحدہ سیاسی شناخت نہیں ہوگی۔	۵۔مسلم جماعتوں کا وفاق ملک کی سیاست پر براہ راست اثر انداز ہوگا،البتہ کوئی ایساسیاسی قدم نہیں اٹھایا جائے گا جس سے علیٰحدگی پسندی کا الزام لگ سکے یا علیٰحدہ مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کا امکان پیدا ہو۔(۱۹)

اورتو اور خود مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی کانگرس میں ہندو ذہنیت کی برتری اور زعم،کانگرسی نیتاوں کی مسلم دشمن چالوں اور جالوں سے حد درجہ نالاں نظر آتے ہیں،ان کی سیاسی سوانح (India Wins Freedom)میں یہی تاثر عام ہے۔جبکہ اس کتاب کے تیس صفحات کو اپنی وفات کے تیس سال بعد تک موخر کرنے کی حقیقت کا واضح مطلب بھی اس کے سوا اور کیا باور کراتا ہے کہ جیتے جی مولانا ابوالکلام آزادؒ کو اس میں حکمت نظر نہیں آئی کہ وہ جوہرلعل نہرو اور سردار پٹیل پر رائے زنی کرسکیں،ظاہر ہے کہ اسے بزدلی کہنا تو مناسب نہیں البتہ مصلحت کا تقاضا گردانا جاسکتا ہے۔امام الہند سے امام الکانگرس کے اس سفر میں اتنی تو روعایت روا ہونی چاہیے۔اب تیس سال بعد ان تیس صفحات کے اصل،نقل یا جعلی ہونے کے خدشات و مقدمات کے باوصف ایک بات تو کہی جاسکتی ہے کہ اس میں پنڈت جواہرلعل نہرو،سردار پٹیل اور دیگر کانگرسی نیتاوں پر مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ارشادات بلکہ الزامات بسمل کی تڑپ ضرور ہیں۔مگر افسوس کہ یہ انکشاف تیس سال کے بعد ہوا ہے۔

ع ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

شاید اس سے بہتر مقام کیلئے کہا نہ جاسکے بلکہ ان صفحات اور خود آزادی ہند کے مطالعے سے مولانا آزادؒ خود اندرونِ کانگرس اور اندرون حکومت جس سیکولر جمہوریہ بھارت کے مرکزی وزیر تعلیم اور ڈپٹی پارلیمانی لیڈر کے طور پر گویا ہیں،اس

ع میں ہوں اپنی شکست کی آواز

کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ انجام واختتام ہے اس شخص کا،جو مسلمانوں کی قومی جدوجہد سے منحرف ہوکر،انڈین نیشنل کانگرس کی سیاست کو متحدہ قومی سیاست گردانتا رہا،وہ ہندو،مسلم آویزش کے سیاسی اور فیصلہ کن معرکوں تک انڈین نیشنل کانگرس کا صدر بنائے جاتے رہے۔مگر ۱۹۴۶ء کے بعد اس کی سیاسی ضرورت نہ رہی تو یہی بزرگ انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے کرپس مشن کے ساتھ مذاکرات بلکہ قلم دوات کے ساتھ علم الکلام پر اُتر آئے،اور اگر ہندو مت کی فکری سیاست کا یہ رُخ ملاحظہ کرنا مقصود ہو تو مولانا ابوالکلام آزادؒ ہی کی شخصیت کا انجام،ایک حیرت انگیز مطالعہ ہے۔بلا شبہ کانگرس میں ان کا مقام اور نام بلکہ کانگرسی نیتاوں خاص طور پر گاندھی اور پنڈت جواہرلعل نہرو ان کے لئے جو احترام روا رکھتے رہے وہ بظاہر خاصا قابل قدر رویہ قرار دیا جاسکتا ہے،مگر جب اور جس وقت یہی ابوالکلام آزادؒ اپنی ذاتی حیثیت یا شخصیت سے باہر آکر مسلم قوم کیلئے کچھ کہتے،سنتے تو کانگرس میں حالت کیا ہو جاتی تھی وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہندو کے لئے مسلمان ایک ہیجان ہے۔

کانگرس کے اندر بھی دوقومی نظریہ!

مولانا مرحوم کے ممتاز سوانح نگار آغا شورش کاشمیری نے کرپس مشن سے مذاکرات اور اس میں مسلمانان ہند کیلئے آئینی تحفظات کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندو کانگرس کا اندرون خود مولانا آزادؒ کے حوالے سے ظاہر کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ

> ''مسلمانوں کے خدشات کا ازالہ کرنے کیلئے مولانا ورکنگ کمیٹی (کانگرس) میں بعض تجاویز کے محرک تھے۔ کہ مسلمانوں کا اعتماد ان سے بحال ہوسکتا تھا۔ وہ تمام تجاویز کانگرس کی مجلس عاملہ کے نزدیک ناقابل قبول تھیں۔ اس باب میں اکادکا ارکان ہی مولانا کے حامی تھے۔ واقعی امر یہ ہے کہ مولانا نے دستوری نقشے میں مسلمانوں کیلئے تحفظات کا جو منصوبہ تیار کیا اس پر گاندھی جی نے مولانا سے کہا تھا کہ ''اس سے پاکستان مان لینا بہتر ہے۔ مولانا نے اپنی توضیحات پیش کیں، تو گاندھی جی نے ان سے کہا کہ آپ کا ذہن یہی ہے تو آپ کی جگہ لیگ میں ہے آپ کانگرس سے مستعفی ہو کر لیگ میں چلے جائیں۔'' (۲۰)

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کا مولانا آزادؒ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کانگرس کے فرد نمائش (Show boy) ہیں، کس قدر بصیرت کا حامل ہے۔ اس پر مولانا آزاد کو مصور پاکستان علامہ اقبالؒ کے ہاں سے دوہائی کیلئے اگر ذیل کا شعر ان کی خدمت میں ہدیۃً پیش کیا جائے تو دوقومی نظریے کے علمبردار اور بانی پاکستان کے رستگار حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ ارشاد، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی حیثیت و کیفیت کا غماز ہے کہ مولانا آزاد کلاسیکی موسیقی بھی جانتے تھے اس لئے گویا ہیں کہ

وہی میری کم نصیبی وہی میری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا ، یہ کمال نَے نوازی

مگر معاملہ اور مسئلہ نہ ابوالکلام کا ہے نہ پاکستان کا بلکہ یہ ہندومت اور اس کی تاریخی روش کا ہے۔ انفرادی طور پر ہندو حد درجہ تابعدار، سمجھدار اور دھیما واقع ہوا ہے۔ مگر عجب المیہ ہے کہ اجتماعی کردار میں وہ ایک خونخوار صورت میں انسانیت پر پل پڑنے میں ماہر بھی ہے اور متحرک بھی اور ہندومت کے مطلب و مفاد کے خلاف کوئی سی حرکت بلکہ خفیف سی گنجائش برداشت نہیں ہوتی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ ہوں کہ دیگر نیشنلسٹ علماء و اکابرین، انہیں مسلم قوم کی اجتماعیت کے خلاف استعمال کرنا اور کام نکال لینے کے بعد منہ موڑ لینا، یہاں تک کہ ان ہی رہنماؤں کی زبان سے ان کی قوم کی پائمالی اور خستہ حالی پر دوہائی اور رونا بھی نہ سننا، ہندومت کا رویہ ہی نہیں ایک تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں دہلی (راج دھانی) میں مسلمانوں کے ساتھ جو بیتی، وہ گذشتہ صفحات میں جامع دہلی میں مولانا آزادؒ کی مظلوم و ہراساں مسلمان کیلئے ''ڈھارس بندھانے'' والی تقریر زیر بحث آ چکی ہے۔ مگر یہاں سے اٹھ کر جب وہ حکومتی اور انتظامی سطح پر اپنا اثر و رسوخ، اپنی

قوم کیلئے استعمال کرنے گئے، تو یہ اثر کس قدر غیر موثر ہو گیا، اس کی جھلک مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زبانی یہ ہے کہ

"دلی میں مسلمان مارے جا رہے تھے۔ لیکن پٹیل (وزیر داخلہ) کے لئے اس میں کوئی سانحہ یا صدمہ نہ تھا۔ جب پنڈت نہرو نے ان کو اس قتل عام پر متوجہ کیا تو وہ الٹا خفا ہو گئے۔"(۲۱)

اور یہ ہے ہندو مت یعنی بغل میں چھری اور منہ میں رام رام

یہی تجربہ مجلس احرار اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ کہ اس کا قیام لاہور کانگرس ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کے موقع پر اس کی جلسہ گاہ کے پنڈال میں ہوا، نام تک مولانا ابوالکلام آزادؒ نے تجویز کیا۔ جس کے پہلے صدر سید عطاء اللہ شاہ بخاری منتخب کیے گئے۔ وہ ایک نامور خطیب تھے، جن کی عوامی تقاریر کا آغاز بھی کلکتہ کانگرس کے اجلاس میں خطاب سے ہوا۔ تاہم ۱۹۳۱ء میں جب گاندھی نے نمکین ستیہ گرہ شروع کیا تو احرار رہنما اس میں شامل ہو گئے۔

لیکن ۱۹۴۶ء تک اس تنظیم کو سیاسی طور پر مسلم لیگ کے خلاف استعمال کرنے کے باوجود اپنی اس معاون جماعت کے زعماء کے لئے عملاً وقعت کیا تھی اس کی مجملاً صورت حال یہ رہی کہ

"۱۔ کراچی کانگرس (۱۹۳۱ء) کے موقع پر مہاتما گاندھی نے مجلس عامہ کے ارکان نامزد کرتے وقت (احرار کے) چوہدری افضل حق کو نظر انداز کر دیا اور ڈاکٹر عالم کو نامزد کر دیا۔

۲۔ امرتسر اور لدھیانہ کے ضلعی کانگرس کے انتخابات ہوئے اس میں احراری زعماء کے نامزد اشخاص کو شکست دی گئی حتیٰ کہ امرتسر میں غازی عبدالرحمان ہار گئے۔ جنہیں گاندھی تحریک خلافت میں لائل پور سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

۳۔ مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں شمول کیلئے لندن جا رہے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے بمبئی پہنچ کر ۱۰ اگست ۱۹۳۱ء کو ان سے ملاقات کی اور مشورہ (؟) دیا کہ وہ ڈاکٹر انصاری کے بغیر نہ جائیں اس طرح کانگرس ہندو جماعت ہو کر رہ جائے گی۔ مہاتما جی نے اتفاق کیا لیکن گول میز کانفرنس میں چلے گئے۔"(۲۲)

ظاہری روابط اور سیاسی مراسم کا انفرادی اور نجی ہندو مت یہ ہے کہ غوریؒ اور غزنویؒ کو 'خون آشام' لکھنے والا، پر بودھ چندر (سابق وزیر تعلیم بھارتی پنجاب) ۱۹۶۰ء میں دہلی سے لاہور آیا تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملنے ملتان گیا۔ شاہ جی سے کہا کہ 'پنڈت جی جواہر لعل نہرو سلام کہتے تھے اور ہاں اندرا گاندھی نے بھی سلام کہا ہے۔' شاہ جی غوطہ کھا گئے، پھر فرمایا

"بھائی پنڈت جی سے کہنا، جس عطاء اللہ شاہ بخاری کو آپ جانتے تھے وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مر گیا تھا۔ البتہ اندرا کو سلام اور دعا کہنا کہ وہ بیٹی ہے۔"(۲۳)

اور ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے (India wins Freedom) مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بھارت کی آزادی کے بعد بطور وزیر تعلیم بھارت طویل دورانیہ کا انٹرویو ہے جو ان کے بنگالی نژاد سیکرٹری ہمایوں کبیر نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جس کے بقیہ تیس صفحات تیس سال کے بعد شائع بھی ہو گئے ہیں جس پر شبہات اور مقدمات کے مراحل بھی درپیش رہے ہیں۔ البتہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان آزاد ہوا تو متحدہ قومیت کی علمبردار اور ہندوستان کی تمام قوموں کی دعوی دار جماعت کانگرس کو اقتدار ملنے کا حقیقی نام ہی تو ''ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے'' نہ کہ مسلمان آزادی حاصل کرتا ہے۔ یہ کتاب نہیں عمل اور عمل درآمد کا نقطہ آغاز تھا۔ اب پتہ چلا کہ متحدہ قومیت سے کیا مراد تھی، کیا مقصد تھا؟ دہلی کی جامع مسجد میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کا خطیبانہ جلال اپنی جگہ مگر ان کی حکومت کے ساتھ ہی وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو، وزیر داخلہ سردار پٹیل کو مسلمانوں کے دہلی اور اس کے نواح میں قتل عام سے روکنے اور بلوائیوں کو نکیل ڈالنے کے سلسلے میں خصوصاً سردار پٹیل وزیر داخلہ جو مولانا آزاد کو آزادی سے پہلے نیت اور طبیعت سے نواز چکے تھے ایک نامور صحافی کی خودنوشت نے یہ راز کھولا کہ

> ''سردار پٹیل کن ہواؤں میں تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے سردار پٹیل نے ایک گفتگو کے دوران مولانا آزادؒ کے منہ پر کاغذات کا پلندہ پھینک دیا تھا۔ ان کی اس حرکت کی تلافی خود گاندھی جی اور نہرو کو کرنا پڑی۔'' (۴۴)

ہندوستان کی آزادی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء مسلمانان ہند کیلئے متحدہ قومیت کی جنم بھومی کہاں بلکہ شمشان بھومی (مر گھٹ) بن گئی۔ متحدہ قومیت کے علمبردار، مولانا ابوالکلام آزادؒ اب بھارتی کابینہ کے پہلے وزیر تعلیم کے عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہو گئے، صرف دارالحکومت (راج دھانی) دلی میں متحدہ قومیت کی جس طرح درگت بن رہی تھی اس کے احوال و آثار کا مطالعہ و مشاہدہ اگر علمائے ہند کے ''انوار'' کہلائیں تو کابینہ کی اونچی مچان پر بیٹھے ابوالکلام آزادؒ مسلمانان دہلی کو سہارا دینے کیلئے جامع مسجد دلی ہی میں خطاب فرمارہے تھے اور دلی کے مسلمانوں کیلئے تمام ہندوستان ہی میں تمام ہندو عذاب بن چکے تھے۔

آزادی کی سہاگ رات سنکھ بجے پنڈت ماؤنٹ بیٹن کی جے جے کار میں بھارت کی راج دھانی دھلی میں مسلمانوں پر ہندو اور سکھ ٹوٹ پڑے۔ محض تین دنوں میں پانچ سو کے لگ بھگ مسلمان مارے گئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء تک کیا لوٹ مار مچی ہوگی۔ بھارت کے دارلحکومت دہلی کی جامع اسلامیہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر مشیرالحسن کی ۲۰۰۱ء میں چھپ کر آنے والی کتاب کا ایک ورق اُس ہولناک صورتحال کی عکاسی کرتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"In the Capital itself, crime was committed under the noses of the

guardians of the law, headed by the Home Minister, including the forcible possession of Muslim houses by Hindu and Sikh refugees in retaliation for the seizure of their own property in Punjab by Muslim refugees from East Punjab. In early September 1947, large gangs of hooligans broke into several Muslim shop and looted conaught place, the elaborate circular shopping avcaete designed by lutyens. No fewer than 500 people, mostly Muslims, were killed around Delhi from September 3 to 6."(25)

یہ دہلی اور اس کے نواح میں مسلمانوں کے قتل عام پر رویہ تھا اور کل ہند عدم تشدد کی علمبردار اور تمام ہندوستان کی ترجمان ہونے کی دعوٰی دار جماعت انڈین نیشنل کانگرس کی حکومت کے ذمہ داران کا، جو ایک دن پہلے ہندوستان بھر میں پھیلے ہندوؤں مسلمانوں تمام قوموں کی واحد نمائندہ ہونے کا بلند بانگ دعوٰی کیا کرتی تھی۔ مگر اختیار و اقتدار ملتے ہی وہ آزادی کی سہاگ رات میں ہی اس قدر بدمست ہوئی کہ مسلمانوں کے قتل عام پر متوجہ ہونا تو مقصود ہی نہ تھا۔ البتہ اس اقلیت کے معنوی ترجمان اور ایک سال قبل کانگرس کے پردھان (صدر) مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی غیر موثر ہو کر رہ گئے تھے۔ صاف کہنا چاہیے کہ اب وہ مولانا آزاد نہیں رہے تھے، وزیر تعلیم (شکشہ منتری) ہو گئے تھے۔ لیلائے وزارت کی ہم نشینی ان کی بے بسی کا مقام بن گیا۔ اور وجہ ظاہر ہے کہ اکثریت کا راج اور استبداد اب آریہ سماج بن گیا تھا۔ ان کی سنتا کون ہوگا ان کی سرکاری کوٹھی واقع ۴ کنگ ایڈورڈ روڈ نئی دہلی، بعض مسلمان گھرانوں کی پناہ گاہ بن گئی، اسکا واضح مطلب تو یہ ہے کہ دوقومی نظریے کے عملی تصادم نے ان کی استقامت و اقامت دونوں کو جا لیا۔ دیش بھگت اور گاندھی بھگت اب بگلا بھگت نہ رہے، خنجرِ خونخوار ہو گئے تھے۔ وہ جو چاہیں کر گزریں، مسلمانوں کو ماریں یا لوٹیں، انہیں کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا۔ جو لگام دے سکتے تھے فساد کی لگام خود ان کے تصرف اور ہاتھ میں تھی۔ اور مولانا اب خود آزاد نہ رہے۔ عملاً بے بس بلکہ پابند ہو گئے تھے مگر کس کے؟ صرف اپنی وزارت کے یا حالات کے، اپنی ذات کی حصاریت کے یا اپنی معنوی سیاست کے انجام کے۔ مگر حیرت ہے کہ جامع مسجد دلی میں انکا مسلمانوں سے خطاب طنز و تشنیع کا آمیختہ تھا۔ وہ بھیڑوں کے گلے کو بھیڑیوں سے پچکار رہے تھے۔ ان کی اپنی سوچ اور سیاست نے مسلمانان دہلی کو یہ دن دکھایا تھا اور نہ برعظیم کا مسلمان نہ بھیڑ تھا نہ بھیڑیا بلکہ وہ تو حد درجہ دلیر تھا۔ مگر قوم پرستانہ سیاست کی حکومت کے روز اولین اور ابتداء آغاز ہی میں وہ کانگرسی بھارت میں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ مولانا خود ابھی تک خود ہی کو ''ملت کے حدی خواں'' کے مقام پر فائز گردان کر دلی کے مجبور و مقہور مسلمانوں کو خمار رفتہ اور سلطنت گذشتہ کے صدیوں پہلے پدرم سلطان بود کے لہجے میں ڈھارس بندھا چلے تھے، حالانکہ امر واقعہ یہ تھا کہ وہ سلطنت گذشتہ (مغل عہد) کے یمین و یسار اپنے باپ، دادا، غوریؒ اور غزنویؒ کے قافلوں کے ہمراہ جمنا کے کنارے اترنے اور وضو کی کہانی سنا رہے تھے مگر وہ خود ان

غزنویؒ وغوریؒ کے جانی اور ایمان دشمن ہندوؤں کے غلبے اور نرغے کو اپنی انا کی تسکین جان چکے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے غزنویؒ وغوریؒ کے ان تاریخی اور روایتی دشمنوں کو اپنا سیاسی، پارلیمانی اور عصری رہنما چن لیا تھا۔ ان کی اکڑی گردن نہ مسلم عوام کے آگے جھکی نہ مسلم خواص کے ہمراہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہوئی۔ یہ اپنی بیعت کے قبول عام نہ ہونے کا ردعمل تھا کہ مایوسی یا امام الہند کے منصب پر اپنے ہم عصر علماء خصوصاً علمائے فرنگی محل اور مولانا سید معین الدین اجمیری کے مبینہ اختلاف کا انتقام تھا کہ وہ مایوسی سے آگے معکوس روش پر چل نکلے، یہاں تک کہ تفسیر ام الکتاب سے کانگرسی خطبہ اور خطاب تک میں کھو گئے اور نتیجہ معلوم کہ

ع اے مفسر تیری تفسیر ادھوری ہے ابھی

کے مقام پر بند اور پابند ہو کر رہے گئے۔ رات گئے ستار پر ساز و آواز کا لہرا، تڑکے میں یاسمین چائے کے جرعے، چاند مارکہ سگریٹ کے مرغولے اور تنہائی ان کی ذاتی شخصیت کا حصار بن گئے، یا پھر مغربی فلسفہ اور فرانسیسی ادب ان کے مراحل مطالعہ تھے۔ گویا ان کی دماغی مشغولیتوں سے کلام اللہ کی بجائے علم الکلام یا پھر کلام کانگرس نکلنے لگا۔ الہلال والبلاغ کے ابوالکلام کو لُونی لگ گئی۔ عالم اسلام سے ہمدردی اب سمٹ گئی یہاں تک کہ برعظیم کے مسلمانوں کی آزادی اور مستقبل ان کے نزدیک ثانوی درجے کی حیثیت تھی۔ اب وہ آزاد ہندوستان کے داعی تھے، کہ ''حزب اللہ'' اب ان کے نزدیک انڈین نیشنل کانگرس تھی۔ اس رجوع کا سبب جہاں ان کی مایوس و معکوس طبیعت کا اظہار ہے، وہاں گاندھی سے عقیدت اس کا اسرار بھی ہے۔ کسی اور کا حوالہ کیا دینا ہے، خود حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی گردن میں گاندھی جی کی عقیدت کی رسی کسی ہے اور وہ خود گاندھی جی سے اپنی وابستگی اور عقیدت کا تذکرہ فرما رہے ہیں کہ

> ''ایک جلسہ میں شرکت کیلئے ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی آیا۔ حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا۔ اس دن سے آج تک جب ۱۹۴۸ء ہے ۲۸ برس گذر چکے ہیں۔ ۲۸ برس کے یہ دن ہم پر ایسے گزرے ہیں کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔ اس عرصے میں بسا اوقات ان سے اختلاف بھی ہوئے، چنانچہ اس لڑائی کے زمانے میں میرا اور ان کا جو اختلاف ہوا تھا اس سے آپ بھی واقف ہوں گے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں میری قطعی رائے یہ تھی جس پر ممبران کی اکثریت کو اتفاق تھا کہ برطانیہ یہ مان لے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی تو ہم لڑائی میں شریک ہوسکتے ہیں ان کو اس سے سخت اختلاف تھا۔ وہ بالکل دوسری جانب جا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے ہم ایسی آزادی لینا ہی نہیں چاہتے جو لڑائی کے سایہ میں ہم کو ملے۔ اس لئے وہ کسی طرح بھی لڑائی میں شرکت کیلئے تیار نہ تھے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کی تجاویز کا ڈرافٹ گاندھی جی ہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اپنے اس ریزولیشن کا

ڈرافٹ بنوانے کیلئے میں اور پنڈت نہرو گاندھی جی کے پاس گئے ، اور انہوں نے اپنے پورے اختلاف کے باوجود اس تجویز کا ڈرافٹ بنایا۔

''غرض اس طویل مدت میں بہت سے مواقع آئے کہ ہم میں اور ان میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی۔ انہوں نے اور ہم نے دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا۔ لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے اختلافوں کے باوجود ان کی عظمت کی جو رسی ہماری گردنوں میں پڑی تھی، ہم کبھی اس سے باہر نہ ہو سکے۔''(۲۶)

ظاہری بات ہے کہ یہ تو سیاسی رفاقت کے سن و سال اور ان میں اختلاف رائے کے طلوع و غروب کا تذکرہ ہے۔ البتہ اس خطاب میں ''دلوں کے رُخ'' اور ''گردن میں عظمت کی رسی'' اپنے ابلاغ کا تمام تر تاثر لیے، مولانا ابوالکلام آزاد کا فکری دریچہ وا کیے دیتی ہے۔ یہاں ہندوستان میں ''ابن تیمیہ'' اور بھارت کے بابائے قوم (باپو جی) مہاتما (روح عظیم) گاندھی جی کا مقام اتصال ووصال بھی ہے اور امام الہند کی فکری معراج اور گاندھی جی کے استدراج کی پرواز کا حاصل مقصود بھی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ بڑی آزادی سے اپنا راز خود کھولے دیتے ہیں۔ یہ ہدیہ سپاس ہے کہ اعتراف، کم وبیش جو کچھ ہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا اپنا ارشاد ہے۔ یہ نقد جان ہے کہ ہدیہ دل اس کی وضاحت خود ہیں۔ فرمایا:

''اس موقع پر آپ سے یہ کہہ دوں کہ میری طبیعت میں ایک طرح کا نقص اور خامی ہے، وہ یہ کہ جب تک کسی کی کوئی خصوصیت میرے سامنے نہ آجائے، جو میرے دماغ پر چھا جائے، اور میری گردن کو دبا لے، اس وقت تک وہ مجھے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا ''میری گردن کی رگیں بڑی سخت ہیں''۔ میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے تو پہلے میرا ذہن اس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لے، چنانچہ جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا اس وقت میں ان کا معتقد نہ تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی۔ جو انسانوں کی آنکھوں کو بند کر دیا کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت کو میرے دل میں واضح کر دیا اور جو دن گذرا، میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم دو آدمیوں (یعنی مولانا اور پنڈت نہرو) کو ان سے انتہائی قرب تھا۔ اور ہمیں بہت طویل موقع ملا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھے جس کا ہر ورق کھلا ہوا، ہر سطر روشن اور ہر لفظ ہوڈ ہلا ہوا اور ہر حرف چمکتا ہوا تھا۔''(۲۷)

یہ اظہار عقیدت واعتراف اپنی وضاحت خود ہے۔ یہاں مولانا آزادؒ کے گاندھی جی کے بارے میں محض عقیدہ اور کیفیت دماغ کا معاملہ تو نہیں، ان کی عظمت ''دل میں راسخ'' ہے اور راسخ العقیدہ مولانا، پنڈت کی ہمراہی میں گاندھی جی کے قرب اور تنہائی سے جو حظ اٹھاتے رہے، وہ ان کی قلبی واردت ٹھہری ہے۔ اس پر باہر سے کوئی سا تبصرہ بدذوقی اور بدکلامی

ہوگی، البتہ مولانا آزادؒ کو یہ بیان کرتے ہوئے کس قدر فخر وانبساط میسر ہے کہ وہ ایک طویل عرصہ ان کی صحبت خاص میں رہے ہیں جہاں انہوں نے پنڈت نہرو کی رفاقت کا بھی اظہار کیا ہے اور لفظ ''ہم'' کا استعمال ہوا ہے۔ بقول خواجہ حسن نظامی کہنے کو تو ''ہ'' ہندو کی اور ''م'' مسلم کا ملا کر ہی تو ہم بنتا ہے جو متحدہ قومیت کا تسلسل و تعمل بھی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد گویا برعظیم کی ملت اسلامیہ کا سوختہ سامان ہیں۔ تاہم گاندھی جی کی عقیدت نے جب ان کی آنکھیں بند کیں، تو پھر یہ مراقبہ مولانا آزادؒ کی تنہائیوں کا سرور بن گیا۔ موسیقی کے شائق تو تھے ہی شاید اپنی مصروف و معروف تنہائی میں گنگناتے یا گاتے ہوں، کہ

ع تیرے خیال سے لو دے اٹھی ہے تنہائی
شب فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

لیکن اس پر حتمی اور قطعی طور پر کچھ عرض کرنا واجب نہیں، واللہ اعلم بالصواب کا شرعی امر مانع ہے۔ البتہ یہ معلوم نہیں ہو پایا کہ گاندھی جی کی متابعت کو سیاسی بیعت کے ساتھ ساتھ روحانی تفوق و برتری کے جس مقام پر مولانا آزادؒ انہیں فائز کیے دیتے ہیں، اس میں روحانی اور قلبی واردات کے ساتھ باضابطہ سلسلہ طریقت بھی تھا، کہ نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ مسلکاً اہلِ حدیث تھے جنہیں عام طور ''وہابی کہتے ہیں'' البتہ اتنا ضرور ہے کہ گاندھی جی کے باطنی اشغال میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محل کی صحبت کا فیض و فیضان، کچھ نہ کچھ تھا ضرور، وگرنہ مولانا فرنگی محل گاندھی جی کیلئے سرمدؒ شہید کا یہ شعر نہ کہتے کہ

ع عمرے کہ با آیات و احادث گزشت
رفتی، و بت پرست نثار کردی

حالانکہ سرمدؒ شہید بھی تو مولانا آزادؒ کے آئیڈیل تھے مگر وارفتگی ان کا مقدر تھی۔ ابوالکلام کو علم الکلام اور دماغوں کا مجموعہ ہونے کا زعم مانع رہا مگر مولانا آزادؒ فرنگی محل کی مبینہ مخالفت کی چوٹ کھا کر ہی تو کانگرسی ہوئے تھے، کہ علمائے فرنگی محل نے امام الہند کے منصب کی تجویز کو باوجود رد کر دیا تھا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محل کے روحانی سرقہ بالجبر کو اگر گاندھی جی کہہ لیا جائے تو مولانا آزادؒ کا گاندھی جی کی شخصیت کے طلسم ہوش رُبا کا شکار ہونا، یا گاندھی جی کے اعتقاد کا سزاوار ٹھہرانا ایک قلبی تعلق بھی ہے اور مولانا آزادؒ جیسے دماغ کا گاندھی جی کے میل ملاپ سے دل ہار بیٹھنا تو ان کے ارشادات بلکہ ملفوظات سے ظاہر ہی ہے۔ لگتا ہے گاندھی جی نے پہلی نظر ہی میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کو اپنی نگاہ التفات سے مات کر دیا، اور اس کو کہتے ہیں

ع تیری اِک نگاہ ہی کی بات ہے
میری زندگی کا سوال ہے

مصور پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کی زبان و علم سے استمداد طلب کی جائے تو واقعہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ہوش وخرد کو شکار کرلیا بلکہ صاف کہنا چاہیے کہ ہوش وخرد کے شکار کا معنوی انجام قلب ونظر ہی تو ہے۔ یہاں گاندھی کے استدراج سے تو بحث نہیں البتہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام سے دین وفقر کی صراط مستقیم کا پتہ خوب چلتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے گاندھی جی کی عظمت کو اپنی گردن کی اکڑی رگوں میں کیونکر پیوست کیا ہے اور دل میں احترام واعتقاد راسخ کیسے ہوا ہے یہ قلب ونظر کے معاملات ذرا عجیب ہیں۔ یہ علم الکلام اور ابوالکلام کی سرحد سے پرے اور اوپر کے مقامات ہیں کوئی پارٹی صدارت یا کابینہ کی وزارت نہیں کہ یہی حتمی مرتبہ ومقام بلکہ انجام ہے۔ حضرت مولانا آزاد کا اقبالؒ نے اس راہ کا پتہ دیتے ہوئے فرمایا ہے صراطِ مستقیم نگاہ مردِ مومن سے ملتی ہے۔ افسوس کہ مولانا آزادؒ صراطِ مستقیم کی بجائے صراط جاوید (سناتن دھرم) کی راہ پر چل پڑے، بلکہ دار ھائی سمت! حالانکہ یہ طریقت مولانا مرحوم کے گھر پر تھی لیکن وہ علم وکتاب میں کھو گئے نیتجتاً بقول اقبالؒ

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

کا امر واقع ہو گیا کیونکہ

ع علم از کتاب ودین از نظر
(اقبالؒ)

بلکہ اس کا اردو مفہوم لسان العصر اکبرالہ آبادی نے فرمایا کہ

ع دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

البتہ گاندھی جی کے استدراج کو موسیقی سے دوآتشہ کر کے، راگ درباری میں اقبالؒ سے مدد لیں، تو مولانا ابو الکلام آزادؒ کا گاندھی جی لے لئے اظہارِ عقیدت مکمل ہوتا دکھائی دے گا کہ

ع گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

گاندھی جی کی روحانیات (؟) سے قطع نظر انکی سیاست کا کانگرسی آنگن بلکہ ہندو کلچر میں رسوئی (باورچی خانہ) جہاں مسلمان کا جانا حرام ہے، مولانا آزادؒ کی حرمت کا رنگ کیسری ہے کہ قیصری ہے یہ وہ جانے، البتہ سیاسی گاندھی کا دلچسپ رویہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے موقف کے خلاف خود ہی قراردادیں اور مسودے تیار کر کے دینا، ایک ریت وروایت ہے کہ مکر کا چکر، شاید روحانی یا ہذیانی جودت طبع کا یہ چلن، مہاتما ہونے کی چستیاں طبعیت، مگر انداز، دلچسپ ضرور ہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے پاکستان میں سب سے زیادہ موثر، قلمی مرید آغا شورش کاشمیری نے گاندھی جی کا ایک تجزیہ لکھا ہے۔ وہ گاندھی جی کے طبعی جوار بھاٹا یا سیاسی طریقہ واردات کی ایک شناخت بھی ہے اور تجزیہ ومشاہدہ بھی لگتا ہے۔ آغا شورش کاشمیری کی

آنکھوں پر مولانا آزادؒ سے عقیدت تو ظاہر ہے، البتہ گاندھی جی سے کھلی آنکھیں لے کر ملے ہیں، عقیدت کی پٹی باندھ کر نہیں، لکھتے ہیں،

''ان کا (گاندھی جی) کا ایک عہد تھا جو تقریباً نصف صدی کو محیط رہا۔ وہ بہت بڑے سیاست دان تھے۔ لیکن ان کی سیاست کا رنگ و روغن عام سیاستدانوں سے مختلف تھا۔ وہ حکومتوں سے نبرد آزما ہونے کی ایک نئی تکنیک یعنی عدم تشدد کی اساس پر ستیہ گرہ کے بانی تھے۔ وہ بیک وقت مجموعہ اضداد تھے۔ کہیں سیاستدان، کہیں مدبر، کہیں سپہ سالار، کہیں مفکر، کہیں مصلح، کہیں مہاتما اور کہیں موہن لال کرم چند گاندھی۔'' (۲۸)

تاہم لگے ہاتھوں ایک اور صحافی کا تبصرہ و تعارف ہے، گاندھی ہی پر، جو ان کی سیاست کے برگ و بار اور عدم تشدد کے گرم بازار میں ان کی سالگرہ کے دن سامنے آیا۔ ڈان کے مدیر مرحوم الطاف حسین نے (۱۹۴۷ء) میں ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام پر لکھا، صرف پیرایہ اظہار کی چبھن ہی کو انسانیت کی چیخ کہہ لیں تو زیادہ انسب ہے۔ فرماتے ہیں۔

''مسٹر گاندھی آج اٹھہتر برس کے ہو گئے ہیں، اپنی بار آور سیاسی زندگی میں انہوں نے عدم تشدد کے لٹریچر کا ایک بہت بڑا انبار لگایا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ لاشوں اور ہڈیوں کے اتنے ہی بڑے ڈھیر کی شکل میں نکلا ہے۔ اور اب ہم متذبذب ہیں کہ آج ان کو کیونکر فسادات کی سالگرہ پر مبارکباد پیش کریں''۔ (۲۹)

مگر ایک شہادت ایسی ہے کہ گاندھی کا دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام پر، برت (بھوک ہڑتال) رکھنا اور اپنے بھگتوں کی حکومت پر اخلاقی دباؤ ڈالنا ان کی عظمت اور بڑائی کا ثبوت ہے۔ اس طرح سے مولانا ان سے کہیں دور اور فی الواقعہ کہیں پیچھے ہیں۔ جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے خطاب کا ذرا پول کھل رہا ہے۔ وہ طنز و تشنیع کا مقفّی و مسجّی لہجہ اپنی پرتیں کھول رہا ہے۔ باخبر مولانا بے خبر مسلمانوں کو عزت و عظمت اور جان لٹنے کے باوجود ڈھارس بندھا رہے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ

''اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو ناگزیر تھا ہونے پر تعجب نہیں، نہ ہوتا تو تعجب ضرور ہوتا۔ کسے خبر نہیں کہ حالات بے قابو ہو چکے ہیں۔ اور طبیعتوں میں فساد موجود ہے۔ اب اگر اس کے برگ بار پیدا ہو گئے ہیں، تو حیران و پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دن سب قسم کے نکل جاتے ہیں، یہ بھی نکل جائیں گے''۔ (۳۰)

ظاہر ہے اکثریت کے استبداد میں مسلم اقلیت کا ایک وزیر، اس سے زیادہ اپنی ذمہ داری اور سرکاری رازداری بلکہ

تشریفات (Protocol) کی سطح پر یہی کچھ کہہ سکتا تھا، جو حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے مجلس احرار اسلام کے تب صدر مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کو ارشاد فرمایا، جو لدھیانہ میں مسلمانوں کے قتل عام، مساجد کی تذلیل اور مسلمان عورتوں کے اغوا کی سازش کے کاغذات لئے دہلی ان تک پہنچے تھے جبکہ مولانا ابوالکلام آزادؒ (وزیر تعلیم) کو دہلی اور اس کے نواح میں مسلمانوں کے قتل عام پر اپنے وزیراعظم پنڈت نہرو اور اپنی کابینہ کے ساتھی اور فسادات کے سرپرست سردار پٹیل (وزیر داخلہ) سے جو کچھ سننا پڑا، دراصل وہ ان کے گلے کی پھانس بن گیا۔ بتوں سے امیدیں یا کہ ان کے پجاریوں سے۔ خود متحدہ قومیت کی حکومت اور راجدھانی میں خون مسلم کی ارزانی کو مولانا آزاد کی مہربانی کہیں، تو تعجب کیسا۔ گاندھی جی کے عقیدت منداور وزیراعظم (پنڈت جی) کے پابند شخص کا نام وزیر تعلیم ابوالکلام آزاد ہو کر رہ گیا۔ وہ کابینہ کے اندر دیگر رہنماؤں کی نفرت سے بالآخر مسلمان ہونے کی وجہ سے ہی بچ نہ سکے، جبکہ کانگرسی قیادت کے اندر گاندھی جی کی سیادت اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی قیادت ان کی نظری اور نظریاتی بیساکھیاں ضرور تھیں نجانے مولانا کیوں بھول گئے کہ ہندو مزاج اور سیاسی دماغ سے وفا کی امید رکھنا، اخلاص و وفا کی آخری ہچکی کا دوسرا نام ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو، وزیراعظم ہو کر بھی جس طرح بے بسی کے نام پر مسلمانوں کے قتل عام پر صرف معذوری ظاہر کرتے پھرے، وہ ان کی اصلی شخصیت کا بے حجابانہ عکس تھا۔ وہ اشترا کی تھے کہ قوم پرست، کانگرس کے صدر تھے کہ اب وزیراعظم، ان کا اصل روپ یہ تھا کہ وہ بہر حال ایک ہندو اور براہمن تھے۔ مغربی تعلیم و اطوار ان کا لبادہ و لباس تھا، مگر ان کی بود و باش، ان کی تمام تر سیاسی اور حکومتی تاریخ یہاں تک کہ وصیت، کہ ان کے پھول گنگا میں بہا دیئے جائیں، اور راکھ ہندوستان پر نچھاور کر دیں۔ ایک تجزیہ مجلس احرار اسلام کے سابق سیکرٹری اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مداح آغا شورش کاشمیریؒ کے واشگاف الفاظ کا میسر ہے کہ پنڈت جی کی حقیقت تب کھلی جب ہندوستان، بھارت بنا:

> ''جونہی ہندوستان آزاد ہوا، ہندوستان کے نقطہ نظر سے سوچنے لگے ظاہر ہے قومیت و وطنیت میں خیالات محدود ہو جاتے ہیں۔ وزیراعظم کا عہدہ ان کے لئے فخر نہ تھا۔ وہ اس عہدے کے لئے باعث فخر تھے۔ لیکن اس عہدے نے ان کی شخصیت کو محدود کر دیا اور وہ محدود ہو گئے۔ ہندوستان ان پر صدیوں فخر کرتا رہے گا۔ وہ گاندھی جی کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ان کے عہد میں ہندوستان مسلمانوں کو جانگداز حالات سے گذرنا پڑا۔ اور وہ ابھی تک سنبھالا نہیں لے سکے۔ لیکن خود نہرو خنجر نہیں تھے، ان کے گردوپیش خنجر ہی خنجر تھے۔'' (۱۳۱)

اس تعارف اور تجزیے میں جو کچھ ہے وہ نوعیت مسئلہ اور توضیحات کا ایک معذرت خواہانہ مغلوبہ ہے۔ پنڈت جی وزیراعظم ہو کر، ذہنی طور پر محدود مگر اختیاراتی طور پر تو لامحدود ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے قتل عام پر اپنے وزیر داخلہ اور اپنے دارالحکومت میں نظر بہ ظاہر حالات ان کے قابو سے باہر تھے، چہ جائیکہ باقی ماندہ ہندوستان میں اور خصوصاً شمالی علاقوں پنجاب

وغیرہ میں موثر ہوتے۔ یہ سانحہ کیا کم ہے کہ راجدھانی (دلی) کی عین ناک تلے پنجاب بھر میں، بھارتی سرکار کا دھرم اور بھرم کھل بھی گیا تھا اور جاتا بھی رہا تھا۔ سچ کہنا چاہیے کہ عدم تشدد واقعتاً ایک طریقہ واردات اور تکنیک نکلی، جسے جدید ہندوئیت کے قومی مفادات اور مصالح کا بھارت کہتے ہیں۔ آزادی کی سہاگ رات سنکھ بجے، تو پورے بھارت میں مسلم ملت کے سروں پر قیامتیں گذر گئیں، متحدہ قومیت کو خون مسلم کی ارزانی کا پانی درکار نکلا! آزادی ہی نے عدم تشدد کا راز کھولا کہ مذہبی شدھی کے بعد سیاسی شدھی کی ناکامی پر تشدد کا روا ہونا، انڈین نیشنل کانگرس کے متحدہ قومیت کا آغاز واعجاز ہے۔ بھارت کی سیاسی قیادت اور مسلمانان دہلی اور پنجاب کے قتل عام اور اس امر واقعہ پر آغا شورش کاشمیریؒ کے استاد حضرت احسان دانش کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

ع وہ شاخ گل پہ زمزموں کی دھن تراشتے رہے
نشیمنوں پر بجلیوں کا کارواں گذر گیا

متحدہ قومیت کا فریب کھلتا ہے

مجلس احرار اسلام کے سابق صدر حضرت مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے تقسیم ہند کے بعد بھارت ہی میں بس رہنے کو ترجیح دی، اور وہیں کے ہو رہے، مگر ان کے سیاسی اور سکونتی وطن مالوف لدھیانہ میں ان کا قیام اور قیادت جس شقاوت کی زد میں آئی، اس کا لابدی نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں اپنے آخری ایام پرانی دہلی کے کوچہ رحمان میں بسر کرنا پڑے۔

حد یہ کہ ۱۹۴۷ء ہی میں مسلمانوں کے قتل عام کی سازش ان کے ہاتھ لگی اور وہ تفصیلات و کاغذات لیے سیدھے دلی پدھارے کہ وہ مولانا آزاد کے سہارے وزیراعظم پنڈت نہرو سے اس انکشاف پر مدد طلب کر سکیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی روئیداد اور فریاد، دونوں اس لائق ہیں کہ انہیں تفصیل سے بیان کیا جائے، یہ جہاں مسلمانوں کے قتل عام میں کانگرس کی براہ راست شرکت کا پردہ چاک کرتی ہے، وہاں نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ خود کانگریس اور ان کی حکومت کے رویہ کا آئینہ عبرت بھی ہے۔ یہ الگ بات کہ اس تفصیل میں مسلمانوں کے قتل عام پر کم اور اپنی اور اپنے خاندان کے خلاف ہندوؤں کی یلغار کے خلاف پکار زیادہ ہے۔ مجلس احرار ہی کے آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں

''اتفاق سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے ہاتھ اس قسم کا تحریری مواد آ گیا جس سے اس بات کا ثبوت ملتا تھا کہ فسادات کی جڑ کیا ہے؟ اس کے پس منظر میں کون لوگ ہیں؟ انگریز آفیسر کیا کر رہے ہیں؟ کانگرسی ہندوؤں نے اب تک کیا گل کھلائے ہیں؟ اسلحہ کہاں سے آتا ہے اور ریاستوں کا ردِ عمل کیا ہے؟ اس مواد ہی میں کانگرس کے بعض رہنماؤں کے علاوہ آزاد ہند فوج کے جنرل موہن سنگھ اور کرنل ڈھلوں کے خطوط بھی تھے۔ مزید برآں اسلحہ کی وصولی، اسلحہ کی تقسیم اور اسلحہ کے استعمال کی رسیدات اور ہدایات بھی تھیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن یہ کاغذات لیکر سیدھا دہلی چلے گئے۔ سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ملے۔ انہوں نے مسلمانوں کے قتل عام پر ایک آہ سرد بھری اور کہا: ''مولوی صاحب یہ سب کچھ میرے علم

میں ہے۔ بہر حال موسمی ہوائیں ہیں گذر جائیں گی۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو ناگزیر تھا۔ ہونے پر تعجب نہیں، ایسا نہ ہوتا تو ضرور تعجب ہوتا۔ کسے خبر نہیں کہ حالات بے قابو ہو چکے تھے اور طبیعتوں میں فساد موجود تھا۔ اب اگر اس کے برگ و بار پیدا ہو گئے ہیں تو حیران یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، دن بھی طرح کے نکل جاتے ہیں۔ یہ بھی نکل جائیں گے۔ البتہ ایک چیز جو صاف ہو گئی ہے وہ بعض لوگوں کی دماغی تربیت ہے۔ میں ان کے بارے میں کبھی خوش رائے نہیں رہا۔ میں نے ان کی طبیعتوں کا شروع ہی سے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ آخر کار ننگے ہو جائیں گے۔ سو ان کے چہروں سے نقاب الٹ چکی ہے۔ اب ان حالات میں ان چہروں کو انہی لوگوں کے سامنے رکھنا گویا اپنی کمزوریوں کو جو پہلے ہی رسوا ہو چکی ہیں اور رسوا کرنا ہے۔ توقف کیجئے اور طوفانوں کی طرح یہ طوفان بھی تھم جائے گا'' (۳۲)

اس احساس و اظہار میں حقیقت پسندی کا غلبہ اس لئے ہے کہ اب ہندوستان میں کانگرس کی حکومت اور ہندو اکثریت ہی کا غلبہ تھا اور رسوائی کے ڈر سے چپ رہنا وقتی تدبیر بھی تھی اور بلا شبہ ایک واضح مجبوری بھی کہ طوفان تھمنے کا انتظار ہی وقت کی پکار ٹھہری۔ یہ الگ بات کہ یہ طوفان ساحل پر محفوظ دور رہنماؤں اور ملاحوں کی نجی گفتگو ہے۔ منجدھار میں مسلمانوں کی جان و آبرو کا کیا حشر تھا، مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنی وزارت کے دفتر میں بیٹھے اگر یہ ارشاد فرمائیں کہ جس سازش کو بیان کیا جا رہا ہے ''یہ سب کچھ میرے علم میں ہے'' تو عملاً اس کے کیا معنی ہیں اور یہ کس مجبوری کا مقام ہے اس پر ان کی آہ سرد'' بھی ایک اظہار مگر کس کا۔ معذرت و معذوری کا تو واضح سی بات ہے۔ گاندھی جی تو ہندوستان کی سیاسی بدنامی اور اپنی نئی نویلی حکومت کی پاکستان کے اثاثوں اور مسلمانوں کے قتل عام کی ناکامی کے باعث برت پر اُتر آئے، مگر مولانا ابوالکلام آزادؒ ان حالات میں کس برتے پر اور کس کی برات کیلئے وزارت کے مزے لے رہے تھے۔ افسوس استعفیٰ نہ دیا ہوتا کہ ان کی عمر بھر کی کمائی یہ ہی تھی اور نہیں تو اپنے گرد و پیش کے نام پر سیاسی گاندھی کی رفاقت مذہبی گاندھی کی تقلید بھی فرما لیتے۔ برت نہیں تو روزہ رکھ لیتے، کہ ان کا دھرم بھی رہ جاتا اور بھرم بھی۔ وزیر داخلہ سردار پٹیل اور مسلم دشمنی پر مولانا آزادؒ کے تذکرے سے لے کر تبصرے تک بذات خود ایک مسلمان دشمن داستان ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو توقف کی تلقین فرمائی کہ اس سے آگے ان کے منصب کی معراج انہیں پابند کیے دیتی تھی۔ یعنی مولانا آزاد نہ رہے پابند ہو گئے۔ یہی وقت کا جواب ہے جس نے مولانا کی سیاسی شخصیت، ادبی حیثیت اور مذہبی نوعیت کو متنازعہ فیہ اور مسلمانان ہند کا مقہور بنا دیا۔ وہ آزاد ہندوستان کے داعی اور راہی تھے۔ مسلمان اور اسلام کی آزادی ان کے نزدیک ثانوی مسئلہ تھا۔ اس لئے وہ پاکستان کی تحریک کو فرقہ وارانہ قضیہ کی کانگرسی تفسیر کے ترجمان بن گئے۔ برعظیم کے مسلمانوں کے احساس آزادی کو ''فرقہ وارانہ قضیہ'' گردانا، آزادی کی سہاگ رات کی خنجر خونخوار اور ننگ خلائق سیاسی کارکنوں کے حکومتی قلعے میں بیٹھ کر مولانا کو ابوالکلام آزادؒ کی بجائے مولانا ابوالکلام پابند کہیں تو ان کی نفسیات کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ پابند اپنے منصب و ماحول کے ضرور تھے۔ اِدھر کانگرسی قیادت پر یقین و اعتماد (ایمان کا لفظ صحیح نہ ہوگا) کا یہ عالم کہ ایک عالم شرع دوسرے عالم شرع کے مشورہ پر عمل توقف

کیجئے کی بجائے سیدھے اپنی ''رسوائی کا سامان'' لیے اقتدار واختیار کے اوج کمال پنڈت جواہر لعل نہرو، وزیراعظم کے ہاں جا پہنچے، حالانکہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا آزادؒ کے ہاں بقول میر تقی میر ایسے ہی تو اُٹھے تھے کہ

ع جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

آغا شورش کاشمیری کا بیان ہے کہ

''مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا آزاد سے اٹھ کر سیدھے، پنڈت جی کے ہاں چلے گئے۔ اپنی بپتا سنائی۔ ان سے کہا کہ کیا ہم نے اسی دن کیلئے کانگرس کا ساتھ دیا تھا کہ اپنے گھروں ہی میں نہ رہ سکیں؟

لدھیانے میں سب سے پہلے جس مقام کو آتشزدگی کیلئے چنا گیا، میرا مکان تھا۔ جہاں سے فرقہ واریت کی کبھی ہوا تک نہیں گذری۔ ضلع کے حکام فسادیوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، بلوائیوں کو خود کانگرس کے لیڈر دعوت دیتے ہیں، اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کیلئے لدھیانہ میں سانس لینا مشکل ہو گیا ہے۔ سردار منگل سنگھ تو جو کچھ تھے آپ جانتے ہیں، لیکن آزاد ہند فوج کے جنرل موہن سنگھ، اور کرنل ڈھلوں آتشزدگی، لوٹ مار اور اجتماعی بلووں کی تربیت دے رہے ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ لدھیانہ محفوظ رہے۔ لیکن دیش بھگتوں نے سنی ان سنی کر دی۔ بلکہ ہمارے خاندان کو سزا دی کہ سب سے پہلے ہمارے خاندان ہی کے مکانوں کو لوٹا اور جلایا گیا۔ ہم نے اس دن کیلئے آزادی کا سفر شروع کیا تھا کہ اس کے ہاتھوں سب سے پہلے ہمارے سینہ میں خنجر گھونپا جائے گا''۔ پنڈت جی سر جھکائے مولانا کی باتیں چپ چاپ سنتے رہے۔ جب مولانا اپنا غصہ ٹھنڈا کر چکے اور جو کچھ ان کے دل میں تھا زبان پر آ گیا، تو پنڈت جی نے کہا:۔

''مولانا میرے پاس ندامت کے سوا کچھ نہیں، میں شرمندہ ہوں، انسان پاگل ہو گیا ہے۔ ہم پاگل ہو گئے، کسی شخص میں تحمل نہیں رہا اور

ع جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

آپ ہمیں معاف کر دیں اور پنڈت جی کا چہرہ اشکبار ہو گیا۔''(۳۳)

پنڈت جی کے آنسوؤں سے کہیں زیادہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پر آنسو بہانے کا مقام ہے کہ اگر برعظیم کے مسلمانوں کے رہنما اسی کیندے (Calibre) کے بزرگ ہوتے تو پورے ہندوستان کا ''لدھیانہ'' بنا دیتے۔ حد یہ کہ اپنی بپتا اور اپنا گھر، اپنا خاندان اور اپنی آزادی کا سفر اور نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ افسوس کہ مولانا انگریزی خواں نہ ہوئے ورنہ پنڈت جی صرف لفظ (Sorry) کہنے پر اکتفا کرتے۔ مولانا آزاد کا مشورہ مان لیتے، تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی

شخصیت کا بھرم قائم رہ جاتا مگر وہ اپنی حیثیت وطبعیت کے عین مطابق ''ہندو، ہندی، ہندوستان'' کے اولین معماروں کے پاس بقول مولانا آزاد مسلمانوں کی ''رسوائی'' لیے پھر رہے تھے۔ غالباً انہیں احساس نہیں رہا تھا کہ یہ آزاد ہند فوج کے جنرل موہن سنگھ اور کرنل ڈھلوں ہی تھے جنہوں نے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں انڈین نیشنل کانگرس کی جیت کو یقینی بنایا اور ان میں افراد اور فساد کی جڑ، آزاد ہند فوج کے جرنیلوں کا مقدمہ (قتل وتشدد) کورٹ مارشل لڑنے کیلئے پنڈت نہرو صدر کانگرس کی حیثیت سے وکالت کا گاؤن پہن کر پہلی دفعہ عدالت (لال قلعہ دہلی) میں تشریف لائے تھے۔ شورش کاشمیری ہی کا بیان ہے کہ"

> ''پنڈت جواہر لعل نہرو نے سری نگر نیشنل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں اچانک یہ انکشاف کیا کہ وہ ان نوجوانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جوان دنوں دہلی کے لال قلعہ میں کورٹ مارشل کا انتظار کر رہے ہیں اور جنہوں نے سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج میں شریک ہو کر برما کے میدانوں اور آسام کی پہاڑیوں میں ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑی ہے۔'' (۳۴)

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی یقیناً ہندو ذہنیت سے تب تک بے خبر تھے۔ وگرنہ انہیں یہ باور کرنے میں کونسی مشکل درپیش تھی کہ ۱۹۴۲ء میں کانگرس ہندوستان چھوڑ دو تحریک (Quite India) دراصل دوسری عالمی جنگ میں محصور و مشغول برطانیہ کو ہندوستان سے بھگانے پر مجبور کر کے اختیارات انڈین نیشنل کانگرس کے حوالے کرنے کا اصل ہدف تھا۔ جس پر قائداعظم نے تقسیم کرو اور جاؤ (Divide & Quite) کا نعرہ لگایا تھا۔ اب جاپان کے کلکتہ تک بمباری اور سبھاش چندر بوس کی کانگرس کے ایماء پر تیاری کا نتیجہ آزاد ہند فوج کا قیام تھا۔ جون ۱۹۴۵ء میں زبردستی اور بالفعل انگریزوں کو ہندوستان سے مار بھگانے اور اختیار و اقتدار ہندو اور کانگرس کو دلانے کی مسلح جدوجہد کی تھی۔ یہ تو بھلے کو حالات اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ ورنہ تشدد اور عدم تشدد کا کانگری اور آزاد ہند فوج کا سنگم، ہندوستان پر رام راج کا سیاسی ملن اور اس کے عسکری بازو کا مطلوبہ ملاپ تھا۔ ہندو قوم کے ان جنرلوں کو مسلمان کے خلاف تشدد پر تیار اور ہتھیار پا کر مولانا حبیب الرحمٰن کو اپنی ذات، مکان اور خاندان بچانے کی فکر پڑ گئی۔ شکر ہے کہ برعظیم کے مسلمان کو اسلام نے بچا لیا وگرنہ کانگرس اور متحدہ قومیت کے نیشنلسٹ علماء لے ڈوبے تھے۔ پوری مسلم ملت کو گنگا، جمنا کے اشنان گھاٹ پر اور اب عملاً موت کے گھاٹ اترنے کا مرحلہ آیا، تو ذاتی قربانی اور ہندوستان کی آزادی میں اپنے مقام کا تعجب کیسا! البتہ مسلمان کا قتل عام بھی تو مطلوبہ ہندوستان تھا، جس کی صبح آزادی کی ایک ہی جھلک سے صدر مجلس احرار کو صرف لدھیانہ سے دلی آنا پڑا۔ وگرنہ آزاد ہند فوج کے یہ جنرل اور ہندو جنتا جس سیاسی اور تاریخی، موڑ پر تھی، قائداعظم کی بصیرت کا ایک بیان ہی کافی ہے۔

شورش نے ان جنرلوں کیلئے لکھا ہے کہ

> ''کانگرس نے مقدمہ کی پیروی کا اعلان کر دیا۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی ڈیفنس کونسل کے سربراہ اور

ملک کے بڑے بڑے وکلاء ان کے معاون ہو گئے۔خود پنڈت جواہر لعل نہرو پہلی دفعہ بیرسٹری کا گاؤن پہن کر عدالت میں آئے۔شہنواز ،سہگل اور ڈھلوں کو سب سے پہلے مقدمہ کیلئے منتخب کیا گیا۔ ملک میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔قائداعظمؒ نے ایک بیان میں کہا کہ کانگرس ان نوجوانوں کے مقدمے کو اپنی انتخابی مہم کا ذریعہ بنا رہی ہے۔''(۳۵)

شاہنواز مسلمان، سہگل ہندو اور ڈھلوں سکھ، جنرل اور کرنل تھے۔مقدمے میں کانگرسی سیاست، ہندو کی ذہانت اور مستقبل پر نظر کی فطانت کا ادعا صاف ظاہر ہے۔اب گاندھی جی نے تشدد گروپ کے مقدمہ پر کانگرسی قیادت کی سیاست پر چپ سادھ لی، جیسے مون برت (چپ کا روزہ) ہو۔لیکن قائداعظمؒ کا فرمان سچ نکلا، ملت اسلامیہ برعظیم کے کھیون ہار کا اظہار عین حالات پر نظر اور ملی تقاضوں سے باخبری کا شہکار ہے۔شورش کاشمیری نے بتایا کہ اس مقدمہ کی پیروی سے

''ہندو عوام میں کانگرس کا بول بالا ہو گیا۔جواہر لعل کا وار نشانہ پر بیٹھا، کسی رہنما کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے ترکش میں جو تیر ہوتے ہیں وہ ان کے استعمال میں چوکس رہتا ہے۔اور جب نشانہ باندھتا ہے تو ٹھیک ٹھیک باندھتا ہے۔جواہر لعل نے آزاد ہند فوج کے ہزاروں نوجوانوں کی جانیں بچا کر، کانگرس کو کروڑوں انسانوں کا حکمران بنا دیا۔اسکو انتخاب جیتنے میں زیادہ محنت نہ کرنا پڑی۔''(۳۶)

انڈین نیشنل کانگرس اور آزاد ہند فوج (آئی این اے) کوئی مخالف اور متضاد ادارے اور قوتیں نہ تھیں بلکہ جس کا کام اسی کو ساجے، ہندو قوم کی تاریخ و توارد پر نظر رکھنے سے یہ انداز بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۸ء جیسے اہم سیاسی سال میں جبکہ ۱۱ میں سے ۸ صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کو چلانے کا موقع تھا تو سبھاس چندر بوس جیسے عسکری اور آتش بجاں شخص کو کانگرسی کی صدارت سے بھگانے ہٹانے کا مدعا کوئی گاندھی جی سے پوچھے کہ انہوں نے راج کوٹ میں برت رکھ کر کیوں سبھاش کی صدارت کو تری پورہ کانگرس میں ناکام بنایا تھا۔

وجوہات پر نہیں نتائج پر نظر کریں تو مقصود نہرو کی قیادت کو پارلیمانی تجربہ تربیت دینا مقصود تھا کہ کم وبیش گیارہ صوبوں اور برعظیم میں پہلی مرتبہ گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں ہندو راج اور آریہ سماج قائم ہوا تھا۔دھیمے سُروں کا استدلالی نہرو اگر صدر کانگرس ہو تو بات بن جائے کہ لاابالی طرز کا سبھاش بابو ان ''ایام تاراج'' میں موزوں نہ تھا۔بہرحال ہندو قوم کی ٹیم سپرٹ کا کمال یہ ہے کہ جس محاذ کا شخص اور شخصیت ہو، اس کی پہچان بھی ہے اور اس سے کام لینے کا پیمان بھی۔اس کا اعتراف ہی کافی نہیں کہ جامع مسجد دہلی کے سامنے سابق ایڈورڈ پارک (اب اردو پارک میں) عین مسجد اور مولانا آزادؒ کی قبر کے سامنے سبھاش چندر بوس کا مجسمہ (بت) نصب ہے اور لال قلعہ دہلی میں آزاد ہند فوج کے مقدمہ ہی کی سماعت کی دلان میں سبھاش بابو کے نام کی کرسی اندرا گاندھی سابق وزیراعظم کے ہاتھوں اپنا مقام متعین کر گئی، حالانکہ لال قلعہ میں آخری مغل

تاجدار بہادر شاہ ظفر کسی لائق نہ تھا۔ افسوس کہ متحدہ قومیت کی سیاسی شدھی لال قلعہ کے اندر تاریخ اور جغرافیہ دونوں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس جملہ معترضہ کی ضرورت محض اس لیے پیش آ گئی کہ آزاد ہند فوج کو محض باغی جان کر وطن پرستی کا جذباتی الاؤ نہ سمجھ لیا جائے۔ یہ حقیقتاً انڈین نیشنل کانگرس کا عسکری بازو تھا جسے دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ کو ہندوستان سے عملاً بھگا کر اس کانگرس کے غلبہ اور قبضہ کا ہراول دستہ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یہ تو جرمنی و جاپان کو حالات لے ڈوبے، وگرنہ ہندوستان انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندوؤں کی گود میں جا گرنے کو تھا کہ برعظیم کے مسلمانوں کو خدائے برتر کی برکت اور جناحؒ کی حرکت نے ہندو اکثریت کی دائمی غلامی سے بچا لیا۔ نہیں تو ملت اسلامیہ پاک و ہند، تمام کی تمام ''بندے ماترم'' گا رہی ہوتی۔ اس گاندھی اور کانگرس کے اتنے مربوط، مسلسل اور مضبوط منصوبوں کی راہ میں استعمال ہونے والے مسلمانوں کے چند ذاتی اور جماعتی طور پر نمایاں اور ذاتی منفعت کیلئے کائیاں افراد ہندو راج میں اپنا آئینہ ایام دیکھ کر بلبلا اٹھے۔ حد تو یہ ہے کہ ملت دشمنی میں اپنی سیاسی حیثیت کو بھی داؤ پر لگایا اور ''رسوائی'' اپنے مطلوبہ مقام اور ماحول تک آ گئی۔ مسلمانوں کے قتل عام کے سانحہ سے کہیں بڑا سانحہ یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پنڈت نہرو سے اٹھ کر اس سارے قتل و غارت کے انچارج، وزیر داخلہ سردار پٹیل کی کوٹھی میں جا گھسے، میر تقی میر نے سادگی کو خوبصورت لباس پہنا دیا ہے۔

ع میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

شورش لکھتے ہیں:

''مولانا وہاں سے اٹھ کر سردار پٹیل کو ملنے گئے تو وہ اس وقت کوٹھی کے لان میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی بیٹی سی بیٹ بھی ساتھ تھیں۔ مولانا نے یہی رام کہانی سردار کو سنائی۔ پٹیل کسی احساس اور تاثر کا اظہار کیے بغیر سنتے رہے۔ سردار نے وہ تمام کاغذات جو مولانا ساتھ لے گئے تھے، ان سے لے کر اپنی بیٹی کو پکڑا دیئے اور کہا:۔

''میں فرصت میں ان کاغذات کو دیکھ لونگا۔ آپ جانتے ہیں کہ کانگرس نے جناحؒ کو راضی کرنے کیلئے ہر جتن کیا عزت نفس تک کھو دی۔ گاندھی بار، بار جناح کے دروازے پر گئے۔ لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس فساد کی ذمہ دار لیگ ہے۔ آغاز اس کی طرف سے ہوا ہے۔ ڈائریکٹ ایکشن کا اعلان اس نے کیا ہے۔ چنگیز و ہلاکو بن جانے کی دھمکی دی۔ مسلمان من حیث الکل، آزادی کی تحریک سے الگ رہے بلکہ روڑے اٹکائے۔ ہم نے تو حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کے بل پر لڑائی مکمل کی ہے۔ اور ہندو عوام کی وجہ سے یہ آزادی ہمیں ملی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ ہم حصول آزادی کے بعد ان ہندوؤں پر گولی چلائیں۔ انہیں قتل کریں یا قتل ہوتا دیکھیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ہم لوگ احرار لیڈر نہیں کہ قربانی بھی کریں، قوم گالیاں بھی کھائیں اور سارے ملک میں تماشا ہو جائیں۔ جس قوم

نے ہمیں اقتدار دیا اس سے بدعہدی ہوگی بلکہ غداری کہ آزادی کے بعد اس جماعت کیلئے ہم اس پر گولی چلائیں جو آزادی کی دشمن ہے اور جس جماعت نے فساد کی نیو رکھی ہے۔'' (۴۷)

ایک مرہٹہ سردار کا یہ تجزیہ وتبصرہ نجانے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو کیسا لگا البتہ وزیر اعظم نہرو، وزیر داخلہ سردار پٹیل طبیعت اور شخصیت کے ساتھ ساتھ جس منصب اور مقام پر تھے، وہ اپنا اظہار وابلاغ واضح تر ہے۔ ہندو قوم اور قیادت کا ادراک وشعور اپنی قوم اور آزادی کے جس مطلوب پر تھا اس کا عملاً اعتراف تو مولانا حبیب لرحمٰن کا یہ ارشاد ہے کہ ہم نے کس لئے کانگرس کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے کہ

ع اب بہار آئی تو کہتے ہیں تیرا کام نہیں

بات یہ نہ تھی کہ بہار (آزادی) میں حصہ اقتدار مانگا جا رہا ہے، یہاں تو صرف احرار رہنما کو اپنی جنم بھومی، لدھیانہ میں ان کے اعزہ اقربا سمیت کانگرسی کارکنوں کے ہاتھوں، مرنے، لٹنے اور جل جانے کا المیہ لاحق تھا۔ سردار پٹیل کے الفاظ میں مولانا کو ''متحدہ قومیت اور دو قومی نظریہ'' کی سمجھ تو خیر کیا آتی البتہ یہی سبب ہے ان کی سیاست اور سوچ کا عمل ہی تاریخ کا جواب ہے کہ ان کی کانگرس کی ہمراہی اور ہمنوائی کا انجام لدھیانے سے دہلی تک کو انگریزوں سے آزاد کرانے اور لدھیانہ خود آزاد کر کے اپنے اعزہ کو جناحؒ کے پاکستان پنجاب کے فیصل آباد، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور گوجرہ بھجوانے کا نام دو قومی نظریہ نہیں، بلکہ دو قومی عمل ہے جس کا ان کی ذات، خاندان اور جماعت کو باچشم خود اور بذات خود تجربہ ہوا۔ یہی تحریک پاکستان اور اس کا دو قومی نظریہ تھا جو ہجرت کی برکت سے دو قومی عمل بن گیا۔ البتہ لدھیانہ سے دہلی تک کے سکونتی یا سیاسی سفر کو مولانا ''استخلاص وطن سے حکومت الٰہیہ تک'' کا مستقر باور فرما لیتے تو برعظیم کی مسلم ملت کو وہ چرکے نہ لگتے جو ان کی رفاقت وسیاست میں کانگرس کا ہندوستان ہو گئے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مذہبی طور پر محترم ومعزز ہی نہیں، مغفور ومرحوم بھی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مصور پاکستان کا یہ شعر، لکھتے ہوئے وہ تمام بصیرت وبصارت ایک مقام بن کر سامنے آ گیا ہے، کہ

ع قوم کیا چیز ہے؟ قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا جانے؟ بیچارے یہ دو رکعت کے امام

اسے کہتے ہیں کہ

ع سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے پس رو صدر مجلس احرار اسلام، مولانا مظہر علی اظہر مرحوم نے تو جناح کی شادی کو سیاسی دشنام کی سان پر کسا اور جلسہ عام میں کہہ اٹھے،

ایک کافرہ عورت کیلئے دین کو چھوڑا۔ یہ قائد اعظمؒ ہے کہ ہے کافر اعظم

درآں حالیکہ یہ ثابت ہو گیا کہ قائد اعظمؒ نے اس خاتون کو اولاً مسلمان کر کے پھر اس سے نکاح پڑھایا۔ حادثہ یہ ہے متحدہ

قومیت کا ہندوستان آج ۶۲ سال بعد مسلم ملت کے باب میں کسی تجزیہ وتبصرہ کا محتاج نہیں۔ افسوس کہ نیشنلسٹ رہنما اب دنیا میں نہیں اور جو ہیں وہ جناحؒ کے پاکستان کے معزز اور معتبر شہری اور بعض قومی سطح پر سیاستدان بھی تھے۔ جن کی اولادیں یہاں پر سیاسی تفوق و برتری کے ساتھ مزے میں ہیں۔ ہندوستان سے متحدہ قومیت کا مزہ چکھنے کے بعد پھر پاکستان آ بسنے والے کانگرسی مسلمان اپنے نظریات و معتقدات کی ہم جلیسی اور فکری مفلسی میں ہو کر اب بھی پاکستان اور اس کے قیام واستحکام کے بارے میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے سن وسال میں زندگی بسر کرتے ہیں، حالانکہ وہ جس ملک میں سیاست کرتے اور اس کا مال کھاتے ہیں اور جس جگہ بس جاتے ہیں سامنے دفاتر میں ایک تصویر لگی ہوتی ہے جسے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کا مقام اور نام حاصل ہے۔ حد تو یہ کہ ان کی جیبوں میں ہر وقت اسی نام محترم کی تصویر بھی ہوتی ہے، جو ایسے لوگوں کی مالی حیثیت پر قائداعظمؒ کی شخصیت کا اعجاز ہی تو ہے۔ کسی کمزور نظر کو کائنات اور اس میں کارفرما قوت (رب تعالیٰ) کا احساس و اندازہ نہیں، تو اپنے مقصد حیات (مادہ پرستی) کی دولت کی کرنسی نوٹ پر جناحؒ کی تصویر ایسے لوگوں کی تقدیر پر مسکراتی ہے۔ بلکہ پاکستان ایسے لوگوں کا ہی کیا تمام عالم اسلام کے مسلمانوں کا قلعہ بھی ہے اور اپنا گھر بھی! یہی جناحؒ، سردار پٹیل کی ''مت'' کو چھو کر نہیں ذرا چھیڑ گیا تھا۔ کہ ہندومت کی تدبیر سے اسلام کی تقدیر کا یہ نتیجہ ہی تھا کہ برعظیم کے تمام مسلمانوں کی پناہ گاہ اور تہذیبی عافیت کا نام پاکستان جہاں بالآخر حضرت مولانا لدھیانوی کے خاندان اور اعزہ کو آنا تھا اور وہ آئے۔ وہ خود بھی پاکستان چلے آئے تھے مگر پاکستان ان کی طبعیت کو راس نہ آیا اور وہ واپس ہندوستان چلے گئے جہاں پر وہ ۱۹۵۶ء میں دہلی میں انتقال کر گئے۔ جامع مسجد دہلی کے شمالی دروازہ میں امام صاحب کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ایک ذاتی شہادت اور روایت پروفیسر محمد اسلم سابق صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جنہیں خود مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ایک ملاقات میں بتایا تھا۔ اپنے معروف ''سفرنامہ'' ہند میں پروفیسر اسلم رقمطراز ہیں:۔

> ''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے صدر تھے اور پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ قیام پاکستان کے بعد موصوف مہاجروں کے قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچے لیکن یہاں ان کا جی نہ لگا۔ اور وہ دسمبر ۱۹۴۷ء کے آواخر میں دوبارہ بھارت چلے گئے۔ ۳ جنوری ۱۹۴۷ء کو وہ گاندھی جی سے ملے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا۔
>
> ''مولانا کیا آپ بھی پاکستان چلے گئے تھے؟ کیا آپ نے لدھیانہ کی سکونت اس بنا پر ترک کی کہ وہاں ہندو اور سکھ آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے؟ اگر یہی آپ کا جرم تھا تو آپ اپنے دین کیلئے جان کا نذرانہ پیش نہ کر سکے؟''

یہ بات خود مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے راقم الحروف (پروفیسر اسلم مرحوم) کو بتائی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ''گاندھی جی کی باتیں سن کر اس قدر شرمندہ ہوئے کہ انہیں کوئی جواب نہ دے

سکے۔"(۳۸)

احرار کا ضمیر

مجلس احرار اسلام کے سیاسی خمیر اور ضمیر پر ایک جامع تبصرہ اس کے نامور رہنما آغا شورش کاشمیری کا ہے جو اس کی ذہنی سطح کا حقیقی تجزیہ بھی ہے

"احرار تحریک خلافت (۱۹۲۱ء) میں اٹھے اور ۱۹۳۰ء تک کانگرس کے ساتھ رہے جو مسلمانوں کے ادنیٰ متوسط طبقے کا گروہ تھا جن کا ذہن سیاسی و اسلامی تھا جس میں انگریز دشمنی، اسلام پرستی، حب الوطنی، سرمایہ سے بیزاری، رجعت سے عناد، ایثار سے محبت، ظلم پر احتجاج، انقلاب کی خواہش اور جہاد کا ولولہ جمع ہو گئے تھے۔ کانگرس کا بورژوائی ذہن، ہندو معاشرے کی طبیعت، تلخ سیاسی تجربے، اپنی انفرادیت کا احساس اور مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کا تصور احرار کی تشکیل کا باعث بنا۔ لیکن کانگرس سے قطع تعلق کے باوجود آخر تک قطع ذہن نہ ہو سکا، ذہن اس کا وہی تھا جو کانگرس کا تھا۔"(۳۹)

کانگرس سیاست کا شکار بعض مذہبی رہنما، سیاسی طور پر جس مرض کا شکار تھے، وہ ان کے مقام و مرتبہ کا شخصی پیمانہ ہے۔ جہاں تک ان کی مذہبی حیثیت کا تعلق ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ علی گڑھ اسٹیشن پر یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ نے مذہبی ابوالکلام سے نہیں سیاسی ابوالکلام سے اظہار ناراضگی کیا تھا۔ جبکہ جناحؒ کی بگھی میں جت کر، انہوں نے کسی مذہبی، مولوی یا مُلا کا اعتراف واحترام نہیں کیا تھا بلکہ اپنے تہذیبی مستقبل کی بقا کی تعظیم روا رکھی۔ باوجودیکہ ملائیت، مسلمانوں کے دورِ زوال کا سانحہ ہے، اسلام میں اس کی گنجائش کہاں ہے حالانکہ مولوی اللہ کے دوست نہ کہ پیٹ کے دھندے کا نام ہے۔ مولوی کا جو مرتبہ اور مقام پاکستان میں ہے، شاید دنیائے اسلام کے کسی ملک میں نہیں، بلکہ دین و فقرے سے لگاؤ جس قدر پاکستان کا مقدر ہے پوری دنیا میں اس کا مقابل کہاں ہے۔ خطبہ الٰہ آبادؒ میں حضرت علامہ اقبالؒ کا، پاکستان کے جغرافیائی استعارہ (شمال مغربی ہندوستان) مسلمانانِ برعظیم کا مستقبل قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ملک کسی مذہبی یا مولوی نے نہیں، حضور سرکارِ دو عالم ﷺ کے عالم دین، حضرت علامہ اقبالؒ کی بصیرت کا کرشمہ، اور بقول قائداعظمؒ "معجزہ" ہے جس پر ہندو سیاست اور کانگرسی قیادت کا ہر حربہ اور ہتھکنڈہ ناکام رہ جانے کا نام پاکستان ہو جائے تو سردار پٹیل کی تقریر کا مطلب سمجھنے میں عقل کو پریشانی ہو، تو ہو، دل اور دین کے حامل کسی بھی مسلمان کیلئے بڑی آسانی سے سمجھ پانے کی چیز ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک شخص کا نام نہیں ایک طبقے کی سیاسی سوچ کا مظہر ہے۔ تجربے سے جس آزادی کو نیشنلسٹ رہنماؤں نے پایا اس کا حقیقی تجزیہ سردار پٹیل کی زبانی سن کر اور باقی عمر سہہ کر اگر باور آیا ہو تو یہی دو قومی نظریہ اور متحدہ قومیت ہے اور قومیں دین سے بنتی ہیں کہ سرزمین سے یہ اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ مجلس احرار کے رہنما آغا شورش کاشمیری آزادی وطن سے پہلے کم و بیش بارہ برس قید میں رہے۔ نیشنلسٹ رہنما کے طور پر کانگریسی رہنماؤں کے قریب ہونے سے ان کا شخصی مشاہدہ کس قدر

حقیقت کشا ہے اس کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ لکھتے ہیں کہ

''آخری قید کے سات برسوں میں ایک چیز جس نے مجھے خیالات کے اتار چڑھاؤ میں مدد دی وہ کانگریس کے ہندو رہنماؤں کی اجتماعی ذہنیت کا مطالعہ تھا۔ عام سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو چھوڑ کر کانگرس کے ہندو رہنما بالطبع ہندو تھے۔ وہ مسلمانوں کو بہر حال پسند نہیں کرتے تھے۔ کانگرس میں بلاتے ضرور لیکن دروزے بند رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ میں نے صاف صاف کرلیا تھا۔ ان کے لئے کسی شخص کا مسلمان ہونا ہی تنفر کا باعث ہے۔ مثلاً مولانا آزادؒ کانگرس کے صدر تھے لیکن پنجاب کے کانگریسی رہنما انہیں بڑی سے بڑی تنقید کا ہدف بناتے۔ میاں افتخار الدین صرف مسلمانوں ہونے کی وجہ سے ان کے معتوب ہوئے حالانکہ انہیں اسلام سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ کوئی ادنیٰ و اعلیٰ مسلمان ان کی نگاہ میں محبوب و محترم نہ ہوسکا۔ ان کے نزدیک احرار اور بھی معتوب تھے اس لئے کہ احرار کے ساتھ اسلام کا لفظ لگا ہوا تھا۔ وہ شیام پرشاد مکر جی اور ساورکر کو تو قومی ہیرو سمجھتے تھے لیکن عطا اللہ بخاری اور حسین احمد مدنی کو نہیں۔ ان کے ذہن میں نیشنلزم کے معنی خود سپردگی کے تھے۔'' (۴۰)

ہندوؤں نے ۱۹۳۷ء میں گیارہ صوبوں اور بالآخر ۱۹۴۷ء کو برعظیم میں اپنی سلطنت وحکومت پالی۔ یہ ہی کیا کم تھا، مگرانہوں نے نظر بہ ظاہر خود غلام ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کو مستقبل میں مستقل طور پر غلام بنائے رکھنے کے یک بیک جتن کیے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے چند معتبر اور مذہبی نام اور افراد ان کے ہمرکاب تھے، تو یہ گالی تو نہیں تاریخ ہے، وگرنہ ابھی ایک اور مرحلہ باقی ہے۔ جہاں سے نیشنلسٹ رہنما اور علماء گاندھی کی سطح سے ملاحظہ کرنے کی چیز ہیں۔ اس آئینے میں سیاسی بصیرت، ذاتی نقطہ نظر اور جماعتی زوایے بیک وقت فوٹو کے کیمروں کی طرح مختلف پہلوؤں سے روشنی پھیلا اور دکھا رہے ہیں۔ گاندھی کے براہ راست ارشاد پر صاد نہ کرنا علمی بدیانتی اور فکری کوتاہی ہوگی۔ اس سے بڑھ کر حقیقت کے قریب تجزیہ شاید ہی مل سکے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی گاندھی سے ملنے گئے۔ شورش رقمطراز ہیں:۔

گاندھی جی مسکرائے، آگئے مولوی صاحب؟ لڑائی باندھنے آئے ہیں آپ؟ کیسے آئے؟ مہاتما جی یہ ہے وہ سوراج جس کے لئے آپ نے اٹھائیس، انتیس برس لڑائی کی۔ اور ہم اس دن کے لئے سال ہا سال جیل میں رہے

ع دن گنے جاتے تھے، اس دن کے لیے

ہم نے مسلمانوں کی اجتماعی خواہش کو ٹھکرا دیا۔ کانگرس کے ہوگئے، اس کیلئے قید و بند کی مصیبتوں کو لبیک کہا، گھربار لٹایا، بچوں کے مستقبل کو تباہ کیا، آزادی آئی تو سب سے پہلے ہمارے گھر لوٹے گئے،

گاندھی بھگتوں نے قاتلوں کی سرپرستی کی۔ عام مسلمانوں کو اس لئے سزا ملی کہ وہ لیگ کے ساتھ تھے۔ ہمیں اس لئے سزا دی گئی کہ لیگ میں نہیں تھے اور کانگرس کے ساتھ تھے۔ عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں، انہیں اس طرح ڈھایا گیا جیسے مسجدیں نہیں، مذبح تھے"۔

گاندھی جی نے سنا، تو انہیں ملال ہوا۔ لیکن مسکرائے، پھر قہقہہ لگایا۔ "مولوی صاحب مجھے افسوس ہے میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ آپ نے ہمارے لئے قید کاٹی؟ غلط ہے۔ قید تو آپ نے دیش کی سوتنترتا (آزادی) کیلئے کاٹی ہے۔ اور اپنا گھر آپ نے موت کے خوف سے چھوڑا ہے۔ مسجدوں کی توہین کے ذمہ دار آپ ہیں۔ ان کیلئے مٹ جاتے آپ کی عزت مسجدوں سے ہے۔ اگر آپ وطن کیلئے قید کاٹ سکتے تھے، تو کیا خانہ خدا کیلئے مر نہیں سکتے تھے۔ آپ نے مذہب کی روح کو نہیں سمجھا، آپ کو مر جانا چاہیے تھا، لیکن خدا کا گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔" (۴۱)

مسکراہٹ اور پھر گاندھی جی کے قہقہے میں جو کچھ ہے، یہ خیالات ہیں کہ ملفوظات بہر حال ایک بڑے شخص کا ارشاد تو ہے ہی۔ اسے ایک آئینہ سمجھ کر، صرف گاندھی جی کی شخصیت کا اظہار و ابلاغ، نوعیت مسئلہ، اور امر واقع پر جس طرح کی کیفیات کا غماز ہے اسکے بعد یہ حقیقت مان لینی پڑے گی کہ گاندھی اگر نہ ہوتے تو آج ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت کا یہ اور چھور قطعاً نہ ہوتا۔ انہیں تو جناحؒ کی ٹکر نے بے سدھ کیے رکھا ورنہ وہ سارا برعظیم پاک و ہند، بمع مسلمان اور اسلام کے، لے اڑے تھے۔ انکی طلسماتی شخصیت میں وہ بلا کا جادو تھا اور جادو کی بلائیں اور ادائیں مضمر تھی کہ مولوی اسکی نگاہ غلط انداز سے سپر انداز تھے۔ گاندھی ہی کا تجزیہ و تجربہ کس قدر بلیغ ہے۔ اس میں صاف بات یہ ہے کہ مولوی روئے مذہب تو ہے، روح مذہب ہر گز نہیں، البتہ فقیر روح مذہب ہے۔ اور یہ فقر نصاب و کتاب نہیں یہ انتساب ہے، جو اپنی مرضی سے نہیں اللہ کی رضا کا نام اور کام ہے۔ یہ اہتمام نہیں اتفاق ہے۔ یہ وہ فقر ہے جو حضور سرکار دو عالم ﷺ کا فخر ہے۔ حتمی بات یہ کہ فقر درس نظامی سے نہیں درگاہ نظامیؒ سے ملتا ہے۔ یہ بارگاہ صمدیت کی عطا ہے، جسے فقر و دین کے ترجمان حضرت علامہ اقبالؒ کے فرمان میں

ع کمال عشق و مستی بے نیازی

کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے، کہ بے نیاز الصمد، صفت رب ہے اور اسی کے اعلان و اعتراف پر فرمایا گیا ہے کہ

ع کشادہ دست کرم، جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند، نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے
(اقبالؒ)

ایک ادیب کا یہ تبصرہ کس قدر سادہ مگر بلیغ ہے کہ

"ایک علم وہ ہے جو ابوالکلام آزادؒ کے پاس تھا اور ایک علم وہ ہے جو اقبالؒ کو خدا نے ودیعت کیا تھا۔

ایک علم، عالم کو کانگرس کا شو بوائے بنا دیتا ہے۔ اور ایک علم برعظیم کے مسلمانوں کو بیک وقت انگریز اور ہندو کے چنگل سے نجات دلاتا ہے۔" (۴۲)

عجب بات ہے کہ گاندھی جی قوم اور قوموں کی قیادت وامامت کے اصل اور حقیقی راز سے باخبر نکلے جس کے ہمنوا ہمارے روایتی مگر نیشنلسٹ علماء محض ضال ومضل اور عقلی اور نقلی علوم کے محض حروف شناس کہ ان ہی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے صاحبزادے جناب عزیز الرحمٰن جامعی نے ایک سال قبل گاندھی جی سے آغا شورش کاشمیری، نوابزادہ نصر اللہ خان اور علامہ انور صابری کے ہمراہ ایک ملاقات میں ان سے پوچھا تھا، کہ

"نیشنلسٹ مسلمانوں کی ناکامی کا سبب کیا ہے؟"

آغا شورش کاشمیری نے لکھا ہے کہ اس سوال پر گاندھی جی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہا کہ

"میں سمجھتا ہوں ان میں کوئی شخص بھی فقیری نہیں کرنا چاہتا، بلکہ فقیری سے اٹھ کر شہنشاہی کر رہا ہے۔ قومی خدمت صرف فقیری ہی سے ہو سکتی ہے۔" (۴۳)

تاہم آغا شورش کاشمیری نے اس کو توضیح کرتے ہوئے لکھا کہ

"میرا خیال ہے گاندھی جی کے ذہن میں ان پچیس لاکھ روپیہ کی غارت زدگی کا احساس تھا جو عام انتخابات (۱۹۴۲ء میں) نیشنلسٹ مسلمانوں پر (کانگرس نے) صرف کیے تھے۔ لیکن بعض لوگ روپے کیلئے امیدوار ہو گئے مال اینٹھا، ہڑپ کیا اور بیٹھ گئے۔" (۴۴)

باقی نیشنلسٹ جماعتوں اور ان کے امیدواروں کا تو پتہ نہیں البتہ مجلس احرار اسلام کی پوزیشن اس باب میں جو کچھ تھی، آغا جی نے لکھا ہے کہ

"مظہر علی نے جہاں سے جو کچھ لیا تھا میں نے اس کی تفصیلات پہلے ہی قاضی احسان احمد کو بتا دی تھیں، وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے، پھر مولانا غلام غوث کو آگاہ کیا۔ انہیں تعجب ہوا۔ کہنے لگے ثابت کر سکو گے؟ میں نے کہا ضرور۔ فرمایا، نہ ہو سکا تو؟ میں نے کہا تو مجھے جماعت سے نکال دیجئے گا۔ مولانا حبیب الرحمٰن کانگرس کی رقم کے راز دار اور حصہ دار تھے، انہوں نے ٹالنا چاہا مگر شورش برپا ہو چکی تھی۔

میں نے استغاثہ شروع کیا، "کانگرس سے مولانا نے ساٹھ ہزار روپیہ لیا، دس ہزار کی پہلی قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط۔ پہلی قسط مولانا داؤد غزنوی نے دفتر احرار میں دی تھی، دوسری قسط لالہ بھیم سین سچر کی معرفت آئی۔ صاحبزادہ فیض الحسن اس رقم میں سے اپنا حصہ لے چکے تھے اس لیے معاملہ ٹھپ کرنا چاہتے تھے۔ اجلاس اگلی صبح پر ملتوی ہو گیا۔ صاحبزادہ مجھے رات بھر مولانا کے مکان پر لے

جا کر سمجھاتے رہے۔ میں دوسرے دن اجلاس میں ذرا تاخیر سے پہنچا تو معلوم ہوا صاحبزادہ صاحب نے کہا ہے کہ شورش اپنا الزام واپس لیتا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا، میں نے انکار کیا۔ قصہ کوتاہ مولانا مظہر علی اظہر مان گئے کہ انہوں نے کانگرس سے ساٹھ ہزار روپے وصول کیے ہیں۔ یونینسٹ پارٹی کے روپیہ کا ذکر چھڑا تو مولانا غلام غوث نے مجھ سے کہا آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ میں نے کہا، ایک سرکاری ملازم دستخطی رسیدیں دکھانے کیلئے تیار ہے لیکن وہ آپ کے اور شاہ جی کے سوا کسی اور کو دکھانے پر آمادہ نہیں۔ مظہر علی نے تیس ہزار روپے کی یہ رقم بھی مان لی۔ اس کے علاوہ تین ہزار روپے احرار کی مختلف شاخوں سے اکٹھا ہو کر آئے تھے۔ مظہر علی نے کل پچانوے ہزار روپیہ کی رقم تسلیم کی، لیکن کہا یہ کہ نصر اللہ خان کے سوا ہر امیدوار کو حصہ رسد پہنچا ہے۔ امیدواروں نے کہا ہمیں الیکشن لڑنے کیلئے رقم ضرور ملی ہے لیکن یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ کانگرس یا یونینسٹ پارٹی سے آئی ہے، ہمیں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ جماعت کا اپنا روپیہ ہے۔ مظہر علی نے کل رقم کا نصف جماعتی اخراجات پر ڈالا، تقریباً تیس ہزار احرار امیدواروں میں تقسیم کر چکے تھے۔ باقی بیس ہزار میں سے دس ہزار اپنے الیکشن کا خرچ بتایا، دس ہزار روپے کے بارے میں کہا کہ وہ روزنامہ آزاد کیلئے محفوظ کر رکھا ہے۔'' (۴۵)

آغا شورش کاشمیری ہی کی ایک نظم کے مصرعے ہیں

اک فقیہہ شہر کی ریش حنائی بک گئی
منبر و محراب کی شعلہ نوائی بک گئی
بک گئی بکنے کی شے تھی پارسائی بک گئی

اور یہی حقیقی بلاغت ہے گاندھی جی کے جواب کی کہ ''قومی خدمت صرف فقیری کرنے ہی سے ہو سکتی ہے'' بلکہ اس سے کہیں بلیغ اور واضح بات گاندھی جی نے اس وقت کہی جب سید عطاء اللہ بخاری مرحوم کے ہمراہ عزیز الرحمٰن نے گاندھی جی سے ان کا آٹوگراف لینا چاہا تو آغا شورش ہی کی روایت کے مطابق گاندھی جی نے کہا''

پانچ روپے لاؤ، شاہ جی (حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری) نے کہا اس کے پاس پانچ روپے کہاں؟''
گاندھی جی مسکرائے نہیں شاہ جی مولوی لوگ بہت زیادہ روپیہ کماتے ہیں دستخط تو پانچ روپے ہی میں ملیں گے۔ شاہ جی نے اصرار کیا لیکن گاندھی جی اصول کے پکے تھے۔ آخر عزیز الرحمٰن نے پانچ روپے پیش کیے اور گاندھی نے اُردو میں لکھ دیا: ''م ک گاندھی۔'' (۴۶)

اور یہی تتمہ تھا، گاندھی جی کی سیاسی اور مذہبی طبیعت کے اس اظہار کا جو ان کی سربراہی اور ہمراہی بلکہ ہم نوائی کے مابین شرع

مبین کے تجربے اور مشاہدے کی رو سے اپنے انجام کو پہنچا کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بیٹے کے پاس سے بالآخر پانچ روپے کا نوٹ نکل ہی آیا۔ بظاہر یہ کہ گاندھی جی نے اپنے آٹوگراف کو اس قدر ارزاں نہ ہونے دیا۔ بظاہر سادہ مگر بباطن پر پیچ ہستی کا تاریخی نام مہاتما گاندھی ہے۔ ان کے اُردو میں م۔ک گاندھی لکھنے کا مطلب کیا تھا؟ اپنے معتقد اور ہمنوا نیشنلسٹ علماء سے ملاقات کا یہ حاصل ہی تو گویا گاندھی جی کی طبیعت و شخصیت کا آئینہ بھی ہے۔

تاہم خود گاندھی جی کی اپنی فکری سطح کس قدر پُر پیچ تھی، وہ ان کی اس وضاحت سے واضح ہے جو انہوں نے آزادی سے ایک سال قبل کی تھی۔ آغا شورش کاشمیری راوی ہیں، کہ

''کیا مسلم لیگ سے صلح کا کوئی امکان ہے'' میں نے پوچھا

''میں تو یہی چاہتا ہوں، اور قائداعظم سے کتنی ہی ملاقاتیں کر چکا ہوں لیکن وہ نہیں مانتے'' (واضح رہے گاندھی جی قائداعظمؒ کو قائداعظم ہی کہتے اور لکھتے تھے۔)

''تو آپ بار بار ان سے ملنے کیوں جاتے ہیں، وہ بھی آپ کے پاس کبھی آئے ہیں؟''

عزیز الرحمٰن نے کہا ''یہ اعتراض اور لوگوں نے بھی کیا ہے لیکن یہ کوئی اعتراض نہیں۔ قائداعظم میرے بھائی ہیں، بھائی کو منانا جرم نہیں، اور نہ اس میں کوئی ہتک ہے۔ روٹھے ہوؤں کو منانا ہی پڑتا ہے گھریلو جھگڑا ہے طے ہو جائے گا۔''

''لیکن آپ کے ایسا کرنے سے کانگرس کو دھکا لگتا ہے اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہوتی ہے۔''

''مجھے آزادی حاصل کرنا ہے قربانی سے ملے یا گفتگو سے، خون دے کر ملے یا بھیک مانگ کر۔ مقصد سامنے ہو تو ذات کوئی چیز نہیں۔ میں ملک کو اُونچا کرنا چاہتا ہوں، خود کو نہیں۔ جب آزادی کیلئے ہم لوگ جیل چلے جاتے ہیں تو قائداعظم کے گھر جانے میں کیا عیب ہے؟ اور آپ جانتے ہیں کہ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا کہ پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے۔ مجھے آزادی چاہیے۔ میں اس کیلئے ہر دروازے پر جانے کیلئے تیار ہوں، سوال میرے یا کانگرس کے وقار کا نہیں، سوال آزادی اور صرف آزادی کا ہے۔ مقصد کیلئے جان دینا یا مال لٹانا ہی قربانی نہیں، بسا اوقات عزت بھی گنوانی پڑتی ہے۔ اور یہ بھی ایک قربانی ہے۔ سچا عشق ہر شے کی قربانی مانگتا ہے۔'' (۴۷)

اور اس کو کہتے ہیں بھارت دیش کے باپو جی مہاتما گاندھی جس نے گیارہ صدیوں میں مسلمانوں کو غلامی اور ۱۹۰ برس انگریزوں کی ہمرکابی میں گزار کر کم و بیش ۱۲ صدیوں بعد، اپنا آزاد اور وسیع ملک بھارت اپنی سیادت و سیاست سے حاصل کیا، اسی گاندھی کی صورت میں بھارت کو نجات دہندہ ملا۔ مگر مسلمانوں کی نماز کے دو رکعت کی امامت کو کانگرس کا دہندہ

اور چند املا۔ یقین نہ آئے تو گھر کا بھیدی لنکا ڈھا رہا ہے، آغا شورش کاشمیری رقم طراز ہیں، فرمایا

ایک لطیفہ

''ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ مولانا داؤد غزنوی لیگ میں شامل ہو گئے۔ سیٹھ سدرشن، شاہ جی (سید عطاءاللہ شاہ بخاری) کے پاس فریاد لیکر آئے کہ وہ مولانا سے کہیں، کم از کم حساب کتاب ہی دے جائیں۔ شاہ جی کو سخت غصہ آیا کہنے لگے، ''اول تو میرا کانگرس سے کیا تعلق اوران کے روپے سے کیا واسطہ اور آپ کا حساب کتاب طلب کرنا بھی عجیب ہے۔ محمود غزنوی نے حساب دیا تھا، جو داؤد غزنوی حساب دیں۔'' (۴۸)

البتہ نیشنلسٹ سیاست کے نام پر دام وصول کر لینے کا بدیہی المیہ یہ ہے کہ اس سے ذاتی منفعت کا حصول بلاشبہ ممکن ہوا مگر ملت اسلامیہ برعظیم میں اس حادثے سے دو چار ہوگئی کہ سنبھالا لینا مشکل ہو گیا۔ خود شورش کاشمیری جیسے نامور ادیب وخطیب اور مجلس احرار کے سابق سیکرٹری جنرل نے لکھا ہے کہ

''میری واضح اور قطعی رائے ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم قضیہ کا حل جب پاکستان قرار دیا جا چکا تھا اور مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس پر جمع ہو گیا تھا تو نیشنلسٹ مسلمانوں کا اس کی مخالفت میں پیش پیش ہونا اس دور کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔ اس غلطی کی انہیں بڑی سخت سزا ملی اوران لوگوں کے ہاتھ سے ملی جو خود بڑی سزا کے مستحق تھے۔'' (۴۹)

ابوالفضل سے ابوالکلام تک۔۔۔ایک سیکولر سیاسی سفر

برعظیم ہندو پاک میں مسلم اقتدار کی کم بیش بارہ صدیوں میں اکبر اعظم کی سیکولر سیاست ہی نہیں ادبی روایت بھی وہ واحد مثال ہے جب وحدت ادیان کی سرکاری اور درباری کوششیں رائیگاں گئیں البتہ وحدت ادیان کی سیاسی کاوشیں ادب و مذہب کا موضوع لیے کتابی شکل میں بیسوی صدی تک رواں رہی ہیں جس کی عصری جھلک مولانا ابوالکلام آزادؒ کی سیاسی اور مذہبی ہی نہیں قلمی کاوش اور ادبی صورت بھی ہے کہ وہ سیکولر جمہوریہ ہند کی کابینہ میں ابوالفضل کا مرتبہ لے پائے اور ادبی سطح پر سرمد کا دفاع کر پائے۔ انہیں ملت اسلامیہ کے مقابلے میں متحدہ قومیت کا سیکولر سیاسی سفر اور ادبی سطح پر سرمد کی مدح کا شخصی مسلک مقدر رہا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف ادبی اور سیاسی سطح پر کیا جانے لگا ہے، یہاں تک کہ بات سیاسی ابوالکلام اور ادبی ابوالکلام سے بات بڑھ کر مذہبی رجحان کے ابوالکلام کو چھونے لگی ہے کہ ان کی پہچان میں اکبری ادبی روایت کا آمیزہ بھی شامل داخل بتایا جا رہا ہے۔ اکبری سیاست کی ادبی روایت جو ابوالفضل اور فیضی سے دارا و سرمد، بلکہ غالب تک پہنچی ہے وہ بیسوی صدی میں بھی جاری ہی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اسی حوالے سے سرمد کے دفاع میں ایک رسالہ رقم کیا۔ آزادی

ہند میں مذہبی، ادبی اور سیاسی ابوالکلام آزادؒ اور، آزادؒ بھارت میں وزیر تعلیم اور ڈپٹی پارلیمانی لیڈر کے طور پر بلکہ نیشنلسٹ علماء اور کانگرس کے ہمنوا مسلم رہنماؤں کو یہ امر تقسیم کے بعد، شاید باور آیا ہو کہ آزادی وطن سے مراد ہندو قوم کیلئے صرف اور صرف ہندوستان کی آزادی تھی۔ اور مسلمانوں کیلئے ہندو کے ہاتھ بربادی بہ چشم سر اور بہ چشم خود ملاحظہ کی گئی مگر ذاتی اور جماعتی طور پر ان کی ذات ہی اس احساس سے بہرہ مند ہوتی تو بھی چشم پوشی کی جا سکتی تھی۔ حادثہ یہ ہے کہ کانگرس کے اندر مولانا ابوالکلام آزاد کو زیادہ طور پر قبول اور مقبول اس لئے سمجھا جاتا رہا کہ وہ مسلمانان برعظیم کی اجتماعی خواہش ایک مسلم قوم اور اس کے آزاد وطن یعنی پاکستان کے خلاف، ہندو سیاست کے ابوالفضل ہیں۔ مگر ان کے مزاج و دماغ نے جب کبھی مسلمانوں کے اجتماعی معاملات پر لب کشائی یا قلم فرسائی کی بھی تو انہیں عملاً دو قومی نظریہ جیسی شکست و ریخت کا سامنا خود کرنا پڑ جاتا۔ ان کے تبحر و تردد نے برعظیم کی ملت اسلامیہ کو جس صورت حال سے دوچار کیا اس کا بدیہی نتیجہ مسلم قوم اور عوام سے بے دلی اور ہندو امراء سے ہم دلی کی صورت میں جب راجدھانی دلی میں خون مسلم کی ارزانی بنا تو ان کی آہ سرد، پھر خاموشی یا جامع مسجد میں طنز و تشنیع کی آتش بیانی کا لاوا بہہ نکلا۔ افسوس کہ انھیں مسلمانوں کے اجتماعی دھارے سے کٹنے ہی سے کانگرس اور ہندو عوام میں وقتی پذیرائی میسر رہی، اس لئے آزاد بھارت میں نہ وہ صدر کانگرس ہوئے نہ صدر جمہوریہ ہند، بلکہ ان کے اوج کمال اور معراج معنوی کو تعلیم کی لیلائے وزارت کہتے ہیں۔ صبح آزادی سے ایک سال قبل کانگرس کے اندر، مسلم نقطہ نظر سے ان کی حیثیت عرفی کا پتہ اس وقت چلا جب کابینہ مشن سے انکا علم الکلام اور کانگرس ورکنگ کمیٹی میں ان کا منطقی اور استدلالی مرتبہ و مقام متعین ہو کر رہ گیا۔ اپنی ذات کی بات نہ بنی تو اپنی شخصیت کی ذیلی ایجادوں سے کانگرس میں مسلم سیاست پر اتر آئے، مگر انہیں ڈانٹا گیا کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ اگر یہی کچھ سوچتے ہیں تو اس سے پاکستان بہتر ہے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی نے انہیں تعریضاً کہا ”کہ آپ کا ذہن یہی کچھ ہے، تو پھر آپ لیگ میں چلے جائیں۔“ وجہ ظاہر ہے کہ مسلم قوم یا اس کے معاملات و تحفظات پر کوئی بات تو عملاً مطالبہ پاکستان یا مسلم لیگ ہی کی بات تھی۔ ہندو اس امر کو بخوبی سمجھتا تھا۔ سانحہ یہ ہے کہ کانگرس میں شامل اور اس کے پاکستان دشمن بڑے بت کو تو ”مولانا صاحب“ یا ابوالکلام آزادؒ کہتے تھے مگر یہ شخص جب مستقبل کے دستوری نقشے میں مسلمانان برعظیم کیلئے کچھ لکھتا یا کہتا، تو پھر وہ کانگرسی ابوالکلام کی بجائے مسلمان ابوالکلام باور کر لیا جاتا تھا۔ حالانکہ خود ابوالکلام یہ کام، کانگرس کی سیاست کیلئے سرانجام دیتے تھے نہ عملاً مسلمانوں کی فوز و فلاح کیلئے، مگر ہندوؤں کو جس چیز سے خوئے مسلمانی اور بوئے سلطانی کا شک بھی گذرا، انہیں ایک لحہ کیلئے تامل نہ ہوتا کہ وہ اپنے مسلمان صدر کانگرس کو روکیں اور ٹوکیں اس کی واضح مثال، مدنی فارمولا اور اس کی ترتیب و تصویب اور اس پر کانگرس کی تغلیط ہے۔

مدنی فارمولا سے پاکستان بہتر ہے

مارچ ۱۹۴۶ء میں برطانیہ کا وزارتی مشن (Cabenit Missiosn) ہندوستان پہنچا تاکہ ہندوستان کے مستقبل پر متعلقہ فریقوں اور جماعتوں سے گفت و شنید کی جائے۔ کانگرس اور مسلم لیگ تو بڑی جماعتیں اور متعلقہ فریق تھے

ہی، کانگرس نے لیگ کو زچ کرنے کی خاطر اپنی ہمنوا، اور ذیلی تنظیموں خصوصاً جمعیت العلمائے ہند اور مجلس احرار اسلام کے زعماء کو بھی اس مشن سے ہم کلام بذریعہ ابوالکلام ہونے کا ادعا اختیار کیا تا کہ باور ہو کہ لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں بلکہ مسلمانوں کے رہنما یہ علماء ہند ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے قلم سے ایک فارمولا تیار ہوا جس کی نوک پلک مولانا آزادؒ نے سنواری۔ اسے مدنی فارمولا کے نام سے مشہور کیا گیا۔ ہوا یہ کہ مشن تو رہا ایک طرف خود کانگرس نے اس کی رسید تک نہ دی۔ کانگرس کے اندر خود مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ذاتی خواہش اور کوشش سے تیار کیے ہوئے فارمولے قابل قبول نہ تھے جبکہ ان کی ذیلی تنظیموں اور ذہانتوں کے فارمولے کو کون مانتا اور ہوا یہی کہ کانگرس کمیٹی نے اس فارمولے کو درخور اعتناء نہ جانا، یہاں تک کہ کانگرس کمیٹی کے اندر جمعیت علماء ہند کے مولانا حفظ الرحمٰن اور مجلس احرار اسلام کے شیخ حسام الدین نے استفسار کیا، تو کانگرس کمیٹی کا تو کیا جواب تھا خود گاندھی جی نے جو کچھ کہا، اس کی تفصیل مجلس احرار اسلام کے سابق سیکرٹری جنرل کا اپنا بیان ہے۔ فرماتے ہیں

> ''وزارتی مشن کے دنوں میں احرار اور جمعیت علماء ہند نے مل کر ہندو مسلم قضیے (حد یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء تک بھی یہی کانگریسی اصطلاح سزاوار ہے) کیلئے ایک فارمولا تیار کیا جو وزارتی مشن کے علاوہ گاندھی جی کو پیش کیا۔ اس فارمولے کا نام مدنی فارمولا تھا۔ کانگرس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب مولانا حفظ الرحمٰن اور شیخ حسام الدین نے ورکنگ کمیٹی سے استفسار کیا تو گاندھی جی نے انہیں بلا کر نہ صرف فارمولا مسترد کر دیا بلکہ فرمایا کہ اس سے پاکستان بہتر ہے۔ آپ لوگ لیگ میں چلے جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔'' (۵۰)

حادثہ کیا؟ ملی سانحہ نہیں تو اور کیا ہے کہ مارچ ۱۹۴۶ء تک بھی نیشنلسٹ علماء کی سوچ ہندو مسلم قضیے کی کانگرسی اصطلاح پر رکی کھڑی تھی جسے علم الکلام میں استدراک کہتے ہیں جبکہ کانگرس اور برطانیہ دونوں پر وقت کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی خواہش آزادی کو ہندو، مسلم قضیے سے آگے دو الگ قومیں اور ان کی آزادی کی صورت میں علیحدہ وطن کا قیام اپنے منطقی انجام کو بھی پہنچ چکے تھے۔ گاندھی جی مدنی فارمولے کو اس لیے مسترد نہیں فرما رہے تھے کہ اس کو مان لینے سے انہیں واقعتاً کچھ دینا پڑ رہا تھا بلکہ وہ تو ان ملاؤں کی سادگی پر ہنس کر یہ فارمولا مسترد کیے دیتے تھے، کہ اگر مسلمانوں کے معاملات پر ان کے مستقبل کے تحفظات پر فارمولا ہی ماننا ہوتا تو پاکستان ہی کیوں نہیں؟ مسلم لیگ بھی تو مسلمانوں ہی کی اجتماعی خواہش، آزادی اور تحفظ و تشخص کے لئے کوشاں ہے۔ اگر اپنے ہمنوا نیشنلسٹ رہنماؤں اور ملاؤں کو اپنی قوم مسلمانوں کے معاملات ہی پر بات کرنا تھی، تو ان لوگوں کا مقام مسلم لیگ ہے۔ یہ ابھی تک کانگرس اور گاندھی بلکہ ہندو کو سمجھے ہی نہیں تھے، ورنہ گاندھی جی کی سیاست و فراست کے ادراک تک پہنچنے کیلئے تابعداری اور متابعت گاندھی اختیار نہ کرتے۔ یہ قوم پرست (نیشنلسٹ) مسلمان خدا جانے کس قوم کے نمائندے تھے۔ ان کی قوم تو متحدہ قومیت تھی بلکہ عقل عیار کی منطقی تاویلوں کے پھندے بلکہ

شرعی حجت ان کے گلے کی پھانسی بنی تھی۔ مسلمانان برعظیم بہ حیثیت مجموعی مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور یہ مقبول عام نعرہ ۱۹۴۶ء کے سال کی مسلم سیاست کا معنوی جواب تھا کہ

ع مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

اور گاندھی جی مدنی فارمولا کے نیشنلسٹوں سے فرمار ہیں کہ اگر مسلم ہو، تو مسلم لیگ میں جا۔ یہ مسلم اور ہندو بنیاد ہی تو فساد کی جڑ اور آزادی کی بنیاد میں دوقومی نظریہ تھی۔ خدا معلوم گاندھی جی کا ابلاغ ان کے ہمنواؤں کے لئے کیسا تھا۔ شاید مسلم مطالبات اور مسلم قوم کا آزاد وطن یہ شریعت ما آب بھی سمجھ نہ پائے ہوں لیکن شیخ حسام الدین (مرحوم) اور مولانا حفظ الرحمٰن (مرحوم) تو ثانوی درجے کی طبیعتیں اور شخصیتیں تھیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کو خود گاندھی جی نے اس باب میں براہ راست جھاڑا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ پر گاندھی جی کی یلغار

اس مرحلہ اور مقام پر دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کانگرس کی صدرات سے ہندوستان میں تعلیم کی وزارت تک، خود تو گئے مگر اپنے ساتھ اپنی ذہانت کی ایجادیں، مجلس احرار اسلام اور جمعیت علماء ہند کو بھی بہا لے گئے۔ انہوں نے احرار اور جمعیت کی نیو اٹھائی، مشاورت سے نوازا، سرپرستی کی، مولانا آزادؒ نے اپنی تمام تر مساعی نامشکور کے باوصف اپنی جماعت کانگرس کو جب تقسیم ہند اور قبول پاکستان پر مجبور پایا، تو اپنے سیاسی موئیدین کو ایک نئی حقیقت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ سیاست کا نیا رستہ بھی سوجھایا۔ انہوں نے سرحد کے خان غفار اور اسکے خدائی خدمتگار، جمعیت علمائے ہند کے رضا کار اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر مجلس احرار کو یہ مشورہ دیا کہ یہ لوگ اب پاکستان چلے جائیں اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کریں تاکہ آئندہ چل کر وہ پاکستان کی سیاست و معاشرت میں اپنا مقام بنا سکیں، مگر تعجب ہے کہ تقسیم برعظیم کے حتمی مراحل میں اپنے سیاسی پیرکاروں اور فقہی، مذہبی اور ادبی حوالے سے اپنے پرستاروں کو دیا گیا یہ مشورہ، براہ راست گاندھی جی تک جا پہنچا۔ حیران کن امر یہ ہے کہ مولانا آزادؒ نے یہ سیاسی مشورہ جمعیت علماء ہند کے مولانا حفظ الرحمٰن مجلس احرار اسلام کے مولانا حبیب الرحمٰن اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کو اپنی تنہائی میں دیا تھا۔ مجلس احرار اسلام کی اپنی روایت کے مطابق۔

> ''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے احرار کو مولانا کے مشورے سے مطلع ہی نہ کیا بلکہ اس مشورہ کو ہضم کر گئے۔ البتہ ان کے حلقوں سے یہ بات گاندھی جی اور سردار پٹیل تک پہنچ گئی۔''

خان عبدالغفار خان کا اپنا بیان ہے کہ

> ''۱۹۴۷ء کے آخری دن تھے اور ابھی فسادات شروع نہ ہوئے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے انہیں بلا کر کہا، ''خان صاحب میرا خیال ہے حالات اس نہج پر آ گئے ہیں کہ آپ لیگ میں چلے جائیں۔''

میں نے جواب دیا ''مولانا! افسوس کہ آپ مجھے ابھی تک سمجھے ہی نہیں۔'' یہ بات بھی گاندھی جی تک پہنچ گئی، گاندھی جی نے ایک ثقہ روایت کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کو بلا کر کہا، کہ ''اگر آپ یہی سوچ رہے ہیں تو آپ کا ٹھکانہ مسلم لیگ ہے۔'' (۵۱)

کرپس مشن سے لیکر وزارتی مشن تک یہ تیسرا موقع تھا جب گاندھی جی نے براہ راست مولانا ابوالکلام آزاد کو ٹوکا اور انہیں مسلم لیگ میں شامل ہونے کا بھاشن دیا۔ وجہ یہ تھی کہ مولانا آزادؒ ذاتی اور جماعتی طور پر انڈین نیشنل کانگرس کے سابق پردھان (صدر)، وددوان (عالم) اور کانگرس کے ترجمان کی حیثیت سے وزارتی مشن سے مذاکرات اور مطالبات فرما رہے تھے۔ جبکہ جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار اسلام خاص طور پر ان کی فکری اور مذہبی چراگاہیں تھی اور خدائی خدمتگاران کے سیاسی بھرم کے سیوکار تھے۔ ان جماعتوں ہی کے تدبیری توازن سے وہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اندر موثر ہو پاتے تھے۔ کہ نہ انکا کوئی حلقہ نیابت تھا، نہ عام مسلمانوں کے اندر موثر اثر۔ البتہ ان کا یہ تدبیری حربۂ سیاست بھی ہندو کو رام نہ کر سکا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کانگرس کے ۱۹۴۶ء تک پردھان رہے کہ اس کے بعد مسلمانان برعظیم کو مذہبی شدھی کے بعد اب سیاسی شدھی کرنے کی متحدہ قومیت کی آکاش بیل مولانا آزاد کا کھیل تھا۔ جب برعظیم کی مسلم امت نے اپنی فطری ترکیب سے قوم بنائی اور ملک لے لیا تو اب مولانا کے مشورے اپنے ان سیاسی پسماندگان کیلئے عملاً کیا وقعت رکھتے تھے؟ دوسرے کانگرس اور گاندھی جی انہیں ابوالکلام آزاد کی حیثیت سے نہیں مسلمان کی حیثیت ہی سے دیکھتے اور کسی لمحے ان کی ملت گریز طبیعت اپنے سیاسی پرستاروں کو پاکستان جانے اور لیگ میں شامل ہونے پر تو کانگرس مشوش ہوئی تو یہ پاکستان کو بہ طیب خاطر قبول فرمانے کا نام نہیں اور نہ ہی انہیں پاکستان کی تحریک، قیام اور استحکام سے کوئی رغبت یا نسبت تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اگر وہ پاکستان کو تجربہ سمجھ بیٹھے اور اس کو مسلمانوں کا ایک ملک ہونے کے ناطے قائم رہنا چاہیے کہتے رہے تو یہ اعتراف شکست نہیں نہ ہی اپنے سیکولر مزاج ہونے کی عملی تردید تھی۔ انہیں پاکستان کا خیرخواہ باور کرانے کیلئے پاکستان میں انکے عقیدت مندوں کی ایک قلمی لابی، بڑی چابکدستی کے ساتھ یہ باور کرانے کے درپے ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ ایک تو ملت اسلامیہ کے اس صدی کے سرخیل اور امام (نجانے کس کے) ہو گذرے ہیں، جن کی انشاء وعبارت اور سیاست وصحافت اس دور کے عجائبات میں سے تھی۔ اس میں کیا شک ہے۔ مگر اس ابوالکلام نے اپنی بقیہ حیات مستعار میں ملت اسلامیہ سے اپنا قرض چکا لیا۔ تحریک پاکستان کے دوران انہوں نے اپنی علمی، ادبی حیثیت اور مذہبی اور خود پسند طبیعت کو پورا کا پورا کانگرس میں داخل فرما لیا تھا۔

ع مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

کی فطری فضا میں وہ سیکولر بھارت میں مسلمانوں کو مدغم اور ضم کرنے کی سیاست کے امام تھے۔ ابوالفضل کے بعد یہ دوسرے مذہبی دماغ ہو گذرے ہیں جن کی درباری حیثیت کو جدید دور میں کابینہ کارکن یعنی وزیر کہتے ہیں۔ ایک وزارت تعلیم کی خاطر انہوں نے برعظیم کی پوری ملت اسلامیہ کو چھوڑا۔ کہ وہ بزعم خویش، امام الہند، یا خود کو ابن تیمیہ کے منصب ومعراج پر فائز پاتے

سیکولر جمہوریہ بھارت کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزادؒ

تھے۔ ان کے پرستاروں نے عقیدت کے زور پر انہیں ''دماغوں کا مجموعہ'' قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے دماغ کی جتنی ضرورت ہندومت کو ہے اس کی اسلام کو چنداں ضرورت نہیں۔ وجہ معلوم کہ عقل، خبر اور دین قلب ونظر کو کہتے ہیں۔

ع عقل قرباں کن بہ پیش مصطفیٰ

یا پھر صاف لفظوں میں

ع کہاں حضور کی لذت؟ کہاں حجابِ دلیل

(اقبال)

یا پھر

یہی تو مفکر پاکستان اقبالؒ کا فیض وفیضان ہے، ابوالکلام کا علم الکلام نہیں کہ جو بلاشبہ ''کئی دماغوں کا مجموعہ'' ہونے کا شوق وشرف رکھتے ہیں جبکہ اقبالؒ تو دین ودل اور فقر وعشق کے بلالؓ مشرق ہیں۔ پاکستان میں مولانا ابوالکلام کے سب سے موثر، موید اور مرید مرحوم آغا شورش کاشمیری نے سچ کہا ہے اور ٹھیک فیصلہ بلکہ فتویٰ دیا کہ

''اقبالؒ، ابوالکلامؒ دو مختلف راستے تھے'' (۵۲)

اور تو اور ۱۹۴۷ء کے بعد سن پچاس تک ہندوستان میں رہ جانے والے تعلیم یافتہ افراد کو انہوں نے پاکستان جانے کی تلقین فرمائی کہ پاکستان کو ان کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں باقی ماندہ مسلمانوں کو سنبھالا دینے کیلئے حضرت مولانا خود جو کابینہ میں موجود تھے۔ دین اور علم وہنر کو دیس نکالا دینے کی مشاورت، اگر ان کے اخلاص علم کا نام ہے تو پھر پاکستان کا قیام برعظیم کے کروڑوں مسلمانوں کے معاشی، اجتماعی اور تہذیبی مستقبل کا نام ٹھہرتا ہے، جو مولانا کی سیاست اور فراست کی ضد کا نام ہے۔ یہاں تک کہ لفظ پاکستان کے بارے میں ان کا یہ ارشاد بھی ریکارڈ پر ہے، کہ یہ لفظ ''میرے حلق سے نیچے نہیں اترتا''۔ افسوس کہ انہوں نے پاکستان کو تر نوالہ سمجھ رکھا تھا کہ ان حلق سے نیچے اترتا۔ البتہ پاکستان ان کے پورے مزاج کا ہیجان ضرور ثابت ہوا۔ چنانچہ بھارت کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو پاکستان بھجوانے اور اپنے سیاسی متبعین اور پیروکاروں کو پاکستان جابسنے کے مشورے ان کے احساس شکست اور اعتراف حق پسندی کا رویہ نہیں، وقت اور حالات کی مجبوری کا نام تھا۔ اور حقیقتاً یہی پاکستان کا مطلب ومدعا تھا۔ سچ تو یہ کہ مولانا ابوالکلام پاکستان میں اپنے ہم نواؤں کے سیاسی اور معاشی مستقبل کو محفوظ ومامون بنانے کے درپے تھے۔ انہیں پاکستان اور اس میں اسلام کا درد نہیں تھا۔ مغل اعظم اکبر کا دور تو ہندو کو سیاسی طور پر گھیرنے کا نام ہے۔ جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت تک کانگرس کا دور مسلمانوں کو ہندویت میں ضم کرنے کی سیاسی اور ہندوانہ سازش میں شریک ہونے کا انجام ہے جو حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے مطابق ''اسلام نے مسلمانوں کو بچا لیا'' (خطبہ الہ آباد) اور یہی واقعی فرق ہے، حضور سرکار دو عالم ﷺ کے علماء اور مسلمانوں کے مکتبی اور روایتی ملا کا۔ اقبالؒ نے زوال آشنا برعظیم کی ملت اسلامیہ میں حضور ﷺ کے فیض وفیضان کے جس درکو وا کیا اس کے روحانی اعجاز کا نام پاکستان ہے۔ پاکستان کیا

ہے؟ گویا اقبالؒ کی ایک التجا کا جواب ہے۔

ع تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی ﷺ
(اقبالؒ)

یہ برعظیم پاک و ہند میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد اقبالؒ تک زوال امت کا تین سوسالہ دورانیہ ہے۔ بس یہی وہ مرحلہ اور مقام بھی ہے جہاں غور و فکر اور عقل کا ابوالکلام صراط مستقیم سے ہٹا جاتا ہے اور عشق کا اقبال پیام دین لیکر اپنی سیاست و سیادت کا نقش چھوڑ جاتا ہے، کہ جس کیلئے نظریہ پاکستان اور اسکا قائد جناح دو نام ہیں۔ یہ نظریہ پاکستان اور بانی پاکستان دونوں ہی تو اقبالؒ کی دریافتیں (Discoveries) ہیں۔ یہی پیکار عقل و دین تھا جس میں اقبالؒ ہی کے ارشاد کے مطابق

ع جیتا ہے رومیؒ ہارا ہے رازیؒ

کا امر واقع ہو کر رہا۔ صاف ظاہر ہے پاکستان حضور سرکار دو عالم ﷺ کے فیض عام کا نام ہے۔

اس سے بڑھ کر بد یہی ثبوت اور عمل کیا ہوگا کہ ابوالکلام کو جاننے ماننے اور اُن کا کلام پڑھنے کا حلقہ ہندوستان نہیں پاکستان میں رہ گیا کہ ان کی تصانیف کو ان کی قومی بھاشا ہندی میں منتقل نہیں کیا جاسکا۔ ''انڈیا ونز فریڈم'' ان کے طویل انٹرویو یا بیان کی بلاغتوں اور یادداشتوں کا نام ہے جس کے تیس صفحات کو تیس سال بعد ظاہر کرنے کا عقلی منصوبہ اب اپنے تمام تر اثرات کے ساتھ ظاہر ہے۔ جس میں مولانا مرحوم نے کانگرس کے بنگالی نیتا سی آر داس کے سوا تمام کانگرسی قیادت پر عدم اطمینان کا اظہار فرمایا ہے۔ اس پر مولانا اور ان کی متحدہ قومیت کی سیاست پر فاتحہ پڑھنا چاہیے۔ مولانا کے پاکستانی پرستار ضد نہ کریں، اور مولانا کو ہندومت کا معاون ہونے میں شک کا فائدہ دے کر بری نہ کریں کہ ہندو اور کانگرس کے بھارت میں کئی مسلمان، عورتیں، عصمتیں، قرآن، مساجد، مزار، بلکہ انسانی اقدار قتل ہو چکے ہیں۔ جن کے بھارت بھر میں قتل کے چشم دید گواہ کا نام ابوالکلام آزادؒ ہے۔ ان کا یہی مقام و انجام ہی کافی ہے کہ ان کے قلمی مرید آغا شورش کاشمیری ہی کا مصرع ہے۔ کہ

ع بُت خانے کے طاق پہ شورش شمع حرم کو دیکھ رہا ہوں

یہ احساس و اظہار فارسی زبان کے اس مصرع کا اُردو سانچہ ہے، جس میں مولانا ابولکلام آزادؒ کیلئے آزاد طور پر کہا گیا

ع بتوں کے نرغے میں گھری ہوئی اذاں کی طرح

اپنے بہی خواہوں کو پاکستان پدھارنے کے بالآخر مشورے بلاوجہ بھی نہ تھے۔ ان کے پیش رو صدر کانگرس مسٹر کرپلانی (سندھ) اور میرٹھ کانگرس ہی میں سردار پٹیل کا خطاب برعظیم کی ملت اسلامیہ پر ایک یلغار نہ تھی تو اور کیا تھا۔ خود مولانا نے اپنے طور سعی فرمائی، کہ ان کا زہر چوس لیں، مگر مولانا کی انا اور میں انہیں سمجھا نہیں پائی کہ ہندو اور مسلمان دو متحارب

قوموں اور دو متخالف سمتوں کا نام ہے۔ مگر کانگرس کے اندر تقسیم ہند تک ان کے ذاتی تجربات و احساسات کے باوجود اعتراف شکست اور اپنے وطنی زاویہ نگاہ کی اجتہادی غلطی کا احساس نہ کرنا، ان کی طویل سیاسی زندگی کی آخری ہچکی ہے۔ حالانکہ شورش ہی نے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ایک انٹرویو میں ان سے کہا تھا کہ

''بعض علماء بھی تو قائداعظمؒ کے ساتھ ہیں۔''

فرمایا

''علماء اکبر اعظم کے ساتھ بھی تھے۔ اس کی خاطر انہوں نے ''دین اکبری'' ایجاد کیا تھا۔ اسی شخصی بحث کو چھوڑ و اسلام کی پوری تاریخ ان علماء سے بھری پڑی ہے جن کی بدولت اسلام ہر دور میں سسکیاں لیتا رہا، راست بازز بانیں چند ہی ہوتی ہیں۔ ۱۳سو برس کی تاریخ میں کتنے علماء ہیں جنہیں تاریخ نے توقیر کے خانے میں جگہ دی ہے۔'' (۵۳)

اولاً:۔ مولانا آزادؒ کے بارے میں نامور مذہبی مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (علی میاں) نے لکھا ہے کہ

''اس کو ہندوستانی مسلمانوں کی بدقسمتی کہیے کہ نااہلی یا مولانا آزادؒ کی بے چین اور عبقری شخصیت کا فکری تقاضا کہ انہوں نے الہلال کے اجراء کے آغاز سے مسلمانوں میں فکری و سیاسی بیداری کا جو انقلابی کام شروع کیا تھا اور جو ''حزب اللہ'' کی تربیت اور امارت شرعی اور امامت دینی کے احیاء پر منتج ہو رہا تھا، جو عرصے سے مسلمانوں میں مردہ اور معطل ہو چکا تھا، مولانا آزاد کی اس صدائے اسرافیل سے اس میں جان پیدا ہونی شروع ہوگئی تھی اور ہندوستان کے ایک بڑے باشعور اور باحمیت طبقہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے یا ان کی امارت تسلیم کر کے ان کو امام الہند بھی کہنا شروع کر دیا۔ اُس کو اُسی جگہ روک دی''۔ (۵۴)

ثانیاً:۔ مولانا آزادؒ کے ایک اور مداح پاکستان کے ممتاز مبلغ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا کہنا بھی یہی ہے کہ

''مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ۱۹۱۳ء میں ''حزب اللہ'' قائم کی اور ''حکومت الہیہ'' کے قیام کی زوردار اذان دی لیکن لوگ ابھی جمع ہی ہو رہے تھے کہ بظاہر ذاتی ''امامت'' منعقد نہ ہونے کے باعث پوری بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی۔'' (۵۵)

جبکہ تحریک پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اعلیٰ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے فیض چشتیہ وصابریہ نے انسان سازی اور خاص طور پر کانگرس کے عصری فتنہ کے خلاف جس قدر کام کیا اور علمائے ربانی کو تحریک پاکستان کی حمایت اور امداد پر تیار کیا اس کے بارے میں شورش کاشمیری نے جو جملہ ''مولانا آزادؒ'' نامی کتاب میں لکھا ہے یہ ان کی شخصی اور ذاتی رائے تو ہے مگر یہ کہنا

''مولانا اشرف علی تھانوی اپنی مشیـــخیـــت کے انسان تھے انہیں برطانوی سرکار کے خلاف ہر جدو جہد سے پرہیز تھا۔''(۵۶)

یہ امام الہند اور شیخ الہند سے عقیدت تو ہے ہی وطنیت کا ہندی (مقامی) تصور ہے، ملی اور اسلامی ہرگز نہیں۔ وجوہ دینی ہیں، سیاسی ہیں اور عصری بھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (علی میاں) نے لکھا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے

''تحریک خلافت کی ناکامی، ہندو مسلم اتحاد کی شکست، فرقہ وارانہ تحریکوں کی مقبولیت اور ان کے خلاف مسلمانوں کے شدید ردِعمل اور جذبات سے بددل ہو کر انہوں نے اپنی ساری دلچسپی و سرگرمی خداداد صلاحتیں اور توانائیاں اور فعال و مستقل و منظم ادارہ (جماعت) انڈین نیشنل کانگرس کے حوالے کر دیں۔''(۵۷)

ثالثاً

اور آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اپنا ایک ذاتی تاثر اور تاسف ہے جو انہوں نے ہندی زبان کے ہندوستان کی قومی زبان قرار پانے پر حمیدہ سلطان نے ریکارڈ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''مولانا صاحب اب تو آپ وزیر تعلیم کی بجائے شکشا منتری کہلائیں گے اور پندرہ برس بعد تو اُردو کو ملک سے خارج کر دیا جائے گا؟ مولانا نے بڑے غمگین لہجے میں کہا ''کون زندہ رہے گا پندرہ برس تک'' اور پھر مولانا سونے کے کمرے میں چلے گئے۔''(۵۸)

نیشنلسٹ سیاست کا انجام

برعظیم جنوبی ایشیاء میں ہندو مت کی صدیوں سے جاری تہذیب و تحریک کو جس صورت حال کا سامنا برطانوی ہند میں ہوا، اس کی صدیوں کی تاریخ میں اس سے زیادہ بار آور اور کوئی دور نہیں گذرا۔ ایک وسیع و عریض ملک، جس کا انتظامی ڈھانچہ، وفائی صلاحیت، اور تعلیمی نظام، عدالتی سسٹم، یہاں تک کہ پورے خطے میں برطانوی استعمار کے جانشین کے طور پر ایک بنا بنایا اور جما جمایا ملک اور ایک معاصر اور موثر طاقت بھارت یہ وہ معنوی، مقصدی اور مفاداتی، حاصل غلامی نہیں حاصلِ رفاقت تھا، جو برعظیم میں ہندو قوم نے انگریز دوستی کے رویہ سے بھارت ایک آزاد ملک کے طور پر مع سود در سود ۱۹۴۷ء میں نقد وصول پایا مسلمانوں کا المیہ یہ رہا کہ اپنے گیارہ سو سالہ اقتدار کے بعد ۱۸۵۷ء میں محکوم و معتوب ہونے کے بعد، معاشی، سماجی اور تعلیمی طور پر انگریز کا براہ راست عتاب اس سابق حکمران قوم کا مقدر قرار پایا جن سے برعظیم کا اقتدار برطانیہ نے تاجور کے روپ میں سازش کر کے چھینا، مبلغ بن کر عیسائیت پھیلانے کی جدوجہد کی، بالآخر انتظامی (Administrative) ترکہ اور تاثر کے ورثہ کو انڈین نیشنل کانگرس کو بخوشی اور مسلم لیگ کو بددلی اور نفرت اور عداوت کے احساسات کے ساتھ کٹا پھٹا مجبوراً پاکستان کا ادھورا جغرافیہ دینے کی بات تسلیم کی۔ وگرنہ انگریز مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے
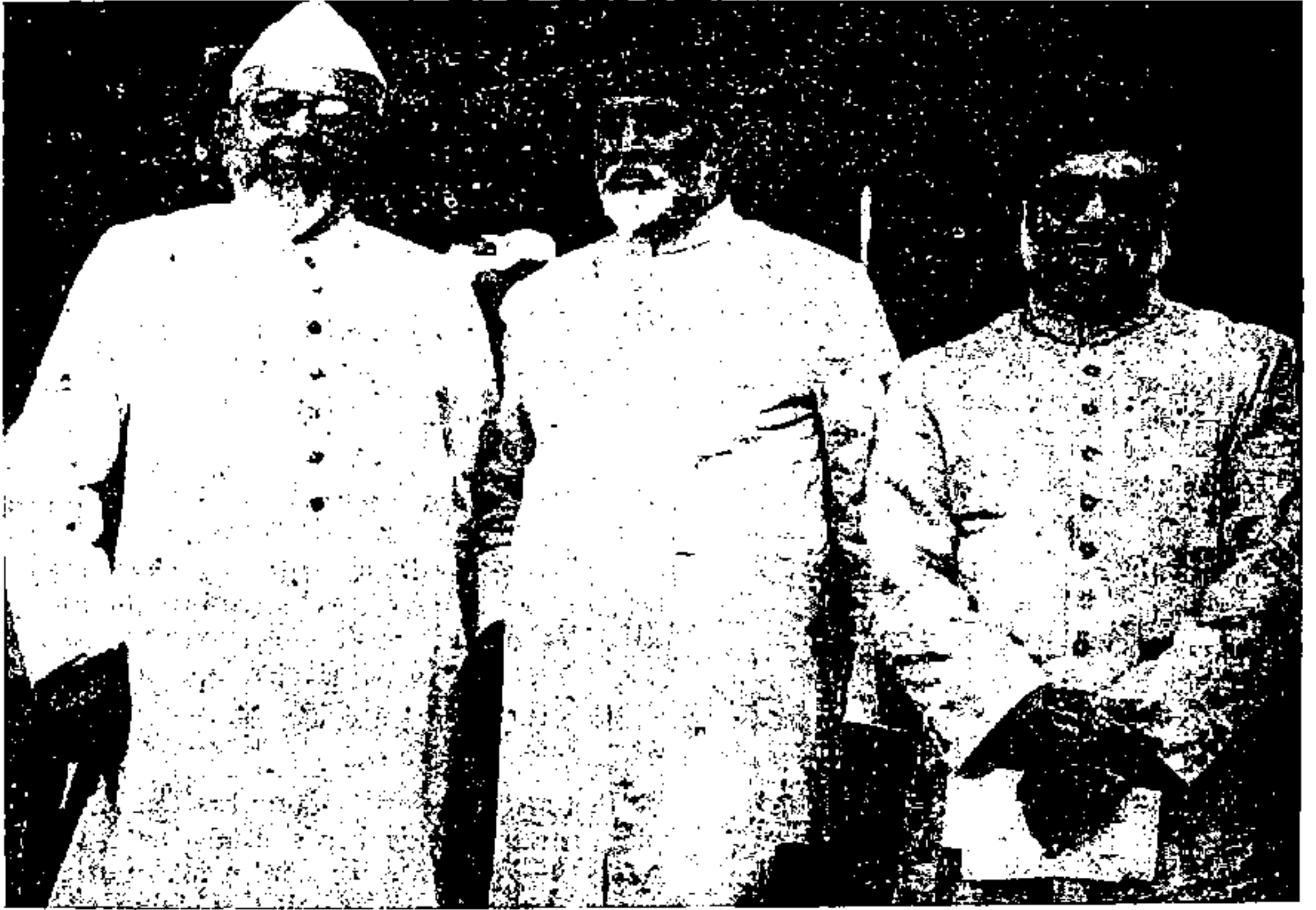
دائیں سے بائیں (شیخ حسام الدین، صدر مجلس احرار، ظہیر الدین صدر آل انڈیا مومن کانفرنس، خواجہ عبدالمجید صدر آل انڈیا مسلم مجلس) نیشنلسٹ رہنما

بھارت کے ساتھ نتھی کر کے مسلم قوم کو ہندوؤں کا مستقل غلام بنانے کی در پردہ خواہش کا علمبردار تھا۔ یہ تو مسلمانوں کی اجتماعی خواہش کا بے باکانہ اصرار اور جذبہ حریت تھا جس نے مسلم لیگ کے منظم اور باہمی اتحاد کی برکت سے جناحؒ کی قیادت پر یقین وایمان اس قدر پختہ کر لیا کہ پھر نہ انگریز کی سازش کامیاب ہوئی، نہ انڈین نیشنل کانگرس کا ادعا اور تدابیر۔ یہاں تک کہ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ سے بعض مذہبی رہنماؤں اور کانگرسی ملاؤں کی کھیپ تو گاندھی جی کے آشرموں سے لے کر چرنوں تک میں سیاسی اور مذہبی شدھی کا متحدہ قومیت کا دامِ ہم رنگِ زمین بچھائے، اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اگر میر جعفر نے پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں اپنی ذات اور اولاد کے تخت وتاجور کی خواہش کو سازش کا روپ دیکر انگریز تاجروں کو ہندوستان کا تاجور بنانے کا دروازہ کھولا، تو میر صادق نے جنوبی ہند میں اپنی غداری سے انگریزی اقتدار کو راستہ دیکر ملت فروشی سے کام لیا۔ بعینہٖ تحریک آزادی ہند میں بعض رہنماؤں نے اپنی ذات اور جماعت بلکہ آئندہ چل کر اپنی سلبی اور نسلی اولاد کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی مستقبل درخشاں بنانے کیلئے ملت گریز اور متحدہ قومیت کی راہ اختیار کی اور ہندو کانگرس کے ایماء پر برعظیم کی ملت اسلامیہ کو ہندوستان کی آزادی کے نام پر ہندوؤں کو موجودہ بھارت دلانے اور وہاں کی مستقل اکثریت ہندو کا مسلمانوں کو مستقل غلام بنوانے کا کارنامہ انجام دینے کو تحریک حریت اور استخلاص وطن سے تعبیر کیا۔ ان رہنماؤں کی نفسیات پر انگریز اقتدار کا متنفر چہرہ اس قدر ہیجان انگیز ہو گیا، کہ اس امر کا ہوش نہ رہا کہ انگریز دشمنی سے مراد ہندو غلامی تو نہیں ہے۔ انگریز کی دیسی مطابقت اور پیروی و رفاقت کا نام ہندو نیشنلزم، انڈین نیشنل کانگرس اور پوری ہندو قوم تھی، تھری پیس سوٹ کی جگہ دھوتی یا لنگوٹی باندھنے، پائجامہ اور شیروانی کی اوٹ سے اصلیت سطح بین لوگوں کیلئے، تو حجاب بن سکتی تھی اور ہے وگرنہ نگاہ بلند نے اس ظاہری لباس ولبادے میں دل ہندو کا، دماغ انگریز کا مگر جدید ہندونسل پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہ کی۔ یہی سبب ہے کہ برعظیم کے مسلمانوں کا مستقبل ایک خود مختار مملکت کا قیام ہی نظر آیا۔ یہ ''میں دیکھتا ہوں، یا مجھے نظر آتا ہے'' حضرت علامہ اقبالؒ کے خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء کے وہ الفاظ ہیں جن میں انہوں نے شمال مغربی ہندوستان (موجودہ پاکستان) کے جغرافیہ کے حصار میں مسلمانوں کے اقتدار کا مستقبل دیکھا تھا۔ البتہ ۶۲ برس بعد بھی کچھ قلم کار یہ بتانے لگے ہیں کہ پاکستان کی تحریک کی مخالفت محض سیاست کا اختلاف تھا اور وہ بھی حضرت قائداعظمؒ کی سخت اور ضدی طبیعت کے باعث اور پھر یہ بھی کہ آخر کار ابوالکلام آزادؒ نے پاکستان کیلئے خیر خواہی کے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی بڑی نوازش، بہت مہربانی، اللہ انہیں اجر دے، ان کی متحدہ قومیت کے بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار کی خبر دے۔ مگر کب اور کہاں ایسا تھا؟ یوپی سے پاکستان جانے والے ایک گروہ سے باتیں کرتے ہوئے ابوالکلام آزادؒ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ ایوان اردو دلی کے مولانا آزاد نمبر میں دسمبر ۱۹۸۸ء کے صفحہ آخر کا اقرار نامہ ہے۔

انجام کیا ہوگا؟ ابوالکلام آزادؒ

آپ مادر وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے سوچا انجام کیا ہوگا؟ آپ کے اس فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ قومیتوں کا دعویٰ لے کر اُٹھ کھڑے ہوں بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان، خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔ کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہ رہ جائیگی؟ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورتحال سے نمٹ سکتے ہیں۔ مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفوں کا سامنا کرنا پڑیگا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے۔"(۵۹)

یہاں تک کہ جوش ملیح آبادی کو پاکستان جانے کا مشورہ دیا تو اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ارشاد و استدلال بھی ملاحظہ کرنے کے لائق ہے۔ یادوں کی بارات میں جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ مولانا نے مجھ سے کہا کہ

"آپ کا ہجرت کر جانا ہر چند ہمارے لئے پشیمانی اور سرگردانی کا باعث ہوگا لیکن جہاں تک آپ کے خانوادے کے مستقبل کا سوال ہے، میری رائے ہے کہ آپ ہجرت کر جائیں۔ یہ سچ کہا کہ نہرو کے بعد آپ کا یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا۔ آپ تو آپ خود مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔ میں ہر معاملے کو منطقی طور پر دیکھنے کا عادی ہوں لیکن جواہر لعل نہرو شدید جذباتی آدمی ہیں وہ آپ کے ہجرت پر کس طرح آمادہ ہونگے"(۶۰)

لگے ہاتھوں جوش ملیح آبادی کے ہاتھوں کابینہ کے رکن اور وزیر تعلیم ہونے کا احوال بھی پوچھ لیں تو ایک ذاتی تجربہ بلکہ تاثر ہے جو مولانا مرحوم کی شخصیت کے منصب کی معراج پر دربار اکبری کے نورتن ابوالفضل سے کہیں زیادہ ابوالکلام آزادؒ وزیر تعلیم کا مقام معلیٰ ہے۔ جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں۔

مولانا آزادؒ اور وزارت تعلیمات

"مولانا بیچارے پر تعلیمات کی وزارت کا نشہ چڑھ چکا تھا اور نہرو وزارت عظمیٰ کا پورا مے خانہ خالی کر دینے کے باوجود ہوش میں تھے۔ یہ فرق دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا کہ مولانا مجذوب بن چکے ہیں اور پنڈت سالک کے درجے پر فائز ہیں۔ افسوس کہ مسلمان پر حکومت کا نشہ بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔"(۶۱)

بلکہ جوش ملیح آبادی کسی کام سے مولانا ابوالکلام آزاد کو ملنے ان کے دفتر گئے۔ کافی دیر تک کیفیت انتظار نے جوش صاحب کو ہلکان کر دیا۔ رند بادہ خوار ہونے کے باوصف جوش صاحب زحمت انتظار سے بلبلا اٹھے۔ مولانا ابوالکلام سے ملے بغیر یہ شعر ان کی نذر کر آئے کہ

کیا ضروری ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا!

(جوش ملیح آبادی)

مولانا مسلمانوں کو پاکستان بھیجتے ہیں

کہاں ۱۹۴۷ء کی صبح آزادی جب راجدھانی دلی مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو گئی اور مولانا ابوالکلام آزادؒ انہیں پاکستان جانے سے روک رہے ہیں اور کہاں مسلمانوں کو باضابطہ طور پر پاکستان جانے کے مشورے دیتے ہیں۔ کہیں خود ہی بھارتی مسلمانوں کو پاکستان کے ماحول میں اجنبی بتانے کے درپے ہیں، منطق و استدلال کے یہ فکری طلوع و غرب کا دوسرا نام ابوالکلام آزادؒ بلکہ انجام قرار پایا ہے۔

متحدہ قومیت میں مسلمان ایک تجربہ

آزاد بھارت مولانا ابوالکلام آزادؒ خود آزاد تھے کہ پابند، یہ ان کی شخصی حیثیت کا سیاسی تجزیہ ہوگا، البتہ متحدہ قومیت میں مسلمان اور پھر مسلسل ان کا قتل عام، کس متحدہ قومیت کا شہکار کہیں، رب ذوالجلال کو پکاریں کہ مولانا آزاد کو آواز دیں، پاکستان میں مولانا آزادؒ کے قلمی مرید حضرت آغا شورش کاشمیری ہی نقشہ کھینچتے ہیں

بھارت میں مسلم کش فسادات پر ایک اداریہ

''دنیا کے نقشہ پر ایسا کوئی ملک نہیں جہاں ۲۱ سال سے اقلیت کے جسم و جان پر لگاتار حملے کئے جا رہے ہوں۔ اس کا لہو پانی سے سستا ہو، اس کی آبرو پر دست درازیاں کی جا رہی ہوں، اس کے گھروں کو خاکستر بنایا جا رہا ہو، اس کی اولاد کا مستقبل ہی نہ ہو وہ رات کو سوئے تو دن کی آس نہ ہو، دن کو پھرے تو اگلے پہر کی خبر نہ ہو، جس کی زندگی انگاروں پر لوٹتی ہو، جس کو مٹی کے ذرے سمجھ کر رگیدا جا رہا ہو، جس کی تہذیب پر خنجر اٹھتے ہوں، جس کا تمدن مٹایا جا رہا ہو، جس کی زبان ایک الزام بن گئی ہو، جس کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں اکثریت کے لُچوں کی زد میں ہوں، جس کی تاریخ کو اس طرح پھاڑا جا رہا ہو کہ اس سے پہلے چشم فلک نے کبھی ایسا منظر ہی نہ دیکھا ہو۔ لیکن ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور وہ ملک ہے ہندوستان، جس کا شدھ نام بھارت ہے۔ اس ملک کے

پچھمن زادے مسلمانوں کو سروپ لیکھا سمجھ کر ان کی ناک کاٹ رہے ہیں۔ مہاشوں کے نزدیک مسلمانوں کا وجود دروپدی ہے کہ جوئے میں ہر چکا اور ان کے تصرف میں ہے گویا انہیں حق حاصل ہو گیا ہے کہ اس سے غاصبانہ سلوک کریں۔

کوئی سال ایسا نہیں گزرا کہ سنگھٹنی فرزندوں نے مسلمانوں کو مٹانے کا تہیہ نہ کیا ہو، کوئی مہینہ چین سے نہیں کٹتا، کوئی ہفتہ آرام سے نہیں نکلتا، کوئی دن سکون کا نہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اس ایندھن کی سی ہے جس کے مقدر ہی میں جلنا لکھا گیا ہو۔

پچھلے مہینے سولہ مارچ کو موتی لعل، جواہر لعل اور اندرا گاندھی کی جنم بھومی الہ آباد میں مسلمانوں کے لہو سے جو ہولی کھیلی گئی اس کی تفصیلات ہزار ہا مقامی مسلمانوں کے دستخطوں سے ۲۴ مارچ کو مرکز کے نائب وزیر قانون مسٹر یونس سلیم کے حوالے کی گئیں۔ اس یادداشت میں کہا گیا ہے کہ الہ آباد کا فساد محض ہندوؤں کی مسلمانوں پر چیرہ دستی ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ پولیس نے بہ نفس نفیس مسلمانوں کو لرزہ خیز مظالم کا تختہ مشق بنایا۔ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی اور اس طرح لوٹا کہ لوٹ کا لفظ بھی فریاد بلب ہو کر چلا اٹھا۔ پولیس پشت پناہی کرتی رہی، مسلمان لٹتے یا قتل ہوتے رہے۔ ہولی کا تہوار ۱۵ مارچ کو ختم ہو گیا لیکن ۱۶ مارچ کو جہاں تہاں مسلمانوں کی دکانیں تھیں لوٹی گئیں یا نذرِ آتش کی گئیں۔ صبح دس بجے سے لے کر شام کے پانچ بجے تک وحشیانہ اودھم مچا رہا لیکن پولیس فسادیوں کو اس طرح شہ دیتی رہی گویا سب کے سب اس کے خانہ داماد تھے۔ کوتوالی کے بالکل سامنے جامع مسجد ہے جہاں دن بھر پتھراؤ ہوتا رہا، لیکن پولیس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اسی یادداشت میں کہا گیا ہے کہ پولیس خود فسادیوں کی راہنمائی کرتی رہی، گولی چلائی تو مسلمانوں پر جو اپنی مدافعت کر رہے تھے۔ غور فرمایئے گولی کا نشانہ بھی مسلمان جن کی ناگفتہ بہ حالت فساد رچانے کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ مسجدوں کو جلایا گیا، امام باڑوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ مسلمانوں کے تحفظ کی درخواست کو ضلعی حکام نے ٹھکرا دیا، الٹا مسلمان بچوں پر گولی چلوائی گئی۔ ایک زخمی اور کئی شہید ہو گئے۔ ستم پر ستم کہ ہندو غنڈے تھانوں میں پناہ لیتے رہے۔ ۱۶ مارچ کو فساد شروع ہوا ۱۹ مارچ تک جاری رہا۔ اکثریت کی بے شرمی ملاحظہ ہو کہ اس کے بدبخت افراد نے پولیس سے ملی بھگت کر کے ایک دکان سے قرآن مجید نکالے، پرزے پرزے کیے، پھر انہیں آگ لگا دی۔ کسی مسلمان کو کرفیو پاس نہیں دیا گیا، ہندوؤں کو اتنی کثرت سے پاس دیئے گئے کہ یہی پاس ان کیلئے آتش زنی اور غارت گری کا پروانہ ہو گئے۔ مسلم آبادیوں کے مختلف حصوں میں کرفیو کے دوران بم پھینکے گئے۔

انصاف ملاحظہ ہو کہ گرفتار شدگان سب کے سب مسلمان ہیں، کوئی ہندو ماخوذ نہیں ہوا جو پکڑا گیا۔ مسلمان پکڑا گیا، ہندو مجسٹریٹوں نے ضمانتیں لینے سے گریز کیا، بعض مجسٹریٹ عدالتوں ہی سے غیر حاضر ہو گئے، ہندو قاتلوں کو پناہ دی گئی، جس کسی مسلمان نے کسی پردہ نشین خاتون کو آگ سے بچانا چاہا اس کو پولیس کے سب انسپکٹروں نے گولی مار کر ہلاک کر ڈالا۔ کسی حلقے میں بھی فسادی ہندوؤں پر گولی نہیں چلی بلکہ شروع سے آخر تک پولیس انہیں ترغیب دیتی رہی۔ مسلمانوں کے جس نمائندے نے اندرا گاندھی کو ان مظالم سے مطلع کیا پولیس افسروں نے اسے بعد میں اغوا کر لیا آج تک معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے، زندہ ہے یا مر گیا۔

یہ صرف ایک شہر کا واقعہ ہے، سارا ہندوستان مسلمانوں کے تعلق سے چتا بنا ہوا ہے۔ ۲۱ برس سے ان بیچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں، ایک زمانہ تھا بالفرض مراکش کے مسلمانوں پر ظلم ہوتا تو سارا ہندوستان انگریزوں کی غلامی کے باوجود چیخ اٹھتا تھا۔

آج ۲۱ برس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو مٹایا جا رہا ہے لیکن ہم ہمسایہ کے مسلمان بھی اس قتل عام میں ان کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ بعض بد بخت اخبار اور زبان دراز مقرر اپنے سیاسی ذائقے کو قائم رکھنے کیلئے شہ سرخیاں جماتے اور خطابت کے طوطا مینا اڑاتے ہیں لیکن ان کا احساس سیاسی خودغرضی کی حد تک ہے، بھارتی مسلمانوں کے وجود کی بہ نسبت انہیں اپنے مصالح عزیز ہیں۔

آخر ہندوستانی مسلمان کب تک ان بدبختوں کے ہاتھ سے مرتے رہیں گے۔ کب تک ان زخم خوردہ شیروں پر ہندوستان کے لومڑ دھاڑتے رہیں گے، کب تک مسلمانوں کا لہو ان کے جام اہنسا کی شراب بنتا رہے گا، کب تک قتل عام کی رونق رہے گی، کیا ہندوستان کا مسلمان انسان ہی نہیں، ان کا کوئی راہنما نہیں رہا، ان کیلئے کوئی نہیں مر سکتا، کیا ہندوستان کے انسان دوست ادیب مر چکے ہیں ان کے قلم رائے عامہ بیدار نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان کو قفل لگے ہوئے ہیں۔ فراق گورکھپوری کی اس غزل کو ہم کیا کریں جو قاصد کا نوحہ کرتی، لیکن قاتل کے خنجر پر چپ ہے۔ کیا یہ سارا فساد اس شہر میں نہیں ہوا جہاں فراق پڑھاتے ہیں۔ سیاستدان مر گئے، شاعر کدھر اور ادیب کہاں ہیں؟ کرشن چندر کے فسانوں کا رُخ اس طرف کیوں نہیں مڑتا؟ ترقی پسند ادیبوں کو عوام دوستی پر بڑا ناز ہے۔ کیا ہندوستان کے ترقی پسند ادیب اور شاعر اس قتل عام پر احتجاج نہیں کر سکتے۔ ویتنام کا ظلم بڑا ظلم سہی لیکن الہ آباد کا ظلم جو ایک نہتی اقلیت پر کیا جا رہا ہے صرف نظر کا مستحق ہے۔ سردار جعفری اور کیفی اعظمی کہاں ہیں؟ ان کے شعروں میں ہندوستانی مسلمانوں کا لہو کیوں نہیں بولتا، اگر ادب عوام کا

آئینہ ہوتا ہے تو یہ آئینہ ہندوستانی مسلمانوں ہی کے خون پر اندھا کیوں ہے؟

بھارت کی اجتماعی ذہنیت ثابت کر چکی ہے کہ وہ مسلمانوں کے وجود کو برداشت ہی نہیں کرتی۔ سوال یہ ہے کہ صورت حال یونہی رہے گی اور ہندوستانی مسلمانوں کا مقدر یہی ہو چکا ہے تو پھر ہم پاکستانیوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ ایک روز خدا کے روبرو پیش ہونا ہے جو ان سے غداری کر کے پاکستان میں ملوں کے مالک بن کر اپنے لئے کفن تیار کر رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے زخموں کو تمام دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتائیں کہ راون کی اولاد ان پر کیا ستم توڑ رہی ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں کی لاش پر کوئی تاریخ نہیں بنانا چاہتے تحریک پاکستان کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی معنوی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں بلکہ انسان دوست افراد کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کے قتل کی داستان رکھیں۔ تمام ایشیا اور تمام افریقہ کو بتائیں کہ ہندوستان کا سیکولرازام کتنا وحشی ہے۔ جب تک ہندوستان کو اس کی صحیح صورت کے ساتھ پیش نہ کیا جائے گا اس کی لیڈر شپ مسلمانوں کی لاشوں پر قہقہے لگاتی رہے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے اعمال و فکار کی بربریت پر قہقہے لگائیں۔

ہندوستان اگر مسلمانوں کو مٹانا ہی چاہتا ہے تو پھر کسی مسلمان کو صدر بنانے اور کسی کلمہ گو کو چیف جج رکھنے سے فائدہ؟ ان شرفاء کو بھی قتل کر دیں، ممکن ہو تو مولانا ابوالکلام آزاد کی قبر اکھاڑ دیں یہ مسلمانوں کے وجود کا نشان ہیں۔ کیا ضرورت ہے ان کی؟

''ہندوستان ہرگز نہ بھولے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے مسلمان اس سے غافل ہوں تو ہوں اللہ اور اس کی غیرت اس سے غافل نہیں۔ اور اس کے یہاں ہندوستان کے اس عظیم جرم کی سخت سے سخت سزا ہے اور وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔'' (۶۲)

افسوس کہ آغا شورش کاشمیری خود ۱۹۷۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے ان کے بعد مسلمانان ہند پر کتنی قیامتیں گذری ہیں۔ خود بھارتی وزارت داخلہ کی رپورٹ کے مطابق

''صرف ۱۹۶۴ء سے ۱۹۸۳ء تک کل ۷۲۸۷ مسلم کش فسادات ہوئے جبکہ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۳ء تک ۲۸۲۲ مسلم کش فسادات ہوئے۔ یہ شرح فسادات کی ہے، شرح اور تعداد اموات کی نہیں۔'' (۶۳)

مولانا ابوالکلام آزاد کی وزارت کا تعلیم تک محدود ہونے کے ناطے بھی جائزہ لیا جائے، تو ان ہی کے نام پر قائم ایک ادارے کی کارکردگی سے بھارت کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا نقشہ ۱۹۹۲ء کی رپورٹ ہے، جس میں ان کے حسن کارکردگی کا شہکار ملاحظہ کرنے میں کوئی سی وقت نہیں ہوتی۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور نے اپنے ادارتی کالم میں تبصرہ کیا

ہے:

بھارت میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت

''بھارت کے ضلع بلند شہر میں سکندر آباد میں قائم مولانا آزاد ریسرچ اینڈ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن نے بھارت میں مسلمانوں کے مسائل اور اُردو کی تعلیم کے بارے میں اعداد شمار جمع کیے ہیں۔ فاؤنڈیشن کی طرف سے موصول ہونے والے ایک مراسلے میں کہا گیا ہے کہ ادارے نے جو اعداد اور شمار جمع کیے ہیں ان سے ایک خوفناک صورت حال سامنے آتی ہے۔ اگر یہ حالات جاری رہے تو اُردو زبان بھارت سے آئندہ پچیس برسوں میں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اس وقت بھارتی مسلمانوں کے جو مسائل ہیں ان میں سرفہرست وہ مخالفانہ ہندو ذہنیت ہے جس نے مسلمانوں کا وجود ہی برداشت نہیں کیا اور بھارت کی سب سے بڑی اقلیت دوسرے اور تیسرے درجے کی شہری بن کر رہ گئی ہے۔ بھارت میں ایک اندازے کے مطابق گیارہ کروڑ مسلمان ہیں جن میں سے ۷ کروڑ سے زائد ناخواندہ ہیں۔ بھارت کی کل آبادی کا بارہ فیصد مسلمان ہیں لیکن انڈین ایڈمنسٹریٹر سروسز مسلمانوں کی تعداد ۲ فیصد یا اس سے بھی کم ہے۔ اس وقت بھارتی مسلمانوں کو معاشرے اور معیشت میں وہ نمائندگی نہیں دی جا رہی جو ان کا حق ہے۔ مرکزی حکومت کی درجہ اوّل کی نوکریوں میں مسلمانوں کا حصہ صرف ایک اعشاریہ اکسٹھ فیصد ہے۔ ایک سو میڈیکل گریجوایٹس میں سے صرف تین مسلمان ہوتے ہیں۔ جو مسلمان بچے پرائمری سکولوں میں داخل ہوتے ہیں ان میں سے ہر بارہ بچوں میں سے دس ایک وقت سکول چھوڑ دیتے ہیں جب ان کی عمر ہائی سکول جانے کی ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کے اقتصادی حالات بھی اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ بچوں کو سکول میں پڑھا سکیں۔ اس طرح تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے مسلمانوں کیلئے اقتصادی ترقی کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ بھارت کے مسلمان زراعت، تجارت، صنعت غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں پسماندہ ہیں۔''(۶۴)

ہندوستان میں اُردو زبان اور تعلیم یافتہ مسلمان کے مسائل کا یہ نقشہ جس منصوبے کا نتیجہ ہے اس کی ابتداء بھارت میں آزاد ہونے کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی یہ سب انہیں کا حاصل سیاست ہے۔ گویا جو بھی مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن ہے اسے ہندوتو لاحق ہے جسے ثقافتی قومیت کے نام پر جغرافیائی شہرت ہندی کے بجائے ہندو کہنا نہیں ہندو کرنا ہے۔

بھارت کے ۱۵ کروڑ سے زائد مسلمانوں کے احوال و کوائف کا سرکاری سطح پر جائزہ جسٹس (ر) راجندر سچر کی دسمبر ۲۰۰۶ء کی باقاعدہ رپورٹ میں سامنے آ گیا ہے جسکا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ گذشتہ ۶۲ برس سے مسلمانوں کو عملاً پس ماندہ رکھنے کا اجتماعی رویہ بھارت بھر کی حکومت ہی نہیں، ہندو اکثریت کا بے مہر اور تنگ نظر ہونا ہے۔ رپورٹ کا یہ ملخص ہی اس رخ سے

دیکھنے کے لئے کافی ہے۔ بھارت نے اپنے چار روایتی طبقوں، برہمن، ویش، کھشتری اور شودر کے بعد پانچواں طبقہ مسلمانوں کا بناڈالا ہے، جسے وہاں کی دوسری زبان میں دلت (شودر) نمبر۲ بھی لکھا جاتا ہے۔ صاف کہنا چاہیے، بھارت میں مسلمان ایک متعصب اور تنگ نظر اکثریت کے معاشی، تعلیمی اور معاشرتی طور پر بیہمانہ انتقام کے رویے کے بعد ایک سہمی ہوئی، دبی ہوئی اقلیت ہیں جنکی نحیف آوازیں (Passive Voices) کے ایل گابا کی کتاب کا عنوان ہی نہیں بھارت کی راجدھانی (دارالحکومت) دہلی سے لیکر ہر قابل ذکر شہر کی مسلم بستیوں اور انکی معاشرتی پستیوں کو بہ چشم خود ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں متحدہ قومیت بال کھولے رو رہی ہے۔

o وما علینا الا البلاغ المبین o

اختتامیہ

آزادیٔ ہنداور متحدہ قومیت کا حاصل تجربہ

پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تائید وحمایت کی نہایت ہی توانا آواز اور قلمی محاذ کے سرخیل آغا شورش کاشمیری نے خود مولانا مرحوم کا معروضی مقام ایک مصرع میں بیان کیا ہے جس سے ہندو سیاست اور متحدہ قومیت دونوں کا حاصل تجربہ بولتا ہے کہ مولانا آزاد، آزادیٔ ہند کے بعد ہندوستان میں کیا تھے؟ کس حیثیت میں وقت گزارا؟ وہ لکھتے ہیں کہ ''مولانا ابولکلام آزادؒ ہندوستان میں ایک اجنبی اور پاکستان میں ایک گالی'' تو اس سے بڑھ کر حقیقی اور تحقیقی نقطہ نظر اتنے جامع اور کلیدی احساس کے بعد اور کیا ہوگا۔ مگر نہرو کے پی۔ اے نے ''نہرو عہد کے یادیں'' نامی کتاب میں مولانا آزادؒ کی جس قدر کردار کشی کی ہے وہ گالی سے بھی بڑھ کر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ جہاں پناہ سے بے پناہ تک

البتہ یہ کہنے میں کیا حرج ہے کہ مولانا آزادؒ بھارت میں کابینہ کے رکن وزیر تعلیم (شکشہ منتری) کے علاوہ بھارتی پارلیمانی میں پنڈت جواہر لعل نہرو لیڈر (پردھان منتری) کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر ضرور رہے ہیں۔ تاہم پارلیمنٹ میں ان کی ایک تقریر کا حوالہ اس لئے مناسب اور موزوں ہوگا کہ بھارت میں ایک ڈپٹی پارلیمانی لیڈر (ڈپٹی پرائم منسٹر نہیں) کے مذہبی، ادبی اور مالی معاملات کا خطیبانہ بہاؤ جہاں مولانا مرحوم کے حسن خطاب کا شہ کار ہے وہاں آزاد بھارت میں مولانا آزادؒ کے منصب کی معراج کے باوصف متحدہ قومیت میں مسلمان، اسلام اور اُردو کا ماتم وگریہ بھی بیک وقت شامل خطاب ہے۔ چند روپوں کیلئے شبلی اکادمی اعظم گڑھ یوپی کی مدد و معاونت اور وہ بھی وزیراعظم نہرو کے باضابطہ نوٹ پر مولانا نے امداد کیا کی؟ اُردو زبان کا دفاع کہاں خود پاکستان کا پروپیگنڈہ مولانا ابوالکلام کا استدلال بن گیا۔ انڈین نیشنل کانگرس ہی کے تین نامور رہنماؤں اچاریہ کرپلانی، پرشوتم داس ٹنڈن اور سیٹھ گوند داس کے اعتراضات پر ۲۹ مارچ ۱۹۵۴ء کو بھارتی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں (لوک سبھا) میں اُردو کے مسئلے پر جوابی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

> ''شری ٹنڈن نے ''شبلی اکیڈمی'' کی امداد پر اعتراض کیا ہے۔ اس اکیڈمی نے بہت سی کتابیں اُردو میں شائع کی ہیں۔ اس ادارہ کا کانگرس سے تعلق رہا ہے اور اس کے کارکنوں کی کانگرس کے لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہیں۔ پچھلے دنوں شبلی اکیڈمی کے وفد نے پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ تقسیم کی وجہ سے ان کے کاروبار پر برا اثر پڑا ہے۔ ان کی جو کتابیں پاکستان جاتی تھیں وہ بند ہو گئی ہیں۔ پنڈت جی (وزیراعظم) نے وزیر تعلیم (مولانا ابوالکلام آزاد) کو چھٹی لکھی کہ ''یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی کہ تھوڑے سے روپے کیلئے یہ سوسائٹی بند ہو جائے اور اگر بند ہو گئی تو پاکستان بھی

پروپیگنڈہ کرے گا کہ ہندوستان میں اب ایسی حالت ہوگئی کہ اس قسم کی سوسائٹی بھی قائم نہ رہ سکی۔"(۶۵)

مولانا ابوالکلام آزادؒ شبلی اکیڈمی کا کانگرس سے تعلق کارکنوں کی کانگرس سے روابط کی کہانی اور خود وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے ان کے وفد کی ملاقات اور خط کی تفصیل بیان کررہے ہیں، وہ بذات خود ایک وضاحت بلکہ استدلال ہے مگر پارلیمنٹ سے کانگرسی قائدین نے جس طرح مولانا ابوالکلام آزادؒ کو اُردو پرستی پر آڑے ہاتھوں لیا، اس کا عکس ان کے خطاب کا جواب آخر ہے۔تقریر کے آخر میں زچ ہوکر، استدلال کا ابوالکلام اب ملال پر اُتر آیا۔اور فرمایا

"میں لیپاپوتی کی باتیں نہیں کررہا ہوں اس قسم کی باتیں وہ کرتا ہے جس میں کوئی غرض کا مادہ پایا جاتا ہو، میرے اندر کوئی غرض نہیں ہے میں نے اب سے ۴۲ برس پہلے جب میری عمر ۱۸ یا ۱۹ برس سے زیادہ نہ تھی اپنی زندگی کا ایک پروگرام بنایا تھا۔اس وقت سے آج تک میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔زندگی کا بڑا حصہ ختم ہو چکا ہے تھوڑا باقی ہے۔وہ بھی قریب الختم ہے۔جس نے اپنے دل سے غرض نکال دی وہ بے پناہ ہو جاتا ہے۔بے پناہ کا شائد آپ مطلب نہیں سمجھے۔میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی جس کو کوئی تلوار نہ کاٹ سکے، تلوار اس جسم پر چلتی ہے جس میں کوئی غرض ہو، اگر غرض نہیں تو کوئی تلوار اس کو نہیں کاٹ سکتی۔"(۶۶)

۱۹۴۷ء میں مسلمانان دہلی کی ڈھارس بندھاتے ہوئے ان کے خطاب میں "کبھی ہم یہاں (ہندوستان میں) "جہاں پناہ" تھے۔اب قبروں کے کھنڈروں میں پناہ مانگ رہے ہیں اور ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس میں بھڑک کر یہ کہنا کہ میں "بے پناہ" ہوں، ایسا لگتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی متحدہ قومیت کی کمائی ایک ادبی جملے میں بند کی جاسکتی ہے کہ خود مولانا آزاد "کبھی جہاں پناہ سے شروع ہوکر بے پناہ میں بند یا پابند ہوگئے ہیں۔" خواجہ حسن نظامی نے اُردو میں لفظ ہم "کا ماخذ" "ہ" ہندو کی اور "م" مسلم کا بتایا ہے جسے مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاست میں متحدہ قومیت کہتے ہیں۔حالانکہ وہ جس پارلیمنٹ میں خطاب فرما رہے تھے، اس کا انتخاب خود متحدہ قومیت کے فلسفے کی عملی تکذیب کا دوآتشہ تھا۔آزادی سے پہلے وہ سرحد سے پارلیمنٹ کے رکن تھے۔آزادی ہند کے بعد وہ پہلے گڑگاؤں اور پھر رام پور سے دوبارہ منتخب ہوئے۔اس متحدہ قومیت کے عملی حاصل تجربہ پر خود ان کے معاصر اور مسلمان صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس پر تاسف کا اظہار کیا ہے، جس کا تذکرہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے برادر حقیقی یوسف حسین نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند نے (نیشنل انٹی گریشن) کانفرنس دہلی میں خطاب کرتے ہوئے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ

"مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگرس نے اس حلقہ انتخاب کرایا جہاں مسلمان رائے دہندگان

اکثریت میں تھے۔مولانا اس ملک کی سیاست میں کوئی غیر معروف شخص نہ تھے۔تاہم ان کے ساتھ یہ صورت اختیار کی گئی، دوسروں کا تو ذکر ہی کیا۔"(٦٧)

شاید کیا یقیناً یہی تلخی دوراں تھی جس نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ادبی، مذہبی اور سیاسی سطح پر ان کی ذاتی تنہائی میں بند کر دیا۔وہ تحمل و نفاست کا ہیولہ ہوتے ہوئے بھی آخری عمر میں آخری خطاب میں کس قدر زمانے کی بے قدری کا رونا روتے ہیں، وہ موت سے چند برس پہلے دلی میں غالب کانفرنس کی صدارت کرنے کی گذارش پر جس طرح بھڑ کے وہ اُردو زبان کے محاورے میں چراغِ سحری کی مانند تھا۔ان کے معنوی انجام و اختتام کا داخلی الاؤ تھا جو شعلہ گفتار بن کر لپکا۔صاف نظر آتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ آخری عمر میں آخری ایام میں بکھر تو چکے تھے اب بپھر بھی گئے تھے۔حمیدہ سلطان نے مولانا کے بارے میں اپنے مضمون "چند یادیں چند باتیں" میں لکھا ہے کہ

"۱۹۵۰ء میں یوم غالب کی تقریب کا افتتاح کرنے کی درخواست لیکر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ یوم غالب کا افتتاح آپ فرمائیں۔میرا یہ کہنا تھا کہ مولانا اک دم بکھر گئے۔غصے سے ان کا رنگ سرخ ہو گیا اور گرجتی ہوئی آواز میں بولے"کون ہے اب سننے والا؟ میں کس ادب پر تقریر سناؤں۔کوئی نہیں رہا، سب ختم ہو چکا ہے۔کس کو اب مولانا کی ضرورت ہے۔میں اب صرف وزیر تعلیم ہوں اور ایک گوشہ نشین انسان، فضول بات مت کرو، میں نہیں جاؤں گا۔"(٦٨)

مولانا ابولکلام آزادؒ کا یہ اظہار ذات ان کے آخری ایام زیست کا توشہ یا تاثر ہی نہیں اس سے پہلے سب ان کی طبیعت کا رچاؤ اپنے وجود پر عصری روش کا مرثیہ گو ہے، فرماتے ہیں۔

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا، غالب کو تو صرف ایک شاعری کا رونا تھا معلوم نہیں میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔"(٦٩)

یہاں تک کہ اپنے ہونے پر بھی نوحہ کناں ہیں۔

"میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"(٧٠)

مولانا ابولکلام آزادؒ کے اپنے ذاتی تاثرات کا یہ معکوس یا مایوس عکس کہا جا سکتا ہے، جہاں تک ان کی مذہبی، ادبی یا پھر سیاسی شخصیت کے کارہائے نمایاں یا کارناموں کا تعلق ہے اس پر ایک زمانہ گواہ ہے۔ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں جہاں نفاست طبع سے لیکر ذوق موسیقی تک، چائے کے جرعے سے سگریٹ کے مرغولے تک، ایک ادبی ابوالکلام، ایک مذہبی ابوالکلام اپنے قلم اور قرطاس کے بعد سیاست اور قیادت کے جلو میں جیل تک، ایک بھرپور داستان ہے۔تاہم عمر بھر کی کمائی کا نقشِ دوام ان کی سیاست کا ملت گریز رجحان ہے جس نے جوان ابوالکلام جو ملت اسلامیہ کا حدی خوان ہے بوڑھا ابوالکلام

انڈین نیشنل کانگرس کا پردھان یعنی صدر الصدور ہے۔ جس کی عمر بھر کی مذہبی اور ادبی شناخت پر متحدہ قومیت کی آکاش بیل چڑھی ہے۔ ان کے وجود اور دماغ سے زمانے نے انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت اور آزاد ہند کی کابینہ میں تعلیم کی وزارت تک سے تو کام لیا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر سن و سال گواہ ہیں۔ ان کی خدمات کا سب سے نمایاں عکس مولانا کی متحدہ قومیت کی تشریح و تفسیر ہے۔ جس کا تذکرہ ان کی خدمات کیلئے ہدیہ سپاس ہے۔ انہوں نے اپنے خطبہ کانگرس رام گڑھ ۱۹۴۰ء میں جس ابلاغ کے ساتھ متحدہ قومیت کی عالمانہ، خطیبانہ اور صحافیانہ تعبیر فرمائی، اس پر ان کے ''ابلاغ'' کے ابوالکلام اور ''الہلال'' کا ابوالکلام فکرِ معکوس کا عکس ہی نہیں نقشِ دوام نظر آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ پر قلم اٹھانے والا ہر ہندوستانی قلمکار کیا ہندو، کیا مسلمان، دونوں ان کی شخصیت اور کارناموں کی فہرست کا سر آغاز ہی نہیں سر فہرست عنوان ۔۔۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور متحدہ قومیت ہی بناتے ہیں۔ بلکہ بڑے فخر وانبساط کیلئے تو ان کا ایک ہی مومنانہ کردار اجاگر کرتے ہیں کہ

''مولانا آزاد آخر وقت تک تقسیم ہند کے مخالف رہے تھے بلکہ گاندھی، پٹیل اور نہرو تک تقسیم ہند کے قائل ہو گئے مگر مولانا ابوالکلام آزاد بھری کانگرس کے واحد رہنما تھے جو آخر وقت تک تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا کی شخصیت اور کارنامے مرتب کرنے والے ایک فاضل محقق نے بصراحت لکھا کہ

''یہاں صرف ایک بات کہنا ضروری ہے کہ مولانا آزادؒ کانگرس کے واحد رہنما تھے، جو آخر تک تقسیم ملک کے خلاف تھے۔'' (۷۱)

یہاں تک کہ تقسیم ہند نے مولانا ابوالکلام آزاد کی طبیعت کو اس قدر مکدر کیا کہ وہ اپنے اس صدمہ کو مستقل روگ کی صورت دے بیٹھے۔ ان کے ایک معاون خصوصی مسعود بیگ کا بیان ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ

''کیا مولانا کو کسی طرح کی خوشبو یا عطر لگانے کا شوق تھا تو مسعود صاحب نے کہا جی ہاں ایک زمانے تک انہیں کو خوشبو پسند تھی مگر تقسیم ملک کے صدمے سے مولانا نے اسے بھی موقوف کر دیا'' (۷۲)

اکبری سیاست کے نورتن ابوالفضل اور فیضی کے بعد، متحدہ قومیت کے فلسفہ سیاست کو مسلم عوام کیلئے قابل قبول بنانے اور مسلم قومیت کو قیدِ مقامی کی سکونتی رفاقت کا سہارا دیکر امت مسلمہ کو برعظیم میں ہندوؤں کا مستقل غلام اور پھر سے دوام دینے کا نام ابوالکلام یا علم الکلام ہی کیوں ہے جبکہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ برملا اظہار فرما چکے تھے کہ

ع   خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

جس میں مکہ کا باسی قریش نسل عربی زبان کی ہم کلامی کا ابولہب اور ابوجہل حضور سرکار دو عالم ﷺ کے نسبتی چچا ہو کر بھی ملت اسلامیہ سے خارج قرار پاتے ہیں۔ جبکہ حبشہ کا بلال ؓ اور فارس کا سلمان ؓ قوم رسول ہاشمی ﷺ کے دو درخشندہ

ستارے ہیں اور امت مسلمہ کے پیارے ہیں جنہیں امیر عمرؓ بھی یا سیدی بلال ؓ کہیں اور فرمائیں کہ یہ ہمارے ہیں، اس پر مولانا ابوالکلام آزاد کی ذاتی بڑھائی کے باوصف ان کی شخصی کمائی کا اعتراف یہ ہے کہ

''مولانا آزاد غالبًا پہلے جلیل القدر مسلم رہنما تھے جس نے زور قوت کیساتھ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا اور اسے ملک کے عوام وخواص میں رائج وراسخ کرنے کیلئے اپنی تمام تر ذہنی، علمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کردیں۔'' (۷۳)

دوسرے مداحین کا حوالہ کیا دینا خود مولانا ابوالکلام آزادؒ ۱۹۴۰ء جیسے اہم سیاسی سال میں اپنے صدارتی خطبہ کانگرس رام گڑھ میں متحدہ قومیت کا جوالاؤ روشن کرتے نظر آتے ہیں، وہ برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ کی چتا نہیں تو اور کیا ہے جبکہ لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجتماع میں قائداعظم محمد علی جناحؒ قرارداد لاہور اور پھر دوسرے دن کی پریس کانفرنس میں مسلم قومیت کی جو سیج سجاتے ہیں وہ اسلامی قومیت کا پیغام تھا کہ ہر ہر دلیل اور شواہد سے مسلمان اس خطے میں ہندوؤں سے علیحدہ اور الگ قوم ہے۔ مسلمانان برعظیم نے اس استدلال اور اس آواز پر جس طرح لبیک کہی، اس کا ایک تاثر ایک تبصرہ خود مولانا ابوالکلام آزادؒ کے قلمی مرید آغا شورش کاشمیری کا حسنِ اعتراف ہے لکھتے ہیں۔

''لیگ (مسلم لیگ) میں ایک ہی شخصیت تھی اور وہ قائداعظمؒ تھے، مایوسیوں کا طوفان، ایک زلزلہ اور ایک سیلاب، چاروں طرف سے امڈ آیا تھا۔ لیکن اس قدر مضبوط اعصاب کے انسان تھے کہ وہ ہر معرکے، ہر مورچے، ہر موڑ اور ہر محاذ پر ایک ہی نعرہ دے رہے تھے، پاکستان اور صرف پاکستان۔'' (۷۴)

انہوں نے نہ صرف اپنے اعصاب کے غیر متزلزل ہونے کا معجزانہ ثبوت دیا بلکہ مسلمانوں کی عصبیت کو اتنا مضبوط کردیا کہ ان کے دل ودماغ اور زبان پر صرف دو لفظ تھے قائداعظم اور پاکستان! حقیقتاً قائداعظمؒ اور پاکستان دونوں ہی تو دوقومی نظریہ کا وجود و شہود ہیں برعظیم پاک وہند میں اس دوقومی نظریہ کی تاریخ کیا ہے، تحریک کیا ہے؟ اس کا ایک نظر مورخانہ اور محققانہ تجزیہ، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سابق صدر، مرحوم پروفیسر محمد اسلم کی فکر رسا ہے جس میں دینی غیرت، ملی مفاد اور مسلم قومیت کے مدمقابل متحدہ قومیت کے موقف اور مراحل سیاست اور کانگرس کے ہمنوا بعض علماء پر ایک علمی قلمی اور منطقی استدلال کا نمونہ یہ ہے، لکھتے ہیں۔

دوقومی نظریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یایھا الذین امنو لا تتخذو الکفرین اولیاء من دون المومنین

(سورۃ النساء: ۱۴۴)

(اے ایمان والوں! مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں سے دوستی نہ رکھو) یہ آیت پاک حقیقتاً دوقومی نظریہ کی اساس ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۶۲۴ء) نے دوقومی نظریہ کو ہردے رام نامی ہندو کے نام اپنے مکتوب میں بصراحت بیان کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلویؒ (م ۱۷۶۳ء) نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے کیلئے احمد شاہ ابدالی سے مدد لی۔ ان کے بعد ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز (۱۸۲۳ء) نے مسلمانوں کو پیتل کے برتن استعمال کرنے سے روکا کہ ہندو پیتل کے برتن استعمال کرتے ہیں اور اس طرح شبہ یعنی کافروں کے ساتھ مشابہت تک نہ ہو۔ سر سید احمد خانؒ (۱۸۹۸ء) نے بنارس کے تب ڈپٹی کمشنر کو کھلے لفظوں میں بتا دیا کہ ہندو اور مسلمان مل کر نہیں رہ سکتے۔ جواہر لعل نہرو کے باپ پنڈت موتی لعل نہرو نے ۱۹۲۸ء میں جو رپورٹ پیش کی وہ ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری کا کھلا ثبوت تھی۔ اسے دیکھ کر قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اب ہمارا راستہ ان سے الگ ہو گیا۔" (۷۴)

مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے شیخ العرب والعجم ہونے کے روحانی امور پر پروفیسر محمد اسلم کا سوال بڑا جاندار ہے لکھتے ہیں کہ

"مجھے اس پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ جمعیت العلماء ہند کے رہنماؤں کو کشفِ قلوب اور کشفِ قبور ہوتا تھا لیکن انہیں کشفِ ہنود کبھی نہیں ہوا۔ وہ تاریخ کی روشنی میں ہندوؤں کی گھٹیا ذہنیت، اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔" (۷۵)

قرارداد لاہور پر مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جو بیان جاری کیا اس میں انہوں نے کہا کہ

"مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میرے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک علاقوں کی تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے بلکہ اسلام سے انحراف ہے اسلام ایسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا" (۷۷)

کاش! اس وقت کوئی مسلمان طالب علم بزعم خویش اسلامی علوم کے اس "سب سے بڑے سکالر" کو بتلاتا کہ دارالسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات ہم نے نہیں گھڑیں۔ یہ پاک اور ناپاک زمین کی تقسیم ہے جو ہمارے آئمہ کرام نے کی تھی اور فقہ میں ان کے مسائل الگ الگ ہیں۔

حالانکہ اسی برعظیم میں بیس بائیس برس پہلے جب تحریک خلافت اپنے عروج پر تھی تو چند عاقبت نا اندیش مفتیوں نے بشمول مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا عبدالباری فرنگی محل نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ داغ دیا۔ ان مفتیوں نے کہا کہ ہندوستان اب دارالحرب بن گیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر یہاں سے ہجرت فرض ہو گئی ہے۔ ان مفتیوں نے مسلمانوں

کو قریبی مسلم ملک افغانستان جانے کا مشورہ دیا۔ جس سے مسلمانوں کی بجائے ہندوؤں کو فائدہ پہنچا۔ یہ عجیب بات ہے کہ فتوے صادر کرنے والے مفتیوں کے سرخیل مولانا عبدالباری فرنگی محل (م ۱۹۲۶ء) اور مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) نے خود ہجرت نہیں کی، جب لوگوں نے ان سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ

"اگر وہ ہجرت کر جاتے تو یہاں لوگوں کو ہجرت پر آمادہ کون کرتا؟ اس لئے ان کا یہاں رہنا ناگزیر تھا، سبحان اللہ کیا منطق ہے۔" (۷۸)

اس تبصرہ اور تاثر میں مسلم ملت کے سوختہ سامان بعض علمائے ہند کی مذہبی حیثیت کے باوصف ان کی سیاسی بصیرت کا المیہ ہی ہے کہ برعظیم پاک و ہند کی مسلم ملت پر ان کی سیاسی بصیرت کیا بصارت تک اپنی عجز فہم کا ماتم خود کر رہی ہے۔ کسی اور کا حوالہ کیا دینا مولانا ابوالکلام آزاد اپنی خود نوشت۔ "ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے" (Indian Wins Freedom) کے آخری تیس صفحات اور موت کے تیس سال بعد انہیں شائع کرنے کی وصیت کے آئینے میں جس متحدہ قومیت کے وہ پرچارک پرستار اور پروردہ زارت وصدارت ہیں اس کی تنظیم انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم دشمن تحریک گویا متحدہ قومیت پر اپنا حاصل عمر رواں یہ فرما رہے ہیں۔ کہ بقول میر تقی میر

ع یاد آئی میرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

اولاً: بہار اور بمبئی کی کانگرس وزارتوں کی تشکیل میں بے انصافی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"بمبئی میں مسٹر نریمان (پارسی) اور بہار میں مسلمان (ڈاکٹر سید محمود) کو وزیر اعلیٰ نہ بنا کر انڈین نیشنل کانگرس ہی قوم پرستی کے باب میں یکسر ناکام ہوگئی۔ گویا متحدہ قومیت کا فریب خود مولانا ابوالکلام آزاد کھولے دیتے ہیں، فرمایا "ان واقعات پر غور کرنے کے بعد میں یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کانگرس نے اپنے نظریات پر عمل نہیں کیا جس کا وہ اعلان کرتی تھی۔ افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس وقت کانگرس کی قوم پرستی اس مرحلے پر نہیں پہنچی تھی جہاں وہ مذہبی اختلاف اور (یعنی فرقہ وارانہ) تصورات سے گریز کر کے لیڈروں کا انتخاب اکثریت (ہندو) اور اقلیت (مسلمان یا پارسی) کی تفریق کے بغیر استحقاق کی بنیاد پر کرتی۔" (۷۹)

اس تاثر کی تائید ان کی کتاب ہی نہیں کانگرس کے اندر قبل از آزادی اور کابینہ میں بعد از آزادی کے ہندو رویے سے بھی ہوتی ہے جس سے مولانا مرحوم نالاں نظر آتے ہیں۔

اپنی کتاب کے تیس سال بعد کے تیس صفحات میں دو قومی نظریہ اور قائداعظمؒ دونوں کی سیاست و سیادت پر معنوی طور پر صاد کرتے ہوئے، یہ اقرار کرتے ہیں تسلیم کرتے ہیں کہ دو قومی نظریہ کی بنا پر قائداعظمؒ کا موقف پاکستان فی الواقعہ اپنے اندر بڑی جان رکھتا تھا۔ یہ انحراف حقیقت ہے کہ اعتراف شکست، جو کچھ ہے بلاکم و کاست یہی ہے کہ مولانا نے لکھا ہے۔

ثانیاً:

''دس سال بعد پچھلے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسٹر جناحؒ نے جو کچھ کہا تھا اس میں جان تھی۔ کانگرس اور لیگ دونوں ہی اس معاہدے (کیبنٹ پلان) میں شامل تھیں اور مرکز اور صوبوں اور گروپوں کے مابین تقسیم ہی کی بنیاد پر لیگ نے پلان منظور کیا تھا۔ کانگرس نے شبہات پیدا کر کے دانش مندی کی بات نہیں کی۔ اگر وہ ہندوستان کے اتحاد کی خواہاں تھی تو کسی حیل و حجت کے بغیر اسے پلان کو منظور کر لینا چاہیے تھا۔ شکوک وشبہات نے مسلم لیگ کو بٹوارے کا موقع فراہم کیا۔'' (۸۰)

بلکہ اسی کتاب کے اختتامیہ میں وہ اس امر کا اعلان کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی بھارت میں سلامتی کے مسئلے پر وزیر داخلہ سردار پٹیل، گاندھی کے یکسر خلاف ہو گئے تھے۔ سوال سادہ سا ہے کہ سردار پٹیل اور کانگرس کے دیگر سرخیل مسلمانوں کے حامی اور حمایتی تھے کب، حالانکہ مولانا کے پیش رو، اچاریہ کرپلانی جب صدر کانگرس تھے انہوں نے ۱۹۴۶ء جیسے اہم سیاسی سال میں کانگرس کے سالانہ اجلاس میرٹھ میں مسلمانوں کے خلاف جو زہر اُگلا تھا اور سردار پٹیل نے جو آگ برسائی تھی وہ مولانا کی سعی اور خطاب کے باوجود نہ بھسم ہوئی نہ ختم ہوئی تھی اس پر اظہار تعجب مولانا کا تجاہل عارفانہ کہیں تو بے ادبی ہوگی، مگر پھر بھی مسلمانوں کے مسئلے پر اظہار خیال تو کرتے ہیں، مگر کیسے؟ یہ بین السطور سے واضح ہوگا۔

"What was most noticeable in all these affairs was that Sardar Patel had turned against Gandhi Ji. He was in-different when Gandhi Ji fasted on the issue of security of Muslim.(81)

اُردو زبان کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی، مولانا ابوالکلام آزاد کی حیاتِ مستعار اور کانگرسی حکومت کی لیلائے اقتدار کے زمانے تک بھارت ہی میں سول سروس میں تھے، ۵۶-۱۹۵۴ء میں غالباً پاکستان چلے آئے انہوں نے مولانا کی نثر کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور طبیعت پر جو جملے کسے ہیں اس کی بلاغت اس قابل ہے کہ اس کا تذکرہ ہو جائے۔

مولانا آزاد کی بیان کردہ خودنوشت کے بقیہ تیس صفحات کے اپنی موت کے تیس بعد شائع کرنے پر ان کا بلیغ جملہ یہ ہے کہ یہ تیس صفحات کہ

''جس کا اظہار وہ اپنی زندگی میں خوف فساد خلق سے نہیں کر سکتے تھے۔'' (۸۲)

کوئی طنز یا تبصرہ اور مزاح نہیں بھارت کے داخلی ماحول کا بدیہی عکس تھا جس کے شہری مشتاق احمد یوسفی نہ صرف

خود تھے بلکہ شاہد بھی تھے۔ہاں البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کی طبیعت اور شخصیت کا بیک وقت تجزیہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ

"ٹوٹے ہوئے بتوں کو جوڑ جوڑ کر امام الہند نے ایسے معبود تراشنے کی کوشش کو جو اہل سومنات کو بھی قابل قبول ہوں۔ یونانی فلسفے کی عینک سے جب انہیں دین میں دنیا اور خدا میں ناخدا کا جلوہ آنے لگا، تو وہ مسلمان ہو گئے اور سچے دل سے اپنے آپ پر ایمان لے آئے۔" (۸۳)

ایم۔او متھائی نہرو کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۹ء تک نہرو کے بعد ہندوستان کا سب سے طاقت ور فرد ایم۔او متھائی تھا۔اس نے "نہرو دور کی یادیں" کے نام سے ایک کتاب میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت ہی کیا خود انکی طبیعت اور حیثیت تک کو جس طرح سان پر کسا ہے وہ تو رہا ایک طرف، مولانا کے بارے میں باب ۲۸ اور باب ۲۹ گویا بوستان کا باپ پنجم باندھا ہے۔حیرت ہے کہ مولانا آزاد کا ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ایک حلقہ ارادت ہے جو علم و قلم سے مولانا کا ادبی، مذہبی یہاں تک کہ سیاسی مقام عبقری اور نابغہ تک بتانے منہمک اور مصروف رہا ہے مگر کسی کو شائد اس امر کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ ایم او متھائی کے شراب و شباب کے ابواب کی تردید کر سکیں، تکذیب کر سکیں۔مولانا مرحوم کے پاکستان میں سب سے زیادہ قریبی اور قلمی مرید آغا شورش کاشمیری کا ان کے بارے میں مصرع اولی، الٹ ہو گیا کہ "مولانا آزاد ہندوستان میں اجنبی اور پاکستان میں ایک گالی" مگر حقیقت اپنے وقت پر منکشف ہو گئی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد پاکستان میں کوئی اجنبی نہیں البتہ ہندوستان میں ایک گالی ضرور ہیں۔۱۹۳۸ء میں نیتا جی شبھاش چندر بوس نے تو انہیں تعریضاً مغل اعظم کہا۔پھبتی کسی، اسے معاصرانہ چشمک بھی کہا جا سکتا ہے مگر ایم او متھائی نے نہرو "دور کی یادوں" میں جس طرح واقعات کی ترتیب اور ابواب کی تقسیم میں مولانا ابوالکلام آزاد کو رسوا کیا ہے اس کا کوئی جواز نہ تھا۔البتہ اس کا جواب تو ہو سکتا ہے، یہ ایک مستقل قرض ہے جو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی ارادت کے بھارت اور پاکستانی محققین پر فرض ہے۔افسوس کہ ایک مسلمان عالم دین کو نہرو سرکار کے ایک قلمکار نے خراج پیش کیا ہے اور اسے کہتے ہیں متحدہ قومیت کا حاصل تجربہ! بلکہ بھارت کی راشٹر بھاشا میں مولانا صاحب کو "شردھانجلی ارپد" کی ہے۔

مولانا آزاد

ممتاز بھارتی صحافی خوش ونت سنگھ نے اپنی خودنوشت میں "پیرس میں گزرا ہوا زمانہ" کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں رقمطراز ہیں کہ:

"دو برس بعد کرپال نے مولانا آزاد کی سربراہی میں پیرس میں ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے والے وفد میں میرا نام شامل کروا دیا۔مولانا آزاد نے تصور کیا کہ میں پیرس میں اچھا وقت ہی گزارنے آیا ہوں اور کوئی کام میرے ذمہ نہیں لگایا۔ہر مرتبہ جب میں ان سے پوچھتا کہ میرے کرنے کا کوئی کام ہے تو وہ جواب دیتے "سردار صاحب! مزا کریئے۔" ایک بار مجھے ایک سینئر

مندوب نے ان سے ایک خاص تجویز کی توثیق کروانے کا کہا، مجھے شام کے وقت انہیں ان کے ہوٹل میں پریشان کرنا پڑا۔ وہ بہت روکھے تھے۔ شام کے وقت وہ کسی سے نہیں ملتے تھے۔ کیونکہ وہ اکیلے ہی سکاچ سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنا امام الہند کا تاثر برقرار رکھنے کے لیے چاہتے تھے کہ ان کی مے نوشی کی عادت غیر معروف ہی رہے۔ وفد میں پروفیسر حبیب، ایک دل کش عالم، بھی موجود تھے جو ہندوستان کی کمیونسٹ چین کو تسلیم کر لینے کے رجحان پر الجھے ہوئے تھے۔ جب ووٹنگ ہوئی تو انہوں نے ہندوستان کا ووٹ ہندوستانی تجویز کی مخالفت میں ڈالا۔ اس کی توثیق کرنا پڑی تھی۔'' (۸۴)

تازہ ترین بات ۲۰۰۹ء میں بھارت کے سرکاری اردو ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی مارچ ۲۰۰۹ء کے اداریے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شراب نوشی کے اہتمام کو اداریہ کی صورت وضاحت کرنا پڑی ہے جسکے مطابق:

ہماری بات

''کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو ملک وقوم کی زندگی پر دوررس اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان کے کاموں کا جائزہ اس اعتبار سے لینا چاہیے کہ ان میں سے کسی نے اپنی قوم کی زندگی پر جو اثرات مرتب کیے وہ مثبت تھے یا منفی۔ اگر اس کے مرتب کردہ اثرات منفی ہیں تو اس کے کاموں کی نفی ضروری ہے لیکن اگر اس کے اثرات مثبت طور پر ظاہر ہوئے ہیں تو اس کے کاموں کی بھی قدر کی جانی چاہیے اور اس کی شخصیت کا بھی احترام کیا جانا چاہیے۔ نجی زندگی میں کسی کے کیا مشاغل تھے، خوردونوش کی کیا ترجیحات تھیں، سونے جاگنے کے کیا اوقات تھے، یہ باتیں چنداں اہم نہیں، اصل اہمیت اس کے ان اعمال و افعال کی ہے جن کے اثرات ملک وقوم کی اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود میں معاون ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے دور کی اہم ترین شخصیتوں میں بھی ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی ولادت ایک دینی گھرانے میں ہوئی تھی اور ان کی تعلیم وتربیت بھی اسی ماحول ہوئی اسی لئے دین کی حمیت کا جذبہ ان کے رگ وریشے میں سمایا ہوا تھا۔ جب انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو ان کی رہنما قوت یہی جذبہ تھا۔ اس جذبے کا بھرپور اظہار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے صفحات پر ہوا لیکن مولانا مذہبی تنگ نظری سے ہمیشہ دور دور رہے۔ دینی حمیت کے ساتھ ساتھ وہ حب وطن کے جذبے سے بھی ابتدا ہی سے سرشار تھے۔ یہ حب وطن کا جذبہ ہی تھا جس نے پچھلی صدی کی پہلی دہائی میں ہی انھیں بنگال کے انقلاب پسندوں کی نظر میں معتبر بنا دیا۔ انقلاب پسندوں کی یہ مختصر سی جماعت ان ہندو انقلابیوں پر مشتمل تھی جو سرسید کی انگریز دوستی کی وجہ سے مسلمانوں کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا آزاد کیسے راسخ قوم پرست تھے اس کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی نیتوں کی طرف سے تذبذب میں مبتلا ان انقلابیوں کی نظر میں معتبر ٹھہرے۔

مولانا آزاد نے استخلاصِ وطن کا بیڑا اس وقت اٹھایا اور وطن پر قابض غیر ملکیوں کی مزاحمت پر اس وقت کمر بستہ ہوئے جب بابائے قوم مہاتما گاندھی ابھی افریقہ کو خیر باد کہہ کر ہندوستان واپس آئے تھے۔ مولانا آزاد کی اس اولیت کا اعتراف واحترام انڈین نیشنل کانگریس کے سبھی چھوٹے بڑے لیڈروں نے کیا اور قومی معاملات میں ان کی رائے کو ہمیشہ اہمیت دی گئی۔ متحدہ قومیت کے اصولوں پر مولانا آزاد کا عقیدہ کتنا واضح اور مستحکم تھا، یہ اس سے ظاہر ہے کہ تقسیم وطن کے فیصلے سے انھوں نے اس وقت بھی اتفاق نہیں کیا جب تمام کانگریسی رہنماؤں نے اسے قبول کر لیا تھا۔

ملک کی تقسیم کے بعد آزاد ہندوستان کا تعمیر و ترقی کی منصوبہ سازی اور انھیں بروئے کار لانے میں بھی مولانا آزاد شریک رہے۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے جو اقدامات کیے ان کی بار آوری کا اندازہ ان اداروں کی کارگزاریوں سے کیا جا سکتا ہے جنھیں آج ہم مختلف ناموں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، کونسل فار ایگریکلچر اینڈ سائینٹیفک ریسرچ، کونسل فار میڈیکل ریسرچ، کونسل فار سوشل سائنس ریسرچ، کونسل فار کلچرل ریلیشنز، ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی، سفارتی عملے کو غیر ملکی زبانیں سکھانے والا ادارہ یا اس طرح کے دوسرے ادارے ان سب کی داغ بیل مولانا آزاد ہی نے ڈالی اور چند برس کی قلیل مدت میں۔

مولانا آزاد کے علمی کارناموں کی فہرست بھی طویل ہے لیکن اس طویل فہرست سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ''ترجمان القرآن'' پر ہی نظر کی جائے تو مولانا آزاد کی دینی بصیرت، قرآن فہمی اور ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ''ترجمان القرآن'' کی تقریباً ڈھائی جلدیں انھوں نے صرف سورۂ فاتحہ کی تشریح وتفہیم میں صرف کی ہیں۔ اگر یہ تفسیر مکمل ہو گئی ہوتی تو معلوم نہیں کتنی ضخیم جلدوں میں سماتی۔

> ''مولانا آزاد کی نجی زندگی بھی بے داغ رہی ہے اگرچہ گاہ بہ گاہ اسے داغدار بنانے کی سعی لا حاصل بعض لوگ کرتے رہے ہیں۔ اب ایک تازہ شگوفہ یہ چھوڑا گیا ہے کہ مولانا شراب نوشی کے عادی تھے۔ اس پر مختلف لوگوں کا ردِعمل بھی سامنے آیا ہے۔ معروف عالم دین مولانا وحید الدین خان نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ کسی شخص کے کام پر تو رائے زنی کی جا سکتی ہے ،اس کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنا غلط ہے۔ یہ غیر اسلامی ہی نہیں، غیر اخلاقی اور غیر انسانی فعل بھی ہے۔''

مولانا آزاد اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اگر ان میں کچھ انسانی کمزوریاں تھیں تو وہ ان کے ساتھ گئیں، ان کی ان مفروضہ کمزوریوں کا علم کتنے لوگوں کو ہو سکا، اب انھیں بزعم خود ڈھونڈ نکالنا اور مشتہر کرنا، اپنی منفی ذہنیت کا اعلان کرنا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ مولانا کے علمی اور عملی کارناموں کو سمجھا اور پرکھا جائے اور توفیق ہو تو ان سے اکتسابِ فیض کی کوشش کی

جائے۔"(۸۵)

مجلس احرار اسلام کا حاصل تجربہ

مجلس احرار اسلام ۱۹۲۹ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور کے پنڈال واقعہ راوی پارک لاہور میں وجود میں لائی گئی، نام تک مولانا ابوالکلام آزاد نے رکھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے پہلے صدر بنے۔ احرار پنجاب دلی اور یوپی میں بعض مذہبی مقررین اور عوامی کارکنوں کے ایک پرجوش مجمع کا نام تھا چونکہ احرار سٹیج کے دھنی اور خطابت کے غنی تھے خاص طور پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری جو سب سے بڑے عوامی خطیب اور بعد ازاں انہیں امیر شریعت کے القابات سے نوازا گیا۔ آغا شورش کاشمیری اسی مجلس احرار اسلام کے تقسیم ہند سے پہلے جنرل سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ بہر حال مجلس احرار اسلام قیام پاکستان کے بعد ختم کر دی گئی اور مجلس کے اکابرین نے باقی عمر پاکستان میں قیام کیا سوائے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے مگر اس مجلس احرار اسلام کا ۱۹۴۷ء کا کانگرسی تجربہ ایسا ہے، جس سے نظریہ پاکستان یا دوقومی نظریہ کی عصری شہادت، مجلس احرار اسلام کا حجاب ہے جو کانگرسی رہنما اچاریہ کرپلانی کا جواب ہے۔ احرار کی اپنی روایت ہے کہ

جمعیت العلماء ہند اور مجلس احرار کانگرس کی نظر میں

مجلس احرار اسلام نے ۱۹۴۷ء کو اپنا سالانہ اجلاس لکھنو میں طلب کیا تو کانگرس کے تب صدر اچاریہ کرپلانی کو دعوت نامہ بھیجا جو انہوں نے مسترد کر دیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور شیخ حسام الدین نے ان سے ملاقات کی، اچاریہ کرپلانی نے کہا

> "لیگ سے ہماری لڑائی محض سیاسی حقوق اور ان کے تعین و تفہیم کی لڑائی ہے جس کا بہر حال کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا لیکن جمعیت العلماء ہند اور مجلس احرار کی ہمنوائی ہمارے لئے سخت خطرناک ہوگی، وہ لوگ زندگی کے ہر پہلو میں ہم سے مختلف ہیں، ان کے لباس، ان کے عمل، ان کی زبان، ان کی فکر، غرض ہر چیز میں پاکستان موجود ہے۔ ان سے مصالحت کرنے کی بجائے مسلم لیگ سے مفاہمت کر لیں تو بہتر ہے۔"(۸۶)

لیکن یہ تو تقسیم کے سال ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے جبکہ ابھی پاکستان قائم ہی نہ ہوا تھا البتہ قیام پاکستان کے بعد جمعیت العلماء ہند کا سیکولر بھارت میں حاصل تجربہ بھی اگر ایک مسلمان کا حاصل تجربہ ثابت ہوا اور ہندوا کثریت کا سماج انہیں بھی اس طرح باور ہو جس طرح اچاریہ کرپلانی نے احرار ہنماؤں کو باور کرایا تھا تو اس پر حاصل تاریخ یا حاصل تجربہ ہی کا عنوان سجتا ہے۔ ایک نظر جمعیت العلماء ہند کے ہاں سے بھی!

بھارت میں جمعیت العلماء ہند اور اس کا حاصل تجربہ

جمعیت العلماء ہند کے سیکرٹری جنرل مولانا سعید احمد ہاشمی کے ارشادات اس قابل ہیں کہ اس کے آئینے میں متحدہ قومیت کی جنم بھومی یعنی بھارت میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کے علمبردار بعض علماء دیو بند ہی نہیں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کی زیر قیادت، ''قومیں دین سے نہیں سرزمین'' سے بنتی ہیں مگر بھارت میں نصف صدی کی تاریخ اگر انہیں کے تجربے کا حاصل بھی ہندو، ہندو ہی نہیں اکثریت کا استبداد ثابت ہو تو پھر یہ الزام نہیں وطیرہ اور رویہ تھا بھارت میں نیشنلسٹ مسلمانوں کا کہ بھارت میں اپنا ۵۰ سالہ ریکارڈ بتاتے ہیں۔

''جمعیت العلماء ہند کاسہ لیسوں کی جماعت بن گئی۔ برسر اقتدار پارٹی کی خوشامدیوں کی جماعت بن کر رہ گئی۔ ظاہر ہے یہ صورتحال ملت کے تشخص اور اس کی انفرادیت اور ضمیر کے مطابق نہیں ہوسکتی ہے۔ جمعیت کو آزادانہ طور پر اپنے مسائل کے سلسلے میں رائے قائم کرنے کا حق ہے۔'' (۸۷)

اس لئے اگر کسی نے آزاد بھارت میں جمعیت العلماء ہند کے کردار کو ایک جملے میں سمیٹ دیا کہ ''نیشنلسٹ مسلمانوں کا گروہ بھارت میں وہی کردار ادا کرتا رہا جو انگریز دور میں خان بہادر انجام دیتے تھے۔ (۸۸)

تو یہ کوئی پھبتی نہیں صرف حقیقت حال ہے۔ مولانا سعید احمد ہاشمی کا کہنا ہے کہ

اولاً:

''آزادی کے نصف صدی بعد بھی مسلمانوں کے حصے میں صرف آئین کی گارنٹیاں آئی ہیں، دستور کی ضمانتیں اور تحفظات کی یقین دہانیاں آئی ہیں لیکن ہمیشہ عملی تجربے میں یہ آیا ہے کہ آئین کی خلاف ورزی کی گئی تحفظات کا استحصال کیا گیا اور انہیں نظر انداز کیا گیا۔ مسلمانوں کے حصے میں کاغذی یقین دھانی اور پُر فریب وعدوں کے علاوہ ان کے حصے میں کچھ نہیں آیا۔ بلکہ انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ اگر انہوں نے اپنے وسائل سے اپنی طاقت اور توانائی کی بنیاد پر ہندوستانی متحدہ قومیت کے ایک حصے کی حیثیت سے کوئی رول بھی ادا کرنے کی کوشش کی تو وہ رول بھی انہیں ادا نہیں کرنے دیا گیا۔ یہی نہیں ان کے کاروبار اور ان کی توانائی کو برباد اور پامال کرنے کی کوشش کی گئی اور عزم و ارادے کے اعتبار سے بھی ان کی اتنی حوصلہ شکنی کی گئی کہ وہ اپنا عزم حیات اور بلند حوصلگی کھو بیٹھی۔''

آگے چل کر مولانا سعید احمد ہاشمی رونا روتے ہیں۔

ثانیاً:

''لیکن اس سب کے باوجود حالات کی بے بسی، محرومی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہندوستانی

مسلمان کی ہندوستانیت پر شبہ نے ذہنوں کے اندر ایک کشمکش پیدا کر دی ہے اور یہ سوال کھڑا کر دیا ہے آیا اس سیکولر جمہوری ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا رول پیش کرنے کی واقعی آزادی ہے یا نہیں؟''

ثالثاً:

''مسئلہ صرف یہ نہیں کہ ہر طرف (بھارت) میں مسلم کش فسادات ہوتے رہے ہیں، ہو رہے ہیں بلکہ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس صورت حال میں ہم اپنا وجود برقرار رکھ سکیں گے یا نہیں؟ آج ہندوستانی مسلمان اپنے وجود کے بارے میں محسوس کر رہے ہیں یہاں تک بھارت کی دوسری نسل یہ کہہ رہی ہے مسلمان بھارت کا وفادار شہری نہیں، اسے دوسرے درجے کا شہری بن کر رہنا پڑے گا۔''(۸۹)

مولانا سعید احمد ہاشمی نے مزید کہا کہ آئندہ کیلئے بھی لائحہ عمل انہی خطوط پر استوار ہو جو تقسیم کے معاً بعد لکھنو کے اندر مسلم آزاد کانفرنس میں طے پایا تھا، جس میں

''مولانا آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک رہنمائی دی تھی اور بتایا تھا کہ آزاد سیکولر اور جمہوری ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس آواز کا وہ اثر تھا کہ سارے آگ وخون کے دریا کے باوجود ہندوستان کے مسلمان نے اس رہنمائی کو اپنے لئے قدر جان لیا۔''(۹۰)

افسوس کہ علماء ہند کی بصیرت ۱۹۴۷ء سے آگے دیکھ نہیں سکی کہ یہ ماحول ومعاشرہ خود انہیں کی پیدا کردہ سیاست کے برگ وبار ہیں کہ بھارت متحدہ قومیت کے دیار کا دوسرا نام ہے۔

مولانا ظفر علی خان کا ایک معروف شعر ہے کہ

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روز سیاہ
خود دکھایا ہے میرے گھر کے چراغوں نے مجھے

تقسیم ہند کے معاً بعد جس مسلم آزاد کانفرنس میں نیشنلسٹ اور نامور علماء کی رہنمائی کا حوالہ مولانا سعید احمد ہاشمی دے رہے ہیں ذرا اس کے ''سویرے اندھیرے'' میں وہ جھلک بھی دیکھ لیں کہ آزاد بھارت میں مسلمانوں کی بقا اور اسلام کا حل کیا ہے؟ وزیر تعلیم مولانا آزادؒ ہی نمایاں تھے انہیں کے ارشادات کا ایک اقتباس ہے کہ

آزاد ہندوستان میں مولانا آزادؒ کا مسلمانوں کیلئے لائحہ عمل

اپنے خطبہ صدارت اجتماع لکھنو دسمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا نے ارشاد فرمایا!

''تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں جو مسلمان ہیں یہ ان کا وطن ہے۔ انہیں یہاں غیرت وآبرو سے

رہنے، اپنے سماجی، اقتصادی، تعلیمی امور آزادی سے انجام دینے کا حق ہے۔ ماضی کی جس غلط سیاست (مسلم لیگ) نے نقصان عظیم پہنچایا مسلمان اس سے بچیں''

اب کیا کریں؟ مولانا فرماتے ہیں کہ

''ہندوستان کی مشترکہ اور جمہوری شہریت میں اپنا مقام پیدا کریں، قوم وملک سے فرقہ پرستی کے زہر کوختم کرنے میں اپنا رول ادا کریں، ہم وطنوں کے دوش بدوش چل کر ملک کے سچے شہریوں کی طرح تعمیر وترقی کے منصوبوں میں لگ جائیں۔ اپنا پورا زور اتحاد اور سیکولرازم اور جمہوریت کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں لگا دیں۔''

اور اس خطبہ صدارت کے آخری الفاظ مولانا کی زبان سے ملاحظہ ہوں کہ

''جہاں تک اس اجتماع کا تعلق ہے آپ صاف اور دوٹوک فیصلہ کرلیں کہ آئندہ کوئی مسلم مجلس، کوئی مسلم نظام، سیاسی میدان میں فرقہ واری کی بنیاد پر قائم نہ کریں گے۔ کسی مجلس کے مقصد پر فرقہ واریت (انہیں مسلمانوں) کی پرچھائی بھی نہ پڑنی چاہیے۔'' (۸۷)

اور جمعیت العلماء ہند (ملی) کے سیکرٹری جنرل مولانا سعید احمد ہاشمی کے ارشادات اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی لائحہ عمل کے ۶۲ سال بعد کا ہندوستان اور اس میں مسلمان جس صورت احوال سے دوچار ہیں اسے قوم پرست مسلمانوں کے علماء ہند کی تدبیری سیاست کا عرصہ درکار تھا جس نے انجام کار اپنا اصل چہرہ متحدہ قومیت کے تجربے کی صورت پیش کیا۔ حالانکہ مولانا آزاد ''ماضی کی غلط سیاست'' کے نام پر جو طنز کا لہجہ اختیار فرماتے ہیں ان کے نقطہ نظر سے تو بحث نہیں البتہ ایک اپیل، التجا بلکہ استدعا مسلمانان برعظیم کے قائداعظمؒ کی تھی جو دو سال قبل ان نیشنلسٹ رہنماؤں کے دل ودماغ میں جگہ نہ پاسکی۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۵ء کو مسلم چیمبرز آف کامرس بمبئی میں خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا!

''اگر قوم پرست نیشنلسٹ مسلمان واقعی مخلص اور دیانتدار ہیں تو انہیں مسلم لیگ کی حریف کانگرس کی پناہ چھوڑ دینی چاہیے۔ وہ مسلمانوں کی قومی تنظیم میں شریک ہوں اور اس کی رہنمائی کریں۔ اگر انہیں مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام سے اختلاف ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ مسلم لیگ میں آئیں اور اس کی پالیسی اور پروگرام بنائیں، یہ خودکشی کی پالیسی ترک کردیں۔'' (۹۲)

متحدہ قومیت دراصل کانگرس کی ہندو تحریک ہی کا دوسرا نام تھا جس میں برعظیم کے مسلمانوں کو جمہوری اکثریت کے نام پر ہمیشہ ہندو قوم کا غلام بنانے کا درپردہ کہاں بلکہ ظاہری انتظام تھا۔ برسوں پہلے اس کے واقعاتی طلوع وغروب ملت اسلامیہ ہند کے نجات دہندہ یہ امر واضح کرچکے تھے مگر تقدیر یہی تھی کہ متحدہ قومیت کے دامِ ہمرنگِ زمین کا شکار بعض نامور مذہبی معلم ہوں۔ ایک اور خطبہ حضرت علامہ اقبالؒ کا بھی ہے جو انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور میں مسلم کانفرنس میں

ارشاد فرمایا تھا۔ کانگرس کی تحریک متحدہ قومیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کانگرس کی تحریک

''میرے خیال میں اس تحریک (سول نافرمانی) کی جڑیں صرف اور صرف ناپسندیدگی میں پوشیدہ ہیں۔ کانگرس کے رہنما یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہند کے عوام کے واحد نمائندہ ہیں، آخری گول میز کانفرنس نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔''(۹۳)

یہی حاصلِ تجربہ ہے نیشنلسٹ مسلمانوں کے پون صدی کے ہندو بھارت کا کہ دستور کی گارنٹیاں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کے خطرے کی گھنٹیاں مولانا سعید احمد ہاشمی کا جو حاصلِ حالات ہے۔ اس میں اصل بات وہی ہے کہ قومیں دین سے بنتی ہیں سرزمین سے ہرگز نہیں۔ اس کے سوا کیا حاصل حالات ہے جس پر بھارت میں ان نامور نیشنلسٹ رہنماؤں اور علمائے ہند سے کہا سنا جائے یا جس سے آئین کی ضمانتیں بھی بے معنی ہو جائیں تو پھر

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے

بھارت میں مسلمانوں کی آئینی حالت

بھارت میں مسلمانوں کی آئینی حالت پر ایک تجزیہ اور تبصرہ، بھارت کے ہی ایک نامور دانشور ڈاکٹر سید عبدالباری کا ہے جو ''دستور ہند پر نظر ثانی مسلمانوں کا موقف کیا ہو'' کے زیر عنوان نوحہ کناں ہیں کہ

''بھارت میں دستور ساز اسمبلی کا ماحول اور کچھ مسلم ممبران کی فلسفہ طرازیاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خاموشی سے مخلوط انتخابات کو دستور کا جزو بنا دیا ان کے تلخ نتائج ہم گذشتہ ۵۰ سالوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان جہاں ۱۵ اور ۲۰ فیصد ہیں وہاں بھی وہ ۵ یا ۶ سے زیادہ منتخب نہیں ہوتے۔ اور قانون ساز اداروں میں ان کی تعداد، تو آبادی کے الگ طبقات کے نمائندہ جو محض ۶ یا ۷ فیصد ہے سے بہت کم ہے''۔(۹۴)

مسلمانوں کی تہذیبی حالت، ایک نظر میں

بھارت کی قانون ساز اسمبلی میں ممتاز دانشور کے ایم پانیکر نے کہا ''ہمارے ثقافتی اتحاد کی جڑیں سنسکرت زبان میں پیوست ہیں۔ اگر ہمارے دانشور سنسکرت کو عام نہیں کریں گے تو بھارت کے ثقافتی اتحاد کو نقصان پہنچے گا''۔ یہ حالت دیکھ کر مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سخت مایوس ہوئے اور قانون ساز اسمبلی کی ڈرافٹنگ کمیٹی سے مستعفی ہو گئے اس پر مولانا آزادؒ کے دوست پنڈت نہرو خاموش رہے لیکن مسٹر کے سی پنتھ نے ان ارکان کے منہ پر کہہ دیا۔

''اپنی اُردو کے لئے پاکستان چلے جاؤ۔'' (۹۵)

مسٹر کے ایم پانیکر یا کے سی پنتھ تو اپنی اکثریت کے ملک بھارت کی ثقافتی بنیاد کیلئے سنسکرت کے علمبردار ہیں۔اردو مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کا شہکار ہے بھلا ہندو مفکر، دانشور اور سیاستدان اسے کیونکر اور کیسے قبول کرتے۔ ہندوازم کی جھلک سیاسی اور دھیمے سُروں کے ہندو زعماء کا وطیرہ ہی نہیں انقلابی اور کیمونسٹ فکر کے رہنما بھی اندر سے ہندو ہی ہوتے ہیں۔ایم این رائے ایسا انقلابی مسلمانوں کے برعظیم پر ایک ہزار سال کا تذکرہ فرمارہے ہیں جب کہ اُردو تو اس کا ثمر ہے وہ لکھتے ہیں،

''ایک اتنا بڑا ملک جو اپنی قدیم تہذیب اور لمبی تاریخ پر اس قدر نازاں ہو وہ اتنی مرتبہ مفتوح اور غلام بنے اور وہ ہر اس لیٹر کے سامنے سر جھکا دے جو یہاں قدم رکھنے کی تکلیف گوارا کرے کیا شرم اور ندامت کی بات نہیں؟ ہم ہندوستان کی گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ کے اس شرمناک پہلو کی کیا تاویل کر سکتے ہیں''۔(۹۶)

اس مرحلے پر نامور ادیب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے دھیمے مزاج کی لو پر اس مرثیہ کو بڑے سوز کے ساتھ باندھتے ہیں، ہندوستان میں اُردو پر اپنے خطبہ صدارت میں وہ لکھتے ہیں جس میں مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ آئینہ تہذیب بھی سامنے ہے فرمایا:۔

''الفاظ، جذبات، اسالیب، خلوص اور صناعت کاری کے اس تاج محل کو جسے اُردو کہتے ہیں آپ مسمار کر دینا چاہتے ہیں۔تو پھر اینٹ پتھر، جسم و روح، تصورات، معتقدات، علم و فن، فیض و برکت ان تمام تاج محلوں کو بھی مٹا دیں جس سے یہ سرزمین بھری پڑی ہے۔ پھر زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس پر مسلمانوں نے اپنے برکات کے نقوش نہیں چھوڑے ہیں اور یہ کچھ ہندوستان پر موقوف نہیں ہے۔ متمدن دنیا کا کونسا حصہ ہے جس پر مسلمانوں کے دست و بازو یا ذہن و فکر کے نقوش نہ قائم ہوں، یہ نقوش کون مٹا سکتا ہے۔ان کو مٹانا بھی نہیں چاہیے کہ جس مشن پر یہ نقوش نمایاں ہیں وہ بجائے خود نقش بر آب ہے۔'' (۹۷)

ظاہر ہے اُردو مسلمانوں کی زبان اور اسلامی تہذیب کا جلوہ ہے اسے مٹا کر ہندی، سنسکرت کو لانا ہی تو بھارت دیش ہے۔نجانے متحدہ قومیت کے رہنماؤں کو اسلام، مسلمان اور پاکستان کے کانگرسی مفہوم کیونکر بھلے لگتے تھے۔اُردو پر اچھا تبصرہ، آغا شورش کاشمیری کے قلم کا اعجاز ہے، لکھتے ہیں:

''وسط ایشیا میں فارسی اسلام کی دوسری بڑی زبان ہوگئی، اس کی وساطت سے ہی ہندوستان میں اُردو کی نیو رکھی گئی اور عربی کی بلاغت، فارسی کی صباحت، ہندی کی لطافت اور انگریزی کی شہامت لیکر رفتہ

وشستہ ہو گئی۔" (۹۸)

بلکہ سچ تو یہی ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام بلاغت نظام کے بعد شورش کا یہ دعویٰ بھی سچ ہے کہ

"اُردو زبان میں کائنات کے سما جانے کا حوصلہ ہے"۔ (۹۹)

بلکہ اُردو زبان کے عناصر اربعہ کا حدود اربعہ شورش ہی کے قلم سے یہ ہے۔

"عربی ہی سے اُردو کی چھاپ ہے، اس کا سنگھار فارسی ہے اور ہندی اسکے ماتھے کا سندور ہے، اب انگریزی نے اسے دو آتشہ کیا ہے۔" (۱۰۰)

متحدہ قومیت میں مسلمانوں کا حال

متحدہ قومیت کے بھارت میں مسلمانوں کی عزت آبرو اور جان و مال کا ذکر ہو جائے جن صوبوں میں مسلمان قدرے زیادہ تعداد میں ہیں وہاں کا ماحول اور معاشرہ تو ہندو فسادات میں مسلم کش رویوں کا ایک دلدوز منظر ہے جو گذشتہ ۶۲ برس کی ہندو اکثریت کی جمہوری، سیکولر اور متحدہ قومیت کے حاصل تجربہ کا شہ کار ہے۔ صرف ایک ہی جملے میں مسلم کش رپورٹ ملاحظہ ہو

"Today in almost every village of U.P., M.P., Bihar and Rajasthan, having some Muslim Houses, we have riot widows, riot-orphens and riot affected.(101)

مسلمانوں کے تعلیمی اداروں پر یلغار

مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، گذشتہ ۶۲ برسوں میں کئی بار ہندو شقاوت کی زد میں رہی ہے، بلکہ عام طور پر وہاں علی گڑھ کو "منی پاکستان" کہتے ہیں۔ اس اکسویں صدی کے آغاز میں مسلم اقلیت کے نامور تعلیمی اور مذہبی اداروں پر فسطائی ہتھکنڈوں کا استعمال اب آئے دن کا معمول ہے۔ تازہ ترین رپورٹ یہ ہے۔

"پچھلے دنوں دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیو بند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بعد اب جامعہ اسلامیہ دہلی کو نشانہ بنانا گیا ہے"۔ (۱۰۲)

بھارت میں مسلمانوں کی یہ صورتحال اور متحدہ قومیت کا معروضی عکس ہے کہ بھارت کی ہندو قوم نے آزادی حاصل کی اور پاکستان کی صورت مسلم قوم نے تو یہ متحدہ قومیت کا فریب اور دامِ ہمرنگِ زمین اپنے ۶۲ سالہ تجربے کے بعد بھی نیشنلسٹ مکتبہ فکر کو باور نہیں آیا۔ تو اس پر روحانی تنزل اور مسلمانوں میں کوتاہ فکری کے دو اور نمونے ہندو تحریک کی زد میں ہیں۔ یہ دونوں نمونے گاندھی کی نگاہ ناز کا کرشمہ ہیں بلکہ شہکار ہیں۔

گاندھی کی نگاہ ناز کا کرشمہ اور مولوی کا روحانی تنزل

کہاں گاندھی جی کہ مولانا عبدالباری فرنگی محل کی صحبت خاص کا حظ اٹھائیں، فیض پائیں اور مولانا عبدالباری فرنگی محل کو اپنا سیاسی پیر قرار دیں تو کہاں مولانا آزادؒ سبحانی اپنے لئے، گرو، مرشد، مربی اور معلم کے مقام پر گاندھی جی کو فائز کیے دیتے ہیں۔ کیا المیہ ہے کہ روحانیت کے داعی نفس کی قوت کے استدراج کے راہی ہو گئے۔ گاندھی جی کے چرن چھو کر ان کے چیلے ہی نہیں وارھائی ہو گئے۔ برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کے چار مسلک بریلوی، دیوبندی (اہلسنت)، اہل حدیث اور اہل تشیع ہیں۔ جبکہ یہاں پر روحانی طریقت کے بھی چار سلاسل ہیں قادری، چشتی، سہروردی اور نقشبندی۔ خود مولانا فرنگی محل سلسلہ عالیہ قادریہ کے بزرگ تھے۔ اہل دیوبند میں مولانا سید حسین احمد مدنی خود بھی چشتی صابری سلسلہ میں بیعت ہیں مگر مولانا آزادؒ سبحانی تو متحدہ قومیت کے سیاسی گاندھی سے آگے گرو گاندھی تک چلے گئے، چیلے بن گئے۔ فقر و دین کی اصطلاح میں جسے فنا فی الشیخ کہتے ہیں وہ حال و قال ہو تو بیعت اور عہد تو عام سی باتیں ہیں۔ گاندھی جی کی روحانی پیروی کا سلسلہ کیا ہے؟ اسے ارتداد کہیں، کہ اتباع یہ علماءِ ہند کا معاملہ بھی ہے اور منصب بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو ان کی ہیئت گذائی سے گریزاں ہیں مگر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزادؒ ہی کے دسترخواں سے مولانا آزاد سبحانی کا حال و قال بیان کیا ہے۔

> ''ان دنوں مولانا آزادؒ سبحانی گاندھی جی کے پکے چیلے بنے ہوئے تھے، ننگے سر، ننگے پاؤں، ایک لنگوٹی بدن پر بندھی ہوئی، کھچڑی داڑھی، سر کے کھچڑی بال، بڑی مضحکلک صورت''۔ مولانا آزادؒ سبحانی اپنے شیخ طریقت گاندھی جی کا محض پہناوا اور دیکھاوا ہی نہ تھے بلکہ گاندھی جی سے عہد (بیعت وقرار) بھی شامل حال تھے۔''

مولانا عبدالرزق ملیح آبادی مزید لکھتے ہیں، مولانا ابوالکلام آزادؒ سبحانی سے مخاطب ہوئے

> ''مولانا آپ اپنی پسند کا کھانا تجویز فرمائیں''

مولانا آزاد سبحانی نے کئی پہلو بدلنے کے بعد فرمایا

> ''مولانا میں تو دنیا ہی چھوڑ چکا ہوں۔ اناج اور اناج کے پکوان سے اجتناب ہے۔ مہاتما گاندھی سے عہد کر چکا ہوں۔'' (۱۰۳)

ایک اور مولانا اپنی فکر کی معراج معلیٰ پر گاندھی جی کو مجتہد العصر قرار دے رہے ہیں متحدہ قومیت ایک سیاسی حربے اور ہتھکنڈے سے بڑھ کر اب عصر حاضر کا اجتہاد ہو گئی ہے۔ مولانا وحید الدین خان اپنی کتاب ''فکر اسلامی'' میں رقمطراز ہیں۔

عصر حاضر میں اجتہاد برعظیم میں گاندھی جی نے کیا

''اٹھارویں صدی کے آخر میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مسلمان ساری دنیا میں مغربی قوموں سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ ۱۷۷۰ء میں جنگ چشمی (Battle of Cesame) میں عثمانی ترکوں کے طاقت ور بحری بیڑے کی تباہی اور پھر ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت نے آخری طور پر مغلوبیت کو ثابت شدہ بنا دیا۔

اس کے بعد ہندوستان کے انگریز حکمران سے خونین جنگیں شروع ہوئیں۔ یہ جنگیں مختلف صورتوں میں تقریباً سو سال جاری رہیں۔ ۱۸۳۱ء میں سید احمد بریلوی کی جنگ اور ۱۸۵۷ء میں علماء دیو بند کی جنگ اور اس طرح کی دوسری لڑائیاں اس کی مثال ہیں۔ انگریزوں سے براہ راست ٹکراؤ جب ناکام ہو گیا تو علماء نے بیرون ملکوں (افغانستان، ترکی وغیرہ) کی مدد سے اس کو جاری رکھا، جس کو ریشمی رومال کی تحریک کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی مکمل طور پر ناکام رہا۔

مگر جیسا کہ معلوم ہوا، اس سو سالہ جنگ سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ مسلمانوں کی تباہی میں مزید زیادہ اضافہ ہو گیا۔ آخر کار ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ زمانہ میں گاندھی جی ظاہر ہوئے، انہوں نے متشددانہ جدوجہد (Violent Struggle) کی بجائے پُر امن جدوجہد (Peacefull Struggle) کا نعرہ دیا۔ یہ نعرہ بیشتر علماء کی سمجھ میں آ گیا مثلاً مولانا محمود حسن دیو بندی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ۔ علمائے ہند کی ۹۹ فیصد تعداد نے اسے قبول کر لیا۔ یہ گویا سابق اجتہاد سے رجوع کر کے دوسرے اجتہاد کی طرف آنا تھا۔ یہ تشددانہ جہاد کو چھوڑ کر پُر امن جہاد کے اصول کو اختیار کرنا تھا۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ پہلی رائے مجتہدانہ خطا تھی۔ دوسری رائے مجتہدانہ صواب۔'' (۱۰۴)

حالانکہ گاندھی کے اہنسا (عدم تشدد) پر فکری کوتاہی کے مولانا وحید الدین خان یونہی اجتہاد تک جا پہنچے ہیں۔ بلاشبہ گاندھی کی یہاں قیادت و سیادت اور ان سے عقیدت کی رسی مولانا آزاد کی سخت رگوں میں پہلے بھی کسی تھی۔ البتہ اہنسا کے بارے میں گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد بذات خود اپنی وضاحت آپ ہیں۔ مولانا آزاد کا ارشاد ہے۔

''عدم تشدد مصلحت کی بات ہے عقیدت کی نہیں، گاندھی جی نے عقیدہ بنا لیا تھا'' (۱۰۵)

اس طرح کے فکری نمونے عقیدت کے سانچوں میں ڈھلے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے راسخ العقیدہ اور مسلک کے بزرگ کا نوشتہ تقدیر بن جائے تو اس کے لئے تاریخ سیاست کا بدیہی المیہ مولانا آزاد کی کتاب اور اس کے تیں صفحات کا مطالعہ ہی کافی ہے۔ متحدہ قومیت کے فلسفہ قومیت کے نیشنلسٹ علماء فی الواقعہ اجتہا دور وحانیت تک گاندھی جی کی قیادت میں

کیونکر چلتے تھے یہ امر خود اس بات کا غماض ہے نیشنلسٹ علماء اور ہندوؤں کے گاندھی سے لیکر سادھوں، سنتوں تک کا اکھنڈ بھارت پر ''اجماع'' ہے۔ اسے متحدہ قومیت ہی نہیں متحدہ ہندوستان بھی کہتے ہیں ہندوؤں کے مذہبی رہنما اور متحدہ قومیت کے علمبردار اپنے موقف اور میلان کی وجہ سے یک آواز ہی نہیں عزائم کا تلاطم لیے ہوئے ہیں۔ دم توڑتی بیسویں صدی کے اختتام پر اڑیسہ کے ساحلوں پر ہندوؤں کے مذہبی راہنماؤں کا ایک اجتماع متحدہ قومیت اور اکھنڈ ابھارت کا سماں باندھے ہوئے ہے۔

اکھنڈ بھارت کے قیام پر سادھوؤں، سنتوں کا زور

''بریمور (اڑیسہ)، یہاں ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے سنتوں اور سادھوؤں کے اجتماع میں سناتن دھرم کو محفوظ رکھنے اور ملک میں ایک ایسا انقلاب لانے کی ضرورت پر زور دیا گیا جس کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں جرات پیدا ہو سکے اور وہ اکھنڈ بھارت کے بارے میں سوچنے کے قابل ہو سکیں۔ اجتماع میں پوری، کاشی اور درا کا شنکر اچاروں (مذہبی رہنماؤں) نے بھی شرکت کی۔ یہ اجتماع بھیروں مندر کے قریبا ایک نئے مندر کے افتتاح کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا'' (۱۰۶)

ہندو قوم جدید تعلیم کے انگریزی عہد کی دانش جدید لئے انڈین کانگرس کے ترنگے تلے آزادی حاصل کرتی ہے جسمیں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور دیگر نیشنلسٹ علماء بھی آزادی حاصل کرتے ہیں مگر کس طرح کی آزادی جو اس اختتامیہ میں متحدہ قومیت کے حاصل تجربہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بلکہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے کا آئینہ ایام ہے۔ اکھنڈ بھارت اصلاً متحدہ قومیت کا جال اور جدید ہندو تحریک کا نام ہے جو مسلم پاکستان کے قیام کو ناممکن بنانے کا وقتی ہتھکنڈہ تھا، تو قیام پاکستان کے بعد اسے عدم استحکام سے دوچار کرنے، ڈپلومیسی سے، جنگ سے اور سازش سے ٹکڑے کرنے کا نام بھارتی خارجہ حکمت عملی میں پاکستان محرک (Factor) ہے۔ جس کے قیام کی مخالفت میں علمائے ہند کا فتویٰ تھا۔ سچ تو یہ ہے اس مذہبی پیشوائیت کے خلاف عوامی بغاوت کا وہ مرحلہ انقلاب تھا، جسے تحریک پاکستان کہتے ہیں۔ روایتی مذہبی رہنما، بالآخر ہار گئے اور عصری، عبقری اور نابغہ قیادت، اقبالؒ و جناحؒ کے روپ میں روحِ عصر بن گئی۔ برعظیم کے مسلم عوام نے مذہبی پیشوائیت کو اپنی سیاسی اور قومی قیادت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دامن چھڑا لیاں اور یہی معروضی رویہ اور رجحان ہے جو پاکستان کے عوام کی سیاسی سمجھ بوجھ اور اجتماعی بصیرت کا وہ نمونہ ہے جو ہر عام انتخابات کے موقع پر مذہبی پیشوائیت کا نوشتہ تقدیر بن چکا ہے یا اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ برعظیم کے عوام نے مذہبی پیشوایت کو سیاسی میدان میں ہمیشہ کیلئے یکسر مسترد کر دیا ہے۔ جبکہ عملاً دین اور نظریہ کو اپنا ایقان و ایمان جانتے ہیں۔

یہ مذہبی مسخرے اپنی فقہ کے نام پر اپنی مذہبی بلکہ سیاسی جماعتیں، اب پاکستان میں بنا رہے ہیں۔ منبر و محراب سے صدارت اور وزارت تک منہ مارنے کو اسلام کا نفاذ گردانتے ہیں۔ ان افراد کو اسلام کا نمائندہ مانتا ہی کون ہے؟ اسی وجہ سے اب انھوں نے بارود اور بندوق اٹھالی ہے۔

حوالہ جات

1- S.N Sen, *History of Freedom Movement of India*,Calcutta, Wiby Eastern Limited, 1989.p.33

2- Ibid.

3- آغا شورش کاشمیری، ''ابوالکلام آزاد، افکار و سوانح'' لاہور مطلبوت چٹان، 1988 صفحہ 98

4- S.N. Sen. Op.Cit., P.44

5- Ibid.

6- اعجاز الحق قدوسی ''آزادی کی تحریکیں''، لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1988 صفحہ 306

7- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ''جماعت اسلامی کے 29 سال'' لاہور، ادارہ بتول، 1970، صفحہ 15

8- ایضاً

9- اشتیاق حسین قریشی، ''برعظیم کی ملت اسلامیہ''، کراچی، کراچی یونیورسٹی 1989 صفحہ 379

10- آغا شورش کاشمیری ابوالکلام آزاد افکار و سوانح حوالۂ مذکورہ صفحہ 65

11- مالک رام، ''خطبات آزاد''، لاہور اسلامک پبلی کیشنز ہاؤس، 1987 صفحات 337-338

12- ایضاً

13- آغا شورش کاشمیری، ''ابوالکلام آزاد''، حوالہ مذکورہ، صفحہ 226

14- ایضاً صفحہ 10

15- شورش کاشمیری، بوئے گل، نالہ دود چراغ محفل (افکار، سوانح) لاہور مطبوعات چٹان، 1972، صفحہ 292

16- ایضاً، صفحہ 344

17- شورش کاشمیری، ''اس بازار میں'' لاہور، مکتبہ چٹان ندارد، صفحات 83-84

18- راشد شاز، ''بھارتی مسلمان''، علی گڑھ، انسٹی ٹیوٹ آف اُمہ افیئرز 1999 صفحات 37-42

19- ایضاً، صفحہ 13 تا 23

20- آغا شورش کاشمیری، ''ابوالکلام آزاد''، حوالہ مذکور، صفحہ 192

21- ایضاً، صفحہ 210

22- شورش کاشمیری، ''سید عطاء اللہ شاہ بخاری''، مطبوعات چٹان، 1978، صفحہ 254

23۔ ایضاً،صفحہ 298

24۔ مولوی سعید احمد،''آہنگ بازگشت''،اسلام آباد،قومی ادارہ برائے تحقیق و تاریخ،1989،صفحہ 236

25- Mushirul Hassan, John Compnay To the Republic, A Story of Modern India, New Delhi, Roli Books, 2001: 33

26۔ مالک رام،''خطبات آزاد''حوالہ مذکور صفحات 348-347

27۔ ایضاً،صفحہ 349-348

28۔ شورش کاشمیری،''بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل''،حوالہ مذکور صفحہ 458

29- Daily the Dawn, Delhi, 30 October, 1947

30۔ شورش کاشمیری،''بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل''حوالہ مذکور، 491

31۔ ایضاً صفحہ 409

32۔ ایضاً صفحات 491-490

33۔ ایضاً صفحہ 492

34۔ ایضاً صفحہ 282

35۔ ایضاً صفحہ 283

36۔ ایضاً صفحہ 284

37۔ ایضاً

38۔ پروفیسر محمد اسلم،''سفر نامہ ہند''،لاہور،ریاض برادرز، 1995 صفحہ 83

39۔ شورش کاشمیری،''بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل''حوالہ مذکورہ،صفحہ 310

40۔ ایضاً،صفحہ 241

41۔ ایضاً،صفحات 493-492

42۔ عطاالحق قاسمی،''جوش اور ہوش''،روزنامہ نوائے وقت لاہور 13 نومبر 1993

43۔ شورش کاشمیری،''بوئے گل،نالہ دود چراغ محفل''حوالہ مذکور،صفحہ 386

44۔ ایضاً

45۔ ایضاً،صفحات 344-343

46۔ ایضاً،صفحہ 383

47۔ ایضاً،صفحات 386-385

48۔ ایضاً،صفحہ 416

49۔ ایضاً،صفحہ 395

50۔ ایضاً،صفحہ 315

51۔ ایضاً،صفحات 423-424

52۔ شورش کاشمیری،''ابوالکلام آزاد''،حوالہ مذکور،صفحہ 211

53۔ ایضاً صفحہ 220

54۔ ابوالحسن علی ندوی علی میاں''پرانے چراغ''،کراچی،نشریات اسلام 1975 صفحات 41-44

55۔ ڈاکٹر اسرار احمد ماہنامہ میثاق لاہور مارچ 1999 صفحہ 13

56۔ شورش کاشمیری،''ابوالکلام آزاد''،حوالہ مذکور صفحہ 499

57۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی''پرانے چراغ''،ہوالہ مذکور صفحہ 41

58۔ حمیدہ سلطان''نقوش''آزاد لکھنو آزاد میموریل اکیڈمی 1975 صفحہ 9

59۔ ابوالکلام آزاد،''مولانا آزاد نمبر''،دہلی ایوان اُردو دسمبر 1988 صفحہ آخر

60۔ جوش ملیح آبادی،''یادوں کی بارات''،لاہور مکتبہ شعروادب،1975 صفحہ 278

61۔ ایضاً،صفحہ 270

62۔ آغا شورش کاشمیری،اداریہ چٹان لاہور 15 اپریل 1968

63۔ روزنامہ جنگ لاہور 21 مئی 1993

64۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور 16 جولائی 1992

65۔ افضل حق قریشی،''ابوالکلام آزاد (ادبی وشخصی مطالعہ)''لاہور الفصیل 1992 صفحہ 648

66۔ ایضاً صفحہ 649

67۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بحوالہ یوسف حسن خان،''یادوں کی دنیا''لاہور،گلشن ہاؤس،1994 صفحہ 102

68۔ حمیدہ سلطان،بحوالہ افضل حق قریشی''ابوالکلام''حوالہ مذکورہ صفحہ 250

69۔ خلیق انجم''مولانا آزاد شخصیت اور کارنامے''،کراچی مسلم پبلشرز 1998 صفحات 191-192

70۔ ایضاً

71۔ ایضاً صفحہ 105

72۔ ڈاکٹر صلاح الدین انٹرویو خلیق انجم ایضاً صفحہ 180

73۔ محمود سعیدی''مولانا آزاد اور سکولرازم''،بحوالہ خلیق انجم ایضاً صفحہ 213

74۔ آغا شورش کاشمیری،''بوئے گل''حوالہ مذکورہ صفحہ 372

75۔ پروفیسر محمد اسلم "تحریک پاکستان" لاہور، ریاض برادرز، 1993، صفحہ 57

76۔ ایضاً

77۔ ایضاً صفحہ 259

78۔ ایضاً صفحہ 212

79۔ پرواز ردلوی "ابوالکلام آزاد نمبر" دہلی ایوان اُردو 1988 صفحہ 279

80۔ مولانا "ابوالکلام آزادؒ" ایضاً، 283

81- Abdul Kalam Azad, *India Wins Freedom*, Hyderabad, Orient Longman, Epilogue, P.430

82۔ مشتاق احمد یوسفی "آب گم"، دہلی کتاب والا، 1991، صفحہ 63

83۔ مشتاق احمد یوسفی "خاکم بدہن" کراچی، مکتبہ دانیال 1992 صفحہ 63

84۔ خوش ونت سنگھ، "آپ بیتی"، لاہور، نگارشات، 2003، صفحہ 170

85۔ اداریہ، ماہنامہ اردو دنیا، نئی دہلی، مارچ 2009

86۔ آغا شورش کاشمیری، "بوئے گل نالہ دل، دودِ چراغ محفل"، حوالۂ مذکور، صفحہ ۳۱۳۔

87۔ مولانا سعید احمد ہاشمی، نوائے وقت 13 جولائی 1990ء

88۔ ایضاً

89۔ ایضاً

90۔ ایضاً

91۔ کامل قریشی، بحوالہ خلیق انجم، مولانا آزاد، شخصیت اور کارنامے حوالہ مذکور صفحہ 209

92۔ حضرت قائداعظمؒ بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور 28/نومبر 1996ء۔

93۔ حضرت علامہ اقبالؒ، مسلم کانفرنس منعقدہ، لاہور، 21/مارچ 1932ء۔

94۔ ڈاکٹر عبدالباری، سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، 17/مارچ 2000ء۔

95۔ سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، 16/مارچ 2000ء۔

96۔ ایم این رائے، "انقلاب کی تاریخ"، لاہور بدون سن، صفحہ 19۔

97۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، خطبہ اردو کانفرنس، (بریلی)، کراچی، دانیال، (1991، صفحات 130۔131)

98۔ آغا شورش کاشمیری، "فن خطابت"، لاہور، مطبوعات چٹان، 1920، صفحہ 20۔

99۔ ایضاً صفحہ 19

100۔ ایضاً صفحہ 20

101- The Radiance Weekly, New Delhi, 12 February 1994.

102۔ سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، 18 اپریل 2000ء۔

103۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، ماہنامہ آج کل، نئی دہلی، حوالہ مذکور صفحہ 8۔

104۔ مولانا عبدالوحید خان، فکر اسلامی، اسلامی سنٹر، نئی دہلی، 1996ء صفحہ 130۔

105۔ آغا شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، حوالۂ مذکور صفحہ 167۔

106۔ سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، 16/ اپریل 2000، صفحہ 3۔

باب سوم

زوال سے اقبالؒ تک

ابتدائیہ

برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی سرگذشت اور اس خطے میں اسلام کی پیش رفت دو الگ موضوع اور یکسر علیحدہ عنوانات ہیں۔ وجہ معروضی بھی ہے اور حقیقی بھی کہ تحریر و تاریخ ایک طرح کا نصاب بھی ہے اور قدرے رواج بھی۔ جبکہ مشاہداتی تاریخ (Oral History) غیر تحریری، حد درجہ اکتسابی اور تخلیقی ہے جو سینہ بہ سینہ یاداشت اور روایات، آیات و الہام، احادیث و پیغام بلکہ شعر و شاعری، لوک موسیقی، لوک داستانیں یہاں تک کہ موسیقی کی دھنیں اور تانیں بھی ایک طرح کا مکمل ذوق اور وراثت نیز معاشرت اور ماحول ہی نہیں ایک تہذیب و تمدن کا مکمل اظہار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تحریر میں تحقیق کے سفر نے جب فطری راہوں کا ادراک کیا تو تخلیق ساتھ ہی شروع ہوگئی جو انسانی تہذیب و تمدن کی ایک رواں قوت اور تمدنی صولت ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب زبانی تاریخ (Oral History) کو سائنسی بنیادوں پر مدون اور محفوظ کیا جانے لگا ہے جس کے حقائق سے معلومات ہی نہیں ادارک بھی حاصل ہوا ہے۔ یوں ماضی کے واقعات، سانحات اور وقوعات کو شعر و الہام، موسیقی اور اس کی تان یہاں تک کہ لوک داستانوں کے بیان یا حقائق (Facts) سے رجحان کی طرف رہنمائی ملی تو لوک ورثہ یا ماضی پڑھنے اور محض مطالعہ و معلومات کی خاطر نہیں بلکہ محسوس کرنے اور متاثر ہونے کا قدرتی اور فطری ذریعہ مان لیا گیا ہے۔ یہ تو بھلے کو سائنسی ایجادات اور انکشافات کے فنی محاسن نے اسے محفوظ و منضبط کر کے سمعی، بصری آلات اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے سے شہرت عام اور کسی حد تک بقائے دوام کے رُخ پر لا ڈالا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے انسان کے عصری شعور کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے جس سے بالکلیۃ یہ امر ثابت ہوا ہے کہ انسان واقعی اپنے ماضی سے پیار کرتا ہے جس میں (Written History) تاریخ ہی نہیں تحریک بھی شامل ہے اور یوں انسانیت کا سرمایہ ہوش (تاریخ تحریری) اور سفینہ جوش (زبانی تاریخ) اس کی ترجمان بنی ہے۔ گویا عقل کا چراغ اور عشق کی شمع دونوں ہی انسان کی تاریخ ہیں، بلکہ عین زندگی کا بھرپور اظہار بھی! صاف کہنا چاہیے کہ مشاہداتی اور زبانی تاریخ (Oral History) کی رو سے عینی شہادت اور انسانی حافظہ دونوں کو جامعیت ملی ہے۔

> ''حالانکہ فن تاریخ تو دلیل طلب کرتا ہے جبکہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ روایات پر مشتمل ہے۔ اگر ہم روایت کی ماہیت پر کاملاً غور نہ کریں تب تک ہم مسلمانوں کی تاریخ کا حقیقی رُخ دیکھ نہ سکیں گے۔''(۱)

اب یورپ کی تاریخ نویسی کا یہ باب اس حادثہ کے بعد کھلا ہے جب عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں نے بنی نوع انسان کو قیامت صغریٰ کے دلدوز نظارے اور دہکتے جہنم کا منظر دکھایا تو انسانیت کی چیخ و پکار کے عینی شاہدین (Eye Witnesses) نے مشاہداتی تاریخ یا عینی شہادت (Oral History) کو سند قبولیت عطا کی ہے۔ جذبے اور شہادت کا فقدان کسی بھی واقعہ یا وقوعہ کی جان نکال لیتا ہے۔ تحقیق کی مدقوق اور روایتی چھان بین کے خشک بیج چھٹ کر حقائق کا منہ

چراتے ہیں، جو تعقل کا تانا بانا تو ہوتا ہے، مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی ہرگز نہیں ہوتی۔ عینی شہادت اور انسانی حافظہ کی یکجائی سے بذات خود تاریخ کے مضمون اور موضوع دونوں کو بھی جامعیت ملی ہے۔ اور مشاہداتی تاریخ (Oral History) اب علمی دنیا کا جدید رجحان اور مقبول عام موضوع بنتا جا رہا ہے حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ حقیقت اپنا آپ منوا رہی ہے۔ منطق واستدلال کے تحریری مواد پر نقد و جرح نے تاریخ کا تجزیہ کرنے میں جانبداری سے حقیقت نگاری کا راستہ روکنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی ہے۔ خود مسلمانوں کا فن تاریخ نگاری بھی روایت کی صحت اور تحریری شہادت کا اسلوب ایک ایسی ہی مشاہداتی تاریخ (Oral History) کا جامع ہے۔

''حالانکہ جدید تاریخ کا اسلوب نگارش اور ترتیب واقعات کا انداز اور ہے اور قدیم مورخوں کا اسلوب اور نقطہ نظر اور اسلام کی روایتِ علم میں تاریخ نگاری کا فن بنیادی طور پر سیرت، حدیث اور طبقات کے ذریعے اپنا ابتدائی مزاج متعین کرتا ہے اور یہ روزنامچہ نگاری سے زیادہ قریب ہے۔'' (۲)

جبکہ تاریخ کی زبان اور تحریک کے بیان کا جامع الکلام ہونا ہی حقیقت کے قریب تر ہونے والی بات ہے۔ اس معیار تاریخ پر پرکھا جائے تو برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی سرگذشت دراصل مسلم دور حکومت (۱۸۵۷ء-۷۱۲ء) کے عروج و زوال کی داستان ہے جبکہ اس خطے میں اسلام کی پیش رفت ایک داستان نہیں اک دبستان ہے جو کھلا پڑا ہے، گلستان ہے جو کھلا ہوا ہے۔ اقبالؒ نے اسے ''اسلام، ایک عصری قوت'' کا نام دیا ہے (خطبہ الہ آباد) یہ علم و قلم کی گہرائی سے پہلے حقیقت کی پہنائی تک پہنچنے کا مرحلہ تحقیق و انکشاف ہے۔ جب تک اس معیار تحقیق تک پہنچا نہ جائے بات کہاں بنتی ہے، حقیقت کہاں کھلتی ہے۔ یہ وہ ہی ژرف نگاہی ہے جسے اقبالؒ نے لفظوں کا جامعہ پہنایا ہے کہ

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے نقاب

اس معیار اور اعتبار سے تخلیقی جائزہ لیں تو برعظیم میں اسلام اور مسلمان بظاہر ایک ہی عنوان ہے مگر اسلام ایک روحانی اور باطنی قوت ہے جو ظاہری حکومت سے کہیں زیادہ فطری، قدرتی اور حقیقی طاقت ہے جبکہ حکومت ایک عارضی اور وقتی چیز ہے اور یہی ایک حقیقی فرق ہے اسلام کی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت کا! اس لئے برعظیم میں مسلمانوں کی حکومت اور اسلام کا فروغ دو الگ پیمانے ہیں جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمیں اسلام کی اس حقیقی قوت اور تمدنی صولت کا صحیح ادراک ہو ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے برعظیم جنوبی ایشیاء میں مسلمانوں کی سرگذشت دراصل مسلم سلطنت و حکومت کے عروج و زوال کی تاریخ (History) ہے۔ جبکہ برعظیم جنوبی ایشیاء میں اسلام کی پیش رفت فی الواقعہ دین و فقر کی رواں تحریک (Movement) اور اسلام کے اقبال و بخت کے الٰہی اور الہامی کارواں اور سدا بہار طریق ہے بلکہ طریقت بھی۔

سراج منیر نے سچ کہا ہے کہ:

''امت کی تاریخ اور حکومتوں کی تاریخ اسلام میں ایک نہیں ہے''۔(۳)

جہاں تک اقبالؒ کی رہنمائی کا تعلق ہے، تو وہ زوال آشنا امت کو اقبال و بخت سے نوازنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ممتاز مذہبی متکلم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھی دین اسلام کے لیے تحریک کا لفظ متعارف کرایا ہے، لکھتے ہیں:

''تحریک'' کا لفظ جس مفہوم کیلئے میں استعمال کرتا ہوں اس کیلئے کوئی دوسرا ایسا لفظ مجھے نہیں ملتا جو آج کل کے عام لوگوں کے ذہن میں اس کی تصویر کھینچ دے۔ ''مذہب'' ایک مدت سے صرف اس معنی کیلئے مخصوص ہو گیا ہے کہ چند عقائد اور چند عبادتوں اور رسموں کا مجموعہ جن کی پابندی سے آدمی روحانی ترقی یا نجات بعد الموت کا متوقع ہو۔ اس معنی کے لحاظ سے آج کل کے لوگ کہتے ہیں کہ مذہب ایک انفرادی چیز ہے، عابد اور معبود کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق ہے، اس کو اجتماعی معاملات اور ملکی انتظام سے کیا تعلق؟ اسلام کیلئے لفظ مذہب کا استعمال موجودہ دور کے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ یہ بھی اسی جنس مذاہب کا ایک فرد ہو گا۔ رہا ''دین'' تو اسے بھی ایک مدت سے مذہب اور دھرم کا ہم معنی بنا کر رکھ دیا گیا ہے، تاہم اگر دین کو اس کے وسیع معنی میں بھی استعمال کیا جائے تب بھی سننے والے کے ذہن میں اس سے صرف اتنی بات ہی آتی ہے کہ یہ پوری انسانی زندگی کیلئے ایک جامع اور ہمہ گیر نظام ہے جو عقائد و افکار سے لے کر انفرادی و اجتماعی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک کا احاطہ کرتا ہے اور جس کا تعلق دنیا اور اس کے انتظام سے بھی اتنا ہی ہے جتنا حیات بعد الموت سے ہے۔ لیکن یہ بات کہ دین ایک نظام ہونے کی حیثیت سے دنیا کا انتظام خود اپنے زیر اقتدار لینے کا متقاضی ہے اور اس کے ایک نظام ہونے کا فطری اقتضا یہی ہے کہ دوسرے نظاموں کو ہٹا کر یہ خود ان کی جگہ قائم ہو، اور اس وجہ سے دین کی پیروی قبول کرتے ہی آدمی پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ دوسرے نظاموں کے تسلط کو مٹانے اور اس نظام کو قائم کرنے کیلئے کوشش کرے، محض لفظ ''دین'' سن کر آج کل کسی کے ذہن میں بھی نہیں آتی۔

اس مفہوم کو موجودہ دور میں لفظ ''تحریک'' اچھی طرح ادا کرتا ہے۔ اس وجہ سے میں اسلام کیلئے ''دین'' کے ساتھ ''تحریک'' کا لفظ بھی اکثر استعمال کرتا ہوں۔ نیز اس کوشش اور جدوجہد کیلئے بھی مجھے ''تحریک'' ہی کی اصطلاح استعمال کرنی پڑتی ہے، کیونکہ جہاد اور مجاہدہ کے الفاظ جو قرآن نے اس مفہوم کیلئے اختیار کیے تھے، انحطاط کے دور میں ان کے معانی بالکل بدل کر رہ گئے ہیں۔

مجاہدہ کا لفظ سن کر آج لوگوں کا ذہن صوفیانہ ریاضات اور چلہ کشی کی طرف چلا جاتا ہے اور ''جہاد'' بولیے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بس اب ایک لشکر مرتب ہوگا اور غنیم کیخلاف معرکہ قتال شروع ہو جائیگا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ''تحریک'' کے نام سے جو چیز میں نے پیش کی ہے آیا وہ دین اور جہاد فی سبیل اللہ ہی ہے یا کوئی اور چیز''۔(۴)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۱۹۴۱ء ہی میں نومبر کے ترجمان القرآن پٹھان کوٹ کے شمارے میں دین کیلئے تحریک کے لفظ کو اختیار کرنے کے بعد اپنے اس اجتہاد کو جماعت اسلامی بنانے میں بروئے کار لائے، جسے عالمی سطح پر تحریک اسلامی کا تخیل دے کر یہ باور کرایا گیا کہ یہی کارِ پیغمبری ہے جو دین کو غالب کرنے کے لئے منظم طریقے سے زمام کار بے خدا تہذیب کے حامل افراد سے چھین کر صالحین کے ہاتھ آ جائے تو اسے حکومتی سطح پر اسلامی نظام برپا کرنا ہوگا جس کے لئے مطالعہ لٹریچر سے ارکان سازی اور عصری محاذ پر کیمونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کے مدمقابل علمی اور قلمی طور پر معاشرے کے مراکزِ اعصاب پر موثر طبقوں میں اپنے افکار کو پھیلانے کے لئے لٹریچر، جرائد اور اخبارات کا اجراء کیا۔ نتیجۃً ان سے متاثر اور متعلق افراد کا ایک نظریاتی گروہ غیر منقسم ہندوستان سے شروع ہوا جو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور کشمیر میں اب بھی مصروف اور معروف ہے۔ تاہم جماعت اسلامی کا مذہبی رجحان، سیاسی اور حکومتی تبدیلی کا خواہاں اور کوشاں طبقہ ہے جسے عوامی پذیرائی تو نہیں ملی البتہ ایک مؤثر پریشر گروپ ضرور ہے جو پارلیمانی سیاست یا انتخابی سیاست کی سرگرمی کو تحریک اسلامی باور کراتا ہے۔ ظاہر ہے مولانا مودودیؒ نے علم اور عقل سے کلمہ پڑھانے کی بھرپور سعی کی ہے مگر دین فی الواقعہ دل ہے جو عقل ہرگز نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ کی سعی مشکور بقول اقبال:

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل

ہے جبکہ اقبالؒ خود اس شعر کا مصرع ثانی ہیں کہ:

دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کیمونزم، سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام حکومت کے مدمقابل نظریاتی سطح پر مولانا مرحوم نے اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اور اس طرح کے دیگر موضوعات اور اسلامی سیاسیات پر قلم کی بجائے گرز سے کام لیا ہے جبکہ معیشت کے موضوع پر مولانا مودودیؒ کا قلم جارحانہ نہیں ہے۔ وجہ یقیناً عصری اور معاشی رجحانات رہے ہوں گے ورنہ ابن حزم ہی نہیں صحابیٔ رسول ﷺ حضرت ابوذر غفاری ﷜ کے معاشی اصول بھی ایک مثالی نمونہ ہیں جن سے سرمایہ داری اور جاگیرداری دونوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

فکر اقبالؒ

ع پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی

جسے علامہ اقبالؒ (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) نے ''اسلام ایک عصری طاقت'' کا نام دیا ہے جس کے سوتے حُبِ رسول ﷺ اور آپ ہی کی ذاتِ اطہر ﷺ سے پھوٹتے ہیں۔ جو دین کی حقیقت اور اسلام کی تا ابد جامعیت اور زندگی کا حقیقی راز ہے اور یہی رحمت اللعالمینی ﷺ ہے۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' (پارلیمنٹ) نامی نظم میں اقبالؒ نے ابلیس کے منہ سے اُس کے مستقبل کے عالمی خطرے کا الارم بجادیا ہے کہ

ع مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

جس کیلئے ابلیس نے اپنی پارلیمنٹ (شوریٰ) کو اس خطرے سے نمٹنے کی بات کی ہے۔ جس کی وجہ سے ابلیسیت دم بخت رہے گی۔ یہی راز، دانائے رازؒ نے آشکار کیا ہے کہ خودی کے زور سے دنیا پر چھانے کیلئے صرف اور صرف عشق رسول ﷺ درکار ہے۔

جس کے لئے

دہر میں اسم محمد ﷺ سے اُجالا' کرنا ہو گا

یہ حُبِ رسول ﷺ کا رازِ حقیقی ہی اسلام کا عصری شہود اور باطنی طاقت ہے جو اسلام اور دین کا عین مظہر ہے۔ اقبالؒ ہی نے دین کی حقیقت ایک مصرع میں کھول دی ہے کہ دین وفقر ہی حقیقتاً زندگی ہے، جو خیال ونظر کی محویت ہے، مجذوبی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اسلام دین ہے اور دین محمد ﷺ ہے، فی الحقیقت اسلام محمد ﷺ ہے۔

با مصطفیٰ بہ رساں خویش را کہ دین ''ہمہ اوست''

کہ دین تو حضور سرکار دو عالم ﷺ کی ذات اطہر ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود علامہ اقبالؒ قیدِ زماں و مکاں (Time and Space) سے انسان کو اوپر اٹھا کر اسے مسلمان بناتے اور بتاتے ہیں کہ خرد اور عقل تو قیدِ زمان و مکاں کی پابند ہے جب کہ مسلمان اور مومن کا مقام اس سے کہیں آگے بہت آگے ہے۔

اس روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

ماضی، حال اور مستقبل کے عقلی منطقی اور استدلالی ذخیرہ (Written History) اور تاریخ کے شعور پر ان کا یہ شعر حقیقت کا کُھلا اظہار ہے۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ قدیم و جدید

اس حال اور حالت کارواں دواں اور ہر دم جوان نام ان کے ایک مصرع کا ابلاغ ہے کہ

ع　　سِرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

یہی ضمیر کن فکان ہے جو آج علمی دنیا اور سائنسی مشاہدہ و تجربہ کا ''حادثہ'' بن گیا ہے۔ بلکہ تین سے پانچ ڈائی منشن (Dimension) بنانے میں حادثے کا بھی اب چوتھا حصہ ہے۔ علم کی دنیا میں اونچائی، لمبائی اور چوڑائی کے بعد اب حادثہ اور وقت بھی شاملِ چمن آرائی ہیں۔ اور یہی کائناتِ ارضی کے محرکات، واقعات کا حاصل ٹھہرا ہے اور یہ یہی مغربی علوم کی انتہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تو اس کائنات ارضی کے اندر ہونے والے حادثات واقعات بلکہ انکشاف و ایجادات کا وقوعہ اور عقل کی آخری حد ہے۔ اقبالؒ نے تو پہلے ہی حقیقت کی ترجمانی فرمادی ہے کہ

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی دمادم صدائے کن فیکون

یہ کائنات کے اندر کُن (ہوجا) اور فیکون (ہوگیا) کا جاری و ساری عمل ہے۔ جو ذات باری الٰہ نہیں، اس کے حکم کا نام ہے اور بس یہ تو حقیقتاً آفاق و کائنات میں گم ہونے اور گم کرنے والی بات ہے۔ جبکہ انس کی پہچان ہی ذات باری اللہ کی آگہی اور عرفان ہے جس کی وسعت اس بسیط کائنات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ آفاق و کائنات میں گم کو گمراہ بتایا گیا ہے۔ ان معنوں میں کہ انسان کا سفر ادھورا ہی نہیں تھوڑا اور لا حاصل بھی ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اسمیں ہیں آفاق

علم کا دائرہ چونکہ عقلی مدرکات ہی تک محدود ہے اس لئے محسوس اور معلوم سے بلکہ خبر سے آگے یہ جا نہیں سکتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ بذات خود قید مکان و زماں (Time and Space) کا پابند ہے جس میں جسمانی اور دماغی مشغولیت ناگزیر عامل (Factor) ہے۔ اس پیمانے سے سائنس کا صدیوں کا سفر بھی کائنات اور اس میں کارفرما قوانین اور قوائے تک ہی پہنچ سکا ہے۔ جس کی بدیہی اور بظاہر صورت حصولِ طاقت اور مادیت کا بُت ہے، جو الہامی کارواں اور انبیاء کرام علیہم السلام کے راستے کا پتھر ہے۔ اس ظاہری قوت کے حصول کا دوسرا نام اب ٹیکنالوجی ہے۔ بلکہ یہ سرد جنگ کی لہریں ہوں کہ روما سے روس تک کی تاریخ کا چہرہ، طاقت اور اقتدارِ ارضی ہی منشائے تحقیق و انکشاف ٹھہرا ہے۔ انسانیت کُش اسلحہ کی خریداری اور ہر نوعی اسلحہ کی تیاری اتنی متاع گراں کیوں ہے؟ یہی نا کہ طاقت خوف پیدا کرتی ہے۔ یہاں پر آکر علم و آگہی کی بس ہو چکی ہے۔ دورِ جدید کے مغربی مفکرین میں ایک بڑا نام ہائیڈیگر Martin Heideger (1889ء۔1976ء) کا ہے جس کے نزدیک

''ٹیکنالوجی کا جنون اس سرزمین کے روحانی تنزل کا آئینہ دار ہے۔ اور ترقی یافتہ قومیں اس کا شکار

بن رہی ہیں۔اس کی تاریخ اب وجود یا ہستی کی تاریخ نہیں بلکہ انسانی انا کی تاریخ ہے جو کائنات کو تہہ و بالا کرنے کے درپے ہے اور اپنی تیز رفتاری میں اپنی ہلاکت کا سامان کر رہی ہے۔'' (۵)

وجہ بھی حقیقی ہے۔علم کا دائرہ عقل کے مدار میں چکر لگا کر رہ گیا ہے جبکہ فقر و دین دل کی زندگی اور کائنات میں کارفرما قوت حقیقی (ذات باری تعالیٰ) کی جلوہ گاہ **فعال لمایرید** (القرآن) ''جو چاہے کر گزرنے والا'' کہا گیا ہے۔اس کی واضح راہنمائی خود حضرت علامہ اقبالؒ کا فرمان ہے۔

علم کی حد سے پرے بندہ مومن کیلئے
لذت شوق بھی نعمت دیدار بھی ہے

یہی سبب ہے کہ بیسویں صدی کے دم واپسیں پر مسیحی یورپ اب اس حد تک آن پہنچا ہے کہ وہ اپنے تمام استعماری حربوں اور اسلحہ و اقتدار کے کھیل میں ہار جانے کا اندیشہ لیکر یہ کھوج لگانے بیٹھ گیا کہ اسلام کا راز حقیقی کیا ہے؟ یورپ کی یونیورسٹیوں میں اس موضوع پر ورکشاپ سیمینار اور مباحثے کا آغاز و اہتمام ہی نہیں ہوا بلکہ عالم اسلام سے علماء اور سکالرز کو وہاں بلایا جا رہا ہے تا کہ وہ بتائیں عربوں کا اسلام اور عجم کا اسلام بلکہ افریقی اسلام کیا ہے، کیوں ہے، اور کیسے ہے؟ یہاں تک کہ امریکی یونیورسٹیوں میں سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش رفت اور نئے شعبہ ہائے سائنس جاری ہونے کی بجائے اب وہاں مستقبل بینی (Futurology) مستقبل شناسی (Futuristic Appraoch) کے شعبے اپنی جدیدیت کا نشان ہیں۔ اسلام کے مخفی راز کا ادراک تو مغرب سے ہو نہیں سکا۔البتہ اس صورت حال کا فی نفسہٖ ادراک، ٹی بی آرونگ کو ہوا، جس نے (Islam Resurgence) میں اس کا اظہار کیا ہے کہ

''اسلام کا ایک عظیم پہلو وہ آفاقی اپیل ہے جو صدیوں کے دائرے میں پوری دنیا کی مختلف النوع اقوام کیلئے ظاہر ہوتی ہے۔اس مذہب (Religion) کے باطن میں کوئی ایسا عنصر ہے جس کو ہم وضاحت سے مشخص اور متشکل تو نہیں کر سکتے لیکن جس نے عرب دنیا سے باہر اسے قابلِ قبول بنایا ہے۔'' (۶)

حالانکہ ابلیس نے اپنی مجلس شوریٰ کو یہ راز پہلے ہی بتا دیا ہے کہ اسلام کو مٹانے کیلئے مسلمانوں کے دلوں سے روحِ محمد ﷺ کو نکالنا ہوگا۔اقبالؒ نے ابلیس کی نشاندہی کی ہے کہ

روحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

ادھر مغربی علوم و فنون اور سائنسی ایجادات و انکشافات کا تمام تر دائرہ کائنات کے اندر رونما ہونے والے واقعات کا تسلسل اب ''حادثہ'' پر جا کر رک گیا ہے بلکہ سائنس کا سفر آخر شب بن کر رہ گیا۔جبکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کائنات میں کارفرما قوت حقیقی (وقت) اور اس کے امر، کن فیکون (ہو جا۔ہو گیا) کے راز حقیقی کو پانے کا نام سرِ آدم ہے۔ بلکہ دین و فقر

میں یہ مقامِ محمد ﷺ ہی نہیں مقام مصطفیٰ بھی ہے۔

بہ عیار مصطفیٰ ﷺ خود را زند
تا جہانِ دیگرے پیدا کنی

وہی جہاں ہے تیرا جس کو تُو کرے پیدا
یہ سنگ خشت نہیں جو تیری نگاہ میں ہیں

یہی کائنات میں کارفرمارازِ حقیقی ہے جو مغربی دانش وبینش کا حجابِ اولیٰ ہے۔ نطشے ہی کی عقل چل جانے پر اقبالؒ نے پیش کش کی تھی۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو بتلاتا مقام کبریا کیا ہے

اقدامِ اقبالؒ اور تحریکِ پاکستان

اسی اقبالؒ نے پاکستان کا نظریہ اور اس کا بانی محمد علی جناحؒ دریافت کیا، بلکہ بازیافت کیا، پیش کیا جسے انگریزی زبان میں (Iqbal's Jinnah) کہیں گے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نظریہ پاکستان اور بانی پاکستان، دونوں اقبالؒ کی دریافتیں (Discoveries) ہیں۔ انگریزی زبان میں کہنا ہو تو بجاطور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ

Both the idea and the founder of Pakistan are the discoveries of Iqbal.

تو یہ بات حقیقت بھی ہے اور اس کا واشگاف اظہار بھی کہ برعظیم میں ایک مسلم مملکت اور اس کے حصول کیلئے قائد کا چناؤ یا اصطفیٰ (Selection) بھی کہہ سکتے ہیں۔ اُردو زبان میں کہنا ہو تو جناحؒ ۔۔۔ اقبالؒ کا مردمومن کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ جو عصرِ رواں اور رہتی دنیا تک حضرت قائداعظم اور بابائے قوم یا بانیٔ پاکستان کا لازوال نام ہے، جس کے احترام میں پاکستان کی نئی نسلوں کے دل ہمیشہ ادب سے جُھکے رہیں گے۔ بلکہ دلوں کے پرچم سدا سرنگوں رہیں گے۔ تحریک پاکستان (۱۹۳۷ـ۱۹۴۷ء) کے پورے دس برسوں میں جس شخصیت اور قیادت کی جہدِ مسلسل کا تعارف ہے وہ اقبالؒ کا یہی مردمومن حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ اور پاکستان، دونام ہیں بلکہ پاکستان اور قائداعظمؒ ہر طرح سے لازم وملزوم ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ تو قائداعظمؒ کی سیادت وقیادت سے پہلے شروع دن سے ہی مسلمانانِ برعظیم کی مسلم اقلیت (Minority) کیلئے انگریزوں سے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی بلکہ معاشرتی حق اور حقوق حاصل کرنے کیلئے قائم ہوئی تھی۔ تحریک پاکستان (Pakistan's Movemement) یا قائداعظمؒ کے کارنامے کو (۱۹۴۷ـ۱۹۳۷) تک کے صرف دس سال کو ایک جملے میں بیان کرنا مقصود ہو تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سیاسی اور معاشی حقوق مانگنے والی مسلم اقلیت کو مسلم قوم بنا کر ایک آزاد وطن پاکستان لیکر دیا۔ تفصیلاً کہنا ہو تو

اولاً: سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کے تحفظ (Safeguard) مانگنے والی برعظیم کی مسلم اقلیت (Minority) کو مسلم قوم (Nation) بنایا اور اس کیلئے

ثانیاً: معاشرتی، سماجی اور سیاسی حقوق مانگنے یا دستوری تحفظات کے ساتھ حقوق مانگنے، متعین کرانے کی بجائے انہیں ایک آزاد، خودمختار ملک، پاکستان لے کر دیا۔ جو (۱۹۳۷ء۔۱۹۴۷ء) تک کا مرحلہ تحریک یا سن و سال نہ تھے بلکہ بقول اقبالؒ

ع ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن

کے جلوے ہیں، نظارے ہیں۔ جسے خود حضرت علامہ اقبالؒ کی ذاتی شخصیت کی پنجاب کی حد تک مسلم لیگ کی صدارت کے چھ سال اور پھر انکی بصیرت دینی کے حامل وہ خطوط ہیں جو ان کی مشاورت اور رفاقت دونوں کے پُر سوز نالے ہیں۔ یہ جناحؒ کے نام اقبالؒ کی آخری عمر کا اثاثہ اور ملت اسلامیہ ہند کے روح رواں جناح کو حقیقتاً اور فی الواقعہ قائداعظمؒ بنانے کا توشہ تاریخ ہیں۔ حضرت علامہؒ نے مسلمانان برعظیم کے جس رہنما کو اس ملت کی قیادت و سیادت کی خاطر آمادہ کیا اس کیلئے ذرا اقتباسات کی ایک جھلک دیکھنے سے اندازہ ہوگا کہ اقدامِ اقبالؒ کیا ہے۔

قائداعظمؒ کے نام اقبالؒ کے خطوط

ع ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کیلئے

۱۔ ''اس وقت مسلمانوں کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے رہنمائی کی توقع وابستہ ہے۔'' (قائداعظمؒ کے نام خط ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء) (۷)

۲۔ ''اسلامی ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی ذہانت وفراست ہماری موجود مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔'' (قائداعظم کے نام خط ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء) (۸)۔

۳۔ ''ہندوستانی مسلمان آپ سے متوقع ہیں کہ اس پُرآشوب زمانے میں آپ ان کے مستقبل سے متعلق ان کی واضح اور کامل رہنمائی فرمائیں گے''۔ (قائداعظمؒ کے نام خط ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء) (۹)

پاکستان کا نام لب اقبالؒ پر

عالم اسلام کے نامور سکالر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، علی میاں نے اپنی عربی کتاب روائع اقبالؒ (نقوش اقبالؒ) میں اپنی حضرت علامہؒ سے پہلی ملاقات بعمر ۱۷ سال کا تذکرہ تازہ کیا ہے جب وہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۷ء کو اپنے پھوپھا سید طلحہ حسن استاد اورینٹل کالج کے ہمراہ اُن سے ملے۔ دیگر باتوں کے علاوہ پاکستان کے بارے میں فرمایا اور غالباً پہلی دفعہ ان

کے لب اطہر سے یہ نام ریکارڈ ہوا ہے۔ مولانا علی میاں لکھتے ہیں کہ پاکستان کے بارے میں فرمایا۔

''جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب وتہذیب کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین وتہذیب حکومت و شوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں اس لئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے اور یہی (مسلمانوں کی) اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے۔'' (۱۰)

پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے سابق نیوز ایڈیٹر اور خاکسار فکر کے معروف صحافی مولوی سعید احمد نے اپنی خودنوشت ''آہنگ باز گشت'' میں بجا طور پر اس مرحلہ تاریخ پر تبصرہ کیا ہے کہ

''اقبالؒ کی زندگی کے آخری دو سال ہر اعتبار سے زندگی کی تکمیل کے سال تھے۔ وہ بستر علالت سے فکری اور سیاسی قیادت فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے نہ صرف منزل کی نشاندہی کی بلکہ اس کے حصول کے لئے ایک قائد بھی متعین کر گئے۔'' (۱۱)

اس امر کی تصدیق وتائید حضرت علامہ اقبالؒ کے خلوت کدہ سے بھی ہوتی ہے، خود ان کی صحبت پاک میں بیٹھنے والوں نے گواہی دی ہے کہ م۔ش لکھتے ہیں یہ بات کتنے لوگوں کو معلوم ہے کہ

''اقبالؒ نے اپنی زندگی کے بقیہ آٹھ سالوں (۳۰ءتا ۳۸ء) میں زندگی کس کرب اور اضطراب میں گزاری۔ یہ کتنے لوگوں کو آج معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے رات کی تاریکیوں میں کتنے آنسو برسائے، اب کون جانتا ہے کہ انہوں نے اپنے خواب (پاکستان) کی تعمیر دیکھنے کے لئے کتنی عظیم جدوجہد کی۔ آج یہ کسے معلوم ہے کہ اقبالؒ نے اپنے خواب کی تعمیر کے لئے جناحؒ کو کیسے ڈھونڈا۔'' (۱۲)

اقبالؒ وجناحؒ

ع ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے پاکستان ٹائمز لاہور میں بادشاہ حسین نے اپنے ایک مضمون

"Why Iqbal's Choice Fell on Junnah"

میں انکشاف کیا کہ انہوں نے ان کی وفات سے دو سال قبل ۱۹۳۶ء میں حضرت علامہؒ کے ساتھ ملاقات میں دریافت کیا کہ آپ کی نگاہ جناحؒ پر کیوں پڑی

ڈاکٹر اقبال:۔ برطانوی استعمار ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور ہندوؤں کا غلبہ بھی ہمارے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ دونوں کا دباؤ ہمیں کچل رہا ہے۔

میں:۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ایک ایسے رہنما کی ہے جو مجاہدوں کی قوت کو منزلِ مقصود حاصل کرنے کیلئے انہیں

استعمال کر سکے۔آپ کے خیال میں کیا مسٹر جناحؒ مطلوبہ شخصیت (Man of the Destiny) ہیں۔

حضرت علامہ اقبالؒ:۔جی ہاں میری بصیرت کہتی ہے کہ مسٹر جناحؒ ملت اسلامیہ کو منزل مقصود تک پہنچا ئیں گے۔

میں:۔کیا آپ نے انہیں قریب سے دیکھا ہے

علامہ اقبالؒ:۔ہم نے اکثر اوقات تقریباً تمام اہم مسائل پر خط و کتابت کے ذریعے گفتگو کی ہے۔ہم نے ملاقاتوں کے ذریعے بھی تفصیل سے باہم تبادلہ خیالات کیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناحؒ سے بڑھ کر کوئی دوسرا رہنما اس مشکل کام (Up-Hill-Task) کو سرانجام نہیں دے سکتا۔

میں:۔لیکن شاید عوام میں انہیں مقبولیت حاصل نہیں؟

علامہ اقبالؒ:۔یہ میری پیشین گوئی ہے کہ مسٹر جناحؒ ایسے کردار،اخلاق،فہم و تدبر اور عزم کے مالک ہیں جن کی بنا پر وہ جلد ہی ایک ایسے عوامی ہیرو بن جائیں گے کہ مسلم ہندوستان میں ابھی تک اس قسم کا کوئی لیڈر پیدا نہیں ہوا۔

مسٹر جناحؒ برطانوی استعمار اور نوکر شاہی کی اصلیت سے بخوبی واقف ہیں وہ کانگرس کی ذہنیت کے بھی بھیدی ہیں یہی وجہ ہے کہ صرف وہی ان دونوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں اور ان کو شکست دے سکتے ہیں (۱۳)

بانی پاکستان اور شاعر مشرقؒ

۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یوم اقبالؒ منایا گیا۔حضرت قائداعظمؒ نے حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔آپ نے فرمایا

ایک انگریز سے کسی نے کہا''برطانوی سلطنت اور شکسپیئر میں سے ایک کو منتخب کر لو۔اس نے جواب دیا کہ میں شکسپیئر کو ترجیح دیتا ہوں''۔حضرت قائداعظمؒ نے فرمایا کہ''میرے پاس کوئی سلطنت ہوتی اور مجھ سے کہا جاتا کہ اقبالؒ اور سلطنت میں سے کسی ایک کو چن لو تو میں اقبالؒ کو چنتا!''(مسلسل اور طویل تالیاں)(۱۴)

اسی طرح اگلے برس یوم اقبالؒ کی تقریب ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوئی۔صدارت سر شاہنواز ممدوٹ نے کی۔اسی موقع پر حضرت قائداعظمؒ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> ''اگر میں اس مبارک تقریب میں شامل نہ ہوتا تو اپنی ذات کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتا۔میں اپنی بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسے میں شامل ہو کر حضرت علامہ اقبالؒ کو عقیدت کے پھول پیش کرنے کا موقع ملا۔۔۔۔۔اقبالؒ کی ادبی شہرت عالمگیر ہے۔وہ مشرق کے بہت بڑے ادیب' بلند پایہ شاعر اور مفکر اعظم ہیں۔لیکن اس حقیقت کو بھی میں ہی سمجھتا ہوں کہ حضرت علامہ اقبالؒ دنیا کے بہت بڑے سیاستدان تھے۔انہوں نے ایک صحیح اور واضح راستہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جس سے بہتر دوسرا اور کوئی راستہ نہیں ہو سکتا۔علامہ اقبالؒ دور حاضرہ میں اسلام کے بہترین شارح ہیں کیونکہ

اس زمانے میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کو کسی شخص نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس امر پر فخر حاصل ہے کہ ان کی قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا مجھے موقع مل چکا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے وہ یقیناً صحیح ہوتی تھی۔ اور وہ اس پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے۔ ان کی علمی اور ادبی گل کاریوں کی وجہ سے ان کا نام جریدہ عالم پر ثبت ہو چکا ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ کیونکہ اسلام کے سچے شیدائیوں اور عاشقوں کا نام ابدلآباد تک زندہ رہتا ہے۔''(۱۵)

یہی بات حضرت قائداعظمؒ نے قرارداد لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی منظوری کے دوسرے روز لاہور میں اپنی محفل میں بھی دوہرائی کہ

''آج علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو یقیناً انہیں خوشی ہوتی کہ بالآخر ہم نے وہی کچھ عمل کیا ہے جو وہ چاہتے تھے۔(۱۶)

ادھر قائداعظمؒ خود کو اقبالؒ کی قیادت میں کام کرنے والا سپاہی بتارہے ہیں اُدھر حضرت علامہ اقبالؒ کا حال یہ ہے کہ وہ خود کو جناحؒ کا ادنیٰ سپاہی ہونے پر فخر فرمارہے ہیں۔

نہرو اقبالؒ کی خدمت میں

ایک بار پنڈت نہرو حضرت علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت مسلمان حضرت قائداعظمؒ کی قیادت میں جمع ہو چکے تھے۔ نہرو حضرت علامہ اقبالؒ کو قائداعظم سے ٹکرانا چاہتے تھے تاکہ متحد ہوتے ہوئے مسلمان پھر منتشر ہو جائیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد نہرو کہنے لگے۔

''جناح بڑا ضدی ہے ہندو اور مسلمان سب آپ سے محبت کرتے ہیں ان کی جگہ اگر آپ ہوں تو ہندو مسلم دونوں آپ کی قیادت میں جمع ہو جائیں گے۔''

حضرت علامہ اقبالؒ بیماری کے باعث لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سُنا تو ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئے، چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا، فرمایا

''دیکھو میں جناحؒ کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں اور مجھے اس ادنیٰ سپاہی ہونے پر فخر ہے۔''(۱۷)

پنڈت جواہر لعل نہرو کو اس امر کا یقیناً ادارک نہ تھا کہ حضرت علامہ اقبالؒ کس مومنانہ بصیرت کی حامل شخصیت ہیں، وہ محض انہیں شاعر، فلسفی اور دانشور سمجھ کو اپنا ترپ کا پتا پھینک گیا۔

اس نے فارسی پڑھی ہوتی تو اسے حضرت علامہ اقبالؒ کے برہمن کے بارے میں ارشاد کا ادراک ہو جاتا جس میں انہوں نے فرمایا کہ

نگاہ دارد برہمن کارِ خود را
نمی گوید بکس اسرارِ خود را
(اقبال)

کہ برہمن اپنے دل کا بھید اور نیت کا چھید کسی پر ظاہر نہیں کرتا، البتہ اس برہمن کو کُھلا جواب اور حضرت علامہؒ کی علالت (۱۹۳۸ء) میں اُٹھ کر جناحؒ کا ادنیٰ سپاہی ہونے پر فخر کے اظہار نے پنڈت نہرو کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔ جبکہ اس سے ۱۰،۱۱ برس قبل حضرت علامہ اقبالؒ کی سیاسی بصیرت کا یہ فیصلہ تھا کہ ہندوؤں کی بالادستی ہرگز قبول نہیں۔ حکیم الامتؒ کے معالج حکیم محمد حسن قرشی بتاتے ہیں کہ

علامہ اقبالؒ اور سیاسیات

''حضرت علامہ اقبال نے فرمایا کہ مجھے اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں پیش پیش ہونا چاہیے، مگر سوال تو یہ ہے کہ موجودہ تحریک (ترک موالات ۱۹۲۷) میں کیا مسلمان آزاد ہو سکیں گے؟ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان انگریز کی جگہ ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔'' پھر فرمایا ''اس سے کیا فائدہ مرتب ہوگا'' مزید فرمایا کہ ''ہندو اس وقت اپنے آپ کو مضبوط کرنے کیلئے سنگٹھن (منظم) کر رہے ہیں اور اسی لئے جگہ جگہ فسادات ہو رہے ہیں تا کہ جو بزدلی اور احساس کمتری ہندوؤں میں پایا جاتا ہے اس کو دور کیا جائے۔ اس لئے مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کسی سمجھوتے پر رضا مند ہو جائیں گے۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ اگر مسلمان زعماء ہندو لیڈروں کی سب شرطیں مان لیں اور بلاشرط مفاہمت کی پیش کش کرلیں، جب بھی ہندو اس سے انحراف کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی کریں گے۔''

ہندوؤں کی سیاست

حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا ''سیاست یہ ہے کہ ہندو نہیں چاہتا کہ وہ انگریز کو برصغیر سے نکال کر اس سے قطع تعلق کرے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ ہے کہ داخلی آزادی حاصل کر کے مسلمان اور دیگر (غیر ہندو) اقوام پر حکومت کرے۔'' (۱۸)

پاکستان کیلئے ۱۹۳۴ء میں دستوری خاکہ

صادق قریشی نے علامہ اسد کی یاد میں اپنے ایک مضمون میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۴ء میں پاکستان کیلئے آئین اور نظام کا اسلامی خاکہ تیار کرنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''علامہ اقبال'' نے ۱۹۳۴ء میں انہیں (علامہ اسد) سے کہا کہ زود یا بدیر ملک (ہندوستان) کے شمال مغربی حصوں میں مسلم مملکت کا وجود عمل میں آئے گا۔ اس کا نظام حکومت اور آئین کس طرح کا ہو، اس پر ابھی سے کام شروع ہو جانا چاہیے۔ آپ اس کو اپنے مطالعہ اور ریسرچ کا موضوع بنائیں۔ پھر حضرت علامہ اقبالؒ نے علامہ اسد کو صحیح بخاری شریف کا انگریزی میں ترجمہ شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ جو انہوں نے شروع کر دیا مگر جنگ عظیم کے دوران جرمن الاصل ہونے کی وجہ سے انگریزوں نے انہیں نظر بند کر دیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ (۱۹)

علامہ محمد اسد اپنی خودنوشت ''بندۂ صحرائی'' کے باب پنجم میں انکشاف کرتے ہیں کہ:

''جب بھی میں لاہور آتا ڈاکٹر محمد اقبالؒ سے ملنے ضرور جاتا۔ ان ملاقاتوں میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے امکانات پر گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ ہم دونوں اس نئی اسلامی مملکت کے قیام کے پُر جوش حامی تھے۔ اقبالؒ ان مسائل سے کماحقہ آگاہ تھے جن سے اس نوزائیدہ ملک کو نبرد آزما ہونا تھا۔ اقبالؒ اپنے ایام جوانی میں اور حصول تعلیم کے زمانہ میں ایک جوشیلے قوم پرست جیسے جذبات رکھتے تھے۔ اس دور میں انہوں نے ''ہندوستان ہمارا'' جیسی جوشیلی نظم قلمبند کی تھی، جو اس وقت سے اب تک مقبول قومی ترانہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اسی اثنا میں اقبالؒ اپنے قوم پرستانہ تصورات سے کنارہ کش ہو گئے اور ماورائے قومیت پر مبنی امت مسلمہ کے تصور کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ بعد میں ان کا یہی شدید جذبہ پاکستان کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ کیونکہ میرے ذاتی نظریات اور رجحانات بھی یکساں تھے، اس لیے ہم دیر تک لائحہ عمل پر گفتگو کرتے رہتے، جو مستقبل میں قائم ہونے والی اس مملکت کے انتظام و انصرام کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے مابین یہ موضوع بھی زیر بحث رہتا تھا کہ کس طرح اپنے سیاسی رہنماؤں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کھل کر مشترکہ مؤقف کی حمایت کریں۔ میں نے بہت سے ایسے مضامین سپرد قلم کیے جن میں یہ صراحت کی گئی کہ پاکستان کیوں ناگزیر ہے۔ میری یہ تمام تحریریں یورپ کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئیں۔ ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک مقبول روزنامہ میں بھی شائع ہوا۔ علاوہ ازیں میں نے اس موضوع پر لاہور اور دہلی کے علمی اجتماعات میں کئی لیکچر بھی دیئے۔

ان دنوں یعنی ۱۹۳۸ء میں اقبالؒ کی صحت تیزی سے بگڑنا شروع ہو گئی۔ ایک روز میں اپنے پریس میں بیٹھا پروف خوانی کر رہا تھا کہ اچانک میرا ایک دوست دوڑتا ہوا آیا اور مجھے اقبالؒ کے انتقال پُر ملال کی خبر سنائی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ دل ہلا دینے والی اس خبر نے میرے جذبات و احساسات پر کتنا گہرا اثر کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرے گرد تاریکی کے بادل چھا گئے ہیں۔

جب میں اقبالؒ منزل پہنچا، تو وہاں اقبالؒ کے شیدائیوں کی کثیر تعداد پہلے سے موجود تھی۔ ہم میں سے کسی کو اقبالؒ

کی اس دائمی مفارقت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہم سب اُن کے بستر مرگ کے قریب خاموش کھڑے تھے۔

اقبالؒ آنکھیں مونڈے بستر پر سیدھے لیٹے تھے۔ ان کے چہرے پر مکمل آسودگی کے آثار نمایاں تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری فکر میں غلطاں ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا اور مجھے ذاتی طور پر یوں لگا جیسے وہ کسی وقت بھی اپنی آنکھیں کھولیں گے اور کہیں گے کہ ''میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔'' اقبالؒ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے غیر مسلم مبہم سیاسی اصطلاحات میں شمالی ہند میں پاکستان کے نام علیحدہ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا اور پھر عمر بھر اپنے ہی بنائے ہوئے اس خاکے میں رنگ بھرتے رہے۔ ممکن ہے ان کے اس تصور پر عظیم مسلمان مفکر جمال الدین افغانی کے بعض سیاسی تصورات کا اثر پڑا ہو۔ اقبالؒ ہی وہ شخص ہیں، جنھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ کیمبرج کے نوجوان طالب علم چودھری رحمت علی کو تحریک دی کہ وہ ان کے اس نظریے کو کاغذ پر منتقل کریں اور آئندہ قائم ہونے والی اسلامی ریاست کے لیے لفظ ''پاکستان'' تجویز کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ پوری دنیا میں ''پاکستان کے باپ'' کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

اقبال کا جنازہ اثر انگیز تھا۔ لاہور میں شاید ہی ایسا غم انگیز منظر دیکھنے میں آیا ہو۔ ان کے تابوت کو بڑے بڑے بانسوں سے مضبوطی سے باندھا گیا تھا اور انہیں چالیس افراد (دونوں جانب سے بیس بیس) نے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ کندھا دینے والے یہ لوگ وقفے وقفے سے تبدیل ہو جاتے تھے، کیونکہ ہر شخص کہ یہ خواہش تھی کہ وہ اقبالؒ کے اس سفر آخرت میں ان کے تابوت کو کندھا دینے کا اعزاز حاصل کر سکے۔ تقریباً دو لاکھ افراد یعنی لاہور کی کم و بیش تمام مردانہ آبادی اقبالؒ کے جنازے کے ساتھ چل رہی تھی۔ ان کے گھر سے بادشاہی مسجد، جس کے بڑے دروازے کے قریب انہیں دفن کرنا تھا، کا فاصلہ تقریباً ایک میل تھا۔ تنگ راستوں سے گزرتا ہوا یہ سوگوار انبوہِ کثیر کئی گھنٹوں پیدل چلنے کے بعد وہاں تک پہنچا۔ بادشاہی مسجد اور قلعہ لاہور کے درمیان ایک وسیع جگہ پر اقبال کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ چند ماہ بعد یہاں ایک پختہ مقبرہ تعمیر کر دیا گیا۔'' اقبالؒ وجدانی اور روحانی طور پر جس مرتبے پر ہیں وہ اُن کے کلام میں واضح تر ہے۔'' (۲۰)

اس بات پر حیرت کیسی تعجب کیسا یہ اس شخص کا فرمان ہے جو کہتا ہے کہ

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو سامنے آنکھوں کے آتا ہے
(اقبالؒ)

بلکہ عام طور پر اور اب تک بھی اقبالؒ کو محض ایک بلند پایہ شاعر اور فلسفی قرار دینے کی روش جاری ہے۔ ان کے کلامِ بلاغت نظام کو صرف شاعری سمجھ لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار اس بات پر متنبہ کرتے ہیں کہ

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں واقفِ رازِ دروں مے خانہ

بلکہ اپنے فارسی کلام میں یہ بات اور زیادہ موثر انداز میں فرمائی،

مجو خیرے ازاں مردے فرو دست
کہ او بامن تہمت شعر و سخن بست

ترجمہ:۔ کہ اس کمینے شخص سے میرے بارے میں خیر کی توقع نہ کرنا، جس نے مجھ پر شاعر ہونے کی تہمت لگائی یا مجھے محض شاعر سمجھا اور شاعر جانا اور بس!

اور حقیقت بیان فرمادی۔

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

ترجمہ :۔ کہ کہاں نغمہ و شعر کہاں میں؟ یہ شعر و سخن تو بات کرنے کا بہانہ ہے میں تو اس بے مہار اونٹنی کو قطار کی جانب کھینچتا ہوں۔

ع نکلی تو لب اقبالؒ سے ہے کیا جانیئے کس کی ہے یہ صدا

اور پھر آخر کار تنگ آ کر اپنے شاعر ہونے کے شہرہ سے جی گھبرا گیا، تو انہیں سے دہائی دی جن کی برکت اور بڑھائی کیلئے یہ شاعری کا اسلوب عطا ہوا ہے۔ عرض پرداز ہیں کہ

من اے میرِ اُمم ﷺ داد از تو خواہم
مرا یاراں، غزل خوانے شمروند

ترجمہ:۔ یارسول اللہ ﷺ! میں آپ سے رحمت و داد کا طالب ہوں۔ لوگ مجھے محض شاعر سمجھنے لگے ہیں۔ بلکہ نگا ہے یارسول اللہ، نگا ہے۔

یہاں تک کہ زندگی کے آخری لمحات میں اپنی اُس رباعی کو دہرایا جس میں شاعری کی ادا اور حضور ﷺ کی عطا کا حقیقی اعتراف ہے، منظر و ماحول ہے، جو ان کے دم واپسیں کی آخری گواہی ہے جو خود ترجمانِ حقیقت کی اپنی حقیقت کا واشگاف اظہار بھی ہے کہ وہ شاعر ہیں کہ فلسفی، سیاستدان ہیں کہ دانشور، وہ خود بول اٹھے ہیں اور خود ہی اپنی حقیقت سے پردہ اٹھا کر خود ہی اس دنیا سے اُٹھ گئے کہ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روز گارے ایں فقیرے
دیگر دانائے راز آید کہ ناید

ترجمہ:۔ کہ پھر یہ روحانی رابطہ اور کیف و سرور، دوبارہ نصیب ہوگا کہ نہیں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مدینہ طیبہ سے پھر لطف و کرم کی نسیم صبح دوبارہ آ کر مشام جان کو معطر کرتی ہے کہ نہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس لئے بھی کہ اس فقیر (نقر سے) کا تو آخری دن آن پہنچا، میرے بعد کوئی دانائے راز (یا فقیر رسول ﷺ) آئے گا کے نہیں۔ میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔

یہی راز جو اقبالؒ نے خطبہ الٰہ آباد میں مسلمانوں کی تاریخ کے حوالے سے بیان فرمایا تھا کہ ''میں نے جس قدر مسلم تاریخ پر غور کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیشہ اسلام نے مسلمانوں کی حفاظت کی ہے نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کی''۔ گویا اسلام ایک عصری طاقت ہی تو ہے جو کائنات وحیات کی کارفرما قوت حقیقی ہے جو حقیقتاً عشق رسول ﷺ ہے۔ اسی توحید و رسالت ﷺ کی قوت کا نام اقبالؒ کے کلام کا ابلاغ ہے اس ہی کیلئے فرمایا کہ

خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ

یقیناً ان کے بنائے اور بتائے ہوئے ملک کا نام، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ بھی اسی سے ماخوذ ہی نہیں اس کلمہ طیبہ کا زندۂ جاوید معجزہ بھی ہے۔

علامہ اقبالؒ نظریہ پاکستان سے جغرافیہ پاکستان تک

(خطبہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء کے بعد ۱۹۳۷ء ستمبر میں)

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سابق سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مرحوم نے حضرت علامہ اقبالؒ سے مسلم طلبہ کے وفد کی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے کہ

''۴ ستمبر ۱۹۳۷ء کے وسط کا ذکر ہے ابھی آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ لکھنو سیشن ہونے میں کچھ دن باقی تھے جس سے مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہونا تھا۔ اس ملاقات میں پھر (مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن) کے نصب العین کا ذکر آیا۔ ایک صاحب نے کہا آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا قیام نصب العین قرار دیا جائے، لیکن رائے کو مبہم سمجھ کر مسترد کر دیا گیا۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے کچھ لاابالیانہ انداز میں فرمایا۔ پھر لکھنو سیشن کا انتظار کرلو۔ لیگ جو نصب العین اختیار کرے وہی تم اختیار کر لینا۔ اس پر میں نے کچھ جسارت کی اور کہا آپ نے تو خود کہا تھا کہ بڑے بوڑھوں پر تکیہ کرنا چھوڑ دو اور اپنا راستہ خود تلاش کرو، پھر ہم لیگ سیشن کا انتظار کیوں کریں۔ خود ہی کیوں نہ فیصلہ کرلیں؟ میرا خیال تھا کہ وہ (حضرت علامہ اقبالؒ) ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن وہ مسکرائے اور فرمانے لگے بھئی بات تو ٹھیک کہتے ہو، واقعی نصب العین فوراً طے کر لینا چاہیے۔ ہم نے کہا آپ تجویز فرمائیں۔ چنانچہ ان کے ارشاد پر نصب العین کے الفاظ قرار پائے۔

''شمال مغربی ہند میں ایک مسلم نیشنل سٹیٹ کا قیام جس میں پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر شامل ہوں۔'' ہم نے اس پر فوراً صاد کر دیا۔(۲۱)

یہ نظریہ پاکستان ۱۹۳۰ء خطبہ الہ آباد کے بعد ۱۹۳۷ء کے مسلم طلبہ کے ساتھ جغرافیہ پاکستان کے الفاظ قرار پائے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحریک قیام پاکستان بھی اقبالؒ ہی کے فکر و عمل کا دوسرا نام ہے۔ نظریہ بھی، قائد بھی، جغرافیہ بلکہ اسلام کی روشنی میں اِس ملک کا آئندہ دستور بھی اور وہ بھی ۱۹۳۴ء میں۔

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ۔۔۔ تحریک قیامِ پاکستان میں عملی اور ظاہری طور پر جس قدر متحرک اور فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں وہ تاریخ کا ایک لازوال باب ہے۔ اپنی علالتِ طبع اور آخری ایام زیست تک ان کے روز و شب اسی حقیقت کے غماض رہے ہیں۔ حضرت قائداعظمؒ کا چناؤ بلکہ اصطفیٰ (Selection) وہ کمال ہے جس کی روح عصر قائد اعظمؒ اور اس کا دوسرا نام پاکستان ہے۔ اس بات کو سادہ زبان میں جامعیت کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق احمد نے بخوبی سمیٹا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''قائداعظمؒ تحریک پاکستان سے وابستہ ہونے سے پہلے بھی مسلمانوں کے حقوق کیلئے سینہ سپر رہے تھے۔ جب علامہ اقبالؒ کی صحبتوں اور افکار نے انہیں ایک علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کا احساس دلایا تو خلوص دل سے وہ اس کے حصول کی کوششوں میں سرگرم ہو گئے اور ملت اسلامیہ کی خواہشات اور جذبات کو ایک نئی اور مثبت جہت عطا کی۔ عنایتِ ایزدی اور اپنے وسیع تجربات کی بنا پر انہیں یہ ادراک حاصل ہوا کہ عصر جدید کے اسلامی تقاضے کیا ہیں؟ اور آنے والے دور میں اسلامی ہند کس شکل میں اُبھرے گا۔ انہیں انگریز اور ہندو قائدین کی شکل میں ایک نہایت ہی عیار دشمن سے پالا پڑا تھا۔ لہٰذا حصول پاکستان کیلئے ان کی برق رفتار فہم و فراست نے موزوں حکومت عملی اختیار کی۔''(۲۲)

حضرت علامہ اقبالؒ کا فکر و عمل جہاں انہیں بانیان پاکستان (Founding Fathers of Pakistan) میں سرعنوان قرار دیتا ہے وہاں پاکستان کیلئے یہ اعزاز و شرف کیا کم ہے کہ اس کا نظریہ، اس کا بانی ہی کیا یہاں تک کہ اس کا جغرافیہ بھی اقبالؒ سے منسوب ہے۔ حقیقتاً اقبالؒ ہی پاکستان کے مرشد اولین اور مبشر اولیٰ ہیں۔ جن کی دینی بصیرت نے اسلامی ایشیاء میں ایک مسلم مملکت کے قیام کو یقینی بنایا، قائداعظمؒ کی رفاقت و رہنمائی بھی انہیں کے حسن تدبر کا اعجاز ہے۔

کلامِ اقبالؒ اور قیامِ پاکستان

ع تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

ان کے کلام بلاغت نظام میں برعظیم جنوبی ایشیاء میں اسلام کی پیش رفت کے بارے میں الہام و اشعار کا مطالعہ

کریں تو پھر اسلامی ہند کی روحانی تاریخ اس بات کی شہادت فراہم کریگی کہ ان کا نظمِ فکر ہی نہیں ان کی روح پاک میں بھی

ع اک اضطراب مسلسل غیاب ہو کہ حضور

پاکستان کی طلب ہی نہیں تڑپ کا حاصل کیا ہے؟ وصول کیا ہے؟ اپنے ایک شعر میں برعظیم کی روحانی تاریخ بیان کر کے حل پیش کرتے ہیں فرمایا۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی ﷺ

یہ شعر حضرت مجدد الف ثانی کی وفات ۱۶۲۴ء سے شروع کرتے ہیں۔ میاں بشیر احمد (ایڈیٹر ہمایوں لاہور) جن کی معروف نظم ہے۔

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ

اپنی ایک یادداشت میں لکھتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے شعری مجموعوں میں مجھے ان کی کتاب ''بال جبریل'' سب سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ مجھے کلکتہ میں ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو ملی۔ لاہور میں ان (علامہ اقبالؒ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے نسخے پر انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔

محمد اقبال لاہور ۱۵ مارچ ۱۹۳۵ء''

چند روز بعد میں ان کے پاس گیا اور اس شعر کی تشریح چاہی۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی ﷺ

میں نے تین سو سال پیچھے نگاہ دوڑائی تو شہنشاہ جہانگیر کی مے خواری نظر آئی۔ میں حیران ہوا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ انہوں (حضرت علامہ اقبالؒ) نے فرمایا کہ ''یہ اشارہ شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندیؒ کی طرف ہے۔'' (۲۳)

گویا یہ شعر ۱۹۲۴ء کا ہے۔ چونکہ حضرت مجدد کی تاریخ وفات ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء ہے۔

یہ شعر فی الحقیقت برعظیم میں اسلام کی روحانی تاریخ کی عصری حالت کا بیان ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ (م ۱۶۲۴ء) کے بعد برعظیم پاک و ہند پر رحمت ایزدی خاص تو تھی، عام ہرگز نہ تھی۔ حضرت علامہ اقبالؒ مجدد الف ثانیؒ کے بعد وہ پہلے روحانی رہنما ہیں جنہوں نے اس خطہ پاک جسے پاکستان کہتے ہیں کیلئے استدعا کی ہے بلکہ التجا کی ہے کہ

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی ﷺ

یہ تو التجا کہاں؟ روحانی رپوٹ عرض ہے کہ اب مناسب ہے بحضور رسالت مآب ﷺ میں، ایک طرح سے عرضِ حال ہے بلکہ

(Feasibility Report) پیش کی گئی ہے کہ یا رسول ﷺ اس خطہ ہند میں جہاں تین سو سال سے آپ کے فیض عام کے در و بام بند ہیں، اب مناسب وقت آ گیا ہے کہ اس خطہ پاک ﷺ کا فیض عام ہو جائے۔ اس کا واضح اور حقیقتاً مطلب یہ ہے کہ پاکستان فی الواقعہ حضور سرکار دو عالم ﷺ کے فیض عام کا دوسرا نام ہے۔ یقیناً یہی سبب ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اردو زبان میں نعت دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ لکھی گئی ہے، لکھی جا رہی ہے۔ بلکہ یہاں کے نعت گو شعرا بڑے جذب سے پاکستان کیلئے بھی روحانی کیف و سرور کا استعارہ لاتے ہیں۔

ارض لا الہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(مظفر وارثی)

دیار عشق رسول ﷺ ۔۔۔۔(حفیظ تائب)

لکھتے ہیں، کہتے ہیں، یہاں تک کہ برادر اسلامی ملک ایران کے قومی شاعر، ملک الشعراء بہار نے حضرت علامہ اقبالؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ

درود باد بروح مطہر اقبال
کہ بود حکمتش آموز گار پاکستان

ترجمہ۔ اقبال کی روح پاک پر ہزاروں درود سلام کہ جس کی بصیرت کا اعجاز ملک پاکستان ہے۔

جہاں تک کلام اقبال کی وسعتوں کا تعلق ہے وہ انفس و آفاق پر محیط ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سچ کہا کہ ''اقبال کا کلام علوم اسلامیہ کا اشاریہ ہے اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ خود قدم قدم پر علمی امور میں علمائے وقت سے طویل اور مسلسل مشاورت کرتے تھے'' (۲۴)

گر دلم آئینہ بے جوہر است
در بحرفم غیر قرآن مضمر است
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

کہ یا رسول ﷺ اگر میرا کلام قرآن پاک کی تفسیر اور تشریح نہ ہو تو مجھے قیامت کے دن آپ ﷺ کے نعلین پاک کو بوسہ دینے کی سعادت نصیب نہ ہو۔ یوں تو مروجہ ماحول، مکتبوں اور مسلکوں کے عالموں اور مولویوں کی طرح اقبالؒ عام معنوں میں عالم نہیں، عارف ہیں بلکہ حقیقتاً وہی عالم دین ہیں۔ یعنی مسلمانوں کے عالم یا مولانا نہیں ہیں جو بقول شورش کاشمیری کہ

ع میراثیوں کے ہاتھ میں میراث انبیاء

اقبالؒ حضور سرکار دو عالم ﷺ کے عالم دین ہیں جنہیں حضور ﷺ نے انبیاء کا وارث قرار دیا ہے (الحدیث)

حضرت علامہ محمد اقبالؒ مصلیٰ پر حالتِ تشہد میں

اقبالؒ ہی نے اس حدیث پاک کا ترجمہ وتفسیر بلکہ تشریح کر دی ہے۔

علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

باالفاظ دیگر

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

مختصراً یہ کہ یہ علم سے عالم نہیں ہوتے بلکہ فقر سے حضور سرکار دو عالم ﷺ کے فقیر ہوتے ہیں، جو اردو زبان میں میر تقی میر کے بعد چھوٹی ردیف، قافیہ کے شاعر عبدالحمید عدم کے بقول

وہ جو تیرے ﷺ فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

اس رُخ سے دیکھا جائے تو اقبالؒ کے مرشد معنوی مولائے رومؒ بارویں صدی عیسوی کے فتنہ تا تار اور تاراج کے بعد تب کی دنیا میں معتزلہ کے فکری فتنہ کے مرحلہ پر فقر کے نقیب ہیں اور اپنی مثنوی میں عقل وخرد کی بے چارگی کا پردہ چاک کیے دیتے ہیں اور عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں جبکہ انکا کلام مثنوی مولوی فقیہانہ ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں دنیائے علم و معرفت میں اور جدیدیت کے فکر و فلسفہ اور مادیت کی فکر گستاخ کا جواب حضرت علامہ اقبالؒ کا فقر و دین ہے جہاں دنیائے علم و عقل تا حال دم بخود کھڑی ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ کا طرز کلام بلاشبہ فلسفیانہ ہے۔

عجیب اتفاق ہے حضور ﷺ کا فقیر رومیؒ سات صدیاں پہلے اور حضور ﷺ کا دوسرا نام فقیر اقبالؒ بھی مولانا رومؒ کے ٹھیک سات صدیاں بعد لب کشا ہوا ہے کہ خود بتاتے ہیں،

رومیؒ در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرار جاں من
بہ دور فتنہ عصر کہن او
بہ فتنہ عصر رواں من

ترجمہ۔ میں نے بھی رومیؒ ہی طرح حرم میں اذان حق بلند کی اور رومیؒ سے ہی اسرار حیات بھی سیکھے ہیں۔ جس طرح انہوں نے اپنے وقت میں اس دور کے فتنہ عقل کا قلع قمع کیا بعینہٖ میں نے عذاب دانش حاضر کو لگام دی ہے بلکہ

طلسم علم حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دانش گستم

خدا داند کہ مانند ابراہیمؑ
بہ نار او چہ بے پروا نشستم

ترجمہ۔ میں نے ہی دورِ حاضر کے علم کا طلسم توڑا ہے، اس کے علم و دانش کا پردہ چاک کیا ہے۔ یہ میرا خدا ہی جانتا ہے کہ میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح کہ جیسے

ع میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

یہ تو پیمانہ اظہار و اشعار بلکہ افکار کا پرتو ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ وہ خود بول اُٹھے ہیں۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

غالبًا کیا؟ یقینًا پورے اُردو اور فارسی کلام میں کہیں بھی اور کبھی بھی اقبالؒ نے اللہ کی قسم نہیں کھائی ہے۔ یہ بات چونکہ عقل وخرد سے ذرا اوپر بلکہ بہت ہی اوپر کا معاملہ ہے اس کی تفصیل بھی اقبالؒ کے ہاں سے ہی معلوم کریں، تو یہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں، حقیقت حال ہے۔ جناب مودود صابری اپنی ''ایک یادگار ملاقات'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں۔

''اقبالؒ کی دید کا اشتیاق دیر سے دل میں موجزن تھا۔ اپریل ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ سے لاہور کا سفر محض شاعرِ مشرق کی زیارت کیلئے کیا۔ پیسہ اخبار کے قریب ایک عزیز عبدالصمد صاحب' اقامت پذیر تھے، ان کے ہاں قیام کیا۔ شام کے وقت ان کو ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب (اقبالؒ) کی کوٹھی پر پہنچا۔ دیر کی بات ہے سڑک کا نام صحیح یاد نہیں مگر جہاں تک یادداشت مساعدت کرتی ہے غالبًا اس سڑک کا نام میکلوڈ روڈ تھا۔ جس پر ڈاکٹر صاحب کا دولت خانہ تھا۔ کوٹھی کے دروازے پر ایک بوڑھے دربان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اطلاع کرنے کو کہا تو دربان نے جواب دیا کہ اطلاع کی کوئی ضرورت نہیں ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں، آپ شوق سے چلے جائیے۔ اقبالؒ اس وقت میرے رگ و پے میں سما چکا تھا۔ میں ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا اور طالب علمانہ شوق کے ساتھ اپنے محبوب شاعر کی دید کیلئے لاہور آیا تھا۔ اشتیاق و عقیدت کے ان جذبات کے ساتھ میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنا تعارف کرایا اور عرض کیا کہ میں علی گڑھ سے صرف اس لئے لاہور آیا ہوں تا کہ اس اقبالؒ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں جس کے سوزِ فکر نے میری راتوں کو بے خواب کر دیا ہے اور جس کے پیام کی حرارت نے میرے جسم و جان کو پھونک ڈالا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت سے میری بات سنی اور آنکھ اُٹھا کر بکمال محبت سے مجھے دیکھا، پوچھا کب آئے تھے؟ میں نے عرض کیا کل رات آیا تھا۔ اور ان صاحب کے مکان پر ٹھہرا ہوں جو آپ

کے سامنے بیٹھے ہیں، یہ بھی میری طرح آپ کے دیوانے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے نہایت شفقت سے فرمایا۔ جب اقبال سے ملنے کیلئے اس نوعمری میں اتنا طویل سفر کر کے آئے ہوتو پھر تم میرے مہمان ہو، سامان لے آؤ اور میرے پاس ہی قیام کرو! خیر ابتدائی گفتگو کے بعد میں نے دلی عقیدت کا اظہار کیا، اور بعض اشعار کے حوالے دیئے' مودود صابری، مزید لکھتے ہیں کہ

اقبالؒ بھی اقبالؒ سے آگاہ نہیں ہے

پھر ڈاکٹر صاحب نے سادگی سے فرمایا تم جس اقبالؒ سے ملنے آئے ہو وہ یہاں نہیں رہتا۔ یہاں تو سیالکوٹ والا اقبالؒ رہتا ہے اس سے ملنا پسند کرو تو حاضر ہے۔ پیام مشرق والے اقبالؒ اور سیالکوٹی اقبالؒ میں کیا فرق ہے اس کو میں اس نوعمری میں کیا سمجھتا، مگر میں نے بصد ادب یہ ضرور عرض کیا کہ جس اقبالؒ سے ملنے آیا ہوں سنا ہے ان کا آپ کے پاس آنا جانا ہے، جب آئیں تو میرا اسلام شوق پہنچا دیجئے گا۔ اس فقرہ پر ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور فرمانے لگے کہ تم نے ٹھیک سنا ہے مگر افسوس جب تمہارا اقبالؒ میرے پاس آتا ہے تو مجھ کو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ اس کے آنے کا علم مجھ کو اس کے چلے جانے کے بعد ہوتا ہے۔ کبھی ہوش باقی رہا تو تمہارا پیغام ضرور پہنچا دوں گا مگر اس کی توقع بہت کم ہے کیونکہ اس اقبال کا میں بھی ایسا ہی دیوانہ ہوں، جیسے تم ہو۔ میں نے بانگ درا کی نظم زہد و رندی کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا کہ آپ کو اقبال کے دیکھنے کی بڑی تمنا تھی امید ہے تمنا پوری ہو گئی ہو گی۔

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اس سوال پر ڈاکٹر صاحب نہ جانے کچھ کھو سے گئے کچھ دیر کے بعد ایک آہ سرد بھری اور فرمایا صاحبزادے جس دن وہ تمنا پوری ہو جائے گی وہ میری زندگی کا معراج ہو گا جو تا حال میسر نہیں ہوا۔" (۲۵)

فقرِ اقبال

ع تیرا دین نفس شماری مرا دین نفس گدازی

فقر کے سلاسل سہروردیہ اور چشتیہ کے نامور بزرگ مینا (لکھنو) نے اپنے ملفوظات میں بجا طور پر واضح کیا ہے کہ

"طریقت و تصوف کے کام عقل سے بالاتر ہیں۔" (۲۶)

عقل وخرد اور دانش و بینش کو بصیرت (Vision) تک لانے میں عام طور پر لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ بے نفسی اور بے غرضی کا آغاز ہی خو کو بھلانے یا تہذیب نفس خود (Self) کو مٹانے (Less) سے ہوتا ہے۔ تمام مذاہب اور اخلاق کی حدیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں جو آدمی کو انسان بنانے کا عمل ہے۔ خود پرستی اور خود پسندی تو وحشت ہے بہیمت ہے (Animalism) ہے۔ اسی تہذیب نفس کیلئے انبیاء مبعوث ہوئے ہیں، یہی کارگاہِ زیست کا اصل معرکہ اور امتحان ہے۔ یہی فقر و دین کا حاصل حیات ہے جو اقبالؒ کے ہاں لفظ کی جامعیت ہی نہیں حال اور حالت کی کیفیت کا خوبصورت نام بھی ہے، جسے وہ عشق کہتے ہیں۔ جو نہ عقل کی معلومات ہیں نہ نفسیات کی دنیا بلکہ یہ دونوں جہاں کا درد ہے جسمیں

دونوں جہاں تیری ﷺ محبت میں ہار کے

جانا پڑتا ہے۔ یہ جاننے (Information or Belief) کا نہیں ماننے (Surrender) کرنے کا وطیرۂ حیات ہے۔ اس کا نام تسلیم و رضا ہے۔ یہی حقیقتاً اسلام ہے، دین ہے، فقر ہے اور عشق ہے بلکہ وارفتگی ہے اور اسی کو اقبالؒ نے اختیار کیا ہے۔ اگر اُردو زبان میں اس طرح کا محاورہ بنانے کی گنجائش ہوتی تو کہا جاسکتا تھا کہ اقبالؒ نے اسلام کو اختیار کیا، اشعار کیا، افکار کیا مگر وہ اختیار سے کہیں زیادہ اس متاع عشق کے امین بنتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ

ع   اہل دل کی سلطنت فقر ہے شاہی نہیں

بلکہ فارسی کلام میں فرمایا

فقر و ذوق و شوق و تسلیم و رضا است
ما امینم ایں متاع مصطفیٰ ﷺ است

ترجمہ:۔ فقر کیا ہے؟ ذوق وشوق ہے۔ یہ سراسر تسلیم و رضا ہے اور یہی تو حضور سرکار دو عالم ﷺ کی عطا ہے، جو متاع بے بہا ہے، جس کے ہم امین بنائے گئے ہیں۔ اور اس کی ماہیت و حقیقت یہ ہے حضور سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ

الفقر فخری و الفقر منی (الحدیث)

فقر میرا فخر ہے اور فقر مجھ سے ہے

حضرت علامہ اقبالؒ ہی اس کا حقیقی ترجمہ اور تشریح فرماتے ہیں۔

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ ﷺ است
ایں تجلیاتِ ذاتِ مصطفیٰ ﷺ است

یہ ہی وہ میراثِ رسول ﷺ ہے جو فقر کہلاتی ہے جسے یہ عطا ہو، وہ فقرِ فقر ہے جس کا مقام ہے۔ بقول اقبالؒ

فقر مومن چیست؟ تسخیر حیات
بندہ از تاثیر او، مولا صفات

فقر مومن کیا ہے؟ حیات و کائنات کی تسخیر ہے کیونکہ فقر کی بدولت بندہ خود مولا کی صفات عالیہ کا حامل ہوتا ہے۔

البتہ جہاں تک علم کا مقصود ہے حضرت علامہؒ اسے پاکی عقل و خرد تک کا محدود مطالعہ کہتے ہیں جبکہ فقر کا مقصود وہ عفت قلب و نگاہ بتاتے ہیں۔ دین دراصل صحبت پاک ﷺ ہے۔ صحابی ؓ بھی صحبت سے نکلا ہے جس کی معنی ہیں وہ شخص جسے حضور سرکار دو عالم ﷺ کی صحبت پاکؐ میں بیٹھنے کی سعادت یا زیارت نصیب ہو تو وہ صحابی ؓ ہے۔ یہ نظرِ کرم کا اعجاز ہے۔ اقبالؒ ہی کا کہنا ہے کہ

خرد نے کہہ بھی دیا، لا الہ تو کیا حاصل ؟
دل و نگاہ مسلمان نہیں، تو کچھ بھی نہیں

مطالعہ قرآن و حدیث بلاشبہ پاکیزہ ذوق اور بہترین مطالعہ ہے مگر مراحل مطالعہ کا جذب و شوق تو اور ہی چیز ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے اسے اپنے فارسی کلام میں بے حد وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

دین مجو اندر کتب، اے بے خبر
علم و حکمت از کتاب دین از نظر

اس کا ترجمہ حضرت علامہؒ ہی کے ہم عصر اور مخلص و مہربان لسان العصر اکبرالہ آبادی نے فرمایا۔

نہ کتابوں سے، نہ کالج سے، نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اسی کو مولانا رومؒ نے اپنے انداز میں لکھا ہے کہ آخر کار وہ اقبالؒ کے مرشدِ معنوی بھی ہیں کہ

گر تو سنگ خارا و مرمر شوی
چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

اگر تو پتھر دل ہے اور سراسر ہی پتھر ہے تو تو جا کسی صاحب دل تک پہنچ تا کہ تو گوہر اور موتی بن جائے

ع نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبالؒ کی زبان میں اس صحبت پاک اور نگاہِ پاک کیلئے ارشاد یہ ہے کہ

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستاں کاملے

اپنی مٹھی بر خاک کو کیمیا صفت بنا لے، جا کسی کامل مرد کے آستاں کو بوسہ دے۔

انہیں کا اُردو ترجمہ یہ ہے کہ

نہ تاج و تخت میں، نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

وجہ مختصراً یہ کہ

ع کامل مرد محمد بخشا تے لعل بنان پتھر دا
(میاں محمد بخشؒ، کھڑی شریف)

یہ بات شاید بعض طبیعتوں کو نئی معلوم ہو، لیکن حقیقت اس سے مختلف نہیں کہ علامہ اقبالؒ اسی فقر کے سلسلہ قادریہ میں باقاعدہ بیعت تھے اور اس بات میں بھی کوئی ابہام نہیں کہ علامہ اقبالؒ کے والد شیخ نور محمدؒ خود بھی سلسلہ قادریہ ہی میں باقاعدہ بیعت اور خلیفہ مجاز تھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے سید سلیمان ندوی اور بعد ازاں پروفیسر طاہر فاروقی نے سیرت اقبالؒ میں اس امر کا باقاعدہ کھوج لگایا، تذکرہ کیا اور بالآخر انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ دانائے راز اقبالؒ خود فقر کے داعی بھی ہیں اور راہی بھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''عرصہ تک اس امر کا کسی کو علم نہ تھا کہ علامہ کسی سلسلۂ تصوف سے وابستہ بھی تھے یا نہیں، عام طور پر خیال کیا گیا تھا کہ مرحوم ایسی کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے لیکن سب سے پہلے اس راز کی عقدہ کشائی امیر ملت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری (جو خود بھی سلسلہ نقشبندیہ کے نامور بزرگ تھے) نے ۱۹۳۵ء میں فرمائی تھی۔ حضرت نے ارشاد کیا کہ

''اقبالؒ نے رازداری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے والد محترم سے بیعت ہوں' حضرت فرماتے ہیں کہ

''اقبالؒ کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت سالک درویش آیا کرتے تھے وہ انہیں سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا۔''(۲۷)

مکاتیب اقبال کے خط نمبر ۳۵ میں جو مولانا سلیمان ندوی کے نام ہے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ

''یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔''

جبکہ مولانا ندوی لکھتے ہیں کہ

''اقبال اگر اکابرِ تصوف کو نہ مانتے تو مولانا رومؒ کے گرویدہ کیوں ہوتے۔ وہ قادریہ خاندان میں مرید تھے۔''(۲۸)

یہاں تک کہ علامہ اقبالؒ خود، سید نذیر نیازی کو ایک خط میں تصوف کی حقیقت کا پتہ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

لاہور ۴ جون ۱۹۲۹ء

جناب نیازی صاحب۔السلام علیکم!

تصوف لکھنے پڑھنے کی چیز نہیں، کرنے کی چیز ہے۔(۲۹)

یہاں تک کہ اسرار خودی کی طباعت واشاعت کے بعد مسئلہ وحدۃ الوجود پر خواجہ حسن نظامیؒ کے اختلاف پر اظہار کرتے ہوئے مولانا شاہ سلیمان پھلواری کو ۹ مارچ ۱۹۱۶ء میں اپنے ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ

''حقیقی اسلامی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہوسکتا ہوں کہ خود سلسلہ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔''(۳۰)

ان کا یہ کہنا بے معنی تو نہیں کہ

بیا بہ مجلس اقبال یک دو ساغر کش
اگر چہ سر تراشد، قلندری داند

آ اقبالؒ کی محفل میں آ بیٹھ اور ساغر عشق وفقر کے جام پی اس نے ظاہری شکل تو نہیں بنائی مگر حقیقتاً وہ تو قلندر ہے۔

مزید فرماتے ہیں

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے

یہ بات طے ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ آپ اور ان کے والد بزرگوار شیخ نور محمد دونوں سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے مگر وہ کون مجذوب صفت سالک درویش تھے جن کی صحبت نے فیضانِ رسالتؐ سے انہیں مالا مال کیا۔وہ سائیں عبداللہ شاہ تھے کہ اسی صحبت پاکؒ اور نگاہ پاکؒ کی خلوتوں اور جلوتوں کا کمال، کلام اقبالؒ اور پیامِ اقبال ہے۔فقرو دین اور عشق و مستی کے بارے میں ہی کیا خود خلوت وجلوت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی ﷺ

خودی بذات خود روحانی شخصیت کا دوسرا نام ہی نہیں، حقیقی مقام بھی ہے جسے خود انہوں نے شعور کا نوری نکتہ لکھا ہے۔حضرت علامہؒ کے حقیقی بھانجے ڈاکٹر نظیر صوفی نے اس حقیقت سے اب پردہ اٹھایا ہے کہ ان کے نانا شیخ نور محمدؒ (عرف میاں جی نتھو) سیالکوٹ ہی کے مجذوب سالک بزرگ سائیں عبداللہ شاہ قادریؒ کے مرید و مراد تھے۔اپنے ایک مضمون میں انہوں نے بتایا ہے کہ

''علامہ کے والد شیخ نور محمد عرف میاں جی نتھو سیالکوٹ کے مجذوب سالک سائیں عبداللہ قادری کے

مرید و مراد تھے۔" (۳۱)

یہی تصدیق و تحقیق سیالکوٹ ہی کے پروفیسر وارث میر مرحوم کی بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے والد ماجد سلسلہ قادریہ ہی سے منسلک تھے۔ ان کے مرشد حضرت عبداللہ شاہ قادریؒ، گوجرانوالہ کے ایک بزرگ حضرت خواجہ محمد عمر بخش قادریؒ کے خلیفہ اول تھے۔ اقبالؒ کے والد شیخ نور محمد، حضرت خواجہ عمر بخش قادری کو ماہ محرم میں سیالکوٹ لے جایا کرتے تھے اور گاہے گاہے گوجرانوالہ بھی خود ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے" (۳۲)

حضرت علامہ اقبالؒ کے والد شیخ نور محمدؒ حضرت سائیں عبداللہ شاہ قادریؒ سیالکوٹی سے سلسلہ قادریہ میں باقاعدہ بیعت تھے۔

یہاں تک کہ علامہ اقبال کی رسم بسم اللہ کا تذکرہ بھی سامنے آیا ہے جس سے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کی عقیدت و ارادت کے سرچشمے کا اعجاز و آغاز فقر کا سلسلہ قادریہ ہے۔ پروفیسر اقبال جاوید نے اپنے ایک مضمون "پروفیسر صوفی محبوب الٰہی کی یاد میں" میں انکشاف کیا ہے کہ

"حضرت خواجہ محمد عمر بخش قادری نے ہی ننھے اقبال کو بسم اللہ پڑھوائی تھی اور اپنا لعاب اس کی زبان پر لگایا تھا۔ نتیجہ معلوم کہ ننھا اقبالؒ حکیم الامت بن گیا۔" (۳۳)

اس حوالے سے ڈاکٹر نظیر صوفی اس طرح روایت کرتے ہیں کہ

"صحیح روایت ہے کہ علامہ اقبالؒ جس وقت چار برس کے تھے تو حضرت خواجہ محمد عمر بخشؒ اپنے خلیفہ سائیں عبداللہ شاہ قادریؒ کو ملنے سیالکوٹ تشریف لائے۔ میاں جی (اقبالؒ کے والد) نے اپنے دادا پیر کی دعوت کی اور اقبالؒ کو اپنے مرشد کے توسط سے بسم اللہ کیلئے دادا پیر کی گود میں بٹھایا، جنہوں نے میاں جی کی استدعا پر اپنے مرشد (حضرت خواجہ محمد عمر قادریؒ) سے عرض کی تو انہوں نے مسکرا کر اپنا لعاب دہن اقبالؒ کے منہ میں لگا کر بسم اللہ پڑھوائی۔ ان ہر دو بزرگوں کی تقدیر ساز توجہ اور اپنے والد گرامی کی دعاؤں ہی سے علامہ حکیم الامت بنے۔" (۳۴)

حضرت علامہ اقبالؒ کے والد کے مرشد سائیں عبداللہ قادریؒ کا مزار اڈا پسروریاں، سیالکوٹ (نزد لیڈی اینڈرسن ہائی سکول) واقع ہے۔ جبکہ ان کے مرشد غوث العصر حضرت خواجہ محمد عمر عباسی قادریؒ کا مزار صوفی محمد جمال اللہ روڈ (بازار خراداں) گوجرانوالہ میں مرجع خلائق ہے۔ فقر کے اس سلسلے قادریہ کا اگر شجرہ مبارک دیکھیں تو حضور ﷺ کے فیض پاک کی یہ کرنیں اس طرح سے جلوہ گر ہیں

شجرِ طیبہ سلسلۂ عالیہ قادریہ طرطوسیہ

۱۔ حضور سرکارِ دو عالم ﷺ
۲۔ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ
۳۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ
۴۔ حضرت خواجہ عجمی رحمتہ اللہ علیہ
۵۔ حضرت شیخ ابوداؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ
۶۔ حضرت خواجہ معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ
۷۔ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ
۸۔ حضرت خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ
۹۔ حضرت شیخ شبلی رحمتہ اللہ علیہ (دادا مرشد حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ)
۱۰۔ شیخ عبدالواحد یمنی رحمتہ اللہ علیہ
۱۱۔ حضرت شیخ ابوالفرح طرطوسیار رحمتہ اللہ علیہ
۱۲۔ حضرت شیخ ہنکاری حسن رحمتہ اللہ علیہ
۱۳۔ حضرت شیخ ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ
۱۴۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ
۱۵۔ حضرت شیخ عبدالرزاق رحمتہ اللہ علیہ
۱۶۔ حضرت خواجہ حسن علی قرشی رحمتہ اللہ علیہ
۱۷۔ حضرت شیخ حفص ابوبکر رحمتہ اللہ علیہ
۱۸۔ حضرت شاہ سلیمان رحمتہ اللہ علیہ
۱۹۔ حضرت شیخ ابوداؤد رحمتہ اللہ علیہ
۲۰۔ حضرت خواجہ ابوبکر رحمتہ اللہ علیہ
۲۱۔ حضرت شیخ موسیٰ ختلی رحمتہ اللہ علیہ
۲۲۔ حضرت شیخ ابوالقاسم رحمتہ اللہ علیہ
۲۳۔ حضرت سید عابد رحمتہ اللہ علیہ
۲۴۔ حضرت سید احمد ولی رحمتہ اللہ علیہ

۲۵۔ حضرت خواجہ خضر ابدال رحمۃ اللہ علیہ

۲۶۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ

۲۷۔ حضرت شاہ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ

۲۸۔ حضرت خواجہ شاہ جمال رحمۃ اللہ علیہ

۲۹۔ حضرت خواجہ عبدالکریم رحمۃ اللہ علیہ

۳۰۔ حضرت خواجہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ

۳۱۔ حضرت خواجہ شیر محمد رحمۃ اللہ علیہ

۳۲۔ حضرت شاہ فیض محمد رحمۃ اللہ علیہ

۳۳۔ حضرت خواجہ نور احمد رحمۃ اللہ علیہ

۳۴۔ حضرت سخی احمد یار رحمۃ اللہ علیہ

۳۵۔ حضرت خواجہ محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ

۳۶۔ حضرت سائیں عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ

۳۷۔ (والد اقبالؒ) حضرت شیخ نور محمد رحمۃ اللہ علیہ

۳۸۔ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (۳۵)

یہ حضرت خضر ابدال بیابانیؒ ہی حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے مرشدِ پاک ہیں جو فقر کے سلسلہ قادریہ کے اس برعظیم پاک و ہند میں پہلے ہندی النسل بزرگ ہیں جبکہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؓ کی اولاد میں شیخ عبدالرزاق سے برعظیم پاک و ہند میں گیلانی سید فاضلی اور سروری قادری دوسرا تسلسل ہے جو اس برعظیم کے قادریہ فقرہ کا سلسلہ (Order) ہے۔ حضرت خضر ابدالؒ ہی وہ بزرگ ہیں جن سے درود خضری منسوب اور معروف ہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ جہاں اُردو، فارسی کلام میں دین وفقر کے ترجمان اور صحیح تر الفاظ میں حیات و کائنات کے ترجمانِ حقیقت ہیں، وہیں پنجابی زبان کے تمام صوفی اور عارف بھی سلسلہ قادریہ ہی کا صاحب اظہار گروہ ہے جس میں شاہ حسینؒ، (باغبانپورہ، لاہور) حضرت بابا بلھے شاہؒ (قصور) حضرت وارث شاہؒ (جنڈیالہ شیر خان ضلع شیخوپورہ) حضرت سلطان باہوؒ (گڑھ مہاراجہ ضلع جھنگ) اور حضرت میاں محمد بخشؒ (کھڑی شریف ضلع میر پور آزاد کشمیر) تمام فقراء کے اسی سلسلہ قادریہ کے فقیر ہیں البتہ فقر کے سلسلہ چشتیہ میں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ (پاک پتن) کے بعد سرائیکی لہجے کے حضرت خواجہ غلام فرید (کوٹ مٹھن) کا کلام بھی کمال ہے بلکہ کرم ہے۔ اُردو پنجابی اور فارسی زبان میں عارفانہ کلام کو بھی ایک نظر دیکھیں تو عشق کے دردمندوں کا پیغام ایک سا ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
(اقبالؒ)

ایہہ دل رب سوہنے دا حجرہ
تے وچ پا فقرا، جھاتی ہو
تے نہ کر منتاں خواجہ خضرؑ دیاں
تیرے اندر آب حیاتی ہو
(حضرت سلطان باہوؒ)

نہ رب تیرتھ نہ رب مکے
میری بکل دے وچ چور
(حضرت بلھے شاہؒ)

مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے
ڈھا دے جو کجھ ڈھیندا
اک بندیاں دا دل نہ ڈھاویں
رب دلاں وچ رہندا
(میاں محمد بخشؒ)

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
(اقبالؒ)

چل بلھیا ہن اوتھے چلیے جتھے ہوون سارے انّے
نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے نہ کوئی سانوں منّے
(حضرت بلھے شاہؒ)

غرض کہ زبان اپنی اپنی، کلام اپنا اپنا مگر پیغام ایک سا ہے۔ بلاشبہ بقول اقبالؒ

عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

اکیسویں صدی اور اقبالؒ

ع   مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو

حضرت علامہ اقبالؒ بیسوی صدی ہی نہیں اکیسویں صدی کے بھی ترجمان حقیقت ہیں۔ تا حال علم وعرفان کی دنیا میں تنہا اقبالؒ ہیں جو انسانیت کو راہ ہدایت کیلئے پکار رہے ہیں۔ اقبال خود کہنے کو تو یہ بھی کہتے ہے کہ

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام

اور کبھی یہ رنگ بھی ہے کہ

رندوں سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

کبھی یہ رنگِ تکلم بھی کہ

شریعت کیوں گریباں گیر ہو، ذوق تکلم کی
چُھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

یہ دین وفقر کا راز ونیاز ہے جسے ان کی فکر کا تضاد نہیں، تنوع کہیں گے۔ انہوں نے اپنی روحانی زندگی کے احساس کو اشعار وافکار کے جس قرینے میں سجایا ہے اس سے زندگی کا اپنا داخلی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ جہاں تک ان کے علو فکر (Elegant Thought) کا تعلق ہے تو وہ محض صوفیانہ ترفع (Ascension) ہی نہیں حقیقت کا واشگاف اظہار ہے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ توحید ورسالت ﷺ بلکہ ختم نبوت پر ایقان کے سرچشمے ان کے ابلاغ واظہار کا شعری جامہ ہے بلکہ فکری اثاثہ (Essence) ہے۔ اُردو کے نامور نقاد اور استاد ڈاکٹر سید عبداللہ نے سچ لکھا ہے کہ

”دبستان اقبالؒ کا فرض ہونا چاہیے کہ فکرِ اقبالؒ کی بنیاد پر ایک فکری اور سیاسی تحریک اٹھائیں۔ اقبالؒ نے جو کام پاکستان سے شروع کیا اس کی انتہا سارے ایشیاء کے اسلامی انقلاب سے جا ملتی ہے۔ کم ہمتی کی حد یہ ہے کہ اقبالؒ کی تحریک کا بوجھ پاکستان کے اندر بھی اب اٹھانا مشکل ہو رہا ہے حالانکہ اسے آگے بڑھ کر سارے ایشیاء میں پھیل جانا چاہیے تھا۔“ (۳۶)

اولاً:۔ یہی بات اُردو کے نامور ادیب اور خطیب آغا شورش کاشمیری کا تجزیہ بھی ہے کہ

”بے شک اقبال کی نظریاتی آواز نے پاکستان کی نیو رکھی۔ وہ پاکستان میں پیدا ہوئے اور پاکستان میں ہی دفن ہیں۔ یہ معمولی شرف نہیں کہ پاکستان ان کا مولد بھی ہے اور مدفن بھی، یہاں ان کے افکار کی روح مقابلۃً نہایت قومی اثر رکھتی ہے۔ لیکن داعی شخصیتیں جن کا پیغام عصری ہوتا ہے مقامی کی بجائے بین الاقوامی ہوتی ہیں۔ ان کا مشن عالمی ہوتا ہے۔ اقبالؒ کو ہم پاکستان کیلئے مخصوص کر لیں تو مطلب ہو گا کہ اُس کو محصور کر رہے ہیں۔ حالانکہ بنیادی طور پر وہ ایک عالمی شاعر اور اسلامی مفکر

ہیں۔جس کے مخاطب مسلمان اور ان کی وساطت سے پورا مشرق ہے۔"(۳۷)

ثانیاً:۔ان کا یہ کہنا بھی سچ ہے کہ

"آج کے انسان کا شعور جاگ اٹھا ہے۔وہ جغرافیائی حدوں کی تقسیم کے باوجود عالمی انسان ہے۔
اس کی حکمرانی کے سانچے عالمی نہ سہی لیکن ان کے فکری سانچے بہر حال عالمی ہیں۔"(۳۸)

اقبالؒ کا کلام اور پیغام اُردو کے علاوہ فارسی زبان میں ہے یہ اسی کی برکت ہے کہ معاصر ایران کے مفکر انقلاب ڈاکٹر علی شریعتی حضرت علامہؒ ہی کے خوشہ چین ہیں بلکہ "ما و اقبال" (ہم اور اقبال) نامی کتاب ان کی سپاس گذاری ہی نہیں انقلاب آفرینی کا منبع ہے جبکہ نو آزاد روسی مسلم ریاستوں میں آج پیام اقبالؒ گونج رہا ہے۔اب تو پورے عرب کو بھی اقبالؒ شناس کہنے میں کوئی حرج نہیں۔یعنی اقبالؒ

عجم کی ژرف نگاہی عرب کی دانائی

تک متعارف ہیں بلکہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، علی میاں کی عربی کتاب روائع اقبالؒ (نقوش اقبالؒ) کے تعارف کے بعد عالم عرب کے بیس ممالک کے بیس کروڑ مسلمانوں میں اقبالؒ کے معارف تک کا تختہ چمن کھل اٹھا ہے۔تاریخ اور تحقیق کے نامور استاد احمد حسن الزیات کا یہ معارف اقبال کیا جملہ ہے "فاذا كان حسان شاعر الرسول فان اقبال شاعر الرسال و اذا كان لحسان من نازعه شرف الا دفاع عن محمد فليس لا قبال من نازعه شرف الدفاع عن المحمدية" کہ اگر حضرت حسان بن ثابتؓ شاعر رسول ﷺ ہیں تو اقبال شاعر رسالت ﷺ ہیں۔حضرت حسانؓ کا شرف دوسرے صحابہ کرام سمیت حضور ﷺ کا دفاع ہے۔مگر اقبال کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ دفاع امت محمد ﷺ کے محاذ پر تنہا کھڑے ہیں اور کوئی ان کا ہمسر ہے ہی نہیں۔"(۳۹)

علاوہ ازیں عرب ادیب، صحافی، سیرت نگار ڈاکٹر طٰہٰ حسین، مصر میں اقبال شناس ڈاکٹر حسین مجیب مصری اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (پاکستان میں سابق مصری سفیر اور کلام اقبال کو منظوم عربی زبان میں پیش کرنے والے پہلے محب اقبال) کے علاوہ کتنے ہی عرب مصنفین اور اہل علم ہیں جن کے نوک قلم پر اقبالؒ کے افکار و اشعار نے حُدی خوانی کا سا ماحول گرما دیا۔

اُردو کے نامور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کا بڑا جامع جملہ ہے کہ

"اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے جو ایک نامعلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا۔"(۴۰)

مگر ماحول کی طرفگی اور مسائل کی اہمیت مشرق و مغرب سے کہیں بڑھ کر عالمی اور عالمگیری صورت اختیار کر گئی ہے۔بنی نوع انسان کو اب اقبالؒ کے ہاں سے اخوت کی جہانگیری اور محبت فاتح عالم کے افکار ہی نہیں شعار لیکر دنیا کو امن و سلامتی اور احترام انسانیت تک لانا ہوگا کہ یہی دین و فقر کی راہ اور اقبالؒ کا حاصلِ حیات ہے۔ویسے بھی پنجابی زبان کے معروف صوفی

شاعر وارث شاہؒ کا کہنا بھی یہی کہ

فقر کُل جہاں دا آسرا اے

''پیامِ مشرق'' اور ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق'' کی تہہ میں مغرب کے فکری غلبہ و استیلا کے خمار کو اتار کر، عالمی سطح پر اقبالؒ احترامِ آدمیت کا علم بلند کیے دیتے ہیں۔ وہ مشرق و مغرب میں ہی کیا پوری انسانیت کیلئے فکری روش اور عروجِ آدمیت کا اجالا ہیں۔ اس لئے وہ خود اس امر کے علمبردار ہیں کہ

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

انسانیت کی حیاتِ نو کیلئے پیامِ اقبال ایک موثر منشور اور فکری دستور ہے۔ اس میں اشعار و افکارِ اقبال ہر درجہ رہنما ہیں۔ ان کے ارشادات کا فکری بہاؤ دراصل الہامی لہریں (Touching Verses) ہیں اور تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) ہیں جو ان کے انگریزی خطبات کا عنوان ہے۔ یہ دراصل نوعِ بشر کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی، نور اور اجالے میں لے آتا ہے۔ بلاشبہ خطباتِ کو عرفانِ انسانیت کی صبح نو یا آدم کی سویر کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ بلکہ ارشاد فرمایا کہ

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

تہذیبِ مغرب نے اکیسویں صدی میں انسانیت کو جو کچھ دیا ہے اس میں

اولاً: ایٹمی موت کا خوف

ثانیاً: معاشی موت کا ڈر اور

ثالثاً: ابلیسی ہتھکنڈہ اور مایوسی کا پھیلاؤ، اشاعتی نظریات و افکار گویا اکیسویں صدی کا عالمی منظرنامہ ہے۔

اس کی عملی صورت ایٹمی اسلحہ اور میزائل کے انبار، ورلڈ بنک اور عالمی مالیاتی ادارے اس کے معاشی جال کے بعد اب سموئل ھنٹنگٹن کی کتاب ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' اور فوکویاما کی کتاب ''تاریخ کا خاتمہ'' بلکہ برزنسکی کی ''شطرنج کی بساطِ عظیم'' انسانیت کو جیتے جی مارنے کا فکری پلندہ ہیں۔ صاف کہنا پڑے گا کہ مغرب کی قوم پرستی اور بالادستی کا الاؤ اور عارضہ ہی درپیش عالمی صورت حال کا براہ راست ذمہ دار ہے۔ اقبال ہی کے بقول

چہرہ روشن، اندرون چنگیز سے تاریک تر

مشرق و مغرب یا شمال و جنوب کے معاشی زاویے دراصل سامراجی زائچے ہیں۔ بین المذاہب مکالمہ (The Inter-Faith Dialogue) سرِ آغاز۔ ان کا ایک جملہ ہے جو ہسپانیہ سے تعلیم و تہذیب لئے فرانس اور اٹلی کی

جغرافیائی تکون کا ایک پل بن چکا ہے جو تہذیبوں کا ٹکراؤ نہیں نہ ہی تاریخ کا خاتمہ ہے بلکہ تہذیبوں کا ملاپ ہے، جذب ہے، تاریخ کا سفر ہے۔ انسان کی بساط شطرنج نہیں، حقیقتاً بساطِ علم وفن ہے۔ اس کی بنیاد و نہاد روسی مصنف کا شطرنج کا کھیل (The Grand Chess Board) نہیں تاریخ کی شاہراہ کارواں دواں سفر اور روشنی ہے۔ یہ خاتمہ تاریخ (The End of History) کہاں ہے، صبح تہذیب کا گجر ہے۔ اسے تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilizations) بتانا تو استعماری حکمت عملی کا فکری نمونہ ہے انسانیت کیلئے پیام موت کا خوف بھی ہے اور استدلال بھی۔ مگر اقبالؒ کے ہاں تہذیبوں کا ملاپ اس کی رواں تاریخ اور اجالے کا سفر اس حقیقت کا غماض ہے کہ فرمایا کہ

''مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔'' (۴۱)

وجہ تاریخی ہی نہیں، علمی بھی اور انسانی بھی ہے کہ علم و عرفان گواہی دیتے ہیں کہ انسانی فکر روبہ پرواز ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے تہذیبوں کا جذب و جدل بھی کہیں تو یہ انسانی تاریخ کا لازمہ ہے جبکہ

مغرب کی روح جدید

''مغرب کی جدید روح کی تشکیل ہسپانیہ میں ہوئی ہے اور یہ بات غلط نہیں کہ مغربی احیاء علوم کا آغاز اٹلی سے نہیں بلکہ سپین سے ہوا ہے۔''

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ

''مغرب اپنے احیاء کیلئے بڑی حد تک اسلام کی فطری قوت استعداد کا منت دار ہے۔ مغرب میں احیاء کا یہ دور بجا طور پر نشاۃ ثانیہ کہلاتا ہے۔'' (۴۲)

انگریزی زبان میں یہ خطبات (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیلِ نو، جسے وہ خود تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کا نام دیتے ہیں کا درحقیقت مدعا بنی نوع انسان ہی کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید ہے جس میں مادیت کے بُت کے آگے سجدہ ریز ہونے سے بچانے کا اہتمام کیا گیا ہے اور یہی مذاہب عالم کا روحانی جہان اور فکری میدان ہے۔ اس ضمن میں کلام اقبال یعنی اُردو اور فارسی کلیات دونوں کلیدِ حیات ہیں۔ اثر آفرینی کے اعتبار سے اُردو زبان کو تو اس قدر نوازا گیا ہے کہ زندگی کے حقائق کا اظہار و ابلاغ بڑے جامع اور موثر پیرائے کے ساتھ اس میں ہوسکتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ

''اُردو زبان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ترقی یافتہ نہ سہی، انسانی جذبات اور احساسات کے اظہار میں آج بھی نہایت طاقتور زبان ہے۔'' (۴۳)

اقبال نے تو حقیقتاً زندگی کی شاہراہ عظیم بلکہ صراط مستقیم کھول دی ہے اور فرمایا کہ

دین، مسلکِ زندگی کی تقویم
دین سرِّ محمد ﷺ و ابراہیم علیہ السلام

کہ دین زندگی (Life) ہے جبکہ شریعتیں تو (Laws) ہیں۔ ویسے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کیا خود حضور سرکار دو عالم ﷺ کے جدِّ امجد ہیں۔ ابـــاک ابـــراھیـــم (تیرے باپ ابراہیم) کے الفاظ زینت قرآن ہیں۔ اقبالؒ تو کب سے اس مادیت کے مارے عالم میں اذان دے رہے ہیں کہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

تمام مذاہب عالم کی بنیاد، ذات باری الہ پر ایمان ہے اور نبیوں اور رسولوں پر ایمان کے علاوہ ان کی لائی ہوئی شریعتوں پر ایمان ہے۔ یہود و نصاریٰ خود انبیائے بنی اسرائیل کا ترکہ اور تسلسل ہے۔ مگر ابتلاءِ زمانہ نے مذہب کو مذہبیوں کی اجارہ داری میں دے کر مادی جہاں کے عیش و آرام کو دوام زندگی سمجھ لیا ہے۔ اسی وجہ سے ہی بین الاقوامی بساط سیاست (International Politics) اور پھر بین الاقوامی تعلقات (International Relations) کا تانا بانا، مادی اور مفاداتی غلبہ یا سرمایہ و سود دراصل غریب و پس ماندہ ممالک اور اقدام کی دریوزہ گری اور گداگری کا رواج نہیں احتیاج ہے۔ جسے سفارتی آداب، کاروباری مفاہمتوں اور انسانیت نوازی کے خوبصورت عنوانوں کے جلو میں سجا کر دیگر بنی نوع انسان کی معاشی مت مارنے کا عالمی نظام ہے۔ جسے انگریزی زبان میں اب نیا لباس پہنایا گیا ہے۔ اب اسے (The New World Order) کا نام دیا گیا ہے۔ ایٹمی کلب، سرمایہ کے نظام (I.M.F) کے بعد اب فکری محاذ پر مایوسی کا پھیلاؤ گویا ایک سپر پاور کے دوام کا شیئر بازار بن گیا ہے بلکہ بندوبست دوامی ہے۔ اس مادی غلبے اور انسانیت کی غلامی کے ماحول میں صورت حال کا حل فطری طریقہ اور تدارک فکرِ حسین اور کلامِ متین ہے جو مکالمہ بین المذاہب (Intera-Faith Dialogue) کی تدبیر و تدبر کا متقاضی ہے جس کی شمع کلام و پیامِ اقبال ہے جو کام آ سکتا ہے، کام دے سکتا ہے بلکہ فکر و وجدان کی دنیا میں وہ پہلے ہی مصروف عمل ہے، اذہان و قلوب کے معرکے میں وہ پہلے ہی مصروف معرکہ ہے کہ

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ

وحدتِ بنی آدم اور مساوات انسانی ہی تو تمام مذاہب عالم کا بنیادی نکتہ ہے۔ اسی نوری نکتے کی تفہیم زندگی کے مسلک کی تقدیم ہے جو محمد ﷺ و ابراہیم علیہ السلام کا پیغام ہے، جو اسلام ہے، اس کائنات ارضی میں اس کا محور و مرکز یروشلم ہے جہاں عالم عیسائیت و یہودیت ہی کیا بلکہ اسلام بھی یکجا ہیں۔ تو مکالمہ بین المذاہب (Intera-Faith Dialogue) کے فکر و نظر کا یروشلم

بلکہ بیت المقدس تنہا اور خالی کیوں پڑا ہے۔ پاکستان اقبالؒ کے فیض کا دوسرا نام ہے۔ اس کے چنے ہوئے قائد جناحؒ کے بعد یہاں کوئی بھی ڈھنگ کی قیادت آئی ہی نہیں۔ یہاں تو قیادت کا دوسرا نام اقتدار کی رہنمائی ہو گیا ہے۔ اذانِ خلیل علیہ السلام کے اس مقصد کیلئے اقبالؒ نے پہلے ہی مطلع کر دیا ہے کہ

قسمت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے

حاصل کلام یہ کہ اقبالؒ نے برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کے دینی تشخص اور ملی تحفظ کیلئے ایک مسلم مملکت کے قیام کا نہ صرف نظریہ پیش کیا بلکہ اس مقصد کے حصول کی خاطر اس کے شایانِ شان ایک ایسا قائد بھی چنا جو بالآخر ۱۰ سال کے ہنگامہ روز و شب کے بعد یہ منزل اور مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو کے رہا۔ پاکستان کا جغرافیائی وجود انہی نظریاتی شہود کا شہکار ہے جو فی الواقعہ اقبالؒ ہی کے پیغام و الہام کا اعجاز و اظہار بھی ہے کہ

ع خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی ﷺ

حقیقتاً اسلام بطور سوسائٹی حضور سرکار دو عالم ﷺ کی ذات اطہر کا مرہون منت ہے۔ اور یہی الٰہی فیض و فیضان کے مقدس ادارے نبوت کا حتمی عطیہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور خاتم ﷺ تک انسانی تاریخ اور الہامی تحریک اپنی جامعیت کے ساتھ ختم نبوت کے تصورِ کاملیت اور اسلام کے بطور دین، بلکہ الدین (The Way of Life) پسند کیے جانے کا بھی حتمی اعلان ہے اور یہی رحمت اللعالمینی ﷺ ہے جو تا قیامت اس کرہ ارض پر جلوہ فگن ہے۔ اقبالؒ کے افکار و اشعار اسی انسانِ کامل ﷺ کے تصور و تخیل ہی کا ابلاغ نہیں بلکہ ان کے عشق کا اظہار ہے جبکہ اکیسویں صدی میں ایٹمی اسلحہ کے خوف، معاشی بدحالی کی بھوک اور مایوسی کے ابلیسی ہتھکنڈوں کے تصنیفی جال گویا تاریخ کا خاتمہ یا تہذیبوں کا ٹکراؤ ہو کر بنی نوع انسان کی بے چینی کا داخلی سبب اور خارجی ماحول ہے اور یہی عالمی ماحول کا استعماری حربہ اور اشتہاری بازار ہے۔ دورِ حاضر کے اس سلگتے جہنم کو گلزار بنانے کیلئے جہانِ نو پیدا کرنا ہوگا۔ اقبال ہی کا فرمان ہے۔

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اقبال ہمارے عہد کے بہترین شارح اسلام ہیں اور یہ الفاظ حضرت قائداعظمؒ ہی کے ہیں۔ اسلامی انقلاب ایران کے مفکر ڈاکٹر علی شریعتی نے بجا طور پر کہا ہے کہ

بیسویں صدی میں اسلام کی حقانیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اقبالؒ جیسا عظیم مفکر عالم اسلام میں پیدا ہو جاتا ہے۔" (ما و اقبالؒ از ڈاکٹر علی شریعتی)

فی الجملہ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ عالم نو کی روحانی ضرورت اور انسانی کے تاریخی مطالبات (Response)

میں کلام اقبالؒ ایک پیکرِ محسوس بنکر اُبھرا ہے۔تہذیبوں کے جذب وجدل میں مکالمہ بین المذاہب کا سرآغاز ان کے انگریزی خطبات (The Reconstruction of Religious Thought in Islam)(اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو) سے ہوسکتا ہے۔جس کی ابتدائی جلوہ گاہ، ان کا بتایا اور بنایا ہوا ملک پاکستان ہے جس کی روحانی قوت اور باطنی طاقت کلمہ طیبہ کا جلال و جمال ہے جو لازوال ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں خود پاکستان کا اپنا کردار قائداعظم ہے۔یہی پاکستان اقبالؒ کی آرزوؤں کا وطن ہے جو اسلام کا دیس ہے۔

اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ﷺ ہے

پاکستان کے قیام اور قائد کے فرمان کو یکجا کریں تو یہ اسلام کی تجربہ گاہ اور اسلام کا قلعہ قرار پاتا ہے جس کی ارض پاک میں آسودہ خاک اقبالؒ ہے جو بلالؓ شرق ہے اور اس دُعا کے ساتھ روزِ محشر تک محوخواب ہے کہ

خدایا! آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے
(اقبالؒ)

اسلامیانِ ہند، اور ہندو سیاست

مسلمان برعظیم میں کم وبیش ایک ہزار برس تک حکمران رہے اور بالآخر برطانوی سامراج سے شکست کھا گئے جو یہاں پر ایک تاجر کے روپ میں وارد ہوئے تھے اور اپنی خانہ ساز سازشوں کے باعث برعظیم کے تاجور بن بیٹھے۔یہاں پر قابض ہونے کے بعد انہوں نے اس امر کی منظم، مربوط اور مسلسل کوششیں کیں کہ مسلمانوں کو ہر لحاظ سے کمزور کر کے رکھ دیا جائے۔ نتیجۃً ان پر تمام سرکاری اداروں کے دروازے یکے بعد دیگرے بند کردیئے گئے اور انہیں زندگی کے ہر شعبہ میں غیر موثر بنا کر رکھ دیا گیا۔

انگریز مسلمانوں کو اپنا اصل حریف سمجھتے تھے، مقامی آبادی سے انہوں نے ہندوؤں کو بطور حلیف ساتھ ملایا اور مسلمانوں کو پیچھے دھکیل کر ہندوؤں کو پوری قوت سے اوپر اٹھایا تاکہ مسلمان انگریز اور ہندو کی دوھری غلامی میں مبتلا ہو جائیں۔

ہندو اور مسلمان چونکہ دو الگ مذاہب کے پیرو اور دو الگ تہذیبوں کے علمبردار تھے لہٰذا اپنے اصول حیات، معاشی مفادات نیز سیاسی عزائم اور قومی تصورات کے لحاظ سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے یکسر الگ اور بالکل مختلف تھے اور اس بات کا کوئی سوال اور امکان نہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے تحت رہ کر اپنے نظام زندگی کو قائم کرسکیں گے۔

جبکہ پوری تحریک آزادی میں انڈین نیشنل کانگرس کی جدوجہد کا یہی مقصد اور محور رہا کہ ملک آزاد ہوجائے، انگریز یہاں سے چلے جائیں، اور اکثریت کے جمہوری اصولوں کے نام پر اقتدار ہمیشہ کیلئے ہندو کے ہاتھ لگ جائے، اور وہ اپنی

واضح اکثریت کی بنا پر ہمیشہ مسلمانوں پر حکمرانی کرتے رہیں۔

لیکن مسلمانوں نے ہندوؤں کے اس کھیل کو بخوبی بھانپ لیا اور ان کا قومی موقف بالکل واضح ہو کر سامنے آ گیا کہ ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں آباد ہیں ہندو اور مسلمان۔ آزادی کی صورت ایسی ہونی چاہیے جس میں دونوں قومیں حقیقتاً آزاد ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کیلئے ہندو کی بالادستی اتنی ہی ناقابل قبول تھی جتنی انگریز کی غلامی۔

اس مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ برعظیم میں ایک کی بجائے دو آزاد اور خود مختار مملکتیں قائم ہوں اور جن علاقوں میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے وہاں ایک آزاد اور خود مختار مملکت بنا دی جائے۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی بنیاد یہی دو قومی نظریہ ہے۔

قومیں دین سے بنتی ہیں نہ کہ سرزمین سے، اس جہاں تاب حقیقت کا علمبردار اسلام ہے۔ یہ محض اصول ہی نہیں اس میں سنت رسول ﷺ کا حتمی اظہار و عمل بھی شامل ہے۔ کتاب و سنت کو ہی مآخذ اسلام مانا جاتا ہے۔ خدا کے آخری پیغام، قرآن اور خدا کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی سنت ہر لحاظ سے حتمی اور ختمی حیثیت کی مہر ہے۔ اس سے سرمُو انحراف کی نہ کوئی گنجائش ہے، نہ اجازت ہے۔ دین کے دائرہ کا اقرار و اعلان ہی کلمہ طیبہ،

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے بعد کفر و اسلام کی لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی مرضی کے تابع رہنے کو مومن کہتے ہیں۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، میں ایک ہی جملے میں دین کی حیثیت اور حضور ﷺ کی خاتمیت کا تصور کاملیت یکجا کر دیا ہے، جس سے قوم بنانے کی حتمی بنیاد حضور خاتمی مرتبت ﷺ کا پیغام اور عمل ہے، جس میں نمونہ کامل موجود ہے۔ فرمایا

> ''اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا۔ لیکن بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم ﷺ کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔''

یہی سبب ہے کہ مکۃ المکرمہ میں حضور ﷺ کی بعثت اور اعلان نبوت کے ساتھ ہی یہ دو قومی نظریہ اپنی ملت کی تشکیل اور عمل میں آنا شروع ہو گیا۔ قریش قبیلہ، عربی زبان، رشتے میں چچا، ابولہب اور ابوجہل دونوں مسلمانوں کے مردود ہیں جبکہ حبشہ کا بلال ؓ، فارس کا سلیمان ؓ اور روم کا صہیب ؓ، ملت اسلامیہ کے روشن ستارے ہیں اور رسول خدا ﷺ کے پیارے ہیں یہاں تک کہ ہجرت کا عمل بھی سنت رسول ﷺ کی گواہی بنکر ترک وطن پر دین کو ترجیح دینے کا ہی دوسرا نام ہے۔ مغرب کے نسلی نیشنلزم کے جدید تصورات یا دھرتی پوجا کا بھدا تصور، پیوند خاک ہونے کی حالت ہے۔ جبکہ اعلیٰ ادراک اور آفاقی شعور میں تو وسعت قلب و نظر کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ مسلمان کا شعور ملک و ملت یہ کہہ اٹھتا ہے کہ

ع   ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

ملت اسلامیہ یا مسلم ملت کا دینی شعور تا قیامت جس ذاتِ اطہر ﷺ کے گرد طواف جان کرتا رہے گا وہ ذات رسول ﷺ ہے۔ وہ حتمی اور کامل نمونہ حیات ہیں، نبوت کے الٰہی ادارہ کا فیضان آپ ہی کی ذات اطہر ﷺ پر جا کر تکمیل پذیر ہوا ہے۔ الیوم اکملت لکم دینکم (القرآن) کہ آج کے دن دین کو تم پر مکمل کر دیا گیا ہے اور رب نے انسانوں پر اپنی نعمت بھی تمام کر دی ہے اور خالق کائنات نے اسلام کو بطور دین (The way of Life) پسند کر لیا ہے۔ اور لقد کان فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اور حضور سرکار خاتم النبیین ﷺ تمہارے درمیان بہترین نمونہ ہیں۔ فی الجملہ یہ کہ قوم درحقیقت رسول اکرم ﷺ کے نام پر ایک ساتھ دل دھڑکنے کا نام ہے۔ جن کے دل ایک ساتھ دھڑکیں وہ ایک قوم ہیں۔ یہی دوقومی نظریہ ہے، یہی ملت ہے بلکہ امت بھی کہہ لیں تو بات مکمل ہو جاتی ہے بلکہ ذات بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ ہی نے کہا ہے

ع ہے ترکِ وطن، سنت محبوبِ الٰہی

ہندو سیاست کے تاریخی حربے

مسلم قوم پنپنے نہ پائے، مسلم ملک بننے نہ دیا جائے

برعظیم جنوبی ایشیا میں مسلم ملت کو ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی سے جو سیاسی زوال آیا، تو انگریزی استعمار ہی کیا بارہ صدیوں سے ہم وطن ہندوؤں کی چالیں سوا ہو گئیں۔ مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے اور انہیں معاشی، معاشرتی اور عمرانی سطح پر کچل دینے کی روش، ایک ہمہ جہت سیاسی انقلاب تھا جس کے بہاؤ کی تیزی میں مسلمانوں کے روز و شب بہہ چلے تھے، بہہ چکے تھے۔ ان جانگسل احوال کی صورت کوئی یکا یک نمودار نہ ہوئی تھی کہ مسلمانوں کا بطور مقتدر طبقے کے سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا، بلکہ حقیقت حال یہ تھی کہ فطرت کی تعزیریں، مسلم ملت کے مقتدر کی زنجیریں بن گئیں۔ اسلامی تہذیب کو اس سیاسی زوال نے نتیجہ نے جو کچھ دیا، اس کی مختصر روئیداد یہ تھی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ رقمطراز ہیں۔

> ''اٹھارویں صدی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھن گیا جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی سلطنت متفرق ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی، پھر مرہٹوں، سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا۔ اسکے بعد قضائے الٰہی نے انگریزوں کے حق میں اس ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کر دیا اور ایک صدی کا زمانہ نہ گذرا تھا کہ مسلمان اس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہو گئے، جس پر انہوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔'' (۴۵)

ہوتا ہے جادہ پیا پھر کارواں ہمارا

برعظیم میں مسلم حکومت کے خاتمے کے معا بعد دوقومی نظریہ کے معرکہ دین و وطن میں جس پیکر انقلاب کو ملت اسلامی کی جدید تقاضوں کے مطابق شیرازہ بندی کرنے کی توفیق ملی، اور جس نے تعلیم، ادب، مذہب اور اتحاد و تنظیم بلکہ یقین

کو مسلمانوں کا ماٹو بنا دیا وہ ایک ہی شخص سر سید احمد خانؒ ہے۔

محسن ملت سر سید احمد خانؒ

وہی ہے صاحب امروز، جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا
(اقبالؒ)

برعظیم میں دور جدید کے مسلمانوں کے معمار اولین سر سید احمد خان (۱۸۱۷۔۱۸۹۸ء) خانقاہ شاہ غلام علی نقشبندی مجددی کی فضاؤں کا پالا ہوا شخص تھا، جس کی ہمہ جہت شخصیت نے اپنے جذبہ ملی کو بروئے کار لا کر اسی انقلاب معکوس و مایوس میں مسلم ملت کی راکھ سے ایک جہانِ نو پیدا کیا۔ انگریزی استعمار کی یلغار میں مسلمانوں کا در عمل اپنی بے پناہ جانی، مالی اور عزت و آبرو کی قربانیوں سے اٹا ہوا ہے۔ مگر مستقبل کے افق پر مسلم ملت کا معروضی ماحول ان کے فکر و نظر سے یکسر کٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے یہ کام جس شخص سے لینا تھا وہ لیا۔ اس کے اس کام پر کسی طبقے یا گروہ نے حمایت تو کہاں سراسر مخالفت اپنوں نے کی، بے پناہ، مزاحمت غیروں کی اور شدید ہمت شکنی کی اس برف کو عبور کرنا پڑا کہ جہاں مسلم قوم کا مستقبل منجمد ہو چکا تھا۔

اقبالؒ نے سچ کہا ہے کہ

ع چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

اہل دماغ تو مسلمانوں میں کئی ایک تھے۔ کچھ نے انگریزی سامراج کو یکسر مسترد کر کے اپنے مذہبی مدرسوں میں پناہ لے لی، کئی ایک نہتے ٹکرائے بھی تو جاں سے بھی گئے اور جہاں سے بھی۔ کاسہ لیسوں کا جھاڑ جھنکار ویسے بھی فطرتاً چلتی ہواؤں کا ساتھی ہوتا ہے۔ مگر دماغ مختل نہ ہوں، حواس گم نہ ہوں، تو غصہ اور رد عمل، عقل کو راستہ کہاں دیتے تھے، یہ تو صرف درد دل ہے جو خلوص کو عشق کی دھیمی آنچ میں پگھلاتا ہے، یہ جان جوکھوں اور پتہ ماری کا وہ عمل ہے جو وہی انجام دیتا ہے جسے یہ قوت پروردگار دے۔ یہ تعلیم و تربیت سے کہیں زیادہ نگاہ مومن اور صحبت صالح کا فیضان ہے جو ذرہ کو گوہر کرتا ہے۔ صاف کہنا ہوگا، دہلی کا خانقاہ شاہ غلام علی کی فضاؤں کا پروردہ ایک شخص اٹھا اور اس نے چالیس برس کے قلیل عرصے میں مسلم امت کو پھر روشناس علم کیا۔ انہیں ان کی تقدیر اپنے ہاتھوں خود بنانے کی راہ دکھائی، اور انگریزی انتداب اور زمانے کے فکری انقلاب سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ بخشا۔ آج برعظیم جنوبی ایشیاء کا مسلمان پاکستان میں ہو یا بھارت میں آزمائش سے دوچار ملت اسلامیہ ہو یا بنگلہ دیش کا باسی مسلمان، اپنے وجود اور شہود بلکہ رجحان میں سراسر سر سید احمد خان کا بصیرتِ ملی کا جہان ہے۔ جدید تعلیم کا فروغ ہو کہ اُردو زبان کا چلن، برعظیم میں مسلمانوں کی حکومت کا تصور و تسلسل ہو کہ برعظیم کی ہندو اکثریت سے علیحدہ شناخت اور تشخص کا عصری رویہ، یہ سب سر سید احمد خان ہی کی دعاؤں، آہوں اور کوششوں کا بدیہی نتیجہ اور حاصل

ثمر ہے۔ بلکہ محدود ماحول میں صرف تعلیمی محاذ پر، پاکستان، بنگلہ دیش، خود بھارت میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا دیگر جدید علوم و فنون کے ادارے، صرف اور صرف سرسید احمد خان ہی کے فکر کے شرارے ہیں۔ اس کا واضح مطلب تو یہ ہے کہ اکیسویں صدی کے طلوع اور بیسوی صدی کے غروب میں کم از کم برعظیم کی ملت اسلامیہ اور اسکی نژادنو، سرسید احمد خان کے معنوی عہد میں سانس لے رہی ہے۔ لغوی معنوں میں تو نہیں اور نہ ہی مذہبی معنوں میں بلکہ خود مذہبیوں کے معنوں میں یہ بات نہیں، مگر حقیقت کا اعتراف اور ہدیہ سپاس کے طور پر برعظیم کی ملت اسلامیہ بجا طور پر سرسید احمد خان کو مجتہد العصر کہے تو بات مکمل بھی ہے اور جامع بھی۔ اقبالؒ نے چشم بصیرت کا ادارک یہ فرمایا کہ

''سرسید احمد خان، دور جدید کا پہلا مسلمان تھا جس نے آنے والے زمانے کے تیور کر پہچانا''

بلکہ مسلمانوں کی آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں اپنے خطبے میں اس امر کا اعتراف بھی کیا اور اعلان بھی کہ فرمایا:۔

> ''میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خان نے مسلمانوں کیلئے جو عملی راہ قائم کی تھی، وہ صحیح تھی۔ اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔''

حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی گواہی

حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے ملفوظات ''مقابیس المجالس'' میں ہے کہ نواب قیصر خان مگسی نے عرض کیا قبلہ! سرسید احمد خان کس قسم کا آدمی تھا؟ آپؒ نے فرمایا۔

> ''نہایت ہی اچھے آدمی تھے اور ان کے چہرے سے برکت ٹپکتی تھی۔ ان کا اسلام کے کسی فرقہ سے اختلاف نہیں تھا اور ہر فرقے کو اچھا کہتے تھے۔ ان کے والد شاہ ابوسعید دہلویؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ شاہ ابوسعیدؒ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ (نقشبندی) کے مرید و خلیفہ تھے، وہ مرزا جان جاناںؒ (شہید) کے مرید و خلیفہ تھے۔ میں نے سرسید احمد خاں سے پوچھا آپ نے بھی کسی بزرگ سے بیعت کی ہے؟ انہوں نے جواب دیا میں نے کسی شخص کے ساتھ بیعت نہیں کی اگر کسی سے بیعت کی ہے تو انکے ساتھ کی ہے (یعنی شاہ ابوسعیدؒ کے ساتھ) جنکی شکل و صورت کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد فرمایا کہ جب میں نے ان سے ملاقات کی تو انہوں نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس اثنا میں رسول اکرم ﷺ کا ذکر خیر اور صحابہ کرام ﷺ کی صحبت کا ذکر ہوا تو بات کرتے ہوئے وہ رو رہے تھے اور آنکھوں سے اس قدر آنسو جاری تھے کہ ریش تر ہو گئی تھی اور قطرے نیچے ٹپک رہے تھے اور کمال شوق اور جوش سے پاؤں اس طرح مارنے تھے کہ جیسے کوئی رقص کے وقت مارتا ہے رسول

اکرم ﷺ کی محبت انکی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔اس کے بعد فرمایا کہ سرسید احمد کا ۱۳۱۵ھ میں انتقال ہوا۔تاریخ انتقال یہ ہے۔

''اب متو فیک و رفعک الی و مطھوی.''(۴۶)

سرسید احمد خان نے بپھرے ہوئے خونخوار انگریزوں کی برچھیوں سے مسلمانان ہند اور خصوصاً دہلی اور اس کے نواح میں جس طرح ہنگامہ دارو گیر میں انسانیت کے قریب جا کر حالات کو (Face) کیا، اسے انگریز کا پروردہ کہنا ایک سیلاب گالی وگفتار ہے جو منبر و محراب کی ایک خاص مخلوق کے علم دشمن رویوں کی زبان رہی ہے مگر اس فرد واحد نے منبر و محراب کے والی ﷺ بلکہ دو جہاں کے سردار ﷺ کی اُمت کی جان، آبرو اور عزت ہی نہیں بچائی، بلکہ خود آنحضرت ﷺ کی ذات اطہر پر یو۔پی کے انگریز گورنر سر ولیم میور کی کتاب (Life of Mohammad) کا بروقت اور برمحل جواب لکھا۔ان کی ادبی خدمات، تعلیمی فتوحات اور سماجی خدمات کا اعتراف معقول اور معتدل علماء کا کھلا اعتراف ہے۔مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:۔

''سرسید احمد خانؒ کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اٹھی، جس کے اثر سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا۔ پرانے لوگوں کی مخالف بیکار ثابت ہوئی، دولت، عزت اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی، انہوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے، قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کیلئے چھوڑ دیا گیا تاکہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلمی کے کام آئے''۔(۴۷)

سیاسی افق پر یہ سرسید احمد خان ہی کی جدوجہد اور اجتہاد کا نتیجہ حالی کی آواز، شبلی کا قلم اکبرالہ آبادی کا طنز، حسرت موہانی کی سیاسی ذکاوت اور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی قیادت کے تسلسل کی صورت میں سامنے آیا۔ یہاں تک ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام سرسید ہی کے جانشینوں کے ارادے اور ایماء پر بنائی ہوئی ایجوکیشنل کانفرنس ہی کے شرکاء اور زعماء کے فکرونظر کا اعجاز ہے۔مسلمانوں میں اسیران ماضی کے درباری طبقے میں ''پدرم سلطان بود'' کا فخر و ناز ان کی انگریز دشمنی کا الاؤ تھا اور انگریزوں سے نجات انکی ذات کا ہیجان بھی۔مگر اس حالت میں امت مسلم کا تار تار دامن، ہندو اکثریت کے کانٹوں میں پرو کر، پرچم آزادی بنانا نہ دینی بصیرت تھی نہ عصری بصارت تھی۔ یہی سبب ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل جب وائسرے کے اشارے اور ایماء پر سرڈگلس ہیوم نے کی تو ہندو سیاست کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو یورپی ذہانت کا دیسی کلب میسر آ گیا۔اس کلب کے ہندو سیاسی زعماء (نیتا) پورے کے پورے انگریزی خواہاں ہی نہیں ابتدائی صدر تک انگریزی تعلیم و تصورات کا جدید ہندی ایڈیشن تھے۔سرسید احمد خان نے انگریزی استعمار کے گورے آقاؤں میں خود

مسلمانوں کیلئے مستقبل میں ان کالے انگریزوں کے اکثریت کے یورپی جمہوری اداروں کی صورت، مستقل اقتدار کو بخوبی بھانپ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کانگرس کے صدر کو خط لکھ کر اسے لمحے اور سمے میں اپنا سیاسی نقطۂ نظر ملت اسلامیہ کے رُخ سے واضح کیا۔ ۱۸۸۷ء کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ :۔

''میں نیشنل کانگرس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا یہ فرض کر لیا گیا کہ ہندوستان میں جو مختلف ذاتیں، فرقے اور مذاہب کے افراد رہتے ہیں، وہ ایک قوم کے افراد ہیں؟ یہ ایک قوم بن سکتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ناممکنات میں سے ہے۔'' (حیات جاوید)

برعظیم کی ملت اسلامیہ کی مذہبی فکر میں مسلم ملت کا انفرادی وجود اور شہود ماضی میں بھی اپنے علیحدہ تشخص کے ساتھ جلوہ گر رہا ہے، خاص طور پر شیخ احمد سرہندیؒ، مجدد الف ثانیؒ اور نامور مذہبی سکالر اور متکلم شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ وہ مذہب کی اساس پر ملت کی استواری کے قائل ہی نہیں، کوشاں مثالیں ہیں۔ نامور مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''شاہ ولی اللہ نے اس ضرورت پر زور دیا تھا کہ مسلم ملت کو اپنی امتیازی حیثیت ضائع کر کے ایک غالب اکثریت والی بڑی ہندو آبادی کے ساتھ مکمل مماثلت پیدا کر کے ہندومت میں جذب نہ ہونے دیا جائے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس خاص کام کو انجام دینے کی خدمت دیوبند کی بجائے سرسید احمد خان کی حصے میں آئی۔'' (۴۸)

مگر یہ تو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد کا امر واقع ہے کہ ہندو اکثریت میں سیاسی طور پر ضم ہونے کی سعی نامشکور کا سرنامہ دارالعلوم دیوبند کے بعض نامور مذہبی مدرسین کی حریت فکر اور تحریک آزادی ہند کا عنوان ہو گیا اور حادثہ یہ ہے کہ اس دارالعلوم کی علمی روایت اور فکری وراثت کا دعویٰ تک ان علمائے ہند کی شناخت بھی ٹھہری ہے۔ سیاست دوراں میں ایک بالغ نظر مسلمان یا سیاسی رہنما کی بجائے ایک معلم اور مدرس بلکہ تقویٰ اور تدین کو اگر بصیرت ملّی کا دعویٰ نہ ہو تو علمی سطح پر ان علماء ہند کو اسیران ماضی کا تسلسل تو کہا جا سکتا ہے یہ الگ بات کہ ہندو اکثریت کے ساتھ ضم ہو کر ایک قوم بنانے کی متحدہ قومیت کا حاصل اگر سیکولر جمہوریت بھارت ہو جائے تو وہاں مسلمانوں کے احوال و آثار گذشتہ ۶۲ برسوں کا وہ مشاہدہ اور تجربہ ہیں جو اپنی شہادت آپ ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وقت نے اپنا فیصلہ دے کر چھوڑا ہے اور متحدہ قومیت کا جغرافیائی بُت سیکولر جمہوریہ بھارت ہے جبکہ دو قومی نظریے پر مبنی مملکت مدینہ کی بازیافت روحِ عصر بن کر ظہور پاکستان ہے۔ اجتہاد نے اپنا فطری راستہ خود بنایا ہے اور غلام ہندوستان کی محکوم و مقہور بلکہ مجبور ملّت اسلامیہ کو جدید علوم و فنون کی راہ پر جس شخص نے گامزن کیا اُسے سرسید احمد خان کے سوا اور کون سا نام دیا جا سکتا ہے۔ ملی سانحہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں متحدہ قومیت کے علمبردار بعض علماء ہند کو یہ احساس تک نہ تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس سانحے کی ایک پرت کھولی ہے۔

''۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد پچاس سال گزرنے پر طاقت کا توازن ہندوؤں کے حق میں منتقل ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علماء نے اس حقیقت کو کبھی نہیں سمجھا اور نہ ہی اُنہیں اس کا ادراک ہوا کہ ان مملکتوں میں جہاں حکومتیں انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آتی ہیں تعداد کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔''(۴۹)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جیسے نامور مورخ نے چشم دید واقعات کے بعد ہی اپنے احساس کو فکری جہت دیکر یہ سیاسی سوال اٹھایا ہے کہ

''متحدہ ہندوستانی قومیت کے ان زبردست علمبرداروں کو یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ مسلم مفادات کے تحفظ کی تدابیر اور وسائل معلوم کیے جا سکتے ہیں، اور پھر انگریزوں کو برعظیم سے نکالا جا سکتا ہے۔''(۵۰)

جبکہ سرسید احمد خان کے برعظیم کی ملت اسلامیہ پر یہ احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو قرون وسطیٰ کے عہد قدیم سے نکال کر جدید دور میں داخل کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ دینی عصبیت بیدار اور نمودار ہوگئی جو قوموں کی زندگی کا زادراہ ہے۔ یہی وہ دوقومی نظریہ ہے جس کے آگے انگریزی استعمار اور عیار ہندو نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔ سرسید احمد خان دوقومی نظریہ کے برعظیم میں اولین علمبردار کے طور پر شہرت عام اور بقائے دوام کی حامل شخصیت ہیں۔ یہ وہ تاریخی کردار ہے جسے کسی دور کا مورخ تذکرہ کیے بغیر گذر نہیں سکتا ہے۔ ایک جامع تبصرہ، ایک تعلیمی ماہر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے تحریر کیا ہے کہ

''سرسید احمد خان انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ایک سیاسی مفکر اور قومی رہنما کے طور پر ابھرے تھے۔ سیاسی امور و مسائل پر ان کی گہری نظر رہتی تھی، مگر اپنی قوم کے مزاج شناس ہوتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کو سیاست ملکی سے دور رکھنے اور انہیں معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی پر مائل کرنے کی پوری کوشش کی۔ جب انڈین نیشنل کانگرس کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے مسلمانوں کو اس سے الگ رہنے کا مشورہ دیا۔ اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا:۔

''جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قوم کی ترقی ہوگی، میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی سمجھتا ہوں۔''(۵۱)

البتہ ڈاکٹر ذوالفقار نے اس حد تک تو اتفاق کیا ہے

''مگر پیٹریاٹک ایسوسی ایشن بنا کر برطانوی حکومت سے اظہار وفاداری میں دُور تک نکل جانا کسی لحاظ سے بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جبکہ کانگرس خود بھی حکومت سے وفاداری کے دائرے میں رہتے

ہوئے کچھ دستوری مراعات مانگ رہی تھی''۔(۵۲)

حالانکہ کانگرس کا دستوری مراعات مانگنا، برطانوی پارلیمنٹ کے اداروں (Institutions) کا ہندوستانی ارتقاء تھا۔ جس میں اکثریت کے جمہوری اصولوں پر دستوری مراعات کا مانگنا یا کانگرس کے پلیٹ فارم سے نوجوان گریجوایٹ کا نوکری طلب کرنا کہ جدید تعلیم یافتہ گریجوائٹس میں واضح اکثریت ہندوؤں ہی کی تھی، یہ امر تو سرسید احمد خان کی قومی بقا کی بصیرت کا اعجاز ہے نہ کہ اعتراض کا محل۔ البتہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن پر عالمانہ اور مؤرخانہ نکتۂ نظر ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی ہی کا موضوع ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ

''۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوششیں کیں تو سرسید احمد خان نے اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس میں شامل نہ ہونے کی ترغیب دی۔ مگر دیوبند نے انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت کی۔ سرسید احمد خان نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کیا تو بہت سے علماء نے مولانا محمد اور انکے بھائیوں مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالحیٰ کی رہنمائی میں ایک فتویٰ جاری کیا جس میں کہا گیا کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں شرکت کرنا ناجائز ہے اور کانگرس میں داخلے کی حمایت کی گئی۔ اس فتوے پر تمام برعظیم کے ایک سو علماء نے دستخط کیے جن میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود حسن اور دیوبند کے دوسرے اساتذہ شامل تھے۔ ان فتاویٰ کو ایک مختصر رسالے ''نصرت الابرار'' کے عنوان سے جمع کیا گیا۔''(۵۳)

سرسید احمد خان اور دارالعلوم دیوبند کے مابین یہ آویزش جہاں قدیم و جدید کا بظاہر ٹکراؤ گردانا گیا وہاں یہ حقیقت بھی بصورت اجتہاد عصر حاضر کا جواب بن کر سامنے آئی کہ

اولاً: برعظیم کی ملت اسلامیہ کا تعلق دینی اور روحانی اعتبار سے مملکت مدینہ کے اصول قدیم سے ہے کہ مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر ایک ملت نہیں بنائی جا سکتی۔ کہ

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمیؐ
(اقبالؒ)

ثانیاً: یہ کہ اسلامی الٰہیات کی فکری تشکیل نو میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا اجتہاد دیوبند کی بجائے علیگڑھ کے سرسید احمد خان کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ فی الواقع یہ روایات سے انحراف کا نہیں روایت سے پیوستہ رہنے کا عصری اجتہاد تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس فکری روایت کو مربوط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''شاہ ولی اللہؒ کے پیروؤں نے جو کوششیں کی تھیں اُن میں قطعاً غیر متوقع شاخ سرسید احمد خان کی تحریک تھی۔ جس کا مقصد مسلم سیاسیات و تعلیمات کو ایک نیا رُخ دینا تھا۔ وہ مشہور مولانا مملوک علی

کے شاگرد تھے جو کلیتاً ولی اللہ مکتبہ فکر اور روایت کی پیداوار تھے۔'' (۵۴)

علامہ اقبالؒ نے اس مرحلہ تاریخ پر اس فکری صورت حال کو واضح کیا ہے جس میں انہوں نے فرمایا

مولوی کا ذہن

''مولوی کا ذہن پچھلے سو برس سے عقیم بانجھ چلا آتا ہے۔ دیو بند ہی کو دیکھئے، دیو بند بھی انگریزی شہنشاہیت کی غیر ارادی تخلیق ہے'' ''میری بات سے غلط فہمی نہ ہو ملاّ کا ذہن فی الواقعہ عقیم ہے اور پچھلی ایک صدی کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ملا غور وفکر سے محروم ہے۔'' (۵۵)

دین ووطن کے اس معرکہ میں ان کے ارشادات والہام کا شعری جامہ بھی تو ہے کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب ﷺ الٰہی — دے تو نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے — ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

جہاں تک سرسید احمد خان کی پٹریاٹک ایسوسی ایشن کے خلاف مذہبی ملاؤں کے فتویٰ کا اثر تھا، اس کی کیفیت پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ

''اس ابتدائی مرحلے میں بھی علماء کا اثر اتنا زائل ہو چکا تھا کہ اس فتوے کے نتیجے میں مسلمانوں کا ہجوم کانگرس میں جمع نہیں ہوا۔'' (۵۶)

یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے دیو بند مدرسے کی سیاسی فکر کو ایک جملے میں سمیٹ کر ماضی، حال اور مستقبل کے مذہبی مدرسین کی سیاست کو کوزے میں بند کیا ہے کہ

''دیو بند کے طرز فکر کی خاص کمزوری ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اس میں حقیقت پسندی کی شدید کمی ہے۔'' (۵۷)

جبکہ مسلمانان برعظیم کی عظیم اکثریت اہل سنت والجماعت کے حامل بریلوی مکتبہ فکر کا بہ حیثیت مجموعی رویہ ہندو اکثریت کے گرداب میں دھنسنے اور پھنسنے کے یکسر خلاف رہا۔ اس ضمن میں تحریک خلافت سے لیکر تحریک پاکستان تک ان کا رویہ ملت اسلامیہ کے ساتھ ساتھ اور پاس پاس رہا۔ اور شاید ہی کوئی بریلوی عالم اس قابل ہو کہ جسکا تذکرہ بطور کانگرس نواز کے کیا جاسکے۔ بلکہ مشائخ اور اہل اللہ نے تحریک پاکستان میں خانقاہوں سے نکل کر حضرت قائداعظمؒ کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ بنارس اور اجمیر شریف میں ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء جیسے فیصلہ کن سالوں میں کانفرنسوں کے ذریعے پاکستان اور نظریہ پاکستان

کے ساتھ قائداعظم کی اطاعت میں مسلمانوں کی جنگِ آزادی اور آزاد وطن کیلئے ہم نوائی کی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

''بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کانگرس کی قیادت قبول کرنے کے اس لئے خلاف تھے کہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اس طرح مسلمان آہستہ آہستہ اپنی جداگانہ شخصیت کو ضائع کر دیں گے اور وہ ہندوؤں کے خیالات اور طور طریقے قبول کر لیں گے۔'' (۵۸)

یہی سبب ہے خانقاہ امدادیہ، صابریہ نظامیہ تھانہ بھون سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ۱۹۳۸ء میں جب پٹنہ سیشن کے موقع پر حضرت قائداعظم کو اپنی حمایت اور تائید سے نوازا، تو دارلعلوم دیوبند کے ارباب مدرسہ کی سیاست سے کٹ کر ان سے اپنے تعلقات تک منقطع کر لیے، جس کی حتمی صورت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ، اساتذہ تک نے دیوبند کو خیر باد کہہ دیا اور دارالعلوم اسلامیہ ڈھابیل کو اپنا مستقر اور مسکن بنا لیا۔ تحریک پاکستان کے حتمی مراحل میں پاکستان کے حمایتی اور سرخیل علماء دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کوئی ایسے غیر اہم نام نہیں، جنہیں دیوبند فکر کے تعلیمی اور علمی حلقے، سیاسی خودکشی کا طعنہ دیں سکیں، بلکہ جمعیت العمائے اسلام کا نام اور قیام بھی تحریک پاکستان کی حمایت و روایت کا دوسرا نام ہے، جو مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع کے جواں جذبوں کا امین ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قیام پاکستان کے پہلے دن مغربی پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں پاکستان کا جھنڈا بانی پاکستان قائداعظمؒ نے مولانا شبیر احمد عثمانی کے ہاتھوں لہرایا اور مشرقی پاکستان ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی کے ہاتھوں مگر سرسید احمد خان کے معاصر علماء دیوبند کے بعد جس شخص نے ملت اسلامیہ برعظیم کو اپنے علم و قلم اور پھر زبان سے چرکے لگائے ان میں سرسید احمد خان کے کامیاب مذہبی مخالف اور سیاسی دشنام طراز مولانا ابوالکلام آزادؒ ہیں۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام نے مولانا آزادؒ کے مزاج میں سرسید احمد خان کے ہیجان کا پتہ دیا ہے کہ

''مولانا ابوالکلام آزادؒ، سرسید کے سب سے کامیاب مخالف تھے اور اس مخالفت کو شبلی کی صحبت نے چمکا دیا ہوگا لیکن مولانا کو ارباب ندوہ سے بھی اختلافات تھے۔'' (۵۹)

مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) سابق وزیر تعلیم سیکولر جمہوریہ ہند، مذہبی، ادبی اور سیاسی شخصیت کے افق پر ایک ایسا نمایاں نام ہے جس کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کلکتہ کے صحافتی دور نے برعظیم کی ملت اسلامیہ ہی نہیں، امت مسلمہ کے دائرے میں سید جمال الدین افغانیؒ کے فکر و فلسفہ کی بلند آواز سے تائید کی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مورخ شہیر ہی نہیں، معاصر شاہد بھی ہیں، ان کا دیا ہوا تعارف مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ذاتی تعارف بھی ہے کہ

''برعظیم کی مسلم ملت کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام کو ایک اہم مقام حاصل ہے، اپنی ابتدائی زندگی میں وہ ایک اچھے عالم اور اتحاد اسلامی کے پر جوش حامی تھے، انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ ''برعظیم کی

مسلم ملت کے مسائل صرف دنیا کی ملت اسلامیہ کے سیاق ہی حل ہو سکتے ہیں، اور اس کیلئے کوئی ایسی تحریک جو صرف برعظیم کے مسلمانوں تک محدود ہو، نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگی'' ۔ وہ مسلمانوں میں نئی تعلیم جاری کرنے پر سر سید احمد خان کی حکمت عملیوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔'' ان کی سیاسیات انہیں اور بھی زیادہ ناپسند تھی، کیونکہ وہ بھی دیو بندی مکتبہ فکر کے علماء کی طرح اسلام کے تمام مصائب کا ذمہ دار برطانیہ کو سمجھتے تھے۔ سر سید احمد خان سے ان کی مخالفت یا شاید ایک عالم دین کی حیثیت سے ان کی تربیت ہی انہیں اس انتہا تک لے گئی کہ انہوں نے اسلام کو سائنسی دریافتوں کے سیاق میں سمجھنے سے انکار کر دیا۔'' (۶۰)

یقیناً فکر و نظر کی عصری سیادت کا وہی نورانی فرق یا فرقانی لمحہ تھا جب ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی اشاعت نے مسلمانوں کے قومی رہنماؤں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی یہاں تک کہ مولانا ظفر علی خان تو عام مسلمین کے ساتھ اسی راہ پر گامزن ہو گئے، جو سر سیدؒ نے دکھایا تھا۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزادؒ قوم پرست مسلمانوں یعنی کانگرس کے ہمنواوں میں شامل رہے۔ اس کے بعد ان کی تیس برس کی سیاسی زندگی کانگرس کی تاریخ کا باب ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام نے مولانا آزادؒ پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا ابوالکلام آزادؒ کی آخری تیس سال کی سیاست نے عامۃ المسلمین اور ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دی، اس سے انکے علمی اور دینی مرتبے کو نہ صرف پنجاب بلکہ ایک زمانے میں تو کلکتے کے مسلمانوں نے ان کی امامت میں نماز عید پڑھنا ترک کر دیا لیکن پھر بھی ان کے علم و فضل اور قرآن فہمی کے قدر دان ہندوستان اور پاکستان میں موجود ہیں۔'' (۶۱)

سر سید احمد خانؒ کی خدمات

سر سید احمد خانؒ نے حیات ملی کے جس مرحلہ پر برعظیم کی ملت اسلامیہ کو اپنے جذب دروں سے نوازا، وہاں کوئی بھی شخص کیا کوئی گروہ آج تک کھڑا نظر نہیں آتا۔ بلکہ لڑکھڑائی ہوئی، روایت کا ایک انبوہ ہے جو حالات کی روشنی میں پتنگے کی طرح شمع سے لڑ کر مارا جاتا دکھائی دیتا ہے اور حادثہ یہ کہ اس گروہ علماء کو بر سر خود امامت و رہنمائی کا حق بھی حاصل ہے اور یہ گویا مسلمان امت کی نظری، نظریاتی بلکہ مذہبی راہنمائی کے لیے اس طرح چوکنے اور چوکس ہیں جسے ان کا مذہبی منصب کوئی الہامی ذمہ داری ہے جو ان کی حیثیت کے چھن جانے کا دوسرا نام ہے۔ رہنمائی اور عوامی پذیرائی میں جو معنوی فرق ہے وہ مخصوص فکر اور فرقہ کا سیاسی ادعا تو ہے مگر بحیثیت مسلم ملت آج بھی سر سید احمد خان کی ممنون ہے، مشکور ہے بلکہ برعظیم کی ملت اسلامیہ کا حال اس کے ماضی کی شان کے ساتھ ساتھ مستقبل کی آن بان بھی ہے۔ سید نذیر نیازی نے اقبالؒ کے حضور ان کی عمر مستعار کے آخری سال اور آخری دو ماہ کا جو روزنامچہ لکھا ہے اس کے بارے میں سر سید احمد خان کا تذکرہ کرتے ہوئے

اقبالؒ کہنے لگے:۔

سرسید کی ذات

''سرسید کی ذات بڑی بلند تھی۔ بڑی ہمہ گیر، افسوس ہے مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا۔''(۶۲)

ارشاد فرماتے ہیں:

''غلامی اور محکومی بڑی آفت ہے، حکومت اور اقتدار ایک سحر، جس سے محکوموں کے دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں۔ علی گڑھ کی کتنی بڑی خوبی ہے کہ اس نے ہمارے دل و دماغ کو محفوظ رکھا یا پھر یوں کہنا چاہئے کہ اسلام میں زندگی کی بے پناہ قوت ہے۔ یہ قوت علی گڑھ میں بھی کارفرما تھی۔ اور محکومی کے باوجود اور مغربی تعلیم کے باوجود مسلمانوں کا جذبہ ملی قائم اور برقرار رہا۔''(۶۳)

''جبکہ مذہبی مدرسے کے مدرسین کی سیاست اور فراست کے مقابلے میں خود ملت اسلامیہ کی اپنی بصیرت دینی اعتبار سے عصر رواں کا دھارا اور سہارا بن گئی۔ علماء کو ایک اور موقع عطا ہوا تھا۔ جب انہوں نے مولانا محمد علی جوہرؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ سے تعاون کا فیصلہ کیا تھا مگر انہوں نے مسلم لیگ سے بے وفائی کی اور ایک مرتبہ پھر اپنے خطرناک سفر پر روانہ ہو گئے۔ آخر کار انہوں نے مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کی حفاظت کرنے کے متعلق اپنے پرانے کردار کو الٹ دیا اور ہندوؤں کے ساتھ ایک مشترک قومیت کے شدید حامی بن گئے۔ مسلم ملت اپنے دین، اپنی ثقافت اور اپنے وجود کی بظاہر مخالفین سے زیادہ عقل مند تھی۔ اس نے انکے مشورے کو مسترد کر دیا اور ان لوگوں کی پیروی کی جو زیادہ حقیقت پسند، زیادہ بیدار مغز، زیادہ باخبر اور ملت کی تاریخ سے زیادہ ہم آہنگ تھے۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ فلسفی شاعر اقبالؒ کو جو عالم دین نہیں تھے مگر اسلام کے متعلق ان کی سوجھ بوجھ زیادہ گہری اور زیادہ فکری تھی۔ دیوبند کے ایک سربرآوردہ عالم اور جمعیت علمائے ہند کے صدر کی فہمائش کیلئے تنبیہہ کرنی پڑی۔ اقبالؒ اسلام میں ایک نئی قوت کے مظہر تھے۔ وہ عہد جدید کے مومن تھے۔''(۶۴)

یہ امر تو طے ہے کہ ۱۸۵۷ء کی مسلم ملت کے دور زوال کو روبہ اصلاح لانے اور مسلمانوں کی ہر نوعی بربادی کو جس شخص نے بڑے درد اور کرب کے ساتھ سنبھالا دیا وہ صرف اور صرف سرسید احمد خان کی ذات تھی بلکہ مسلمانوں کی

''اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لگی تھی اُس نے مسلمانوں کے صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہ کیا بلکہ ان کی ہمتوں کو بھی توڑ ڈالا۔ انگریز سلطنت جتنی جتنی پھیلتی گئی

مسلمانوں سے ان کی طاقت چھنتی گئی، جن کے بل پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی اس سے فارسی اور عربی کی بجائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا لیا چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بدولت مسلمان قوم کو (انگریزوں نے) مفلس، جاہل، پست خیال، فاسد الاخلاق اور ذلیل وخوار کر کے چھوڑا۔''(۶۵)

اس صورت حال کی ٹھیک تشخیص اور اس کے سد باب کی ٹھیک ترکیب سر سید احمد خانؒ ہی کی تجویز کردہ حکمت عملی تھی جس کی دینی بصیرت نے Wisdom and Vision کی راہ اختیار کر کے، مسلمانوں کی پستی کو روکا اور انہیں ٹھیک راہ پر گامزن کرنے کیلئے دن رات ایک کر دیا۔ زمانہ شناسی کے وصف کا شہکار سر سید احمد خانؒ کی ذات نکلی اور انہوں نے مایوسی اور مصلحت کی بجائے برعظیم کی ملت اسلامیہ کیلئے درپیش صورت حال میں انگریزی استعمار سے نبرد سے آزما ہونے کا کہا

اولاً: ۔مصالحت و مفاہمت کی راہ اپنائی اور توازن و اعتدال کا دامن پکڑ کر انہیں تحریراً، عملاً اور اصولاً یہ باور کرا کے چھوڑا کہ مسلمانان برعظیم کے بارے میں ان کی روش انصاف اور انسانیت دونوں سے عاری ہے اور مسلمانوں کی حالت کا ٹھیک تجزیہ کر کے، انگریز دشمنی کے الاؤ میں عافیت کی راہ راست نکالی اور خود انگریزوں کو اس امر پر متوجہ کر کے انہیں اسلامیان ہند کے بارے میں ڈھنگ سے چلنے اور سوچنے پر زور دیا۔

ثانیاً: ۔پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گری مسلم قوم کو حالات سے آنکھیں چرانے کی بجائے اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے دن کے اجالے میں حالات سے آنکھیں چار کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ عقلی علوم اور نقلی علوم کے قدیم ذخیرۂ کتب اور مکتبوں کے مدرسین کی مذہبی قلعہ بندی سے مسلم عوام اور خواص دونوں کو ''علم ہر مسلمان، عورت اور مرد کا فریضہ ہے (الحدیث) اور علم کا حصول ماں کی گود سے اپنی گور تک حاصل کرنا مسلمان کیلئے حکم رسالت ہے (الحدیث)۔ اس علم کی تحصیل ان کی علی گڑھ تحریک کا نشان منزل بن گیا۔ جہاں تک ان کی انگریزی تعلیم اختیار کرنے کی پالیسی کا تعلق ہے تو اکیسویں صدی کے اجالے میں سر سید دبستان پورے عالم اسلام کا معروضی معاشرہ، ماحول اور حاصلِ حالات ہے۔ سر سید احمد خانؒ ہی کا عہد ہے، اُسی کے طرز تعلیم کا چلن ہماری پہچان ہے بلکہ حقیقتاً پاکستان ہے۔ نامور مورخ اور برعظیم کی فکری تاریخ کے دانشور شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب ''موج کوثر'' میں برعظیم کی ڈیڑھ سو برس کی سیاسی، اور قومی زندگی کو خوبصورت پیرائے میں سمویا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

''سیاسی لحاظ سے ڈیڑھ سو سال (۱۸۰۰ء۔۱۹۴۷ء) کا زمانہ محکومیت کا دور تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے انتہائی پستی کو پہنچ گئی تھی لیکن قوم میں ابھی جان باقی تھی۔ اللہ کا ایک بندہ اٹھا اور اپنی ہمت، معاملہ فہمی اور چالیس سال کی مسلسل جدوجہد سے حالات

کا نقشہ بدل دیا۔اب قومی تنظیم اور بیداری کی کم از کم یہ حالت ہوگئی کہ قومی حقوق کی حفاظت ہو سکے اور جب بالآخر ۱۹۴۷ء میں پردیسی حکمرانوں کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اگرچہ مغلیہ سلطنت بحال نہ ہوئی (اور نہ ہو سکتی تھی) لیکن برصغیر کے ایک وسیع خطے پر ایک خودمختار اسلامی ریاست قائم ہوگئی جو دورِ حاضر کی ایک بڑی اسلامی مملکت ہے۔'' (٦٦)

جہاں تک سرسید کی مذہبی فکر پر روایتی اور قدامت پرست حلقوں کے سخت اعتراضات کا تعلق ہے تو اس میں تفسیر بالرائے کو مسلم دنیا میں کبھی پذیرائی نہ ملی تھی، نہ ملے گی، لیکن دینی فہم میں تفسیر ماثوری اور تفسیر بالرائے کے دونوں طریقے مسلمانوں کی مذہبی فکر میں ایک تاریخ کا درجہ رکھتے ہیں البتہ سرسید کی انگریز دوستی کو استعمار پرستی تک کا طعن دراز کرنا فکری المیہ ہے، فقہی مغالطہ ہے، سرسید کے دور میں ''وہابی'' کا لفظ انگریزوں کیلئے ''غدار'' اور ''باغی'' کے مترادف تھا بلکہ مسلمان عوام میں ایک ''گالی'' تھا۔خود سرسید کی جرات قلندرانہ ملاحظہ ہو کہ وہ ببانگ دہل اعلان کرتے تھے کہ میں ''وہابی'' ہوں۔ بلکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہید کا تذکرہ ''آثار الصنادید'' میں جس جذب، ادب اور احترام سے کیا ہے اُس سے انہیں ''وہابی'' فکر کا نمائندہ تک بنالیا گیا ہے۔حالانکہ انگریزی عتاب اور انتداب کے گرداب میں اس طرح کی جرأت آموز صداقت کا اظہار صرف سرسید ہی کا حصہ ہے۔انگریزوں کے کاسہ لیس ہندوؤں کی نسبت سے ہی اگر دیانتداری سے برطانوی استعمار کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیں تو اسلامی دنیا اور خود برعظیم میں انگریزوں کے سیاسی غلبے اور فکری غلبے میں سلامتی کا راستہ یہی تھا جو عملاً اختیار کیا بلکہ سرسید احمد خان کا حال تو خود ایک صاحب حال جیسا ہے۔ملت اسلامیہ کی تہذیب و تقدیر کے حوالے سے علمی محاکمہ سراج منیر کا تجزیہ ہے۔لکھتے ہیں۔

''اسلامی دنیا میں اگر عام طور پر یورپی تصورات کو قبول کیا گیا تو انہیں اپنے تہذیبی باطن کی پر خلوص قلب ماہیت کی بجائے کم و بیش وقتی تہذیبی حکمت عملی کی حیثیت دے دی گئی، حتیٰ کہ سرسید احمد خانؒ جو ان تصورات کے اہم ترین وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کے معتقدات کا نظام شاہ غلام علیؒ کی خانقاہ سے پھوٹتا ہے اور ان کی والدہ کے عقائد کے مطابق ہے''۔(٦٧)

سراج منیر ہی نے سرسید احمد خانؒ کی تحریک کے جامع نتائج کو باور کرایا ہے اور لکھا کہ

''برصغیر کی صورت حال میں سرسید کی اہمیت یہ ہے کہ مسلم حکومت کے مٹ جانے سے جو خلاء مسلمان معاشرے میں پیدا ہوتا تھا اُسے صرف سرسیدؒ کی تحریک نے پُر کر دیا۔'' (٦٨)

اس میں تعلیمی تحریک، اُردو زبان کے فروغ، دوقومی نظریہ پر اصرار اور دوقومی وطن کا بلوغ انکے فکر کا حاصل حالات بنا ہے۔اس قدر منزہ فکر اور ترفع ایک ایسی ذات میں جمع ہو جائے تو یہ سراسر رحمت باری اور رحمت اللعالمین ﷺ ہی کا فیض و

فیضان ہے۔کافر وزندیق اور ملحد ونیچری بلکہ تجدد کے القابات کا مذہبی لفظیات کا ذخیرہ جس قدر سرسید احمد خان کی چتا جلانے پر صرف ہوا، اسکے مدمقابل انتہائی صبر واستقامت کا پہاڑ یہ شخص قومی درد لیے اپنی راہ پر مستقل مزاجی کے ساتھ مگن رہا۔ گالیاں، فتوے، رکاوٹیں، الزامات یہ سب کے سب اس کی راہ میں حائل نہ ہو پائے۔ کس شخص کو کیا کہا جا رہا ہے؟ اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان کا حامل کوئی بھی گنہ گار شخص اسکا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ جس زمانے میں یو پی کے گورنر سر ولیم میور کی حضور اکرم ﷺ کے بارے میں گستاخانہ کتاب کا جواب لکھنے کی خاطر لندن گئے ہوئے تھے تو وہاں سے ایک خط میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں۔

''ان دنوں میرے دل میں سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت ﷺ کے حالات پر لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا ہے۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا ہے اور مصمم ارادہ کیا ہے آنحضرت ﷺ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے بھی ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ اور یہ فقیر، بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے! قیامت میں تو یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر، مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو

ع   مارا ہے تمغۂ شاہنشی بس است

کہ ہمارے لئے حضور ﷺ کا یہ تمغہ ہی شہنشاہی ہے جو ہمارے لیے کافی ہے۔(۶۹)

بلکہ اپنی ایک فارسی غزل میں سرسید احمد خان کا یہ شعر جو آج بھی ان کی قبر کے سرہانے اعلان کر رہا ہے ان کے عشق رسول ﷺ کی کیفیت کا غماض ہے۔فرماتے ہیں۔

خدا ادارم، دلے بریاں ز عشق مصطفیٰ ﷺ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانِ کہ من دارم

ترجمہ:۔خدا میرے ساتھ ہے اور حضور سرکار دو عالم ﷺ کے عشق میں سوختہ دل میرے پاس ہے جو ساز وسامان مجھے میسر ہے بھلا کسی کافر کے نصیب میں کہاں۔مولانا حالی کی حیات جاوید کے حوالے سے شیخ اکرام نے لکھا ہے۔

''سرسید احمد خانؒ نے مذہب ہی کی آغوش میں پرورش پائی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا ۱۸۳۹ء سے لیکر جب تک انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے مختصر حالات لکھے، ۱۸۹۸ء تک جو وہ امہات المومنین کے متعلق ایک عیسائی مصنف کے اعتراضات کا جواب لکھتے لکھتے وفات پا گئے۔ ۸۰ برس کی عمر پا کر وہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پا گئے، تو آخری وقت ان کی زبان پر قرآن مجید کی یہ آیات جاری تھیں، حسبی اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر ان اللہ و ملائکتہ یُصلون تعلی النبی یا یھا الذین امنو صلوا علیہ وسلموا!

تسلیما."(۷۰)

سرسید احمد خان کے شدید ناقد لسان العصر اکبر الہ آبادی نے ان کی وفات پر اعتراف کیا کہ

ع ہماری باتیں ہی باتیں تھیں، سید کام کرتا تھا

یاد رہے کہ سرسید احمد خان خود بھی شعر کہتے تھے اور آہ سے آہی تخلص فرمایا کرتے تھے۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی کا ایک مصرع سرسید احمد خان کے دردمند دل اور مسلمان قوم کیلئے آہ و درد کا آئینہ دار ہے۔ شاید اسی سوز و درد نے انہیں چشم حقیقت سے آشنا کیا ہو، کہ

ع غم بڑا مدرک حقائق ہے

(اکبر الہ آبادی)

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے پس چہ باید کرد میں درحضور رسالت مآب ﷺ کی نظم پر ایک نوٹ لکھا ہے کہ جب بغرض علاج بھوپال گئے ہوئے تھے تو انہوں نے ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو سرسید احمد خانؒ کو خواب میں دیکھا، لکھتے ہیں:۔

رات در خواب دید، سر سید احمد خان
فرمودند کہ از علالتِ در حضور رسالت مآب ﷺ عرض کن

''کہ اپنی علالت طبع کے بارے میں حضور سرکار دوعالم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ میں عرض کرو''۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید احمد خان نے دور جدید میں فیضان نبوی ﷺ کے باعث برعظیم میں دوقومی نظریہ کی ترویج کی اور انھوں نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ قومیں سرزمین سے نہیں دین سے بنتی ہیں۔ بلکہ مسلم قوم درحقیقت مسلم ملت ہے جو دل دھڑکنے سے بنتی ہے۔ جن کا دل ایک ساتھ دھڑکے بلکہ بنامِ مصطفیٰ ﷺ دھڑکے، وہ ایک قوم ہے، ملت ہے، امت ہے باقی بتانِ آزری۔ دین و وطن کے اس معرکہ میں اقبالؒ کا ارشاد و الہام سچ ہے کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اسکا ہے وہ ملت کا کفن ہے

۱۸۵۷ میں مسلمانوں کی جاگیریں ضبط ہوئیں، ان کی جائداد انگریزوں کے قبضے میں چلی گئیں۔ مہاراجگان پٹیالہ اور کپورتھلہ کو جنگِ آزادی میں انگریزوں کی مدد کرنے کے صلے میں اُتر پردیش میں جاگیریں عطاء کی گئیں جو ظاہر ہے کہ مسلمانوں سے چھینی گئی تھیں۔ انگریزوں نے سرکاری ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے۔ بقول سرسیّد احمد خانؒ مرحوم مسلمانوں کو چپڑاسی، پنکھا قلی، سائیس، کوچوان یا گھسیارہ کے علاوہ کوئی اور نوکری نہیں ملتی تھی۔ ان کا کاروبار تباہ ہوا، عزتیں لٹیں اور وہ نانِ شبینہ کے لئے محتاج بنا دیئے گئے۔

ہندوؤں نے بقول سرسیّد احمد خان مرحوم، گنگا میں نہا کر اپنے پاپ دھو لئے۔ انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر

اسکولوں اور کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سرکاری ملازمتیں حاصل کیں۔ کاروبار پر ہندو چھا گئے اور مسلمان ہر میدان میں ان سے بہت پیچھے رہ گئے۔ سر سیّد احمد خان مرحوم کے زمانے میں ایک سال کلکتہ یونیورسٹی سے ۲۴۰ اُمیدوار بی۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے، ان میں صرف ایک اُمیدوار مسلمان تھا۔ ان حالات میں سر سیّد احمد خان نے برعظیم کی مسلم ملت کو حالات کا سامنا کرنے کے قابل کر دیا۔ اس سلسلے میں سر سیّد احمد خان کی تعلیمی تحریک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ سر سیّد احمد خان پر مذہبی مسخروں کی ژاژ خائی اور یلغار کو سامنے رکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس شخصیت کو ''فتووں'' سے ہراساں کرنے کی سازشیں بروئے کار لائی گئیں۔

پنجاب یونیورسٹی شعبہ تاریخ کے نامور استاد پروفیسر محمد اسلم مرحوم نے سر سید احمد خان کے فکر وحق کا جامع جائزہ لیا ہے جسکے مطابق:

سر سیّد احمد خان اُور علی گڑھ تحریک

مسلمانان پاک وہند اور بنگلہ دیش کے مُحسن اور قافلہ سالارِ آزادی سر سیّد احمد خان کا شمار ان عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریخِ اسلام میں اپنی سیرت اور کردار کے اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

ولادت اور خاندان:

سر سیّد احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ امام علی تقیؒ سے ملتا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سیّد برہان، شاہجہان کے عہد میں ہرات کی سکونت ترک کر کے دہلی میں آبسے۔ سر سیّد کے دادا میر ہادی صوبہ دہلی کے افسرِ مال اور قاضی عسکر تھے۔ شاہی دربار سے انہیں جوادالدولہ کا خطاب عطاء ہوا تھا۔

والدِ بزرگوار:

سر سیّد احمد خان کے والد بزرگوار سیّد متقی (م ۱۸۳۶ء) ایک درویش صفت انسان تھے۔ انہیں سرکاری ملازمت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کے والد میر ہادی کی وفات کے بعد انہیں اپنے والد کے منصب اور خطاب کی پیش کش ہوئی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی (م ۱۸۳۷ء) کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم تھے۔ اس لئے سیّد متقی بلا تکلف دربار اور محل میں چلے جاتے تھے۔ ایسے کئی موقعوں پر سر سیّد احمد خان ہی ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔

سیّد متقی، نقشبندی مُجددی سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شاہ غلام علی دہلوی (م ۱۸۲۴ء) کے مرید خاص تھے۔ نقش بندی سلسلے میں وابستگی اور حضرت مُجدّد الف ثانیؒ، شیخ احمد سرہندی کے ساتھ عقیدت کی بنا پر انہوں نے اپنے بیٹے کا نام ''احمد'' رکھا تھا۔ شاہ غلام علی زندگی بھر مجرّد رہے۔ اس لئے انہوں نے سید متقی کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اسی نسبت سے سر سیّد احمد خان حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کو ''دادا ابا'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ سر سیّد لکھتے ہیں '' کہ وہ بچپن میں ان کی گود میں بیٹھ کر خدا جانے

کیسی کیسی گستاخیاں کیا کرتے تھے۔لیکن شاہ غلام علی صاحب سیّد متقی کے ساتھ تعلق کی بنا پر ان کی حرکات کو برداشت کیا کرتے تھے۔سرسیّد نے ان کی صحبت میں جو قلیل لمحات گزارے وہ ان کی عمرِ عزیز کا حاصل تھے۔اس صحبت کا اثر ان پر مرتے دم تک رہا۔

سرسیّد کے نانا:

سرسیّد احمد خان کے ننھیالی رشتے دار عبدالعزیز دہلویؒ کے عقیدت مند تھے۔ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد، نقشبندی سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت یوسف ہمدانی (م ۱۱۴۲ء) کی اولاد سے تھے۔انہوں نے دہلی میں تعلیم حاصل کی اور لکھنؤ جا کر ماہرِ علوم ریاضی علامہ تفضل حسین خان سے ریاضی، الجبرا اور مثلثات کی کتابیں پڑھیں۔تعلیم سے فراغت کے بعد خواجہ فرید الدین احمد دہلی چلے آئے لیکن جلد ہی اَودھ کے حکمران نواب سعادت علی خان نے انہیں لکھنؤ بلا کر ایک اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔اپنے لکھنؤ میں قیام کے دوران ان کے چند انگریز افسروں کے ساتھ تعلقات قائم ہوئے اور انہیں کے ذریعے ان کی قابلیت کا شہرہ کلکتہ پہنچا۔گورنر جنرل وارن ہسٹینگز نے کلکتہ میں مدرسۂ عالیہ کے نام سے مسلمان طلبہ کے لئے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا۔کلکتہ کے حکام نے خواجہ فرید الدین احمد کو اس کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا۔انگریز حکام نے ایک بار انہیں سفارتی مشن پر ایران بھیجا۔انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی اس خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ انگریزوں نے خوش ہو کر انہیں شاہِ برما کے دربار میں اپنا نمائندہ مقرر کیا۔برما سے واپسی کے بعد خواجہ صاحب کا تقرر افسرِ مال کے طور پر ہوا۔

۱۸۱۵ء میں مغل حکمران اکبر شاہ ثانی نے انہیں منصبِ وزارت پر فائز کیا۔ان دنوں خزانہ قریب قریب خالی ہو چکا تھا اور فوج کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ان کے منصبِ وزارت پر فائز ہونے سے پہلے مرہٹوں نے دہلی پر حملہ کر کے دہلی کے لال قلعے کو خوب لوٹا تھا۔شاہ جہان نے دیوانِ عام کی چھت تانبے کی چادروں سے بنوائی تھی۔مرہٹوں نے وہ چادریں دکن لے جانے کی غرض سے اُتار لی تھیں لیکن وزنی ہونے کے سبب نہ لے جا سکے۔خواجہ فرید الدین احمد نے ان چادروں کو ڈھلوا کر سکّے مضروب کراوئے اور فوج کے واجبات ادا کئے۔ان حالات میں خزانہ، بادشاہ اور اس کے اہلِ خانہ کی فضول خرچیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، خواجہ صاحب نے غیر ضروری اخراجات پر قدغن لگائی تو اس پر بعض خود غرض افراد ان کے خلاف ہو گئے۔ان حالات میں خواجہ صاحب منصبِ وزارت سے مستعفی ہو گئے۔

خواجہ فرید الدین احمد کی سبکدوشی کے بعد ان کا کوئی جانشین حالات پر قابو نہ پا سکا تو مجبوراً اکبر شاہ ثانی نے انہیں دوبارہ قلمدانِ وزارت سونپا۔تین سال کے عرصے میں ہُلکر کا کوئی منظورِ ثانی ان کی مخالفت پر اُتر آیا تو انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔جب پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ کو اس کا علم ہوا تو اس نے خواجہ صاحب کو لاہور آنے کو دعوت دی لیکن ان کی بیٹی نے اصرار کر کے انہیں دہلی میں رُوک لیا۔

آخری عمر میں خواجہ فریدالدین احمد تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے اور انہوں نے رسول شاہی سلسلۂ تصوف میں باقاعدہ بیعت کر لی تھی۔ ان کا انتقال ۱۸۲۸ء میں ہوا۔ سرسید احمد خان نے ''سیرت فریدیہ'' میں ان کی سوانح حیات قلمبند کئے۔

سرسید نے کئی کتابیں اپنے نانا جان سے پڑھی تھیں۔ وہ ان کی سیرت و کردار کے بڑے مداح تھے۔ سرسید کی کردار سازی میں ان کے نانا کا بڑا ہاتھ تھا۔

سرسید کی والدہ محترمہ

سرسید احمد خان کی والدہ ماجدہ عزیز النساء ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ خواجہ فریدالدین احمد نے اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی پر خصوصی توجہ دی تھی۔ وہ بڑی نیک دل، منکسر المزاج، رسم ورواج اور توہمات سے متنفر اور مخیر خاتون تھیں۔ ان میں عفو درگزر اور تحمل کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ انہیں خدا کی ذات پر کامل بھروسہ تھا۔ ایک بار بچپن میں سرسیّد نے گھر کے ایک قدیم ملازم کو تھپڑ دے مارا تو ان کی والدہ نے یہ کہتے ہوئے انہیں گھر سے نکال دیا کہ وہ مہذب اور شائستہ لوگوں میں رہنے کے لائق نہیں ہیں۔ سرسید نے تین دن اپنی خالہ کے ہاں گزارے اور چوتھے رُوز خالہ کی وساطت سے انہیں اس شرط پر گھر میں رہنے کی اجازت ملی کہ پہلے وہ اس ملازم سے اپنا قصور معاف کرائیں۔ سرسیّد نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ یہ وہ گھریلو ماحول تھا جس میں سرسیّد احمد خان نے آنکھیں کھولی۔

تعلیم وتربیت

سرسیّد احمد خان کے زمانے میں دہلی علم وادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ (م ۱۸۶۸ء)، فضلِ حق خیرآبادی (م ۱۸۶۱ء)، غالب (م ۱۸۶۹ء)، مومن (م ۱۸۵۲ء)، ذوق (م ۱۸۵۴ء) اور شیفتہ (م ۱۸۶۹ء) جیسے نابغۂ رُوزگار دہلی میں موجود تھے۔ دوسری جانب شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزندوں نے علم کے چراغ روشن کئے ہوئے تھے۔ سرسیّد کے بچپن میں شاہ غلام علی دہلویؒ اور شاہ عبدالعزیز مُحدِّث دہلویؒ بقیدِ حیات تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد ان کے نواسے شاہ محمد اسحٰقؒ (م ۱۸۴۵ء) نے درس وتدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ دوسری جانب شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدینؒ (م ۱۸۱۸ء) کے فرزندِ ارجمند شاہ مخصوص اللہ (م ۱۸۵۵ء) نے اپنی خاندانی روایات زندہ رکھیں، سیّد احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی سرسیّد کے بچپن میں دہلی میں مقیم تھے۔ سرسیّد نے اسی ماحول میں ہوش سنبھالا۔

سرسیّد احمد خان نے ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اپنے ماموں خواجہ زین العابدین سے ریاضی اور الجبرا کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے نانا خواجہ فریدالدین احمد فرصت کے اوقات میں اپنے پوتوں اور نواسوں کو سبق پڑھایا کرتے تھے۔ سرسیّد نے طِب کی تعلیم حکیم غلام حیدر سے حاصل کی۔ ہنوز ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ۱۸۳۶ء میں ان کے والدِ بزرگوار سیّد متقی

انتقال کر گئے اور گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کے نازک کاندھوں پر آ پڑیں۔''(۷۱)

عکسِ شخصیت

ملی سطح پر سرسید احمد خانؒ کی تحریک کے اثرات اور برگ وبار، جنوبی ایشیا میں جدید مسلم معاشرہ ہی تو ہے بعض مسلم مذہبی طبقہ کے مطابق غالباً مسلمانوں کی جدید معاشرتی وروایتی اقدار کی یکسر حامل نہ سہی، البتہ دینی، فکری اور ملی سطح پر یہی معاشرہ آج کا مسلمان معاشرہ ہے جو معاشرے کی تلچھٹ نہیں، قوم کا شعور اور نور وظہور ہے۔ یہی مسلمان حالات حاضرہ اور وارداتِ کافرہ دونوں سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس جدید تعلیم یافتہ طبقے کا مسلمان ہی فی الواقعہ سرسید احمد خانؒ کا احسان ہے۔ اِسے ہی بقا نصیب ہوئی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ سرسید کی طبیعت میں ایثار اور دردِ قوم اُس تربیت کا روحانی ظہور ہے، جو نقش بندیہ سلسلے کے نامور بزرگ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ کے خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ کی نگاہ اور خانقاہ کا فیض وفیضان ہے۔ ممتاز صوفی اور ادیب خواجہ حسن نظامی کے فرزند خواجہ حسن ثانی نظامی نے سچ بتایا ہے کہ:

> ''مرزا صاحب کے جانشین حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ ہوئے اور یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سر سید احمد خان مرحوم کی شخصیت دراصل حضرت موصوف کی بنائی ہوئی شخصیت ہے۔ سرسید انہیں دادا کہا کرتے تھے۔ اور سرسید کا پورا بچپن شاہ صاحب کی صحبت میں گذرا تھا۔ سرسیدؒ نے ان کی خانقاہ کے آنکھوں دیکھے حال میں لکھا ہے کہ افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، مشرق بعید نیز افغانستان اور وسط ایشیا کے ان گنت طالبانِ علم اور طالبانِ روحانیت کا جمگھٹا حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ میں لگا رہتا تھا۔''
>
> (خواجہ حسن ثانی نظامی، علاقہ روہیل کھنڈ کی زرخیز ریاست رام پور، رام پور رضا لائبریری جرنل ۶۔۷، ۲۰۰۲ء، صفحات ۱۰۱۔۱۰۲)۔

ممتاز مورخ خلیق نظامی نے سرسید البم میں جس حسن وخوبی سے سرسید احمد خان کی تحریری اور تصویری شخصیت کو متعارف کرایا ہے، اسے ایک نظر دیکھنے سے یہ بخوبی باور ہوتا ہے کہ سرسید احمد خانؒ واقعتاً ایک دردمند دل اور قومی خدمت کے ایثار و پہاڑ کا دوسرا نام ہے۔ ذات کی نفی کا یہ پیکرِ عظیم جس اخلاقی اور دینی بلندی پر متمکن ہے اس کی مختصراً مگر جامع صورت احوال یہ ہے کہ:

اولاً: ''سرسیدؒ کو جب مسٹر شیکسپیر نے جہان آباد کی جاگیر اور تعلقہ کی پیش کش کی تو انہوں نے سادات کی اس جاگیر کو لینے سے صاف انکار کر دیا۔''

ثانیاً یہ کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزی استعمار کے ظلم و بربریت پر سرسیدؒ کا کہنا یہ تھا کہ

''مجھے اپنے گھر لٹنے کا مطلق غم نہیں، مگر میں عوام کے مصائب ومشکلات دیکھ کر تڑپ گیا ہوں۔ یہ

مسئلہ ذاتی نہیں، ملّی مشکل ہے، جس کے لئے مجھے کچھ کرنا ہوگا۔“

(خلیق نظامی، سرسیدؒ البم، ادارۂ ادبیات، دہلی، ۱۹۸۴، صفحہ ۲)

سرسید احمد کا آخری مضمون

”سرسیدؒ نے وفات سے نو روز پہلے جو مضمون حضرت رسالت مآب ﷺ کی ازواجِ مطہرات ؓ کی نسبت لکھا تھا، اسکا مسودہ صاف کیا ہوا ہمارے پاس موجود ہے۔ اس مضمون کو دیکھنے سے ہر شخص کو یقین ہوگا کہ سرسیدؒ نے مرتے دم تک اسلام، اور نبی اسلام ﷺ کی حمایت میں زندگی بسر کی۔“

(ایم۔ اے۔ او۔ کالج میگزین، علی گڑھ، اپریل ۱۸۹۸ء)

سرسید احمد خان کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالیؒ کے درج ذیل اشعار ان کا بھرپور عکسِ شخصیت ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ

چیست انسانی ؟ تپیدن از تپ ہمسایگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شُدن
زیست در فکرِ قوم و مردہ اندر بندِ قوم
اگر توانی، میتوانی، سید احمد خانؒ شدن

ترجمہ: انسانیت کیا ہے؟ دوسروں کے غم میں پگھلنے کا دوسرا نام ہے، گرم ہوا کے تھپیڑوں سے پژمردہ اور ویران باغ کو ہرا بھرا کرنے کی فکر میں رہنا اور قوم کے غم میں جینا اور قوم کے غم میں مرنا درکار ہو تو اس مقصدِ عظیم کے لئے سرسید احمد خانؒ بننا پڑے گا۔

سرسیّد احمد خانؒ روحانی طبیعت اور باطنی شخصیت کے اعتبار سے کس مرتبہ اور مقام کے حامل ہیں انکے ایک فارسی شعر ہی سے انکا مکمل تعارف ہو جاتا ہے۔ خانقاہ شاہ غلام علی دہلوی نقش بندیؒ کی فضا کے پروردہ سرسیّد احمد خانؒ خود بتاتے ہیں کہ

بہ مکتب رفتم و آموختم اِسرار یزدانی
بے فیضِ نقش بندِ وقت و جانِ جانِ جانانی

ترجمہ: میں مکتب گیا اور اسرار یزدانی، نقش بندِ وقت اور جانِ جانِ جانانی کے فیض سے سیکھے۔

یاد رہے حضرت شاہ غلام علیؒ حضرت مظہر جان جاناں شہیدؒ کے خلیفہ تھے جنکے خلیفہ شاہ ابوسعیدؒ کی صحبت پاک کا فیض سرسیّد احمد خان کی عقیدت کا محور و مرکز ہے۔ سرسیّد انہیں دادا ابا کہہ کر پکارتے تھے۔ (۷۲)

ہندوسیاست کی دانشِ جدید۔۔۔شری رام کرشنا سے گاندھی تک

ہندویت کی تاریخ کا فکر و فلسفہ جہاں عقل کے ہتھیار سے وقت کی رفتار کا ساتھ دیتا ہے، وہاں ہر قدم پہ نت نئے سانچے میں ڈھل جانا ہی ہندومت ہے۔ البتہ فکری جدل و جذب کا توشۂ تاریخ بھی ہندو تہذیب کا روایتی ہتھکنڈہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ جس قدر قدیم ہے اسی قدر جدید بھی ہے۔ کم وبیش گیارہ صدیاں مسلم ہندوستان (۷۱۲ء۔۱۸۵۷ء) میں پوری ہندودانش درباری رول بھی ادا کرتی رہی اور موقع بہ موقع اپنے سیاسی عزائم کو روبہ عمل لانے کیلئے بطور خاص مغلوں کے آخری دور میں برسرِ پیکار بھی رہی۔ البتہ فکری زاویے، بھگتی تحریک اور صوفیہ اسلام کی روشن خیالی، مذہبی رواداری اور وحدت آدم کے احساسات کی رعایت لیکر خود ہندومت بھی بھگت کبیر کے دوہوں اور گورونانک کے اشلوکوں میں ڈھل گیا۔ تاہم بدھ مت یا جین مت کی طرح اسلام کا ظاہر و باطن اس قدر مکمل اور الہامی تھا کہ ہندومت کے روایتی ہتھیار اور ہتھکنڈے اُسے مرعوب یا متاثر یا مدغم تو نہ کر پائے البتہ وحدت ادیان کی کوششوں کا ایک در ہے جو اکبر کی سیاست سیکولر اور دارالشکوہ کے فکر و فلسفہ کی چھایا میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ حالانکہ ہندویت (Hinduism) کا جدید دور تک کا دام اس کے دیگر تہذیبوں کو خود میں ضم کرنے یا مدغم کرنے کی روش کا مرہونِ منت ہے جس کی شرعی تاویل مولانا ابوالکلام آزادؒ کی وحدت ادیان کی قرآنی تفسیر اور اُن کی سیاسی زندگی کی کانگرسی تعبیر ہے۔ مسلمان بہرحال جس علاقے اور ملک میں بھی گئے، مقامی رنگ کے تمدنی رنگ میں زبان، لباس یا رہن سہن میں تو ضرور رنگے گئے مگر ان کی باطنی تہذیب کا روشن چہرہ ان کے تمدن کی وہ تاریخی پختگی ہے کہ بیچ دیوار کی صدیوں کی سکونتی رفاقت بھی ہندو مسلم کی عملی تفریق کو جھٹلا نہ سکی اور مسلمان اپنے تشخص کا دینی اظہار ہر دور میں کرتے چلے گئے۔ ہندومت اس پہلو سے صدیوں بعد آج بھی ناکام ہے حالانکہ بھارت میں کروڑوں مسلمان خود بھارت کی سرکاری روش سے پائمال ہیں مگر ان کی دینی قوت اور تہذیبی پختگی انہیں بھارت کے قومی دھارے میں مسلمان سے ہندو نہیں کر پائی، اور یہی صداقت صدیوں کا ورثہ بھی ہے۔ اس صریح صداقت کا جائزہ لیتے ہوئے نامور مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے صحیح لکھا ہے کہ

> ''برعظیم کی ملت اسلامیہ کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ انضمام کی تمام کوششوں کا مقابلہ کر کے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے، برعظیم میں ہندو، مسلم تعلقات کے اکثر علاقوں کا بنیادی ڈھانچہ ان ہی دو فطرتوں کے عمل اور ردِعمل سے بنا ہے۔'' (۷۳)

اسلام نے ہندومت کے اعتقادی نظام، بت پرستی بلکہ ذات پات کے نظام، کو وحدت آدم اور وحدتِ الٰہ کے تصور سے اجاگر کرنے کی اپنے طور پر سعی مشکور کی ہے۔ جس کا لابدی اور لازمی نتیجہ مقامی ہندوؤں کا قبول اسلام ہے، جو سراسر صوفیاء اسلام کا کرشمہ ہے۔ جہاں تک تعقل کی بادیہ پیمائی اور دلیل و منطق کی لفظیات کا تعلق ہے وہاں ہندومت کا روایتی ہتھکنڈہ عقل ہے۔ اس سارے معاملے میں عقل پرستی کا لفظ ان پر فرشتے اور تلک کی طرح سجتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ

ع   عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے

۱۸۵۷ء کے برطانوی غلبہ اور استعمار کی مغربی علوم وفکر بلکہ عیسائیت کی یلغار کا سامنا بھی ہندومت کے اِسی روایتی ہتھیار سے کیا گیا اور دوسروں کو دھیمی آنچ پہ پکانے کا عمل ہندوفکر کا احیائی ہتھکنڈہ ہے۔ جواہر لعل نہرو اسے اپنے الفاظ میں دوسروں سے استفادہ کا نام دیتا ہے۔ مگر یہ واضح نہیں کرتا کہ استفادہ کی نوعیت کیا ہے اور یہ فائدہ اصل میں ہے کس کا؟ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ویدانت میں بدھ مت کے افکار بلکہ اقتدار کو ہندومت میں جذب کرنے کا ایک جملہ لکھا ہے۔ ظاہر ہے یہی وطیرہ ہندومت (Hinduism) ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ہندومت نے ایک ہی معانقے میں بدھ مت کو جذب کر لیا''۔ البتہ مسلم ہندوستان کی کم وبیش گیارہ صدیوں میں ہندومت کی درمیانی راہ صرف بھگتی اور تصوف کے مشترکہ احساس کو وحدت ادیان تک لاتے لاتے اور چلتے رہنے کی روش ہے۔ رام اور رحیم کے الفاظ میں الہ کو سمونے کے جتن بھی بھجن ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور الہام کے آگے عقل عیار بے بس ہی رہی البتہ اس نے اپنے داخلی سماج کو مسلم اثرات سے بچانے کی اپنے طور اور ہر دور میں بھرپور کوشش کی ہے۔ بہر حال یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ صدیوں کی رفاقت کا انجام اور ہندو، مسلم ادغام بالکل کیا کبھی نہ ہو سکا اور نہ اس کے کوئی امکانات تھے، بلکہ اس پورے دور میں ہندو مسلم تعلقات کی معنوی روش یہ رہی ہے، ایک دوسرے کی ضد بلکہ

ع   ہم ہوئے کافر، تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

لیکن یورپی یلغار کا استقبال (بلکہ سواگت) ہندوازم نے اپنے روایتی طریقہ کار کے عین مطابق کیا اور صاف کہنا چاہیے کہ وہ اسلام کے مقابلے میں عیسائیت کے ساتھ اپنے روایتی ہتھکنڈہ کے استعمال میں غایت درجہ کامیاب ہو رہا ہے۔ یہی ان کی فکری روایت اور ان کے ابن وقت ہونے کی سچی تعریف بھی ہے۔

ع   گنگا گئے تو گنگارام، جمنا گئے تو جمنا داس

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا کہنا یہ ہے کہ

> ''دو صدیوں کے بعد جب مغربی تہذیب اور عیسائیت نے اس قسم کے مسائل (ہندومت کی کمزوریاں) پیش کیے تو ہندومت نے ان ہی (روایتی) طریقوں سے ان کا جواب دیا۔ اس نے برہمو سماج جیسے فرقے بنا ڈالے اس نے گاندھی اور نہرو جیسے مفکر پیدا کر دیے۔ اول الذکر عیسائی قدروں کے داعی کی حیثیت سے اتنی شہرت پا گیا کہ اسے اپنے عہد کا سب سے بڑا مثل مسیح انسان قرار دیا گیا۔ اور موخر الذکر بیسوی صدی کی زبان اس طرح بولتا ہے کہ وہ اس عہد کی تمام قدروں کا مجسمہ معلوم ہوتا ہے۔ اس ہتھیار کی افادیت حال اور مستقبل کے نظریاتی نظاموں کے خلاف خواہ کیسی بھی ثابت ہو، جہاں تک ماضی کا تعلق ہے، عیسائیت اور اسلام دونوں کے مقابلے میں یہ ہتھیار

موثر ثابت ہوا ہے۔''(۷۴)

خود انگریزی استعمار کا ہندوستان میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو توازن بھی ایک بنیادی وجہ تھی کہ انگریزوں نے دہلی کا تخت مسلمانوں ہی سے چھینا تھا اور وہ اس کے فطری حریف تھے، جبکہ مقامی آبادی اور اکثریت سے ہندو بطور حلیف کے سامراجی حکمت عملی اور بقائے اقتدار کا آزوبازو، تاہم علمی روایت کا فکری تعصب بھی اس حکمت عملی کا اصل حصہ تھا ، بلکہ آگے چل کر اپنے اقتدار کے دوام میں مقامی آبادی کی کثیر تعداد کا چلن ان کے دیو مالائی (Mythology) کے اوراقِ قدیم کا مرہون منت تھا، جو سنسکرت زبان کے اوقِ اوراق میں صرف برہمنوں کے پڑھنے کی متبرک کتب تھیں۔ اس امر کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے مسیحی یورپ کی روایتی مسلم دشمنی کا بھی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> ''مسلمانوں اور ہندوؤں کے متعلق انگریزوں کے طرز عمل پر ایک طرف اسلام کے خلاف یورپ کے روایتی تعصب اور دوسری طرف سنسکرت ادب اور ہندو فلسفے کیلئے یورپ کی ہمدردی کا بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ اول الذکر اثر سے صلیبی جنگوں کی مخفی یادیں بیدار ہوتی ہیں اور موخر الذکر اثر سے مشترک آریائی ماضی پر افتخار میں اضافہ ہوتا ہے۔''(۷۵)

بلکہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے حاشیے میں میکس مولر (Max Muller) (۱۸۲۳۔۱۹۰۰ء) کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جس نے ہندوؤں کے سنسکرت کلام اور خاص طور پر ویدوں کا انگریزی ترجمہ کر کے ہندوؤں کی بڑی خدمت کی ہے اور خود مغرب کو ہندوؤں کے علوم و فنون سے آشنا کیا ہے بلکہ انہوں نے وحدت الوجودی معروف فلسفی اسپنوزا (Spinoza) (۱۶۳۲۔۱۶۷۷) کا بھی اس ضمن میں نام لیا ہے جس پر ہندو اثرات پائے جاتے ہیں، خاص طور پر وحدت الوجود کے نظریات اسپنوزا کا فکری جامہ ہے۔

شری رام کرشنا (۱۹۳۶۔۱۸۸۶) اور اس کے نامور شاگرد سوامی وویکانند (۱۸۳۲۔۱۹۰۲ء) فکری محاذ پر ہندو ازم کے جدید احیائی مفکرین ہیں جس میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہندو دانش کا ایک مربوط سلسلہ فکر ہے اور عمل بھی بلکہ گزشتہ دو صدیوں سے ہندو دانش و بینش کا تہذیبی ملاپ، مغرب کے سنگم پر اس فکر و فلسفہ کی عصری جھلک ہے۔ جہاں پر جدید ہندوستان اپنی روایتی پرتیں (Variations) کھول رہا ہے۔ یہ مغربی ساز و آواز اور مغرب کے سنگ چلنے کی روش ہی نہیں ، برطانوی استعمار کا ہندو تجربہ کہنا ہوگا۔ مگر یہ تجربہ رہا کیسا یہ سوامی وویکانند کا یورپی دورہ، خاص طور پر شکاگو (امریکہ) میں ۱۸۹۳ء میں ان کا معروف لیکچر ''ہندو دھرم ایک عالمی دھرم'' کا ابلاغ و اظہار گویا قدیم و جدید کا امتزاج ہی تو ہے۔ جو ہندویت کی داخلی نفس کشی یا نفس پرستی دونوں ٹانگوں پر کھڑا بگلہ بھگت ہے۔ کہیں شکار نظر پڑے تو پھر نفس کی غذا چننے کیا اس پر جھپٹنے کے انداز ملاحظہ کرنے کا منظر ہوگا۔ بلکہ بے حس و حرکت اور ساکت بگلے کی برق رفتاری یہ ڈپلومیسی کا دھیما ہندو مزاج اور برتری اور بالادستی کی جنگ کا الاؤ بھی ہے مگر عملاً ہوا کیا، یہی کہ یورپی دورے نے وویکانند کو یورپی فکر و فلسفہ اور مادی ترقی کی

چکا چوند میں نقدِ جاں ہار دینے کا عندیہ دیا۔ یہ حکمت عملی بھی ہے اور دوسروں سے جذب و انضمام کی روایتی ہندو حکمت عملی بھی، مگر ان کے تاثرات پڑھنے سے تو ایسا ہی لگا کہ انہوں نے مغربی تہذیب و تمدن کے آگے مکمل طور پر ہتھیار پھینک دیئے ہیں۔ اوپر گاندھی اور نہرو پر وویکا نند کے فکری اثرات کا تذکرہ ہوا ہے۔ ہندو دانش کا یہ نمونہ بہر حال جدید بھارت کی روحِ رواں قرار دینا پڑیگا۔ بلکہ ہندو سیاست کیا خود ہندو ریاست، دونوں کا ملاپ، شری راما کرشنا اور سوامی وویکا نند کے گرد پھیرے دیتی نظر آئے گی۔ ہندو سیاست کے مآخذ جدید دور میں کیا ہیں اس کا سادہ سا جواب یہی ہے کہ

''آج کی پوری ہندو سیاست پر اگر غور سے نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی طرح کے تہذیبی سفر سے پھوٹ رہی ہے۔ یعنی یہ کہ ماضی قریب کی ہندو دانش میں اہم ترین شری راما کرشنا ہیں، جن کے شاگرد سوامی وویکا نند کو جدید ہندو علوم میں مرکزی اہمیت حاصل ہے اور گاندھی پر وویکا نند کے گہرے اثرات ہیں۔''(۷۶)

ہندویت کا تہذیبی سفر جو تقریباً ۵۰۰ قبل مسیح سے ریکارڈ پر ہے، البتہ اس کی کئی کڑیاں تاریخی اعتبار سے گم بھی ہیں اور کم بھی۔ تاہم اطاعت و سرکشی، دونوں کیلئے موزوں، موقع شناسی ہی ہندو تہذیب کی داخلی روایت کا عملی پرتو ہے۔ اگر پاکستان، بھارت تعلقات کے پس منظر میں بات، روش کے طور پر کہنا ہو تو یہ ہندو روایت کا تاریخی توشہ ہے جو حقیقتاً ''سمجھوتہ ایکسپرس'' ہے۔ یہ گاڑی یا ریل گاڑی نہیں رویہ ہے، سوچ ہے۔ وویکا نند کے ان افکار کا بدیہی اثر ہندو فکر و فلسفہ کے جدید شارحین پر اسقدر پڑا ہے کہ وہ اپنی اصل کیلئے مغرب سے سمجھوتہ نہیں معانقہ بھی کیے دیتے ہیں۔ ایک جائزہ سراج منیر ہی کے ہاں ہے، لکھتے ہیں۔

> ''عہد استعمار میں ہندو مت کے مستند نقطہ ہائے نظر مغربی افکار کی یلغار کے سامنے یکے بعد دیگرے اعتراف شکست کرنے چلے گئے، سوامی وویکا نند کے سفر امریکہ کے تاثرات اگر پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کی تہذیب کے حیاتی مظاہر نے اس وقت کے ہندو ذہن میں کتنی حیرت پیدا کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تصورات ہندو اصطلاحوں میں بیان ہونے شروع ہو گئے حتیٰ کہ دو قدم آگے بڑھ کر اندازہ ہوگا کہ ہندو علوم اٹھارویں صدی کے مغربی تصورات کی شرح بن کر رہ گئے۔ اس کی بہترین مثال ڈاکٹر رادھا کرشنن اور اس سے بھی ایک قدم آگے نرادی چوہدری جیسے شارحین ہیں۔''(۷۷)

انڈین نیشنل کانگرس کی جدوجہد آزادی کے نامور نام، گاندھی پر وویکا نند کے اثرات کا تذکرہ دوبارآ چکا ہے۔ مغربی تہذیب و تعلیم کا ہندو مزاج اپنی جگہ، اپنی اصل پر نظر مرکوز رکھنا بہر حال ہندو تہذیب کا روایتی وصف ہے۔ اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ مغربی نظریۂ وطن اور اکثریت کے جمہوری اصولوں پر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلانے کا شوق بلکہ شرف بھارتی ڈپلومیسی کا مغربی ماسک (Mask) ہے۔ مگر عملاً بھارت کے اندر واقعتاً شرف و مجد انسانی کا وہی تصور جمہوریت

ہے جو مغربی ادراک کا خاصہ ہے، اس پر بحث کی بہت گنجائش ہے۔ کانگرس کی تنظیم انگریزی تعلیم، پارلیمانی جمہوریت کے تمام تر برطانوی ادراک کا فائدہ بھی ہندویت کے تہذیبی سفر کا حاصلِ زمانہ ہے۔ البتہ سیکولر جمہوریہ بھارت کے باپو(Father of the Nation) بیرسٹر کا گاؤن اتار کر لنگوٹی اور لاٹھی کی ہیئت کذائی کے ساتھ عدم تشدد، ستیہ گرہ (ضبط نفس) بلکہ تزکیہ نفس کیلئے آشرم (خانقاہ)، اناج سے پرہیز بلکہ اُردو زبان میں بیرسا برمتی ہیں ہندو سیاست کے تشکیلی زاویے اور فکری رویے اپنی جگہ خود گاندھی کی تہذیب جدید اور مغرب سے فکری ہم آہنگی اور ودیکانند یا برہمو سماج سے وابستگی اور دل بستگی کی تہہ میں کیا ہے اور گاندھی کے اپنے من مندر میں کیا ہے، یہ رام باہر آ گیا ہے۔ گاندھی آزادی ہند کا خواہاں تھا مگر ہندوؤں کی قوم کی آزادی کا۔ بہرحال یہ بات لائق تذکرہ ہے اور اس سے گاندھی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس نے بارہ صدیوں بعد نہ صرف ہندو قوم کو ایک بنایا، ملک بھارت لیکر دیا بلکہ ایک منظم طریقے سے ہندو قوم کا جدید ایڈیشن تیار کر کے چھوڑا، جس میں برہمن کی برتری بدستور قائم ہے، جبکہ اچھوت، ہریجن (خدا کی اولاد) بنا کر انہیں ان کے لیڈر ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کو اپنے دستور کے حوالے کر دیا۔ یہ بات گاندھی کے اپنے الفاظ کا مذہبی الاؤ ہے کہ عندیہ جو کچھ ہے وہ کم و بیش یہ کہ:

> ''گاندھی بھارت میں رام راجیہ قائم کرنا چاہتے تھے اور ہندو قوم کی آزادی (سوراج) کا نصب العین (آئیڈیل) رام راجیہ ہے، جس کے معنی ہیں، مذہب کی حکومت۔ اس کی بظاہر صورت تو سیکولر مکھڑا ہے مگر بباطن ہندو مذہب کا عملی ادب، سروپ۔ اگر یہ بات خود گاندھی سے پوچھنا ہو تو وہ بتاتے ہیں کہ ''میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں کہ میں دنیا میں بدکردار ہونے سے بچا تو صرف ''رام نام'' کی بدولت اور جب میں مشکلات میں گھرا ہوں تو میں نے ''رام نام'' لیا ہے اور میں بچ گیا ہوں۔'' بلکہ انکے آخری لمحات میں آخری الفاظ تھے بھی رام رام۔'' (۷۸)

سچ تو یہ کہ برعظیم میں ہندو قوم نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنے بارہ صدیوں کے مسلم دور (Muslim Rule) کے غروب کے بعد اپنا طلوع شروع کیا ہے۔ تاریخ کی زبان میں بلکہ تحقیق کی نپی تلی بولی میں بات کرنا ہو تو کہنا چاہیے ۱۸۵۷ء کا انقلاب جہاں ایک عہد (مسلم) کا خاتمہ تھا وہاں یہ انقلاب ایک نئے عہد (ہندو) کی تمہید بھی تھا۔ جس کی بدیہی صدورت تو انڈین نیشنل کانگرس کی سیاسی تنظیم ہے مگر فی الواقعہ یہ ہندویت کی جدید تجسیم اور نیشنلزم کی جغرافیائی تقسیم تھی جبکہ اسے بھارت جیسا ملک ایک منظم اور مربوط نظام حکومت ورثے میں ملا ہے۔ جدید تعلیم کیلئے تعلیمی اداروں کا جال یہاں تک کہ کلکتہ، مدراس بلکہ بمبئی میں تو ۱۸۵۷ء سے یونیورسٹیاں قائم تھیں جو کام کر رہی تھیں۔ برہمو سماج، آریہ سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، جنوب مشرق بلکہ شمال اور مغرب کے پورے ہندوستان میں ہندو انجمن، آشرم (ہاسٹل) دھیمی رفتار سے ملازمتوں، تجارت، زراعت بلکہ رسل و رسائل پر بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ چھا جانے کا نام ہندازم کا برطانوی ہند ہے۔ کانگرس میں گوکھلے سے

تلک تک اور سوبھاش چندر بوس سے گاندھی تک ہندو قوم کے منظم، مربوط اور مسلسل شعور عقل کے چرخے کی رفتار ہے۔ اس عدم تشدد کی سیاست ہو کہ تشدد کی سیاست (آزاد ہند فوج) ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں ریل کی پٹریاں اکھاڑنا ہوں کہ ریل میں بلا ٹکٹ سفر، قوانین کی تذلیل کرنا ہو کہ دھرنا یا ہڑتالیں، جیل بھرو تحریک ہو کہ مذاکرات، خط و کتابت ہو کہ بائیکاٹ، راج گوپال اچاریہ کو قائداعظمؒ سے پاکستان مان لینے کا فارمولا ہو، کہ اُسے کانگرس کمیٹی سے نکالا باہر کرنے کا حربہ، یہاں تک کہ بمبئی میں اس پر ٹماٹروں کی بوچھاڑ، یہ گاندھی کے سمندھی ہیں اور آزاد بھارت کے ماؤنٹ بیٹن سے کام نکلوانے کے بعد، پہلے ہندوستانی گورنر جنرل بھی راج گوپال اچاریہ ہی ہیں۔ ۱۹۳۸ء کے فیض پور کانگرس کے صدر آتش بجاں بنگالی نیتا سبھاش چندر بوس کے خلاف گاندھی نے برت رکھ کر اسے کانگرس کے صدر سے معزول کرایا، مگر ۱۹۴۵ء میں آزاد فوج کے تشدد اور مسلح بغاوت کے اقدامات کو اس لئے پذیرائی اور ہمنواہی بخشی کہ ''ہندوستان آزاد ہوگا اور آخر میں ہماری کامیابی ہوگی'' سبھاش چندر بوس کے یہ الفاظ ہندو سیاست کا مزاج اور (Negation) نہیں حقیقی مزاج ہے۔ جیسا مزاج ویسا کاج، اہلیت کی پہچان کے مطابق کام لینا بھی تو حکمت عملی ہے۔ لال قلعہ دہلی میں آزاد ہند فوج کے باغیوں کا مقدمہ لڑنے عدم تشدد کے پرستار جواہر لعل نہرو پہلی دفعہ وکالت کا گاؤن پہن کر کیا آئے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کانگرس کو اسی مقدمہ کی عوامی ہمدردی نے جتوائے، اس لئے قائداعظمؒ نے بروقت انتباہ کیا تھا کہ یہ انتخابات جیتنے کا حربہ ہے، اور یہی ہندو مت ہے۔ جو برقرار ہے جس کی سرشت یہ ہے کہ

جنم ہمیں لینا ہوگا کئی کئی بار

ہندو مسلم، اتحاد کی سعی رائیگاں۔۔۔ جناحؒ سے محمد علی جوہرؒ تک

برطانوی تسلط کی تکمیل ہو جانے کے بعد برعظیم میں برطانوی تاج کے تحت سیاسی، انتظامی اور آئینی اداروں کو پروان چڑھانے کے سیاسی مواقع شروع ہوئے تو انقلاب ۱۸۵۷ء کو پچاس برس بیت چکے تھے۔ اسی دوران برطانوی حکام اپنے قدم بڑی مضبوطی کے ساتھ برعظیم میں جما چکے تھے۔ اب اداروں کی تشکیل اور پہلے کے مغل یا دیسی حکمرانوں کے بنائے نظام کی توڑ پھوڑ کے بعد، انگریزی دفتری زبان اور ایڈمنسٹریشن بلکہ تعلیم کا جدید برطانوی نظام کلکتہ تب (انگریزوں کا اولین) دارالحکومت میں مدرسہ عالیہ سے آغاز ہو چکا تھا اور دفتری امور چلانے کیلئے بنگالی بابوؤں بلکہ ہندوؤں کی ایک کھیپ نئی ملازمتیں سنبھال چکی تھی کہ ۱۹۰۵ء میں محض انتظامی سہولت کیلئے انگریزوں نے بنگال کی انتظامی تقسیم کر کے، مشرقی بنگال اور مغربی بنگال بنا دیئے۔ اتفاق سے اس اقدام کے نتیجے میں مشرقی بنگال کی مسلم اکثریت کو ہندو ساہوکاروں اور کلکتہ کے ہندو تاجر کی سود خوری اور جائیداد ضبطی کی مشکل سے کسی قدر نجات کی صورت پیدا ہوگئی۔ مشرقی بنگال (اب بنگلہ دیش) کی اس انتظامی تقسیم نے مغربی بنگال کے جدید انگریزی تعلیم سے آراستہ اور بظاہر تعلیم یافتہ بنگالی ہندوؤں کو انتقامی تجسیم میں بدل دیا۔ دو قومی نظریہ عملی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اب نظریہ عمل بلکہ ردِعمل میں ڈھلنے لگا۔ بنگال میں انگریز حکمرانوں کے اس فیصلے

کے خلاف باقاعدہ سیاسی ہی نہیں انتقامی اور دہشت گردی (ٹررسٹوں) کی کاروائیاں شروع ہوگئیں۔مسٹر آربندو گھوش اپنی سیاست کا آغاز اسی دہشت گردی سے کرتے ہیں اور انہوں نے کلکتہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ ہندو ساہوکار، تاجر اور ملازم بلکہ سیاسی دہشت گرد یکجا اور یکجان ہو گئے۔انہوں نے انگریز حکام کے ناک میں دم کر دیا اور تو اور مسلمانوں نے اس صورت حال سے یکسر سراسیمگی محسوس کی کہ کلکتہ کا دارلحکومت اور برطانوی مقتدر حکام سے اپنا مطالبہ منوانے کیلئے دہشت و تشدد کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ کلکتہ کے امام ابوالکلام جو آگے چل کر مولانا ابوالکلام آزادؒ کے نام سے متحدہ قومیت کے نامور ترجمان بنے پہلی دفعہ ان مسلم دشمن اور ملت دشمن ہندو بنگالی دہشت گردوں تک بمشکل رسائی حاصل کرتے ہیں اور پھر ہندوؤں کے دہشت گرد رہنماؤں (نیتاؤں) کا بالآخر اعتماد حاصل کر کے اس کے ساتھی بن کر صوبہ سرحد سے ان ہندو دہشت گردوں کو خفیہ اسلحہ سپلائی کرتے ہیں۔مولانا ابولکلام آزادؒ کے رفیق کار مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ''ذکر آزاد'' میں لکھتے ہیں۔

> ''شروع شروع میں مولانا تشدد پسند انقلابیوں کے ساتھ تھے اور ہندوستان میں مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ایک طرف بنگال کے انقلابیوں کے ساتھ تعلقات استوار تھے دوسری طرف سرحد کے قبائل میں ان کے آدمی کام کر رہے تھے۔شیخ الہند مولانا محمود حسن، اور مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم سے بھی رشتہ مضبوط تھا۔ جب میں ان کی رفاقت (۱۹۲۰ء) میں آیا تو اس وقت تک مولانا مسلح بغاوت ہی کے قائل تھے۔ایک دفعہ خود مجھے ایک جگہ بھیجا اور میں دو درجن پستول لے آیا جو انہوں نے کسی اور کے ہاتھ کہیں بھیج دیئے تھے۔(۷۹)

پاکستان میں مولانا ابولکلام آزادؒ کے سب سے زیادہ مؤید اور قلمی مرید آغا شورش کاشمیری ہی نے ''مولانا ابولکلام آزادؒ، افکار و سوانح'' میں مولانا ابوالکلام آزادؒ ہی کی زبان میں ان کی یہ کہانی سناتے ہیں۔مولانا ابولکلام آزادؒ فرماتے ہیں۔

> ا۔''لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا فیصلہ کیا تو ایک زبردست سیاسی و انقلابی جوش پیدا اور کارفرما ہوا۔شری آربندو گھوش بڑودہ سے کلکتے آ گئے، تاکہ اس شہر کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائیں۔ان کا اخبار ''کرم لوگن'' قومی بیداری کا نشان اور غیر ملکی حکومت کے خلاف جنگ کا جھنڈا بن کر لہرانے لگا ان سے میری دو تین موقعوں پر ملاقات ہوئی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلابی سیاست کیلئے میرے دل میں ایک کشش پیدا ہوئی، اور میں ان کے گروپ میں شامل ہو گیا۔'' (۸۰)
>
> ۲۔''شری شیام سندر چکرورتی اس دور کے انقلابیوں (ٹیررسٹوں) میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ان کی وساطت سے میں انقلابیوں سے ملا۔ وہ انقلابی مسلمانوں سے بدظن تھے اور اپنے رفقاء متوسط طبقے کے ہندوؤں میں سے چنا کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں برطانوی

حکومت نے مسلمانوں کو اپنے لیے آلۂ کار بنا رکھا ہے اور وہ اس کے اشارے پر چلتے ہیں۔"(۸۱)

ہندو سیاست کے ذہن جدید میں شری آربندو گھوش کا مقام ان اولین فکری رہنماؤں اور عملی کارپردازوں میں ہے جنہوں نے ہندو ذہن کو خود اعتمادی کے ساتھ ہر طریقے سے اپنے مقاصد کی تکمیل کا حوصلہ دیا۔ ان کی کتاب "The Divine Life" کی دو جلدیں پڑھیں تو اعتقاد اور فکر کے بعد عمل کی دنیا میں کارگزاری کیلئے، جو تلقین اور یقین وہ بتاتے اور بیان کرتے ہیں وہاں سے آریہ سماج کے احساس برتری، یا برہمن کی طرزِ فکر سے اس کی ماحولیاتی صورت کا تقدس بھی جھلکتا ہے، مگر مادہ اور روح، نظریہ اور عمل کی جدید ہندو دانش کا فکری پرتو بھی نمایاں ہے۔ یہی سبب تھا کہ تقسیم بنگال میں متوسط طبقے کو آلہ کار بنانا بھی اُسی حکمت عملی کا عکس ہے کہ غریب کا بچہ بک جائے گا اور بک بک جائے، درمیانہ طبقہ نظریہ اور عقیدہ میں ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ دوسرے ہندویت (Hinduism) کا جدید ذہن بلکہ ہندو دانش کا فکری عملی اور بالآخر تربیتی مقام، آربندو آشرم "پانڈی چری" بنا جہاں افراد سازی کا جدید ہندو ذہن، برعظیم پر اپنی نسلی برتری اور حکمرانی کے خواب ۱۹۰۰ء ہی سے دیکھنے لگا تھا۔ البتہ ان ہندو دانشور سیاسی دہشت گردوں میں مسلمان ابوالکلامؒ کی سیاست کا آغاز اور اسلحہ کی سپلائی اور ہندو دہشت گردی میں اعتماد ان کی شخصی حیثیت کا متنازعہ سیاسی ایجنڈا ہے، لیکن مسلمانوں کے بارے میں ہندو تشدد پسند بنگالی کارکنوں کی زبان سے تقسیم بنگال پر آتش بجاں ہندو کی زبان سے جو جملہ مولانا آزاد نے بحیثیت تبصرہ نقل کیا ہے، عجب بات ہے کہ یہ جملہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۵۸ء تک مولانا ابوالکلامؒ آزاد کی حیات مستعار تک مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور وہ بھی مسلم لیگ کے پرچم تلے قائداعظم کی قیادت میں قیام پاکستان ایک قوم پرست، (خدا پرست نہیں) مذہبی مدرسین اور ملاؤں ہی کیا خود نیشنلسٹ سیاست کے تمام پرستاروں کا فکری خلاصہ اور خاصہ ہے کہ برعظیم میں مسلمان انگریزوں کا ایجنٹ ، مسلم لیگ انگریز سے ہمنوائی، بلکہ پاکستان تک انگریزوں کی ایجاد ہے۔ یہ ہندوؤں کی روح ہے کہ ابوالکلام کا ارشاد، یہ ایک جملہ ہی نیشنلسٹ فکر و فلسفہ کا ترجمان ہے جو مسلمانوں میں متحدہ قومیت اور تا حال پاک، بھارت تعلقات کی ہندو سیاست کا وہ حربہ ہے جو مسلمانوں میں متحدہ قومیت کے غیر اسلامی فلسفے کی یکسر ناکامی کے بعد انگریز دشمنی کے مسلم الاؤ کو مسلم مذہبی رہنماؤں اور بعض گاندھی کے مسلم متبعین (Followers) کیلئے حریت مآب، باپ دادا کی موروثی سیاست کا خاندانی فخر ہے۔ ہندوؤں میں ایک بازو، انگریز سے آزادی کیلئے برسرِ پیکار، مگر مرحلہ وار ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے سالانہ کانگرس سیشن میں گاندھی کو مولانا حسرت موہانی کی کامل آزادی کی قرارداد منظور نہیں، ڈومینن سٹیٹس درکار ہے اور وہ ان کے مرشد زادے مولانا عبدالباری فرنگی محل کے ذریعے انہیں چپ کراتے ہیں، اور مولانا حسرت موہانی مستقل طور پر کانگرس سے روٹھ جاتے ہیں جبکہ ۱۹۲۹ء میں مسلمانوں کی مکمل طور پر مت مارنے کے بعد پورے ہندوستان کا واحد ترجمان بننے کا دعویٰ لیکر لاہور کے سالانہ اجلاس کانگرس میں راوی کنارے آزادی کامل کا ریزولیشن پاس کیا کہ اب پھل پک چکا تھا، آزادی میں مسلمانوں کا حصہ کہاں یہ تو مقصد تک نہ تھا۔ یہ تھی ہندو ازم کی صدیوں پرانی ادغام پالیسی۔ مسلمان شاید اپنے اقتدار کے باعث بارہ

صدیاں تو ہندو مت میں مدغم نہ ہو سکا، اب غلام ہندو نے غلام ہندوستان میں اپنے سابق اور صدیوں پرانے آقا کو پہلے تو مدہم کیا پھر تحریک خلافت میں مدہوش، پھر ہندو مسلم فسادات سے خاموش اور جب جناحؒ اور اسکی مسلم لیگ کا مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ اس قدر ٹیڑھا ہو گیا تو اس کے مذہبی ملاؤں کا ایک گروہ اکثریتی مسلم پنجاب میں کانگرس کا حمایتی بنایا گیا اور مجلس احرار اسلام کی بنیاد اس کانگرس کے سالانہ اجلاس کے پنڈال میں پڑی۔ نام تک مولانا آزاد نے تجویز کیا، گویا کانگرس نے مسلمانوں کو بالآخر عملاً یہ باور کرا کے چھوڑا کہ مستقبل کے دستوری نقشے یا مستقبل کے بھارت میں صرف تمہیں کانگرس کی ہاں ملانے کا نام متحدہ قومیت ہوگا۔ گویا متحدہ قومیت پر ایمان خود سپردگی کی عملی شکل ہے۔ اگر الگ ملک اور علیحدہ وجود یہاں تک جداگانہ انتخاب اور حق نمائندگی کی بات کی تو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر تب محمد علی جناحؒ ہو کہ ہندو مسلم اتحاد کا اسیر، مولانا محمد علی جوہرؒ یہاں تک کہ حُریت کا فقیر مولانا حسرت موہانیؒ، انکی آل انڈیا کانگرس میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ آل انڈیا کا بدیہی مطلب واضح ثبوت، تاریخی کردار آل انڈیا صرف ہندو انڈیا ہے وہاں کوئی مسلمان قوم الگ سے، علیحدہ سے تسلیم نہیں کی جاسکتی ہے حالانکہ ابھی انگریز کا اقتدار باقی تھا۔ حد یہ ہے کہ غلام ہندو تک نے مسلمان کو اپنا غلام بنانا چاہا۔ اور ۱۹۴۷ء کے آخر تک بلکہ آخری وقت تک انگریز حکمران اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس امر میں یکسو، یکساں اور کوشاں رہے کہ مسلمانوں کو آزادی نصیب نہ ہو۔ ان کا آزاد وطن کوئی نہ ہو بلکہ پورے ہندوستان کو انڈین کانگرس کے حوالے کرنے کا نام تحریک آزادی اور اس کا حاصل جدوجہد، بھارت بلکہ اکھنڈ بھارت ہو۔ ہندو مسلم اتحاد نہیں ہندو مسلم ادغام ہی وہ مختلف محاذ تھے جہاں آتش بجاں بنگالی مزاج سبھاش چندر بوس ۱۹۴۵ء کی آزاد ہند فوج کا نیتا جی ہے۔ وہاں ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج اپنے حتمی مطمع نظر اور مقصد (Goal) کیلئے "ہندی، ہندو، ہندوستان" کے نعرہ کے ساتھ حالات میں اپنی راہ بناتا رہا۔ جبکہ سیاسی اقتدار کیلئے انڈین نیشنل کانگرس اپنے موقع کی مناسبت سے اپنے پتے کھیلتی، پڑت کھولتی بلکہ زبان بولتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا مطلب ہندوؤں کی آزادی ہے۔ بعض کانگرسی ملاؤں کے مطابق مسلمانوں کی آزادی کا مطلب انگریز پرستی ہے۔ انگریزی سازش ہے۔ اقبالؒ و قائدؒ بلکہ سر سید احمد خانؒ انگریز کے ایجنٹ تھے۔ سر آغا خان نے وائسرائے کے ایماء اور اشارے پر شملہ وفد ۱۹۰۵ء میں تشکیل دیا تھا کیونکہ انگریز لڑاؤ اور حکومت کرو، (Divide & Rule) کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے تھے اور جب ۱۹۴۲ء میں کانگرس نے انگریزوں کو ہندوستان سے بھگانے کیلئے ہندوستان چھوڑ دو (Quite India) تحریک شروع کی تو قائداعظمؒ نے بجا طور پر مسلم قوم کا موقف بیان کیا کہ (Divid & Quite) تقسیم ملک کرو اور جاؤ شاید یہ Divid بھی روایتی متحدہ قومیت کے پرستاروں کا مذہبی ہیجان ہے۔ وہ اکھنڈ بھارت کے ہندو مہاسبھا اور اب آر۔ ایس۔ ایس کے سربراہ ایس سدرشن کی طرح تقسیم ہند کے خلاف ہیں، اور بلکہ پاکستان کا کھا کر، یہاں کے معاشی، سماجی، اور مالی مفادات بلکہ قائداعظمؒ کی تصویر والے نوٹ کما کر، اپنے شخصی وجود، نظریاتی شہود کی چلتی پھرتی تذلیل ہیں، تلبیس ہیں، بلکہ تکذیب بھی۔ انصاف، عقل اور غیرت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ایسے ملت دشمن اور ملک دشمن لوگ اپنے خوابوں کی سرزمین

اور گم گشتہ جنت کو سدھاریں، اور گاندھی کے فکر و فلسفہ کے دیش بھارت میں جا بسیں کہ وہاں متحدہ قومیت کی علی گڑھ نہیں تو دارالعلوم دیوبند کا مدرسہ تو ان کی عقیدت اور عقیدہ کا مرکزِ نگاہ ہے۔ باسٹھ برس کی تاریخ کا چہرہ اس قدر روشن ہے کہ اس کے آئینہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے فکر و عمل اور اس برعظیم کی ملت اسلامیہ کا چہرہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ اگر یہ بات دل کو اچھی نہ لگے تو بیسویں صدی کے انجام پر اپنے ملت گریز رویہ سے رجوع نہیں ہو سکا تو اپنے انجام کی ایک جھلک اکیسویں صدی کے روشن طلوع میں ملاحظہ کرنے کی چیز ہیں جس میں دارالعلوم دیوبند کے بانی اور سرسید احمد خان کے ہم عصر بلکہ ہم درس مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی خدمات جلیلہ پر بھارت کی راجدھانی دلی کے تال کٹورہ سٹیڈیم میں ایک سیمینار، دارالعلوم دیوبند ہی کے ابنائے قدیم (Old Boys) کے زیر اہتمام ہوا ہے۔ اس میں خطبہ استقبالیہ کی سطور اس قابل ہیں کہ بھارت میں گذشتہ ۶۲ برس میں متحدہ قومیت کا مسلمان تجربہ اور مشاہدہ دونوں بول رہے ہیں۔ یہ تجربہ کیا کہتا ہے صرف دارالعلوم دیوبند کے ماننے والے بعض پاکستانی زعماء اور علماء یہ آواز سنیں کہ اقبالؒ نے ان کے نقطہ نظر سے شاید غلط نہیں کہا تھا کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

وہ لوگ مصرع ثانی میں جو

ع ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

کی بجائے جو مولانا ابوالکلام آزاد کو 'اسلام ہے مولانا آزاد' سمجھتے ہیں تو انہیں اگر وقت کا فیصلہ اور تاریخ کا روشن چہرہ اپنے افکار، کردار، رزق اور شہرت پر اب بھی شک رہتا ہے تو اپنے وجود پر اصرار کرنے کیلئے، دارالعلوم دیوبند کے بانی پر سیمینار کا خطبہ استقبالیہ ان تک پہنچا نہ ہو تو اس خطبے میں اپنا نہیں تو امام نانوتویؒ کے دارالعلوم کے نیاز مند شاگردوں کی کہانی سنیں، متحدہ قومیت کے ۶۲ سالہ مسلمان تجربے کا نہیں، مذہبی تجربے کا یہ آئینہ کیسی تصویر دیکھا تا ہے، صرف ایک پیرا ہی کافی ہے جس میں متحدہ قومیت کی جنم بھومی، بھارت میں متحدہ قومیت ہی کے سب بڑے علمبردار، دارالعلوم دیوبند کے مدرسین کا حاصل تجربہ، وہ جادو ہے جو سر چڑھ کے بول رہا ہے، بول اٹھا ہے۔ نئی دہلی کا سہ روزہ دعوتِ غور و فکر ہی نہیں متحدہ قومیت کے سیاسی نقطہ نظر سے رجوع اور توبہ کا مقام رپوٹ کرتا ہے کہ

> ''گذشتہ ۲۰ تا ۲۳ مئی ۲۰۰۰ء کو نئی دہلی کے تال کٹورہ اندور سٹیڈیم میں دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر تین روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں بھارت بھر سے ممتاز علماء، مختلف جماعتوں کے سربراہ اور قائدین اور دانشوروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سیمینار کا اہتمام ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نے کیا تھا۔ خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے مولانا محمد عبداللہ مغیثی نے کہا:۔
>
> ''آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل جن حالات میں امام محمد قاسم نانوتویؒ نے تحریک دیوبند کی بنیاد ڈالی

تھی، جس نے احیاءِ امت اور احیائے اسلام کے ساتھ ساتھ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی اسلامی شناخت کو باقی رکھنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ آثار بتا رہے ہیں کہ ہم پھر کچھ اسی قسم کے تشویشناک حالات سے دوچار ہونے والے ہیں۔

آج پھر ہماری شریعت، ہماری عبادت گاہیں، اور ہمارے مدارس و مکاتب نشانے پر ہیں۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم منصوبہ بند طریقے پر درپیش مسائل و خطرات کا مقابلہ کریں اور بانی تحریک دیوبند کے کارناموں کا مطالعہ کریں، جنہوں نے ڈیڑھ سو سال پیشتر آج سے زیادہ تشویشناک حالات و خطرات میں گھرے برصغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی کی تھی۔'' (۸۲)

تاریخ کا تجزیہ ہے کہ دیوبند نے مذہب کو اور علی گڑھ نے مسلم قوم کو بچایا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمانانِ ہند کے تھکے حوصلوں اور پژمردوں میں زوالِ مکمل کو جس شخص نے نئی راہیں اور ہمت اور حوصلے سے مسلسل جدوجہد کی راہ دکھائی وہ سرسید احمد خانؒ اور ان کی جدید تعلیم کی تحریکِ علی گڑھ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد خود برعظیم کی ملت اسلامیہ میں حالات کے منجدھار میں تین طرح کے طبقے وجود میں آ گئے ایک تو دارالعلوم دیوبند کے اولین مجاہدین اور ان کے مرشد و مبداء حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تھے جو سلسلہ عالیہ چشتیہ، صابریہ کے شیخ تھے، اور انہوں نے نانوتہ، شاملی، تھانہ بھون، لکھنوتی اور اس کے گرد و نواح میں انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا ان میں شہداء عوام کے ساتھ ساتھ علماء بھی شہید ہوئے۔ البتہ یہ لڑائی بہادر شاہ ظفر کے نام پر مرکزی کمان جنرل بخت کے تحت نہ تھی، علماء دیوبند کے موسیین نے اپنے علاقے میں اپنے طور پر لڑی، اور شہادت اور قربانی کے باوجود شکست سے دوچار ہو کر حضرت حاجی امداد اللہؒ نے مکہ مکرمہ ہجرت فرمائی اور باقی عمر وہیں بتا کر وہیں وفات پائی۔ ظاہر ہے اس گروہ مجاہدین سے وابستہ علماء انگریز کے شدید ترین دشمن اور انگریزی سامراج کے شدید ترین مخالف تھے۔ ان کی مخالفت بلکہ نفرت اور بغاوت کے حق بجانب ہونے میں کبھی بھی اور کسی کو بھی اعتراض نہیں رہا۔ بلکہ علماء کی شہادت اور ان کے ایثار و اخلاص اور امت کے مصائب اور دین میں شدائد پر، براہ راست قربانی، مسلمان دلوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ لیکن جس بات نے برعظیم کی ملت اسلامیہ کو ۱۸۵۷ء کے بعد حالات کے حوالے کیا، دیوبند میں بعد کے مدرسین نے انگریز سے نفرت کو انگریزی زبان، تعلیم اور انتظامیہ سے سراسر نفرت کو سیاسی پالیسی پسند کیا، اور اپنے آپ کو مکمل طور پر دارالعلوم دیوبند میں بند کر لیا۔ باقی مسلم ملت کیلئے بھی ان کے ہاں کا تقویٰ اور فتویٰ یہی باور کراتا رہا کہ انگریز حکمرانوں سے تعاون و تعلق حرام ہے، جدید انگریزی تعلیم کی طرف جانا بھی حرام ہے اور ''انگریزوں کا جویار ہے، اسلام کا غدار ہے'' طرزِ کہن پر اڑنا، بہر حال دیوبند کے ۱۸۵۷ء کے بعد کے بعض مدرسین کا اصولی موقف اور شرعی نقطۂ نظر قرار پایا، جبکہ دوسری طرف سرسید احمد خانؒ نے تدبیر و تدبر بلکہ اجتہاد کا راستہ اختیار کر کے اُس خلاء کو پُر کیا جو ۱۸۵۷ء میں مسلم حکومت کے زوال کے باعث اسلامیانِ ہند کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے

مسلمانوں میں جدید علوم اور جدید تحقیق و تعلیم کے راستوں پر چلنے کی تلقین اور سعی کر کے علی گڑھ تعلیمی تحریک کو وہ شکل دی جو آج کے برعظیم میں پاکستان ہو کہ بھارت، بنگلہ دیش ہو کہ کشمیر، جدید دور اور جدید تعلیم اور جدید شعور و ادراک کی ملت اسلامیہ کا نام سرسید احمد خانؒ کے احسان کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شیخ محمد اکرام نے صحیح کہا ہے کہ سرسید احمد خان نے برصغیر کی ملت اسلامیہ کو قرونِ وسطیٰ کے عہد سے نکال کر دور جدید میں لا کھڑا کیا ہے لیکن انگریزی سامراج کے برعظیم پر چھا جانے کے بعد سرسید احمد خان اور ان کی علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں کا باشعور طبقہ اس راہ پر گامزن ہوگیا۔ جہاں تک دنیاداری کے کاسہ لیسوں کا تعلق ہے وہ ہر دیگ کے چمچے اور ہر دور کے غلام ابن غلام ہوتے ہیں۔ انہیں درباری راگ کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ یہ مغل مسلمان حکمران ہو کہ عیسائی انگریز تاجور، یہ ہندو کانگرس کے قائدین ہو کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا دور، اس میں مُلا یا مسٹر کی تمیز نہیں، یہ ایک ذہنیت کا ظہور ہے جو میر جعفر سے میر صادق تک، مغل دربار کے میراثیوں سے لیکر کاسہ لیسان فرنگ کے روایتی جاگیرداروں کی نسلی، شکلی اور عقل کے معیارات سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے پرکھا جائے تو سیاسی شعور و ادارک اور تحریک و کردار کے حوالے سے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۸ء تک کا دور بلاشبہ سرسید احمد خانؒ کا دور کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اسی علی گڑھ کے گریجویٹ اور آکسفورڈ کے جدید تعلیم یافتہ مولانا محمد علی جوہرؒ کا عہد کہہ لیجئے جو ۱۹۳۱ء تک کی لندن گول میز کانفرنس میں آخری تقریر اور آخری سانس کے ساتھ ختم ہوگیا۔ برعظیم کی ہندو سیاست ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی آزادی کے محاذ پر ہر رنگ سے یکسو تھی، مگر مسلمانوں میں جدید تعلیم اور تحریک کے علمبردار سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کی بارش کا پہلا قطرہ مولانا محمد علی جوہرؒ بن کر خارزار سیاست میں وارد ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کے دوسرے گریجویٹس، مولانا شوکت علیؒ اور مولانا حسرت موہانیؒ بھی میدانِ سیاست میں آگئے۔ گویا مسلمانوں میں جدید تعلیم کا جواں ہمت اور روشن فکر طبقہ ماضی، حال اور مستقبل کا شعور و ادراک لیکر مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی فلاح و بہبود کا نشان منزل لیے وارد ہوا۔ خاص طور پر علی گڑھ تحریک ہی کی ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ ۱۹۰۶ء ہی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، جس میں علی گڑھ کے والی وارث ہی نہیں اسکی پہلی فارغ التحصیل کھیپ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور نواب محسن الملک جیسے علیگ، آل انڈیا مسلم لیگ کے بانی ارکان ہیں۔ جبکہ دوسری طرف انگریز دشمنی کا طرہ امتیاز دیو بند مدرسے کے مدرسین تھے جو انگریز سے تعاون کو حرام کی حدود تک محدود رکھتے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے ادوارِ تاریخ کو بخوبی بانٹا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> ''ہندستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمانوں کی تاریخ دو دوروں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا دور سرسید احمد خان کا دور ہے ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ زمانے میں یہ دور اپنی طبعی عمر کو پہنچ گیا، اور اس کے بعد انہی کے بطن سے دوسرا دور پیدا ہوا، جسے محمد علی، ابوالکلامؒ اور اقبالؒ کا دور کہنا چاہیے''۔ مولانا مودودیؒ کا تجزیہ ۱۹۴۰ء کا ہے، جس میں وہ بتاتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہرؒ اور علامہ اقبالؒ کی وفات

اور تیسرے لیڈر ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے انقلاب بتام سے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔" (۸۳)

مولانا محمد علی جوہرؒ (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء) انڈین نیشنل کانگرس میں سرسید احمد خانؒ کی پالیسی کے برعکس کانگرس میں شامل ہو گئے۔ تاہم قیام مسلم لیگ کے باعث وہ بیک وقت مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے رکن تھے اور اس زمانے میں دونوں جماعتوں کا بیک وقت رکن رہا جا سکتا تھا۔ بلکہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل وزیر حسن اور مولانا محمد علی جوہر ہی کے ایماء پر قائداعظمؒ تب محمد علی جناحؒ، مسلم لیگ کے رکن بنے تھے۔ بلکہ رکنیت فارم پر ممبر شپ کے دستخط ہر دو رہنماؤں ہی نے کرائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۶ء کے لکھنو سیشن میں جہاں آل انڈیا کانگرس کا بھی سالانہ اجلاس ہو رہا تھا، وہ مشہور معاہدہ وجود میں آیا جسے تاریخ میں لکھنو پیکٹ یا میثاق لکھنو کہتے ہیں۔ جس میں قائداعظمؒ کی کوششوں سے پہلی دفعہ ہندوؤں اور کانگرس نے مسلمانوں کا جداگانہ حقِ نیابت اور انتخاب تسلیم کیا۔ یہ الگ بات کہ اس میں مسلم اکثریتی صوبوں، پنجاب اور بنگال میں ہندوؤں کو پاسنگ دیکر، مسلم اکثریت کی صوبائی حکومتوں کی سکیم مشکل بن گئی تھی۔ تب سے محمد علی جناحؒ ہندو، مسلم اتحاد کے سفیر اور مولانا محمد علی جوہرؒ ہندو، مسلم اشتراک و تعاون کے اس حد تک موئید تھے کہ گاندھی کی متابقت میں ہر مسلم مطالبہ بھی نظر انداز جبکہ تیسرے لیڈر ابوالکلام آزاد ہندوؤں میں مسلمانوں کے مکمل ادغام اور علیحدہ مسلم قومیت کے شدید منکر تھے، اور ظاہر ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا نکتہ نظر ہندوؤں یا کانگرس بلکہ گاندھی کے مذہب اور قومی مقاصد میں سب سے زیادہ "مطلوب و مقصود" بلکہ وارے کی چیز تھی۔ یہی حاصل ہے اُس برس ہا برس کی مشترکہ جدوجہد، تحریک اور تاریخ کا جس میں بالآخر جناحؒ اور جوہرؒ دونوں کو انڈین نیشنل کانگرس سے نکلنا پڑا۔ جس میں ابوالکلام آزادؒ کی معاصرانہ چشمک تو بدیہی سی بات ہے، اصل میں ہندو واردات کا دخل اور عمل کہیں زیادہ ہے کہ وہ صدیوں سے بدھ مت، جین مت یہاں تک کہ چارواک کے فلسفے اور بدھ مت کے اقتدار تک کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اسلام اور مسلمان اس کے لئے تر نوالہ ثابت نہ ہوئے تھے، اب انگریزی عہد مسلمانوں کے باب میں ہندوؤں کی آسانی کا عصری رویہ بن کر سامنے آیا اور انہوں نے مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ اور باشعور سیاسی قیادت کی بجائے دیوبند کے مدرسین کا الگ موثر گروہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نگرانی میں مذہبی ملاؤں اور مقررین کا ایک مسلم لیگ دشمن گروہ پیدا کر کے، مسلم ایک علیحدہ قوم یا مسلمانوں کی آزادی کا حقیقی مطلب ایک علیحدہ وطن یعنی پاکستان گویا ان ملت گریز ملاؤں کے گلے کی پھانس ہی نہیں، گلے کا سرطان ہو گیا، جس کے جواب میں ملت اسلامیہ کی کثرت کثیرہ نے ان کانگرسی ملاؤں کو اپنی عوامی سان پر کس لیا۔ ظاہر ہے متحدہ قومیت کا بت ایسا تھا کہ کانگرس کے "علماء ونگ" کی آوازان کے حلقۂ اثر تک ہی محدود رہی، اور برعظیم کی ملت اسلامیہ نے حقیقتاً مذہبی پیشوایت کو کلیتہً مسترد کر دیا ہے، اور تا حال یہی روش، رویہ اور رجحان ہے جو برعظیم کی ملت اسلامیہ کا اجماع امت بن چکا ہے۔ ۱۹۳۰ء تک کا برعظیم انگریز سے آزادی کی مراعات و مطالبات تک جس مقام تک آ پہنچا ہے، اس میں جناحؒ، جوہرؒ اور پھر ابوالکلام آزادؒ بلکہ جمعیت علماء ہند کا وجود بھی ایک مسلم آواز ہی تو تھی۔ البتہ ان کے سیاسی نکتہ نظر کو جناحؒ ہندو مسلم اتحاد، جوہرؒ، ہندو مسلم اشتراک اور ابوالکلامؒ ہندو

مسلم ادغام کی تین علیحدہ اور الگ کوششوں کا نام قرار دیا جاسکتا ہے جس میں اختلاف کی گنجائش کم ہے۔

۱۹۱۶ء لکھنو پیکٹ کے بعد دوسرا بڑا مرحلہ جس نے ہندو مسلم اتحاد، اشتراک و تعاون اور ادغام تینوں میں ہندو ذہنیت کو آشکارہ کر دیا وہ تحریک خلافت ۱۹۱۹ء تھی جبکہ کانگرس کی ۱۹۲۱ء کی عدم تعاون کی تحریک کا بدیہی ملاپ گاندھی کی سیاست کا متحرک ترین مرحلہ ہی نہیں، صاف کہنا چاہیے کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا عشرہ سیاست گاندھی کی سیاسی چالبازیوں اور مسلمان قوم، مسلمان لیڈر شپ کو اپنے پیچھے لگا کر، بالآخر انہیں دھکا دیکر کانگرس سے باہر پھینک دیا، جیسے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی، جو انہیں "باپو" کہتے تھے، ہر طرح سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلمانوں کے مسائل و معاملات بلکہ مطالبات کیلئے کانگرس کیا خود انگریزوں تک سے برسر پیکار رہتے تھے۔ گویا محمد علی جوہرؒ نے کانگرس میں شمولیت تک کو مسلم ملت کے مفاد پر کبھی قربان نہیں کیا، وہ جذبات کے آدمی تھے، انکا قلم بھی شعلے اگلتا تھا، زبان و خطابت بھی دل دہلاتی تھی، البتہ ان کے اخلاص و ایثار کا کچھ اثر اگر کبھی اور کہیں نہ ہوا تو انڈین نیشنل کانگرس کی ہندو قیادت اور خاص طور پر گاندھی کی سیادت تھی۔ یہ سادگی یا سادہ دلی کا حسین پیکر تھا، جو مسلمان دل کے ساتھ جدو جہد آزادی کا خواہاں، کوشاں بلکہ حدی خواں تھا مگر آخر کار اور انجام کار، یہ کھل گیا کہ ہندو قوم مسلمانوں کے معاملے میں اپنے تاریخی وطیرہ کے عین مطابق انہیں اپنے میں ضم کرنے کے درپے ہے اور انہیں کسی طور بھی الگ قوم، الگ مطالبات یا اگر وجود اور جداگانہ انتخابات تک میں حصہ دینے پر آمادہ نہیں، حالانکہ وہ خود کچھ بھی دینے کی پوزیشن میں نہ تھی، بلکہ ابھی انگریز حکمران موجود تھے، صرف مستقبل کے دستوری نقشے میں مسلمانوں کے سیاسی، ملی مفادات کے تحفظات پر انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ یا مسلمانوں کے مابین سمجھوتے، مفاہمت یا معاہدے تک صورتحال تھی، مگر تحریکِ خلافت نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو یکسو اور یکجا کر کے منظم کر دیا تو گاندھی اس تحریکِ خلاف کی حمایت میں آدھمکے۔ یہ حمایت تھی کہ سیاست یہ آگے چل کر چند برسوں میں واضح ہو گیا۔ کانگرس کے آنگن سے خلافت اور کانگرس کے سنگم سے یہ بیان اس قابل ہے کہ علی گڑھ تحریک کی جدید قیادت جوہر اور شوکت علی اور دیوبند کے مذہبی مدرسین اور مولانا ابوالکلام آزادؒ یہاں گاندھی کی امامت (Leadership) میں مقتدی بنے ہوئے یکجا ہیں۔ ایک سابق کانگرسی مسلمان قاضی محمد عدیل عباسی کا کہنا ہے کہ

> "مہاتما گاندھی نے مسئلہ خلافت سے دلچسپی ظاہر کی اور نہ صرف دلچسپی ظاہر کی بلکہ اس میں شرکت کا وعدہ کیا اور نہ صرف شرکت کا وعدہ کیا بلکہ اس میں کود پڑے اور بہت جلد مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے تمام لیڈروں نے ان کو اپنا لیڈر مان لیا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تو ان کو "باپو" کہتے تھے اور کراچی کے مقدمہ میں سزا پانے کے بعد جب وہ راہ میں تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ تحریک کا کیا حال ہے تو انہوں نے کہا میں تو جیل میں ہوں، البتہ یہ جانتا ہوں کہ رسول ﷺ کے بعد میرے اوپر گاندھی جی کا حکم نافذ ہے۔" (۸۴)

یہ تو مولانا محمد علی اور شوکت علی کا حال بھی تھا اور قال (کہنا) بھی۔ مولانا آزاد سبحانی کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی عدیل لکھتے ہیں کہ

''مولانا آزاد سبحانی گاندھی جی کے آشرم میں چلے گئے تھے، اور ایک لباس پہن لیا تھا جو صرف گھٹنا اور کہنی بند تھا، مولانا ابوالکلام آزادؒ قولاً اور عملاً گاندھی جی کے ہمنوا تھے۔ حضرت شیخ الہند کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور اب مسلم قیادت کو کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔ احمد آباد کانگرس کے موقع پر مولانا عزیر گل (رفیق شیخ الہند) نے ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے جس میں میں خود موجود تھا کہا:۔

''ہم نے گاندھی کو اپنا رہنما مان لیا ہے، آگے جانے کو کہے گا تو آگے جائیں گے، پیچھے ہٹنے کو کہے گا تو پیچھے ہٹیں گے۔ لیکن گاندھی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مسلمان اپنے خلیفہ کو بھی نہیں مانتے، جب وہ راہ حق سے تجاوز کرتا ہے۔ گاندھی جب تک حق پر رہے گا ہمارا رہنما رہے گا''۔(۸۵)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ

''گویہ سب بعد کی باتیں ہیں، ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء سے مئی ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ روحی وقلبی اضطراب، بے پناہ جوش اور ہر طرح کی قربانی کیلئے تیاری اور راہ عمل کی سرگرم تلاش کا زمانہ تھا۔''(۸۶)

''البتہ احمد آباد کانگرس ہی میں عدم تعاون کی گاندھی قرار داد کے خلاف قائداعظم محمد علی جناحؒ کی مخالفت پر مولانا شوکت علی نے ان پر ڈنڈا اٹھا لیا تھا اور مولانا حسرت موہانی کی کامل آزادی کی قرارداد کو دبانے کیلئے ان کے مرشد مولانا عبدالوہاب فرنگی محل کے بیٹے اور مولانا محمد علی، شوکت علی کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محل (م ۱۹۲۶) کے ذریعے خاموش کرایا تھا۔''(۸۷)

قائداعظمؒ کانگرس سے مستعفی ہو گئے، اور پھر گاندھی تھا اور محمد علی جوہرؒ، ابوالکلام آزادؒ، یا پھر آزاد سبحانی۔ قاضی محمد عدیل عباسی نے گاندھی کی سیاست کا مسلم رہنماؤں کے بارے میں طریقہ کار یا طریقہ واردات یہ لکھا ہے کہ

''گاندھی ۱۹۱۸ء میں سیاست ہند پر چھا رہے تھے، انہوں نے ان لوگوں کو چن لیا جن سے معاونت حاصل کرنا تھی، چنانچہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ملنے کراچی گئے مگر جیل حکام نے انہیں ملنے نہ دیا۔ وہ برابر علی برادران سے رابطہ قائم رکھ رہے تھے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محل میں تو برابر ان کی آمدورفت تھی۔ گاندھی جی کے کام کا قاعدہ یہی تھا کہ وہ چند چوٹی کے لوگوں کو چن لیتے تھے اور ان کو ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے تھے۔''(۸۸)

الغرض قاضی عدیل عباس نے برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک خلافت اور کانگرس کی تحریک عدم تعاون کے مراحل پر گاندھی سیاست اور قیادت کو دو جملوں میں یکجا کر دیا ہے وہ خود تحریک خلافت اور کانگرس کے کارکن تھے، ان کی تحریری

شہادت اور آنکھوں دیکھی شہادت کا تذکرہ بھی یکجا ہے کہ

''چنانچہ اس وقت موہن داس کرم چند گاندھی مطلع ہندوستان پر آفتاب و مہتاب بن کر طلوع ہوئے اور بہت جلد دوسرے لیڈروں کا ستارہ غروب ہو گیا اور سب نے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔''(۸۹)

گاندھی نے مسلمان قائدین کیا جدید طرز کے مولانا محمد علی جوہر کیا محمد علی جناح کو انڈین نیشنل کانگرس کے اندر ٹکنے نہ دیا بلکہ ان کی ذہانت و اہلیت کو خود ان ہی کے ہم مذہب اور مذہبی قائدین کے ہاتھوں، ایک دوسرے کو زچ کرنے کی چالیں بھی چلیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قاضی عدیل عباسی کا کہنا ہے کہ

''تحریک خلافت ہی کے زمانے میں جمعیت علماء ہند کا قیام عمل میں آیا جس کے روشن خیال علماء نے آخر وقت تک کانگرس اور گاندھی جی کی تائید کرتے ہوئے ملک کی آزادی کے لئے دار و رسن کو دعوت دی، اور مسلم لیگ کا تا دمِ آخر مقابلہ کیا، تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوئے''(۸٦)

پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے نامور استاد پروفیسر محمد اسلم مرحوم نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات کا تذکرہ کرتے ہوئے جمعیت علماء ہند کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''جمعیت العلماء ہند، جسے کانگریس کا علماء ونگ کہنا زیادہ مفید رہے گا انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی لیکن اس جماعت نے مسلم لیگ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مذہبی امور میں اس سے مشورہ لیا کرے۔ یہ جماعت چونکہ دیوبندی مکتبہ فکر کے صرف ایک گروپ کی نمائندگی کرتی تھی اس لئے مسلم لیگ نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اس جماعت نے مسلم لیگ سے ایک بڑی رقم بھی طلب کی تھی جو مسلم لیگ جیسی غریب جماعت ادا کرنے سے قاصر تھی۔ اس لئے جمعیت العلماء ہند مسلم لیگ کی حمایت سے دستکش ہو گئی''۔

(پروفیسر محمد اسلم، ''تحریک پاکستان''، لاہور، ریاض برادر، ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۸۱)

یوپی (موجودہ اتر پردیش) میں مسلم لیگ کے رہنما چودھری خلیق الزمان نے اپنی خودنوشت ''شاہراہِ پاکستان'' میں جمعیت العلماء ہند کے مسلم لیگ کے ساتھ معاملات اور کانگریس کا ساتھ دینے پر اظہار خیال کیا ہے جس کے مطابق:

الہ آباد جمعیت العلماء کانفرنس ۱۹۳۷ء

''۷ مئی کو جمعیت العلماء نے مولانا آزاد کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ جمعیت العلماء بلاشرط کانگریس کے ساتھ ہو گی اور اس کے دو تین دن بعد مولانا حسین احمد نے مجھے ایک طویل خط لکھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ میں نے آپ کی

وزارت کے لئے راستہ صاف کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے مولانا کا وہ خط معلوم نہیں کیونکر گم کر دیا۔ ورنہ اسے قارئین کے استفادہ کے لئے پیش کرتا۔ جمعیت العلماء کے اس اقدام سے میں اپنی قلبی تکالیف کا کیا ذکر کروں عیاں راچہ بیان؟ راجہ صاحب سلیم پور ادھر گئے اور ادھر علماء نے ساتھ چھوڑ دیا میرے اعصاب کی مثیت کی طرف سے سخت آزمائش شروع ہو گئی۔

بہر نوع اسی مسئلہ کے متعلق مولانا احمد سعید کا ایک خط میرے پاس موجود ہے جو اس واقعہ کے کئی مہینہ بعد یعنی ۱۹/ اگست ۱۹۳۷ء کا لکھا ہوا ہے، پھر بھی جمعیۃ العلماء کے الہ آباد کے جلسہ پر اس سے کافی روشنی پڑتی ہے۔

''بازار بلی ماران دہلی (۶۵۷)؟

محترم چودہری صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم۔ آپ کے مفصل گرامی نامہ کا شکریہ مجھے تو اپنے دوستوں سے یہ شکوہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کی خاطر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کی خاک چھانی تھی ان دوستوں نے منتخب ہونے کے بعد اپنے ان خدام کو فراموش کر دیا۔ مسٹر جناح اگریکلچرل پارٹی کو ملانے اٹھے تو انھوں نے بات نہیں کی اور ہمارے بعض خودغرض دوست منسٹری اور اسپیکری کیلئے کانگریس سے سمجھوتہ کرنے اٹھے تو انھوں نے بات نہ پوچھی۔ میری ذمہ داری دیکھئے کہ جملہ رفقاء سے میں برائی اٹھا رہا ہوں لیکن ہر ایک سے یہی کہتا ہوں کہ مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرو۔ الہ آباد کانفرنس میں میں نے جو کچھ کیا اس سے آپ بھی غافل نہ ہوں گے۔ اور میرے دوستوں نے جو سلوک میرے ساتھ کیا اس کا بھی آپ کو علم ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ میں اپنی رائے پر قائم ہوں کہ اگر حافظ محمد ابراہیم صاحب کا معاملہ درمیان میں نہ آجاتا تو شاید میں اپنی پوری جماعت کو اپنا ہم خیال رکھ سکتا۔

بہر حال مفصل باتیں تو عندالملاقات ہوں گی۔ آپ کی لیگ کچھ نہ کرے گی اور نہ اس سے کچھ ہوگا۔ اگر لیگ کسی قابل ہوتی تو آج مسلمانوں کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ہاں یہ تو فرمائیے کہ اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے کہ اگر آپ کے لئے اور نواب اسمٰعیل خاں کے لئے کوئی جگہ نکل آتی تو آپ کا کانگریس سے سمجھوتہ ہو جاتا۔ کانگریس ایک منسٹری تو نکال لینے کے لئے تیار تھی لیکن آپ نواب صاحب کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ اور ان کے لئے کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس لئے صلح ناکام رہی۔ اور کیا یہ بھی سچ ہے کہ مسٹر رفیع قدوائی جن کی آپ نے پوری امداد کی اور ان کے مقابلہ سے احتراز کیا تھا انھوں نے بھی آپ کے ساتھ غداری کی۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ مہربانی فرما کر مجھے صحیح معلومات

بہم پہنچائیں گے۔

فقیر

احمد سعید

گلی قاسم جان دہلی'' (۸۷)

اس خط سے اس دور کی سیاست کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ میں ورق کے ورق لکھ ڈالتا پھر بھی اتنا صحیح عکس ان حالات کا جو اس خط سے واضح ہوتا ہے پیش نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے مسلم لیگ کی خامیوں اور کمزوریوں کے متعلق پچھلے صفحات میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر مولانا احمد سعید نے اپنے جملوں میں میری تائید ان پُرزور الفاظ سے کردی ہے کہ ''آپ کی لیگ کچھ نہ کرے گی اور نہ اس سے کچھ ہوگا۔'' جہاں تک آئندہ کے متعلق انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے وہ تو اپنے پرانے تجربہ کی بناء پر ہے جو بعد میں صحیح ثابت نہ ہوا مگر اس سے اتنا معلوم ہوگیا کہ عام طور پر علماء اس کے مستقبل سے ناامید تھے۔ دوسری بات جو اس خط سے ثابت ہوگئی وہ یہ تھی کہ الہ آباد کے جمعیتہ العلماء کے جلسہ میں اصولوں کے مقابلہ میں ذاتیات کو بڑا دخل تھا اور افسوس یہ ہے کہ مقتدر علماء بھی ان ہی ذاتیات میں الجھے ہوئے تھے۔ مولانا احمد سعید کا یہ جملہ عبرت آموز ہے کہ جن لوگوں نے ان کی خاطر شہر شہر قصبہ قصبہ کی خاک چھانی تھی ان دونوں نے منتخب ہونے کے بعد ان خدام کو فراموش کردیا۔ گویا تمام انتخابات کا قصہ صرف ذاتیات پر مبنی تھا۔ اور اس کو مسلمانوں کے سیاسی مستقبل سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس ایک فقرہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس وقت علماء کی سیاسی بصیرت کس قدر تنگ اور محدود تھی۔ وہ ۱۹۳۵ء کے دستور سے جو سیاسی انقلاب پیدا ہوگیا تھا اس ابجد سے بھی ناواقف تھے اور یہ سمجھنا کہ وہ کانگریس کی گود میں آزادی کو جنم دینے کے لئے مسلم لیگ کو یتیم چھوڑ کر چلے گئے تھے قطعاً غلط ہے۔ اس زمانہ میں جس طرح کانگریس کی کامیابی سے تعلقدار اور خطاب یافتگان لرز اُٹھے تھے اسی طرح سے علماء بھی کانپ اٹھے اور غالباً مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کو یہ سمجھایا تھا کہ مسلم لیگ کا ساتھ چھوڑ کر وہ مسلم لیگ کی بڑی خدمت کریں گے۔ کیونکہ علماء کی علیٰحدگی کے بعد مسلم لیگ اونے پونے کانگریس کی شرائط پر صلح کرنے پر مجبور ہوجائے گی اور یہ خود مسلمانوں کی بڑی خدمت ہوگی۔

مولانا احمد سعید صاحب نے رفیع احمد قدوائی کی غداری کا بھی ذکر کیا ہے میں ان کے طریقہ کار کو غداری نہیں سمجھتا مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ خود کبھی مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق غور کرنے پر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ وہ مفکر نہ تھے، مقرر نہ تھے اور اس کی وجہ سے وہ کانگریس کی ہر پالیسی کو لبیک کہتے تھے اور اس کے علاوہ اگر وہ سیاست میں رہنا چاہتے تو ان کے لئے اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ وہ ملک کی آزادی کے خواہاں تھے اور بہت سے اور بے بصیرت مسلمانوں کی طرح اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرتے تھے۔ چونکہ ان مسائل پر آگے مجھے بہت کچھ لکھنا ہے اس لئے فی الحال اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔'' (۹۱)

دوسری طرف مولانا محمد علی جوہر کی ذہانت و فطانت کا فکری دائرہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جو تحریک خلافت کے شاہد اور شریک ہیں، مولانا محمد علی جوہر کی فکر کی جہت کو بیان کرتے ہیں کہ :۔

''مولانا محمد علی جوہر نے خیال ظاہر کیا کہ ہندوؤں سے باعزت مصالحت کرنی چاہیے جس کے بغیر اجنبی حکومت سے نجات غیر ممکن ہے۔مگر یہ سمجھوتہ اس کی ملت کے حقوق کا ضامن ہونا چاہیے، تاکہ ملت ایک اور غلامی سے، جو اس مرتبہ خود اس کے ہم وطنوں کے ماتحت ہوگی، محفوظ رہ سکے۔وہ برعظیم کی مسلم ملت کو دو دنیاؤں کا باشندہ خیال کرتے تھے۔ایک طرف ملت اپنے مادری وطن سے وابستہ تھی، اور اس بنا پر جو ان کے حقوق و فرائض تھے ان سے دست بردار نہیں ہو سکتی تھے، اور دوسری طرف وہ اسلام کی عالمی ملت کا بھی ایک جزو تھی جس کی طرف سے بھی اس پر ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہوتے تھے۔وہ مسلم ملت کی جداگانہ ہستی کو ابھرتی ہوئی ہندوستانی قوم میں ضم کر دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔'' (۹۲)

تحریک خلافت کے روح رواں تو حقیقت میں محمد علی جوہرؒ اور ان کے مرشد سلسلہ قادریہ فرنگی محل کے مولانا عبدالباری فرنگی محل تھے جنہوں نے جمعیت علماء ہند کیلئے دیوبند، بریلی، بدایوں اور امرتسر کے اہل حدیث علماء کو یکجا ہونے کی ترغیب دی۔آگے چل کر یہ گاندھی اور کانگرس دونوں کا ''علماء ونگ'' بن گئی بلکہ محمد علی جوہرؒ سے بھی ان کی ٹھن گئی۔تحریک خلافت کے خاتمے سے مسلمانوں کی جدید لیڈر شپ بھی متاثر ہوئی اور قدیم طرز کے مذہبی رہنما بھی شدھی، سنگھٹن کی ہندو تحریکوں کے باعث ایک آپادھاپی کا شکار ہو گئے، نتیجۃً مسلمانوں کی قربانیاں اور جوش و خروش بھی رائیگاں گیا اور ہندو، مسلم اتحاد کا یہ آخری نظارہ ہندو مسلم عناد کی صورت اختیار کر گیا۔پھر اس کے بعد جناحؒ اور جوہرؒ بھی، مسلمانوں کے لیے انڈین نیشنل کانگرس سے ان کے حقوق کی حفاظت اور ان کے مفادات کی ضمانت تک لینے میں یکسر ناکام رہے۔حالانکہ جناحؒ، ہندو مسلم اتحاد کے سفیر اور مولانا محمد علی جوہرؒ ہندوؤں اور کانگرس سے مسلمانوں کے اشتراک کے خواہاں تھے۔گاندھی کی سیاسی طبیعت نے اپنی سیاست کی چالیں دھیمے سروں، مسلمانوں اور ان کے قائدین بلکہ جذبات تینوں پر یک بیک وار دیں کہ پھر ۱۹۲۸ء کی نہرو رپورٹ انڈین نیشنل کانگرس کا وہ حتمی رویہ، تحریری اعلان اور عزم تھا کہ ہندوستان کے دستوری نقشے میں مسلمان نام کی کوئی قوم نہیں اور اس کے کسی نوعیت کے سیاسی، سماجی یا معاشی، معاشرتی حقوق کو در خور اعتنا یا لائق توجہ ماننا تو کہاں، لائق تذکرہ بھی نہیں، بلکہ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنو میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے تسلیم شدہ حق اور سمجھوتے کو بھی مسترد کر دیا گیا، حالانکہ برعظیم میں قوم کہلائے جانے کے اعتبار سے صرف مسلمان ہی واحد قوم تھی، ہندوستانی یا ہندو، کوئی قوم کہاں ذاتیں تھی یا پیشے، انہیں انڈین نیشنل کانگرس کی سیاست اور گاندھی کی قیادت نے دو خطروں اور خوف پر یکجا کر کے ہندو نیشنلزم کو ہوا دی۔

اولاً انگریز دشمنی

ثانیاً مسلم دشمنی

پھر مسلمانوں کی تنظیمی قوت کو متحرک ورکروں، مذہبی ملاؤں، سٹیج کے مداری اور گلے کی کراری بلکہ مجمع باز، لسانی بدکاری کے مذہبی مسخروں کے ذریعے مسلمانوں کے قائدین کو ننگی گالیوں اور گندھی نالیوں میں گھسیٹا گیا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کو لدھیانہ کے مولانا حبیب الرحمٰن کے ذریعے زچ کرایا، تو جناح کو مولانا شوکت علی کے ہاتھوں ڈنڈا دکھایا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے مولانا محمد علی جوہرؒ کی طبعی آویزش اور عصری چشمک کو دو گروہوں میں بانٹا، یہاں تک کہ فوراً قائدین کا قلع قمع اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے ہندو قوم مسلمان بستیوں پر پل پڑی۔ شدھی کیلئے شردھانند نے تحریک چلا دی جو دو سال پہلے دہلی کی جامع مسجد کے مکبر (تکبیر واذان کا چبوترہ) پر لا کر تقریر کرائی تھی۔ بمبئی کے ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن کی جسمانی اور نیم عسکری تنظیم کھڑی کی اور ہندو نوجوانوں کو لاٹھی، چاقو وغیرہ کے استعمال اور اشتعال کی راہ پر لگایا۔ حالانکہ مولانا محمد علی جوہرؒ تحریک خلافت میں اسیری کے بعد جب وہ ۱۹۲۳ء میں رہا ہوئے تو کانگرس کے خاص اجلاس دہلی ستمبر ۱۹۲۳ء میں حصہ لیا اور اس کے بعد کوکرناڈا کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ یہاں کانگرس کے صدارتی خطبے میں انہوں نے اپنی قوم سے کہا

"تمہارے لئے اجنبیوں سے عدم تعاون اور اپنے ہمسایوں سے تعاون کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے"۔ (۹۳)

بلکہ اس خطبے میں مولانا محمد علی جوہرؒ کا جوہر ذات کھلا ہوا ہے، وہ کس طرح کی فکر کے حامل تھے، کس درد دل کے ساتھ وہ سوچتے تھے پورے خطبے میں عیاں ہے۔ البتہ آخر میں انہوں نے بال گنگا دھر تلک کے جملے پر فرمایا کہ

"۱۹۱۶ء کے لکھنو پیکٹ پر مہاراج تلک سے شکایت کی کہ مسلمانوں کو ضرورت سے زیادہ (حقوق) دے رہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا "آپ لوگ مسلمانوں کی ضرورت سے زیادہ کبھی دے نہیں سکتے" (۹۴)

یہ تھے مولانا محمد علی جوہرؒ کے نظریات اور سیاسی سوچ کا خطبۂ کانگرس مگر خود ہندو، کانگرس کے ایماء اور اشارے پر، سنگھٹن جس نے بمبئی کے موپلا مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنے میں معاونت کی، شدھی جس نے ملکانہ کے راجپوت اور میوات کے نیم خواندہ مسلمانوں کو ہندو بنانے کی ٹھانی، جس کے ردعمل میں تبلیغی جماعت کا وجود عمل میں آیا۔ یہ سارا منظر ہندو سیاست کی دانش جدید کا ہیجان ہے کہ پلان اسے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے تاریخی تجزیہ اور عینی شہادت دونوں کو یکجا کر کے سمیٹا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

انتہا پسند ہندوؤں کی کانگرس سے بغاوت اور ۱۹۲۲ء۔۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کے خلاف تحریکات کا اجراء

حقیقتاً اس کا نتیجہ تھا کہ برعظیم کی سیاست میں مسلمانوں کا بڑھتا ہوا اثر اور تحریک خلافت کی تنظیم اور اس کے انضباط سے پیدا ہونے والی مسلم قوت ہندوؤں کو بہت ناگوار تھی۔ کانگرس کے خلاف یہ تمام ہندو قوم کی بغاوت تھی۔ گاندھی اور دوسرے کانگرس رہنما یا تو اپنی قوم کے متحدہ جذبے سے مجبور تھے یا وہ اپنی قوم کے خلاف اس لئے عمل نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ خود اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔''(۹۵)

حالانکہ حقیقت حال یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی دفعہ مسلمان جدید تعلیم سے آراستہ اور علی گڑھ فکر سے پیراستہ، تحریک خلافت کی صورت ہندوستان کے سیاسی منظر پر چھا گئے تھے۔ ادھر عالمی سطح پر خلافت ترکیہ کے حصے بخرے ایک بین الملی جذبات کا وہ دھارا تھا جو مسلمانان برعظیم کے جذبوں کا سہارا تھا۔ ہوشیار ہندو، اور کائیاں گاندھی دھوتی اور لنگوائی کے ساتھ ہاتھ میں سونٹا لیے، عاجزی کے دھیمے لہجوں میں اپنی ہندو قوم، اسکی آزادی اور آزاد وطن کیلئے ہر درجہ چوکنا ہو کر چومکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیڈروں کو قدیم وجدید کے وزن اور وژن (Vision) کے ہر ناپ تول کے بعد اپنی چوسر کی نردیں جس کمال احتیاط، ہوشیاری اور عیاری سے کھیلتا تھا، اسکی چالیں پھر ۱۹۲۴ء تک عرصہ سیاست میں سوا ہو گئیں۔ ہندو مسلم فسادات کے خلاف ہندو تحریکات پر عاجزی اور عدم تشدد کا پیکر کس قدر مصنوعی دانت کی طرح عجز کی جھلک دکھاتا ہے۔ گاندھی نے کہا:

''میں نے اپنی ناقابلیت کا اعتراف کر لیا ہے۔ میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس مرض کا علاج کرنے والے طبیب کی حیثیت سے میں کم بضاعت ثابت ہو چکا ہوں۔''(۹۶)

انجام کار یہ کہ تحریک خلافت کی ناکامی برعظیم کے مسلمانوں کی مایوسی، پراگندہ خیالی اور بے حالی کا منہ بولتا ثبوت بن گئی، اِدھر گاندھی اور کانگرس کی ذیلی ایجادوں اور تنظیموں نے مسلمانوں کے اتحاد، تنظیم اور ایمان تینوں کا صفایا کرنا شروع کر دیا اور یہی تو گاندھی کا مطلوب بھی تھا۔ مسلمانوں کی حالتِ زار پر ایک تبصرہ ان حالات کے چشم دید گواہ اور مبصر مولانا مودودیؒ کا ہے، فرماتے ہیں،

''تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد مسلسل مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہوئیں، پیہم خطرات سامنے آئے مگر کوئی ایک چیز بھی ان کو اشتراک عمل کیلئے جمع نہ کر سکی۔''(۹۷)

تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)

فی الواقعہ برعظیم کے مسلمانوں کی قربانی ایثار، تنظیم و تحریک کا وہ بھرپور اظہار تھا جو عوامی اور سیاسی سطح پر ہی نہیں ہندوستان بھر کے ماحول اور معاشرے کو ہلا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد یہ پہلی عوامی، اور اسلامی تحریک تھی، جس میں علماء اور عوام بھی مختلف مکاتب فکر کے یکجا ہو گئے، جدید لیڈر شپ، مولانا محمد علی جوہرؒ، جو ہر کارواں بن گئے، یہاں

تک کہ شیعہ مسلک کے جسٹس امیر علی نے خلافت کے مسئلے پر ایک بھرپور اور مدلل مضمون سپرد قلم کیا، آخر ایسا کیوں نہ ہوتا کہ مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن کا دوسرا نام محمد علی جوہرؔ ہو گیا تھا، جس نے کہا تھا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

علی گڑھ تحریک کا یہ سپوت آزادی وطن کا سب سے بڑا نقیب بن کر ابھرا کہ گاندھی کو اس صورت حال سے نمٹنے کیلئے مسلمانوں کے مسئلہ خلافت اور اسکے غلام ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف برپا تحریک میں خود کودنا پڑا، پھر اس گاندھی نے اپنی ہندو روایت کے عین مطابق اپنی اہنسا کے جوہر دکھائے اور مسلمانوں کی صفیں تڑوا کران کی قیادت کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر کے اور اشتعال دلا کر، انہیں تتر بتر کر دیا، اور اس طوفان خلافت میں جو کام کا بندہ ملا، اسے متحدہ قومیت کا جھنڈا اور چندہ دیکر اپنے چرنوں اور آشرموں میں لے اڑا۔ شورش کاشمیری کا مصرع ہے

ع لے اڑی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین

تحریک خلافت کا یہ عارضی منظر، پھر ہندو مسلم فسادات اور اس کے بعد ہندوؤں کی مسلمانوں کے خلاف جارحانہ تحریکوں میں بدل گیا۔ کیا آریہ سماج، کیا شدھی، کیا سنگھٹن بلکہ ہندو مہاسبھا جو ۱۹۰۰ء سے ''ہندو، ہندی، ہندوستان'' کے نعرہ کے ساتھ گامزن تھی، کانگرس اس کا سیاسی بازو ثابت ہوئی، یہاں تک کہ نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء اس شعور اور ہندو دانش کا عصری اعلان تھا کہ مسلمانوں کو ایک الگ سے کوئی سی آئینی، اجتماعی شکل دینا تو کجا ان کے کسی معقول اور جائز معاملے کو بھی غلام ہندوستان کی غلام ہندو قوم کا رویہ اور نہ ماننے کا وطیرہ تھا، جو بالآخر اپنے اصل رنگ وروپ کے ساتھ سامنے آ گیا اور یہ سچ ہے کہ

''تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں کا جذبہ ایثار وقربانی اور آزادی کے لئے ان کی تڑپ دیکھ کر ہندو بوکھلا اٹھے، اس لئے انہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں لانے کیلئے ایسی جارحانہ تحریکیں شروع کیں جن کی بنیاد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پر رکھی۔'' (۹۸)

اس کے بعد ۱۹۳۰ء تک کا عرصہ ہندو اور مسلمانوں کو ملانے اور متحد ہو کر آزادی حاصل کرنے کی تمام تر جناحؒ کی (۱۹۱۶ء۔۱۹۲۹ء تک کی) کوششوں کے باوجود یہ ثابت کر گیا کہ دونوں قوموں کا الگ الگ وجود تاریخی اور روایتی وجوہات ہی کا مرہون منت ہے اور دونوں قوموں میں یکجائی اور اشتراک تک باقی رہنے کے کوئی سے امکانات معدوم ہیں۔ راہیں جدا اور سیاسی زبان میں (Parting of the Ways) ہو گیا۔ مگر درحقیقت دین اسلام کی حقیقت فی الواقعہ درپیش صورتحال میں الم نشرح ہو گئی کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ اور الگ قومیں ہیں، لکم دینکم ولی دین ○ تمہارے لیے تمہاری راہ اور ہمارے لئے ہمارا راستہ (القرآن، سورۃ الکافرون)۔

قائداعظم کے پیش کردہ چودہ نکات وہ آخری دستوری، آئینی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہم آزادی کا حتمی محضرنامہ تھا، جو مسلم لیگ کے صد اور مسلمانوں کے آئینی مطالبات کی صورت میں مارچ ۱۹۲۹ء کو نہرو رپورٹ پر غوض کے بعد پیش کیا، مگر حقیقت حال اب کھل چکی تھی، ہندو سیاست کے داؤ پیچ کیا ہیں اور وہ کس قسم کی آزادی اور مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے کی راہ پر کس قدر منصوبہ بندی، دوراندیشی اور سنبھل سنبھل کر ہر موقع پر اس کے عین مطابق طریقہ واردات اختیار کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ گاندھی تو اُس لمحے اور سمے میں اس تاک میں تھا کہ گذشتہ بیس، پچیس برسوں میں مسلمانوں میں جو تعلیمی ترقی، سیاسی شعور، اور سیاسی قیادت ابھری ہے، اسے کسی طرح اور کسی طور سے پلٹ دیا جائے۔ یہ کوئی الزام نہیں وہ رفتارِ وقت تھی جس نے مذہبی گاندھی اور سیاسی گاندھی کا ہندو آنگن پورا کا پورا ادا کرلیا۔ اور اس بات کو سمجھنے کیلئے کوئی عقل کی زیادہ مقدار بھی درکار نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہی ہندوؤں اور ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے ہندو رہنماؤں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ کس طرح کا مستقبل ان کو لانا ہے۔ اُن رہنماؤں نے یہ پیشگی منصوبہ بندی کرلی تھی اور پیش بینی بھی کہ مغرب کے جمہوری اصولوں کے آئینی مضمرات سے ہندو اکثریت کا ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں اقتدار پر مستقل قبضہ ہو جائے گا۔

یہی رفتار اور کردار کا پورا لائحہ عمل ہے جو کانگرس کی تنظیم، مقاصد اور تحریک کے سن وسال کا مطالعہ و تجزیہ ہے۔ مولانا مودودی کا تجزیہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مطالعے کی بنا پر کہتے ہیں کہ

> ''انگریزوں نے ہندوستان میں آکر اپنے ملک پر قیاس کرتے ہوئے، اس ملک کی آبادی کو بھی ایک قوم فرض کرلیا ہے کہ اس مفروضے پر وہ اپنے ملک کے نظام کے مطابق یہاں جمہوری ادارہ قائم کر رہے ہیں۔ ہندو قوم کیلئے یہ بات سب سے زیادہ مفید تھی، کیونکہ وہ اکثریت میں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دیکر جو جمہوری نظام قائم ہوگا اس کا سارا فائدہ انہی کو حاصل ہوگا، اور آخر کار مسلمان ان کے ماتحت بلکہ ایک طرح سے انکے عملاً غلام بن کر رہ جائیں گے۔'' (۹۹)

تحریک خلافت ہی کے دوران، مولانا محمد علی جوہرؒ نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اے کاش کوئی اللہ کا بندہ، اسلام کے تصور جہاد کو واضح کرنے کیلئے اپنے قلم کو حرکت دے۔ اسکا روحانی مطلب تو یہ ہے کہ تب صحافی مودودیؒ سے، عالم اسلام کا جدید متکلم مودودیؒ فی الواقعہ مولانا محمد علی جوہرؒ کے دل کی دھڑکن کا شگوفہ ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے خود بتایا ہے کہ

> ''میرے دل میں تحریک مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی ایک تقریر سے پیدا ہوئی تھی، جس میں انہوں نے بڑی درد کے ساتھ اس ضرورت کا اظہار کیا تھا کہ اے کاش کوئی شخص اسلام کے مسئلہ جہاد کی پوری وضاحت کرے تاکہ اس وقت اس معاملہ میں اسلام کے خلاف جو غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں انکا سدِ باب ہوسکے۔'' (۱۰۰)

اور ۲۳ برس کے مولانا مودودی کی پہلی کتاب ''الجہاد فی الاسلام''، اسی صدائے جوہر کی دردمندی کا جواب ہے جو عصری شعوری کے ساتھ دورِ جدید کا متکلمِ اسلام بنا ہے

وجہ یہ تھی کہ ہندو تنظمیں اور لیڈر تو اسلام اور یہاں تک کہ حضور ﷺ کی ذات اطہر پر رکیک حملے کر رہے تھے، مسلمانوں پر حملے کر رہے تھے، مگر گاندھی تک نے اپنی توتلی زبان کو شعلہ جوالہ کیا اپنا شوالہ بنا دیا اور کہا کہ

''اسلام تلوار کا مذہب ہے یہ تشدد کا مذہب ہے۔'' (۱۰۱)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اس زمانے کے ایک باہوش اور باخبر صحافی ہی نہیں، حالات کے ناظر اور مطالعاتی وسعتوں کے ساتھ شاہد اور سوچنے والے شخص تھے۔ انہوں نے اس زمانے کے سیاسی احوال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ

''۱۹۲۸ء تک تو ہندوستان میں عام خیال یہ پایا جاتا تھا کہ آزادی کی کوئی تحریک مسلمانوں کو ساتھ ملائے بغیر نہیں چل سکتی اور مسلمان بھی اس بھروسہ پر تھے کہ کانگرس آزادی کے راستے پر ہمیں ساتھ لیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی، لیکن ۱۹۲۹ء تک پہنچتے پہنچتے گاندھی نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو بھانپ لیا کہ یہ قوم بالکل پراگندہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر کوئی قیادت باقی نہیں رہی ہے۔ اس میں کوئی تنظیم باقی نہیں رہی ہے اور اب میں صرف ہندوؤں کو لے کر انگریزی حکومت سے لڑ کر آزادی حاصل کر سکتا ہوں۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ اس نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ ''میں آزادی کی جنگ لڑونگا، تم ساتھ آؤ تو تمہیں ساتھ لیکر، تم نہ آؤ تو تمہارے بغیر اور تم مزاحمت کرو تو تم تمہاری مزاحمت کے باوجود۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ۔

"With you or without you or inspit of you "

''اس نے مسلمانوں کو اس پوزیشن میں ڈال دیا کہ یا وہ غیر مشروط طور پر اس کی قیادت میں ہندو اقتدار قائم کرنے کیلئے آلہ کار بنیں یا خاموش تماشائی بن کی اپنی قسمت کا فیصلہ ہوتے دیکھتے رہیں، یا مزاحمت کر کے انگریزی اقتدار کی حمایت کا الزام اپنے سر لیں، اور بدقسمتی سے اس وقت مسلمانوں کے تین گروہوں نے یہ تینوں راستے اختیار کیے اور پوری قوم متحدہ ہو کر کسی ایک قیادت کے تحت کوئی ایک راستہ اختیار نہ کر سکی۔'' (۱۰۲)

یہی وہ ہندو سماج اور ہندوستان کی آزادی کا لمحہ عروج اور مطلوب تھا کہ کانگرس کا سالانہ سیشن لاہور میں راوی کنارے ۱۹۲۹ء میں منعقد کر دیا گیا اور اس میں پہلی دفعہ کانگرس نے آزادی کامل کا ریزولوشن منظور کیا تھا، جو ۱۹۲۱ء میں کانگرس کے سیشن میں مولانا حسرت موہانی کا پیش کردہ اُس لمحے اور سے منظور نہ تھا کہ ابھی وہ منزل نہ آئی تھی، جہاں ''ہندو، ہندی، ہندوستان'' کی ترتیب، حکمت عملی، اور طریقہ کار یا طریقہ واردات اسے لاتا تھا اور یہیں سے جواہر لعل نہرو پہلی دفعہ

کانگرس کے صدر (پردھان) بن کرانارکلی لاہور میں سفید گھوڑے پر سوار کالی شیروانی میں ملبوس ہندو کنیاؤں کو مبہوت کرتے چلے گئے۔ عجب حادثہ ہے کہ لاہور کانگرس ہی کی جلسہ گاہ (پنڈال) میں مجلس احرار اسلام کی تشکیل عمل میں آئی، نام تک مولانا ابوالکلام آزادؒ نے رکھا اور پھر سٹیج کے دھنی اور خطابت کے غنی نامور خطیب، مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ اسکے پہلے صدر بنائے گئے اور یوں پنجاب اور یوپی کی حد تک احرار کے سٹیج نے کانگرس کیلئے رات گئے جلسوں کی سیج سجائی کہ جناحؒ سے ''زنا'' اور قائداعظم سے کافراعظم'' تک کے الفاظ احرار کے سٹیج کی ''لسانی بدکاری'' ہو گئے، جبکہ کانگرس نے مسلم رابطہ عوام کی مہم شروع کی تو اس میں اصل کارکن بھی مسلمان کیمونسٹ اور دیو بند کے مذہبی مدرسین کا ایک بڑا گروہ یہ فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔ مولانا مودودیؒ ہی کا کہنا ہے کہ

> ۱۹۳۸ء میں، میں نے دیکھا کہ کانگرس اب اپنی اس پالیسی سے ایک قدم اور آگے بڑھا رہی ہے جس کا اعلان ۱۹۲۹ء میں کیا گیا تھا، اس وقت تو صرف یہی کہا گیا تھا کہ ''مسلمان آتے ہیں آئیں، ورنہ ہم اپنی آزادی کی جنگ خود لڑیں گے'' مگر اب یہ نئی پالیسی بنائی گئی کہ مسلمانوں کو فرداً فرداً کانگرس کی تحریک میں جذب کرلیا جائے، اور مسلمانوں کی کسی جماعت سے بحیثیت جماعت کوئی معاملہ کی بات سرے سے کی ہی نہ جائے۔ چنانچہ اس غرض کیلئے مسلم رابطہ عوام (Muslim mass contact) کی مہم شروع کی گئی، جس کے اصل کارکن ''مسلمان کیمونسٹ تھے اور غضب یہ ہے کہ اس کام میں علمائے کرام کا ایک گروہ بھی اُن کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ گروہ اس بات کا قائل تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں، اور اس ایک قوم کے اندر ایک ایسا جمہوری نظام رائج ہو سکتا ہے جس میں فیصلہ اکثریت کرنے والی ہو'' (۱۰۳)

مسلمانوں کی منتشر قومی وحدت اور قیادت کے فقدان کا منظر و ماحول اپنی جگہ، مگر اس سوال پہ کہ کیا مسلمان ہی اس قدر نفس پرست تھے جو اپنی قوم و ملت اپنے دین و ایمان اور اپنے مستقبل سے اس قدر غافل اور بے پروا نکلے جو ہندوؤں کے ہاتھوں وقتی طور پر استعمال ہی نہ ہو رہے تھے بلکہ اس برعظیم کی ملت اسلامیہ کی بارہ صدیوں کو ہندویت (Hindusim) میں مدغم کرنے کی بالواسطہ کوششوں کا حصہ دار ہی نہیں آلہ کار بن گئے تھے؟ عقلی دلائل، اور منطقی استدلال کے ملاوں کی فہم کو طاعون چاٹ گئی کہ ہندو سرمایہ لے اڑا، کیمونسٹ بھی مسلمان ہوتے ہیں کہ خدا اور رسول ﷺ کے انکار پر انکا اعتقاد (اگر یہ لفظ ان کی مادہ پرستی پر فٹ بیٹھا ہو تو) ہی تو انہیں کیمونسٹ بناتا ہے۔ اسکے لیے چندہ اور دھندہ اب یہ بھی داستان ماضی ہے۔ البتہ مولانا مودودیؒ ہی نے اس مسلم المیہ کا جائزہ پیش کیا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ وجہ سراسر نفس پرستی ہے، فرماتے ہیں۔

> ''گذشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا، اس کے لیے خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار انکو مل

گئے جنہوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ سے، پاؤں سے حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔ یہ ناپاک اور ذلیل ترین وصف جب ہمارے افراد میں موجود ہے تو جس طرح چھ ہزار میل دور کے رہنے والوں نے ان سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح ہم سے ایک دیوار بیچ رہنے والے تھے اسی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر ہماری فاش گوئی کسی کو بری معلوم نہ ہو تو ہم صاف کہہ دیں کہ انہوں نے اس سے فائدہ بھی اٹھانا شروع کر دیا ہے۔'' (۱۰۵)

یہ تجزیہ اور تاثر ہمارے اپنے مسلمان گریباں کی دھجیاں ہیں، یہ آئینہ امروز ہے کہ فردا؟ مسلمان قوم میں غداری، کاسہ لیسی، اور ملت و مذہب دشمنی کا یہ ذلیل ترین اور ارزل المخلوقات رویہ، اسلام دشمن قوتوں کا استعماری حربہ ہو، تو ہو، امت مسلمہ کے عبداللہ بن ابی حضور سرکار دو عالم ﷺ کے دربار گہربار کا ازلی روگ ہے۔ شاید اس لئے قرآن نے شدید ترین وعید کی ہے کہ ان المنافقین فی درک الا سفلِ من النار ۔کہ یقیناً منافقین کو جہنم کے گندے ترین حصے میں ڈالا جائے گا۔ تاریخ کے اس مرحلے پر اس مخلوق کا چہرہ شرعی ہے کہ کلین شیو، لارڈ کلایو سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کیا خود گاندھی، نہرو، پٹیل اور ہندو قوم کی طرف سے مسلمانوں کیلئے متحدہ قومیت کی آکاس بیل، کس کے کندھے پر اور کس کے منڈھے چڑھی، مولانا مودودیؒ گواہی دیتے ہیں کہ

''پرانی مارکیٹ میں جب سرد بازاری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، نئی مارکیٹ میں ایمان کی خرید و فروخت کا بیوپار بڑھ رہا ہے۔ ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبان سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈہ سنتے ہیں، متحدہ قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں اور یہ آوازیں بھی سنتے ہیں کہ اس کا اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر نہیں ہے تو ہمارا حافظہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کچھ اس نوعیت کی آوازیں اُس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں جب سرکار برطانیہ کی غلامی کا زریں پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔'' (۱۰۶)

اور یہ تھا مسلمانوں کو ایک متحد قوم کے طور پر قبول نہ کرنے کا نہیں، انہیں ہندوؤں میں ضم کرنے کا طریقہ ٔ سیاست۔ ہندو سیاست کی دانش جدید، گاندھی اور جواہر لعل نہرو کے عصری روپ، اپنی پرانی روش اور روایت کا جدید ایڈیشن ثابت ہوگئی اور انڈین نیشنل کانگرس نے بالآخر اپنے روپ کے اصل درشن، پنڈت موتی لعل نہرو کی رپورٹ ۱۹۲۸ء اور پھر گول میز کانفرنس لندن میں گاندھی کی عدم شرکت کے رویے میں دکھائے کہ وہ ہندوستان میں کسی مسلم قوم، کسی مسلم مطالبے کے جواز اور جائز ہونے کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت انڈین نیشنل کانگرس ہے، جو ہندوستان کے مستقبل کی کلی دستوری ذمہ داریاں خود سنبھالنے کی تگ و دو میں ہے۔ یہاں ایک ہی قوم بستی ہے جسے ہندوستانی کہتے ہیں، اور مذہب کی بنیاد پر کوئی قوم تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ مذہب تو ایک ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اس کا امور سلطنت یا عمرانی سطح پر

معاشرے کے نظم و نسق یا با الفاظ دیگر اس کا حکومت کے کاروبار سے کیا لینا دینا۔ یہ فلسفہ متحدہ قومیت، جمہوری اصولوں کے مغربی تصورات پر اکثریت کا راج ہوگا، گویا بارہ صدیوں کی حکمران مسلم قوم کو دو صدیوں کی برطانوی غلامی کے ساتھ ساتھ کانگرسی قیادت کا ہندویت میں مسلمانوں کو ضم کرنے اور مستقبل کے جمہوری اور آئینی ہندوستان میں مدغم کرنے کی تدبیر کا نام ہے۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کی زیر صدارت دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری ہفتے میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں نہرو رپورٹ کو متفقہ طور پر مسترد کر دیا گیا۔ خود قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس رپورٹ کے بعد کانگرس کی بنیادی رکنیت سے بھی استعفیٰ دیدیا۔ اس رپوٹ میں ہندو راج کے قیام کا نقشہ بھی ابھر کر سامنے آ گیا، اور یہیں سے ہندوؤں نے مسلمانوں کو مکمل طور پر نظرانداز کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی نے نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے حقوق سلب کرنے کی روش کو شدید ردِعمل کے ساتھ محسوس کیا اور اس رپوٹ کو کلیۃً مسترد کر دیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بتاتے ہیں کہ

> ''نہرو رپوٹ مسترد کرنے کے دو بڑے وجوہ تھے کہ مسلمان اس کا عزم کر چکے تھے کہ جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں انہیں مکمل خود مختاری حاصل ہونی چاہیے اور یہ کہ ان کیلئے جداگانہ انتخاب کا طریقہ ضرور برقرار رہنا چاہیے، یہاں تک کہ مسلم قوم پرست مختار احمد انصاری نے گاندھی کو مشورہ دیا کہ کانگرس کو مسلمانوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کر لینا چاہیے مگر جواہر لعل نہرو کے ایماء پر جنھوں نے کہا کہ ہندوستان مسلمانوں کا انتظار نہیں کر سکتا، اس تجویز کو نظرانداز کر دیا۔'' (۱۰۷)

اسی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ

> ''میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خانؒ نے مسلمانوں کے لئے جو راہِ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔ بلکہ وہ دورِ جدید کا پہلا مسلمان تھا جس نے آنے والے زمانے کے تیور کو پہچانا۔'' (۱۰۸)

کانگرس کے ہندو جماعت ہونے میں تو کبھی شبہ نہ تھا مگر غلام ہندوستان میں ہندوازم کی تاریخی روایت جس جدید طرز کے اندازِ سیاست کے ساتھ عصری زاویے بنتی ہے وہ تحریک خلافت کے طوفان میں ہندو رہنماؤں کا ملاپ اور پھر ہندو مسلم فسادات کا منظم منصوبہ، شدھی اور سنگھٹن کے مظاہرے، ان سب مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی جارحانہ تحریکوں سے آخر کیا باور کرانا مقصود تھا، یہی کہ ''ہندو، ہندی اور ہندوستان'' تو لازم و ملزوم ہیں، مسلمانوں کو علیحدہ کوئی حیثیت نہیں دی جائے گی اور سیاسی محاذ پر، کانگرس کے ۱۹۲۹ء کے صدر جواہر لعل نہرو جسکے باپ کی انا کو رام کرنے کیلئے گاندھی نے اپنی جگہ اُسے لاہور کانگرس میں اور نوعمری میں صدر کانگرس بنا دیا تھا، اس کے باپ پنڈت موتی لعل نہرو کی رپوٹ میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب مسلم اکثریت پر مشتمل صوبوں کی خود مختاری تک قبول نہ ہوئی جیسے یہ خود ہی کچھ عطا کرنے والے ہوں، اور پھر

۱۹۳۰ء کی لندن گول میز کانفرنس کے پہلے اجلاس میں کانگرس اور گاندھی کا بائیکاٹ بھی اسی روش کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ کانگرس ہندوستان میں کسی دوسری قوم کو تسلیم ہی نہیں کرتی، چہ جائیکہ ان کی جداگانہ انتخاب یا آئینی حقوق کو درخور اعتنا جانے۔ اگلے اجلاس ۱۹۳۱ء میں کانگرس شرکت کیلئے تیار ہوگئی کیونکہ گورنر جنرل لارڈ اِرون اور گاندھی کے درمیان ۵ مارچ کو ایک سمجھوتہ ہو گیا تھا، جو عام طور پر اِرون، گاندھی میثاق کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ہی کا کہنا ہے کہ

''گاندھی کو اس گول میز کانفرنس میں کانگرس کا واحد نمائندہ نامزد کیا گیا، مسلمانوں میں ایک اہم اضافہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کا تھا۔'' (۱۰۹)

مولانا محمد علی جوہرؒ کا انتقال

اسی گول میز کانفرنس کے پہلے اجلاس میں ایک فصیح تقریر کے دوران مولانا محمد علی جوہرؒ کا یہ اعلان کہ ''میں ایک غلام ملک واپس نہیں جاؤنگا'' ایک صحیح پیشین گوئی ثابت ہوا اور ان کا انتقال اس وقت ہوا جب کانفرنس کا پہلا اجلاس ختم ہوا تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے مولانا جوہرؒ کے بارے میں ایک جملے میں انکی زندگی اور موت کا سامان سمیٹا ہے، لکھتے ہیں۔

''ان کی ساری زندگی خدمتِ اسلام کے لئے وقف رہی تھی، اس لئے یہ بالکل مناسب حال تھا کہ انہیں اسلام کے مقامات مقدسہ میں سے ایک مقام بیت المقدس میں وہاں کے باشندوں کی درخواست پر دفن کیا گیا۔'' (۱۱۰)

مولانا محمد علی جوہرؒ کی دعا

جب مولانا محمد علی جوہرؒ ۱۹۳۰ء کے آواخر میں لندن کیلئے بمبئی سے روانہ ہو رہے تھے تو انہیں بیماری کی شدت کے باعث سٹریچر پر لٹا کر جہاز میں لے جایا گیا۔ یہ منظر کس قدر دل دوز اور رقت آمیز تھا، سراج نظامی نے اس واقعہ کی چشم دید رپورٹ میں لکھا ہے

''۱۹۳۰ء کے آواخر میں مولانا محمد علی جوہر لندن گول میز کانفرس میں شرکت کیلئے بمبئی سے روانہ ہونے لگے، تو انہیں ایک سٹریچر پر لٹا کر جہاز میں لے جایا گیا، لوگ یہ نظارہ دیکھ کے بے اختیار رونے لگے۔ بعض مخلص عقیدت مندوں نے مولانا محمد علی جوہرؒ سے پوچھا مسلمانوں کا مستقبل بڑا تاریک اور پُر آشوب معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے بعد ان کی قیادت کون کریگا؟ آپ نے بلا تامل جواب دیا ''صرف جناحؒ! اللہ کرے ان کے دل میں یہ خیال سما جائے۔'' (۱۱۱)

لیکن محمد علی جناحؒ نے ہندوستان کے حالات، گاندھی اور کانگرس کی سیاست اور مسلمانوں کی حالت تینوں سے

بددل ہوکر لندن ہی میں مستقل طور پر بس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ گویا جوہر لندن میں چل بسے اور جناح لندن ہی میں جا بسے۔ اس سال ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء میں اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد کے سالانہ اجلاس میں وہ خطبہ دیا جو پاکستان کی نظریاتی بنیاد بنا ہے۔

اسلام ایک زندہ قوت۔۔۔زوال سے اقبالؒ تک

عالم اسلام کو یہ خوش بختی نصیب ہوئی ہے کہ گذشتہ چودہ سو برس میں حضور سرکار دو عالم ﷺ کے دو علماء دین فقر ایسے ہیں جنہیں رہتی دنیا تک دین کے ابلاغ کو عالمی اور انسانی معیار کی پکار کہنا پڑے گا۔ ایک نے تو ٹھیک ۷ صدیاں پہلے عقل وخرد کے تارِ عنکبوت کے مدمقابل دین ودل کی برتری کا میدان بدر برپا کیا ہے یعنی مولانا جلال الدین رومیؒ نے، جبکہ مغربی تہذیب کے مادی فکر وفلسفہ کو الہیات کی لگام دی ہے۔ ٹھیک ۷ صدیوں بعد اقبالؒ نے بیسوی صدی عیسوی کے غروب اور اکیسویں صدی کے طلوع پر، یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں، کہ اس صدی کے ترجمانِ حقیقت کیا، آئندہ زمانوں میں جن کا کوئی نام نہیں میں بھی اقبالؒ حیات وکائنات اور مقصد حیات کے ترجمان بنے رہیں گے۔ ان کی نظم ونثر ہی کیا خود خطبات، ارشادات، خطوط، ان کی مجلس کے روز وشب کا روزنامچہ، ایک جہانِ تازہ ہے، جس کے گلوں کی خوشبو انسانیت کی مشامِ جاں کو سدا معطر رکھے گی۔ اس برعظیم پاک وہند کے جس دور میں انہیں حیات مستعار کا وقت عطا ہوا ہے، اس کی فکری اور روحانی جہتوں پر اقبالؒ کے اشعار وافکار کا پرتو ابھی پردۂ افکار ہے۔ جب اور جس لمحے یہ صورت اظہار وابلاغ میں آیا تو دنیا زندگی کے حقائق پر نظریں جمائے، جادہ ومنزل دونوں کو پالے گی، کہ یہ بظاہر کلام اقبالؒ ہے پیام اقبالؒ ہے، مگر فی الحقیقت اقبالؒ شاعر مشرق تو ہیں ہی ترجمان حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ فی الواقعہ حضور سرکار دو عالم ﷺ کی سدا بہار صدا ہیں۔ تاریخ کی زبان اور رسالت ﷺ کے دربار سے آنکھیں روشن ہوں تو پھر یہ کہنے میں کیا باک ہے کہ اقبالؒ بلال ؓ رسول ﷺ ہیں، جو اللہ کی توحید اور حضور المرسلین ﷺ کی پکار ہیں۔ اُردو کے نامور خطیب، ادیب اور شاعر آغا شورش کاشمیری نے خوب لکھا ہے کہ

> ''اقبالؒ عربی لہجہ میں عجمی آواز ہیں، ان کا نصب العین مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ انہوں نے مغربی افکار کی بالادستی پر زبردست تنقید کی۔ ان کا نصب العین توحید ورسالت ﷺ سے غیر متزلزل وابستگی کی بنا پر قرونِ اول کی روایتوں کا احیاء ہے۔ ان کی شاعری زوال آمادہ مسلمانوں کے میدانِ حشر میں صورِ اسرافیل ہے۔'' (۱۱۲)

علوِ فکر اور روحانی معراج معلّٰی کے اُس عرش بریں کے دربار میں حاضری وحضوری میں اقبالؒ امتِ مسلمہ کے زوال اور عرضِ حال میں حضور سرکار دو عالم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ میں کس قدر گریاں کناں ہیں۔ جو پہلی جنگ عظیم اور مسلمانوں کی بربادی کی اُس کیفیت حال کا مقام (ارضی نہیں روحانی) ہے کہ بلقان کی مسلم آبادی کی بربادی پر نظم کا عنوان ہے: ۔حضور رسالت مآب ﷺ میں چند اشعار ہی حضور ﷺ کے فرمان اور اقبالؒ کی عرض ملاحظہ ہو کہ:

فرشتے بزم رسالت ﷺ میں لے گئے مجھکو
حضورِ آیہ رحمت ﷺ میں لے گئے مجھکو
کہا حضور ﷺ نے، اے عندلیب باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمئی نوا سے گداز
نکل کر باغِ جہاں سے برنگ بُو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تُو آیا؟

اقبالؒ عرض گزار ہیں اور عرض کرتے ہیں:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
یہ چیز وہ ہے، جو جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس سطح کا انسانِ عظیم، جس برعظیم میں خود شاہد حالات امت ہو تو بھلا اس کے درد، سوز اور نالۂ شب و سحر کا عالم کیا ہوگا؟ خود اسکے اشعار افکار اور ارشادات وخطبات کا الہیاتی، روحانی اور فکری پہلو، اہل دل اور اہل دانش دونوں کی متاع بے بہا ہے۔لیکن سوز و آرزومندی کا اقبالؒ برعظیم کی ملتِ اسلامیہ کے زوال کا جس قدر نوحہ خواں ہے، وہاں اس سے کہیں بڑھ کر کاشف المسائل انسان بھی ہے۔۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد کا مطالعہ ہر پاکستانی شہری کا ذوق وشوق بن جائے تو پاکستان کی روحانی بلندیوں کو چھونے کیلئے، اقبالؒ کا مردمومن ہر فرد، پاکستان کی نسلِ نو کا اور اس کا مستقبل بن جائے۔ یہ خطبہ کن سیاسی حالات کے تناظر کا وقتی آئینہ افکار ہے، لائحہ عمل ہے، اس پر تو ایک زمانہ شاہد ہے۔ نامور مذہبی مفکر حضرت مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے ۲۱ اپریل ۱۹۷۰ء میں مرکزیہ مجلس اقبالؒ کے زیر اہتمام، پنجاب یونیورسٹی (علامہ اقبال کیمپس) کے ہال میں جو خطاب فرمایا ہے، شاید مولانائے مرحوم کا کسی بھی معاصر، شخصیت پر یہ پہلا اور آخری خطبہ ہے۔اس خطبہ میں جہاں انہوں نے اقبالؒ کے اسلامی تاریخ میں عظیم الشان اصلاحی کارنامے پر روشنی ڈالی ہے وہیں اس کارنامے کو سرانجام دینے کے ان حالات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ جن میں یہ کارنامہ انجام دیا گیا۔وہ فرماتے ہیں:

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک کا ہندوستان

''۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین زمانہ ہے۔اس وقت مسلمانوں نے تحریکِ خلافت میں اپنی تمام تر پونجی لگادی تھی، ان کو یہ احساس تھا کہ خلافت اسلامیہ کو بچانے اور مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کو اغیار کے قبضے سے چھڑانے کے لئے جو کچھ ہم

سے ہوسکتا ہے، وہ ہمیں کر گزرنا چاہیے۔ وہ اس مقصد کے لئے اس حد تک گئے کہ جن ہندوؤں کے متعلق ان کو صدیوں سے تجربہ تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا جذبات رکھتے ہیں انہوں نے ان کے ساتھ بھی محض اس امید پر اتحاد و تعاون کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ کسی طرح سے ہم خلافت کے ادارے کو بچالے جائیں اور اپنے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضے سے چھڑالیں۔ لیکن آخر کار اس ساری تگ و دو کا جو انجام ہوا وہ یہ تھا کہ جس خلافت کو بچانے کے لیے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی اس کی بساط انہیں لوگوں نے لپیٹ کر رکھ دی جن کی خلافت کے لیے مسلمان کوشش کر رہے تھے۔ ایک طرف تو ہندی مسلمانوں کو خلافت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنی ساری کوششوں کا یہ نتیجہ دیکھنا نصیب ہوا، دوسری طرف جس کانگرس کے ساتھ انہوں نے اتحاد اور جن ہندوؤں کے ساتھ انہوں نے تعاون کیا تھا وہی ان پر ٹوٹ پڑے۔ گویا مسلمانوں کو دوہری شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک طرف جس مقصد کیلئے جان لڑائی تھی وہ مقصد فوت ہوگیا، اور دوسری طرف جن لوگوں سے اتحاد کیا تھا وہ مسلمانوں سے لڑنے اور انہیں تباہ کرنے کے درپے ہوگئے۔ سب سے زیادہ انہوں نے گاندھی جی پر اعتماد کیا تھا اور انہیں اپنا لیڈر بنالیا تھا، مگر خود انہی کو کبھی اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس مرحلے پر مسلمانوں پر ہندوؤں کی زیادتیوں کے خلاف زبان کھولتے۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر یکا یک ایک سخت مایوسی طاری ہوگئی اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ میں اُسے زمانے میں موجود تھا اور ان سارے حالات کا شاہد ہوں اور بکثرت ایسے لوگ بھی ہمارے ہاں موجود ہیں جن کے سامنے یہ ساری تاریخ گواہ ہے کہ کس طرح مسلمان ایک شدید مایوسی کا شکار ہوکر رہ گئے۔ اور اس کے ساتھ اس ساری لیڈر شپ سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ گیا جنہوں نے تحریکِ خلافت اٹھائی تھی، اور اس میں کانگرس کا ساتھ دیا تھا۔ اس طرح مسلمان مایوس بھی ہوگئے اور بے قیادت بھی رہ گئے۔ پوری قوم میں ایک ہمہ گیر اور شدید انتشار کی کیفیت رونما ہوگئی۔ اس انتشار کی حالت میں مسلمان اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ غیر مسلم ایک لیڈر کی لیڈر شپ میں پوری طرح متحد ہیں اور وہ ہندوستان پر اپنے قبضے کو مکمل کرنے کے لئے ہر ممکن جدوجہد میں مصروف ہیں اور دوسری طرف مسلمان بالکل اس قابل نہیں کہ اس صورتحال کا مقابلہ کر سکیں، اور اپنے تحفظ کی کوئی تدبیر اختیار کرسکیں۔'' (۱۱۳)

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

اقبالؒ کا عظیم کارنامہ

''اس عالم میں صرف اقبالؒ وہ شخص تھا جس نے اس پوری صورت حال کا مقابلہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک چودہ سال پر محیط زمانے میں اسلامی تحریک، اور اسلامی جذبے کے احیاء کیلئے اور مسلمانوں میں اسلامی اور ملی شعور کو ابھارنے اور بیدار رکھنے کیلئے اگر کوئی سب سے بڑی طاقت کام کر رہی تھی تو وہ اکیلے اقبالؒ کی طاقت تھی۔'' (۱۱۴)

آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء الہ آباد میں اپنے خطبۂ صدارت کا آغاز حضرت علامہ اقبالؒ جن الفاظ سے فرماتے ہیں، اس کا سرعنوان ایک ہی جچا ہے، اور وہ ہے، ''اسلام، ایک زندہ قوت'' فرمایا:۔

''آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کیلئے ایک ایسے شخص کو چنا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے، جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا، ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملے پر بھی غور کرے اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ نہ خیال فرمایئے گا کہ جس مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور دستور حیات اور نظام عمل سے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اسکا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز اور ممیز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلاء و آزمائش کا کبھی ایسا وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔'' (۱۱۵)

اس خطبۂ الہ آباد میں وہ پاکستان جلوہ گر ہے جو آج روئے زمین پر عالم اسلام کی پہلی اور دنیا کی ساتویں بڑی ایٹمی قوت ہے۔ اس ملک کو اس خطبے میں انہوں نے ''ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان'' کا نام دیا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کی آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب اور مسلم اکثریت کے صوبوں کی خود مختاری کی قراردادوں کی تائید کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

نشانِ منزل

''ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں، میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست بنا دیا جائے، (خواہ ریاست سلطنت

برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اسکے باہر)۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیے، نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص خطے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔" (۱۱۶)

اس پر حضرت علامہ اقبالؒ کا اپنا شعر ہی سجتا ہے کہ فرمایا:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

"اس خطبۂ الہ آباد کا وہ جملہ ایک زمانہ کی زبان پر ہے جس میں فرمایا کہ "میں نے مسلمانوں کی تاریخ کا جس قدر مطالعہ کیا اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیشہ اسلام نے مسلمانوں کی حفاظت کی ہے نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کی۔" (۱۱۷)

قیادت وسیادت

ع سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز ﷺ اپنا

فی الواقعہ قیادت وسیادت کی ذات ہی وہ رازِ حقیقی ہے جو قوموں کی تقدیر بدلنے میں رہبر و رہنما کے طور پر ابھر کے سامنے آتی ہے۔ یہ مروجہ معنوں میں لیڈر شپ نہیں ہے کہ صرف اقتدار اور محض اقتدار ہی کا نام رہنمائی ہو گیا ہے۔ یہ تو حکومتیں بنانے، بگاڑنے اور امور سلطنت کے کارندے ہیں جنہیں انتظامی سربراہ، آئینی سربراہ، صدر اور وزیر اعظم کے معروف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ یہاں جس قیادت وسیادت کی بات ہو رہی ہے وہ قوموں کی قیادت بلکہ اقبالؒ کے کلام میں قوموں کی امامت کا تصور قیادت بھی ہے فردِ قیادت بھی، جسے جناح سے قائد ہی نہیں قائد اعظمؒ ہونا مقدر تھا۔ اور یہی تقدیر اور تدبیر کا وہ سنگم ہے جہاں ہندوستان کی سیاستِ دوراں سے بددل ہو کر جناح لندن جا بسنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور سیاست کا یہ نامور نام اپنی پوری شخصیت کا اثاثہ سمیٹ کر لندن ہی میں رہ گیا تھا کہ نگاہِ اقبالؒ نے اس دل کا شکار کیا اور خوش قسمتی سے ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس کے دوران جناح پر ملی ذمہ داری کے احساس کو آشکار کیا۔ ان ظاہری باتوں اور ملاقاتوں کی برکت تھی جو جناح کو واپس ہندوستان لائی اور جس قائد اور امام (Leader) کی جستجو تھی، وہ آرزو بن کر قائد اعظمؒ ہو گیا۔ قیادت اور قائد کا یہ اصطفی (Selection) صرف اقبالؒ کی چشم بصیرت کا ہی اعجاز نہیں، ان کے اپنے بیان کردہ روحانی اور دینی ادراک کا کھلا ثبوت بھی ہے، ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد میں، قائدین اور قائد پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قائدین سے میری مراد ہے وہ اشخاص جو اللہ کی دین یا تجربے کے باعث اسلام کی روح اور اس کے مستقبل کے بارے میں خاص ادراک رکھتے ہیں، اور اتنا ہی تیز ادارک ان کا جدید تاریخ کے رجحان کے بارے میں ہو۔ ایسے لوگ فی الحقیقت عوام کیلئے قوتِ متحرکہ ہوتے ہیں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہوتے ہیں، وہ خواہش کے مطابق تیار نہیں کیے جا سکتے۔'' (۱۱۸)

اس خطبہ کی آخری سطور، مردِ مومن کی امامت وقیادت ہی کا ادعا لیے ہوئے ہیں، جس میں خاتمہ کلام سے پہلے فرمایا:

''میں یہ کہتے ہوئے کسی کو مخمصے میں نہیں ڈالنا چاہتا کہ ہند میں حالات وہ نہیں ہیں، جو نظر آتے ہیں، تاہم اس کے معنی آپ پر اس وقت ظاہر ہونگے جب آپ انہیں دیکھنے کیلئے ایک حقیقی اجتماعی خودی حاصل کر لیں گے۔ الفاظ قرآنی کے مطابق، ''خود کو مضبوطی سے پکڑ لیں، کوئی شخص جو غلطی کا مرتکب ہو، تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا، بشرطیکہ تمہاری اچھی طرح سے رہنمائی کی جا رہی ہو۔'' (۱۱۹)

یہ قیادت وسیادت وہ ہے جسے ارشادِ رسالت ﷺ میں فراستِ مومن (Vision & Wisdom) کے جامع الفاظ میں سمویا گیا ہے، فرمایا حضور سرکارِ دو عالم ﷺ نے، اتقوا فراسة المومن فإنهٗ ينظر بنور الله ٥ مومن کی فراست کو پہچانو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اقبالؒ ہی نے اس ارشادِ رسول ﷺ کا ترجمہ وتشریح فرمائی ہے کہ

تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا

مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

یہ عصری قیادت کا رازِ مخفی ہے۔ یہ خواہشوں کا الاؤ اور اقتدار کی ہوس کا نفسی ابتلاء نہیں ہوتا ہے۔ یہ قوموں کی قیادت وسیادت کا خصوصی منصب ہے، جو ذاتِ باری الہ کی مرضی مطلق کا معاملہ ہے۔ ووٹوں اور نوٹوں کی انسان دشمن سیاست دوراں کا عارضہ نہیں ہوتا ہے جسے اقبالؒ کے ہاں

ع گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو

کہا گیا ہے اس فارسی مصرع کا اُردو مفہوم انہیں کے ہاں میسر ہے فرمایا

ع جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست

امتِ مسلمہ کی سیاسی تاریخ میں خلیفہ (انتظامی سربراہ) یا ملوکیت یعنی موروثی بادشاہت (Dynasty) کا روپ، سروپ بھی اس دولت، شہرت، اور حکومت کے عناصرِ اربعہ کا بازارِ مصر ہے۔ یہ خلافت راشدہ کا دور نہیں تھا، جہاں امامت (روحانیت) اور خلافت (انتظامیہ) یکجا ہو کر، حضور ﷺ کے واضح ارشاد کے مطابق تیس ۳۰ برس تک بہارِ جاوداں کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو آج بھی امتِ مسلم کا مثالی دور ہے۔ عصری قیادت یا قوموں کی قیادت کا الٰہی ادارہ تو نبوت کا کمال ہے، جو

حضور سرکار دو عالم ﷺ کی ختم نبوت پر تصورِ کاملیت کے ساتھ تا قیامت جلوہ گر ہے۔ دین مکمل ہے۔ مختصراً یہ کہ حق تو اصول ہے مگر ذات رسول ﷺ ہے اور یہی کلمہ طیبہ کا حقیقی مفہوم ہے۔ جبکہ حکومت و فقر کی یکجائی کا نام خلافت راشدہ ہے جو علی منہاج النبوۃ ہے۔ گویا علم و عرفان کی یکجائی کو قوت نافذہ ملے تو خلافت علی منہاج النبوۃ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں باہمی نزاع پر ایک مشیر کے جواب میں سچ فرمایا کہ "پہلے شیخین رضی اللہ عنہما کا مشیر میں تھا، میرے مشیر تم ہو، اس لئے باہمی جدل ہے۔" اقبال نے صحیح ترجمانی کی ہے

ع　　خلافت فقر و تاج و سریر است

لیکن امت کی امامت اور سیادت کا معیار، وہ جس مرتبے کی شخصیت کا تعارف ہے وہ تخیل ملکوتی ہے جو ہدایت خداوندی کا سرچشمہ بنکر رہنمائی کرتا ہے۔ فرمایا

خوشا وہ قافلہ، جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند!

یہ عاشقانِ پاک ﷺ کا ورد ہے، جن کا ایمان و ایقان، نور نبوت کی کرن سے منور ہوتا ہے، یہ فقر وقت ہوتا ہے جو خضر راہ ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے نالوں کا جواب آتا ہے آخر اور وہ نوید سناتے ہیں کہ دشتِ حجاز سے وہ قائد، وہ رہنما منظوری لیکر آیا ہی چاہتا ہے فرمایا۔

خضر وقت از خلوت دشت حجا ز آید بیرون
قافلہ زین وادئ دور دراز آید بیرون

کہ خضر وقت، دشتِ حجاز کی خلوت سے باہر آیا ہی چاہتا ہے جس کی رہنمائی میں یہ بھٹکا ہوا قافلہ، اس وادی دور دراز کا، اب منزلِ مراد تلک پہنچنے کو ہے۔ یہی خضر وقت، یہ رہنمائے عصر، کون اور کیسے، چنا جاتا ہے، قران کی زبان میں اسے اصطفیٰ (Selection) کہتے ہیں، عربی زبان میں چننے کے لئے لفظ آتا ہے، اصطفیٰ، اس کے معنی ہیں "چن لینا" عربی زبان کا ایک لفظ ہے انتخاب (Election) اس کے معنی ہیں "چھانٹ لینا"۔ چھانٹ لو یہ انتخاب ہے، "چُن لو" یہ اصطفیٰ ہے۔ جس بندے کا اصطفیٰ ہوتا ہے وہ چنا ہوا ہوتا ہے اور جس کا انتخاب ہوتا ہے وہ "چھٹا ہوا" ہوتا ہے مزید برآں عملی طور پر اس کی صورت ہے۔ کہ

بہت سے چنیں تو انتخاب (Election) ہے
اور ایک چنے، تو اصطفیٰ (Selection) ہے۔

مذہبی اجتماعات میں بعض علماء یہ خطبہ پڑھتے ہیں، الحمد اللہ و کفیٰ، و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ: یہ چنے ہوئے بندوں کی سلامتی کیلئے ہے، عام طور یہ انبیاء کرام ہی کے لئے مستعمل لفظ ہے۔ بلکہ ادارۂ نبوت یا نبی

کے چناؤ کیلئے یا پھر قوموں کی ہدایت و رہنمائی کیلئے لفظ، اصطفیٰ استعمال ہوا ہے ارشاد ہوا ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (سورۃ آلِ عمران، پارہ نمبر۳، آیت نمبر۳۳) ترجمہ :۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ نے چُن لیا، آدمؑ اور ابراہیم ؑ کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہاں والوں پر'' پیر سید کرم شاہ الازہری نے لکھا کہ مصطفیٰ ﷺ کا لفظ بھی اسی اصطفیٰ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں چنا ہوا۔ پیر کرم شاہ الازہری ہی نے مزید کہا ہے کہ ''اصطفیٰ کا مفہوم یہ ہے کہ یہ نعمتِ نبوت ہے'' اُنہوں نے حوالہ دیا ہے کہ

''قرطبی نے زجاج سے اصطفیٰ کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ انہیں نعمتِ نبوت کے لئے سارے جہاں سے چُن لیا، اس کے بعد قرطبی لکھتے ہیں کہ ''حضور ﷺ کا مقام درجہ اصطفیٰ سے بہت بلند ہے۔ حضور ﷺ تو حبیب ﷺ اور رحمت حق دوسرے انبیاء رحمت کیلئے پیدا کیے گئے ہیں، اور سرکار دو عالم ﷺ کو سراپا رحمت پیدا کیا گیا ہے۔ اور حضور ﷺ کی تشریف آوری سے خلقِ خدا کو امان مل گئی، اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا میں اللہ کی طرف سے رحمت کا تحفہ ہوں۔'' (۱۲۰)

اور یہی لفظ اصطفیٰ کا حقیقی مفہوم اور معنی ہیں، مگر یہ تو نبی کے چناؤ کا معاملہ ہے، جو حضور ﷺ سے پہلے کے تمام انبیاء کرام کے اصطفیٰ (Selection) کا (Process) ہے۔ تا قیامت تو نبوت آپ ﷺ پر تمام کر دی گئی ہے۔ آپ ﷺ تو رحمت ہیں تمام جہانوں اور عالموں اور عصروں کیلئے، مگر اللہ کی مرضی مطلق نبوت کے کمال اور دین کی تکمیل کے بعد قوموں کی قیادت کیلئے اور خاص طور پر سرکارِ دو عالم ﷺ کی ختم نبوت کا تصورِ کاملیت ہے، جو امت مسلمہ کا زادِ راہ ہے جو تا قیامت جاری و ساری سلسلہ ہے کہ

ع سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز ﷺ اپنا

یہ دین کی روح ہے

ع نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کا حقیقی فقر ہے جس کے معجزات سے حکومتیں بنتی ہیں، قومیں بنتی ہیں۔ اقبالؒ ہی نے اس کی نشاندہی کی ہے کہ

بہ عیار مصطفیٰ خود را زند
تا جہان دیگری پیدا کنی

بلکہ

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد خموش باقی و فانی بہم کرد

اپنے آپ پر مقامِ مصطفیٰ ﷺ وارد کرو، تا کہ پھر ایک نیا جہاں تخلیق کر سکو، یہی بنی نوع انسان کی عصری قیادت کے جلوؤں کا دوسرا نام بن جاتا ہے اور عوام الناس کے دلوں میں اس کی پذیرائی، اس کی حقیقی رہنمائی کا راز ازلی ہے۔ گویا اصطفیٰ

اللہ تعالیٰ کا چناؤ ٹھہرا جبکہ انتخاب بندوں کی مرضی کا معاملہ ہے۔اس لئے امام چنا جاتا ہے، خلیفہ منتخب ہوتا ہے۔ یعنی خلافت، بیعت کا نتیجہ ہے، نہ کہ ملوکیت کی طرح بیعت کا سبب ہو۔ بلکہ خلیفہ پہلے، بیعت بعد میں اور یہی بدترین بادشاہی یا موروثی حکومتوں کا وطیرہ تھا، کہ باپ کے بعد بیٹا بادشاہ، نام خلیفہ اور بیعت بعد میں اور وہ بھی جبرِ سرکار سے جس کے جواب میں اقبالؒ کا ایک ہی مصرع کافی ہے

ع حقیقت ابدی ہے مقام شبیری علیہ السلام

یا پھر موروثی، ملوکیت بادشاہی کے خلاف ایک ہی شعر کامل ہے، مکمل ہے فرمایا

اک فقر ہے شبیری ؓ، اس فقر میں ہے میری میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری ؓ

مگر یہ کربلا کون برپا کرے؟ اقبال نے اس لئے رو کر کہا تھا

ع قافلۂ حجاز میں ایک بھی حسینؓ نہیں،

مرحلۂ امامت و قیادت وہ متاعِ دین و دنیا ہے، کہ یہاں صرف اور صرف ایک ہی نام تا قیامت تابندہ ہے اور وہ ہے امام عالی مقام حضرت امام حسین علیہ السلام اور بس۔ البتہ اصطفیٰ کا عصری شہود کیا ہے؟ یہ مرضی مولا کے تابع، نظامِ مصطفیٰ ﷺ ہے، کہ کس بندے سے کون سا کام لیا جانا ہے۔ یہ سراسر اللہ کے کرم کا کمال ہے، اس میں بندوں یا بندے کی مرضی کا نہیں سراسر اللہ کی مرضی کا معاملہ ہے، اصطفیٰ ﷺ کے الٰہی ادارہ اور نبوت کے اصطفیٰ ﷺ اور حضور رحمت اللعالمین ﷺ کے تا قیامت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقام مصطفیٰ ﷺ کا بھی اصطفیٰ ہے۔ جو فیضانِ نبوت ہے، بلکہ حضور سرکار دو عالم ﷺ کا فقر ہے جو دین ہے جسے اقبال عشق کے لفظ میں بند کیے دیتے ہیں البتہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے رسول ﷺ اور عام رہنماؤں کے فرق کو واضح کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

رسول ﷺ اور عام رہنماؤں میں فرق

> ''خارجی رہنما کی ضرورت ہر زمانے میں انسان نے تسلیم کی ہے۔ کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انسان کیلئے محض اسکی باطنی دنیا کی ہدایت کافی ہے۔ آباؤ اجداد، خاندان اور قبیلے اور قوم کے بزرگ، اساتذہ، اہل علم، مذہبی پیشوا، سیاسی لیڈر، اجتماعی مصلحین اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کو جن کی دانشمندی پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا، ہمیشہ رہنمائی کا منصب دیا گیا ہے۔ اور ان کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن جو چیز ایک رسول کو ان دوسری قسم کے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے وہ ''علم'' ہے۔ دوسرے رہنماؤں کے پاس علم نہیں ہے۔ وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں اور رائے میں ہوائے نفس کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔''(۱۲۱)

روحِ عصر کی اپنی قیادت کیلئے یہی رمزِ مصطفیٰ ہی فیضان مسلسل ہے، جہاں اقبالؒ جیسا عالم دین امرِ ربی اور سنت

الٰہی کو ختم نبوت کی کاملیت کو عشق مصطفیٰ اور اس کے وصال و وصل کی معراج کہتا ہے، یہ فنا فی الرسول ﷺ کا ہی مقام ہے کہ

دِر دل مسلم، مقام مصطفیٰ ﷺ است
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ ﷺ است

کہ حضور سرکار دو عالم ﷺ کا مقام، مومن کا دل ہے، جن کے نام پاک پر ساری امت کی آبرو ہے۔ اسی مقام پردہ در حضورِ رسالت مآب ﷺ میں عرضِ حال و قال ہیں، فرمایا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی
اے پناہے من، حریم کوئے تو
من بہ امیدی، رمیدم سوئے تو

کہ میرا ذکر و فکر، علم و عرفان سب کچھ آپ ﷺ کی ذاتِ پاک ہے، آپ کا حریم ناز میری پناہ ہے جہاں کیلئے میں دوڑا آتا ہوں۔ برعظیم کی ملتِ اسلامیہ کے معرکۂ دین و وطن کیلئے اقبالؒ نے حضور سرکار دو عالم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ سے مہلت زیست و عمل مانگی ہے، ذرا التجا کے الفاظ کو دیکھیں تو عمر بھر کا حاصل یہ شعر کس طرح کے معرکہ میں اپنی درازی عمر کی دُعا کرتا ہے۔ عرض کرتے ہیں کہ:۔

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

کہتے ہیں کہ "میرا مقابلہ اندھیرے کے پجاریوں سے ہے، میرے چراغ میں روغن ختم ہونے کو ہے، مزید مہلت (وقت) عطا کریں۔"

یہ شعر تو ۱۹۳۲ء کا ہے مگر اپنی آخری عمر کے آخری سال میں مسلمانانِ نیروبی کی ایسوسی ایشن کو جو خط لکھا، وہ ان کی اپنی درازی عمر کا اختتام بھی ہے اور اطمینان بھی، کہ اب جناحؒ کی درازی عمر کیلئے خود بھی دست بدعا ہیں اور مسلمانوں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں فرمایا:

> "میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں، مجھے اب زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہے۔ اس وقت صرف ایک شخص ایسا ہے جس کی مسلمانانِ عالم بالعموم اور مسلمانانِ ہند کو بالخصوص اشد ضرورت ہے اور وہ ہیں مسٹر محمد علی جناح۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ ان کی درازی عمر کیلئے دُعا کریں۔" (۱۲۲)

عصر رواں میں کارفرما قوتِ حقیقی ذات باری الٰہ ہے جو مقام مصطفیٰ ﷺ کی ماہیت کو بروئے کار لاتا ہے جو کہ دنیا

میں ائمہ ضلالت کی نہیں بلکہ رہنمائی و ہدایت کے الٰہی اور الہامی فیض پاک کا کرشمہ ہوتا ہے جسے معاصر زبان اور تاریخ کا بیان کرشماتی قیادت (Charismatic Leadership) کا نام دیتا ہے۔ اقبالؒ اسے

ع تو ئی مولائے یثرب آپؐ میری دستگیری کر

کہتے ہیں۔ اس ضمن میں ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد کے بعد لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں فرمایا:

اولاً:۔ ''یاد رکھیئے کسی نصب العین کو اس کی علمی قیود سے آزاد کر کے ظاہر کرنا ایک الگ منصب ہے۔ مگر ایسے نصب العین کو زندہ حقیقت میں بدل دینے کی رہنمائی کرنا بالکل دوسرا کام ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں ''سیاسیات کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک سوسائٹی ہے۔ سیاسیات میں میری دلچسپی بھی دراصل اسی وجہ سے ہے۔ آج کل ہندوستان کے اندر سیاسی تصورات جو شکل اختیار کر رہے ہیں، وہ آگے چل کر اسلام کی ابتدائی ساخت اور خطرات پر غالباً اثر انداز ہوں گے۔'' (۱۲۳)

ثانیاً:۔ ''میرے پاس کوئی نئی چیز پیش کرنے کیلئے نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میں آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ (الٰہ آباد ۱۹۳۰ء) میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔'' میں فی الحال صرف اتنا عرض کرونگا کہ اگر آپ کا فیصلہ موجودہ حکمت عملی کو خیر باد کہنے کا ہو، تو آپ کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ پوری (مسلمان) قوم ایثار کیلئے تیار کریں، جس کے بغیر کوئی غیرت مند قوم باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے نازک وقت آن پہنچا ہے اپنا فرض بجا لایئے، یا اپنے وجود کو مٹا دیجئے۔'' (۱۲۴)

اس خطبے میں انگریزوں کی سیاست اور گاندھی کی ذہنیت پر جامع جملے ارشاد فرمانے کے بعد پہلے ایک پیشن گوئی فرماتے ہیں کہ:۔

''اسلام، جو وقت میں نشان حقیقت دیکھتا ہے ایشیاء کی غیر مبدل تصویروں میں خلل انداز ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔'' (۱۲۵)

اسلام کی حقیقت اور دین کا رازِ حقیقی خود کیا ہے؟ اقبالؒ تو

ع بہ مصطفٰی ﷺ برساں خویش را کہ دین ''ہمہ اوست''

حضور ﷺ کے نعلین پاک پر خود کو نچھاور کرو کہ دین آپ کی ذات اطہرؐ ہے، دین و دنیا کی حقیقت میں صراط مستقیم بتاتے ہیں کہ

"عشق رسول ﷺ سرِ دین بھی ہے اور وسیلۂ دنیا بھی، اس کے بغیر انسان نہ دین کا ہے نہ دنیا کا۔"(۱۲۶)

یہی وہ دینی بصیرت کا اعجاز ہے جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کو ہندو کانگرس کی متحدہ قومیت کی آ کاس بیل میں جکڑنے اور بالآخر ہندویت میں ضم کرنے کے خلاف کھل کر اعلان کیا، اقدام کیا، نشانِ منزل دی، اس منزل کے حصول کی خاطر شایانِ شان قیادت کا اصطفیٰ (Selection) فرمایا، اور لندن سے جناحؒ کو ہندوستان واپس آ کر، مسلمانوں اور مسلم لیگ کی قیادت پر آمادہ کیا، اس ارشاد کے ساتھ کہ

"ہندوستانی قومیت کا اقرار، امت کے جداگانہ وجود کا انکار ہے۔"(۱۲۷)

جناحؒ اپریل ۱۹۳۴ء میں پانچ سال لندن میں قیام کے بعد ہندوستان واپس کیا آئے بقول اقبالؒ

ع افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

بنکر لوٹے، حالات کی رفتار اور برعظیم کی ملت اسلامیہ کی پکار پر جوں ہی واپس آئے تو امیدوں کا چمن کھل اٹھا۔ ایک جائزہ سراج نظامی سے کہ محمد علی جناحؒ نے۔

"مسلم لیگ کے تن مردہ میں نئی روح پھونک کر اُسے زندہ کر دیا، آپ نے محسوس کر لیا کہ اگر اس وقت مسلمانوں کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو برعظیم کے مسلمانوں کا مستقبل اندلس کے مسلمانوں سے بھی بدتر ہوگا، آپ کی عقابی نگاہوں نے اس حقیقت کو پالیا کہ ہندو سیاستدانوں کی ساری سرگرمیاں صرف مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے منصوبوں کیلئے وقف ہو چکی ہیں۔ آپ کے قلب و ذہن میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ سرزمین کے حصول کی تڑپ پیدا ہوئی، آپ نے ملت کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سہارا دیا، اُسے انگریز کے استبداد اور ہندو کی عیاری کے باوجود ساحل مراد پر لا کر دم لیا۔ آپ نے قیادت کا حق ادا کر دیا اور مسٹر محمد علی جناح سے مسلمانوں کے محبوب قائداعظم بن گئے۔"(۱۲۸)

قائداعظمؒ کی واپسی ۔۔۔ مسلم امت، مسلم مملکت، ایک آئینی جدوجہد

حضرت علامہ اقبالؒ کی حیات مستعار کے آخری دو برس جہاں ان کی علالت طبع کا وہ عرصہ ہے جس میں وہ بستر علالت سے لگ گئے، ان کی آواز بیٹھ گئی تھی، قلب کا عارضہ بھی تھا اور دمہ کی سی شکایت نے ان کی مصروفیات کو گھر کے اندر اور کمرے سے صحن تک محدود کر دیا تھا، وگرنہ وہ ۱۹۳۶ء تک ظاہراً بھی پنجاب میں مسلم لیگ کو قیادت کا شرف بخشتے رہے۔ ان کی علالت طبع کے باوجود انکی زندگی کے آخری دو برس برعظیم کی ملتِ اسلامیہ پر ان کی دینی بصیرت اور روحانی توجہ کی بارشوں کا عرصہ ہے۔ ان کی خلوت خاص اور رفقاء خاص نے جس قدر محبت، توجہ اور ارادت سے یہ آخری عرصۂ حیات ان کی صحبت میں گزارا اس کی روزنامچہ کی صورت میں یادداشتیں سید نذیر نیازی کی کتاب "اقبالؒ کے حضور" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں، جبکہ میاں

محمد شفیع (م ش مرحوم) کی تحریریں بھی اِسی تسلسل کی ایک وقیع روایت ہے۔ اپنے دیباچے میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ

''حضرت علامہ رہ رہ کر اسلام اور مسلمانوں کا ذکر چھیڑتے، رہ رہ کر کسی خیال میں ڈوب جاتے، دفعتاً خاموشی اختیار کر لیتے، جیسے کوئی کیفیت طاری ہو، بے قراری کے عالم میں اٹھ بیٹھتے یا اللہ کا ورد کرتے، عشق رسول ﷺ کی والہانہ کیفیتوں میں اشکبار رہتے۔ ان کا ذہن مرکوز تھا تو فی الحقیقت دو باتوں پر، اسلام اور مسلمانوں پر۔ اسلام عین حیات ہے دنیا کو اسلام کی کس قدر ضرورت ہے۔ فرمایا ''اطمینانِ قلب بڑی نعمت ہے اور یہی نعمت ہے جو یورپ نے مادیت پرستی میں کھودی ہے۔''(۱۲۹)

سید نذیر نیازی نے اس یادداشت کے دیباچے میں مزید لکھا ہے کہ'' راقم الحروف نے اس، بیاض یاداشت (اقبالؒ کے حضور) کو جن الفاظ میں ترتیب دیا ہے اس سے حضرت علامہ کے ایمان و یقین، حضرت علامہ کے واردات و مشاہدات، حضرت علامہ کے نورِ بصیرت اور فکر ونظر کی تمام ترجمانی ہوگی، راقم الحروف کا خیال ہے یعنی اس بجوائے:۔

میرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبریل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکان کے لیے
(اقبالؒ)

اسی روزنامچہ میں ۱۵ فروری ۱۹۳۸ء کا ذکر کرتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ حضرت علامہؒ نے ارشاد فرمایا کہ تب جماعت احمدیہ کے امیر ''مرزا محمود احمد نے جناح کو خط لکھا، مسلم لیگ میں شمولیت کے لیے ارشاد ہوا'' جناح نے مرزا محمود احمد کا یہ خط مجھے بھیج دیا ہے۔''

''میں نے بہر حال جناح کو لکھ دیا ہے، اس قسم کے خطوط کا کوئی جواب نہ دیں۔''(۱۳۰)

اس امر کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہ ہوگا، کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال فکر ونظر کی جس معراج پر ہیں، ان کی حیات مستعار کے آخری برس، بیماری کی شدت کے باوجود، مسلمانانِ برعظیم کی بہبود وفلاح اور مسلم لیگ کی تنظیم اور جناح کیلئے صلاح ومشورہ میں کس قدر بے تاب ہیں، مسلم ملت کو انڈین نیشنل کانگرس کے متحدہ قومیت کے دام ہمرنگ زمین سے بچا کر، مسلمانوں کی حقیقی آزادی کا راز ایک مسلم ہندوستان یعنی مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ان کی اپنی حکومت کے قیام پر مرکوز ہے۔ اور یہ انگریز حکمرانوں اور کانگرس کے ہندو سیاستدانوں کے عزائم اور ارادوں کے علی الرغم مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی بقا اور سلامتی کے خواں ہیں۔

اسی کام اور قیادت کی خاطر، جناح کو لندن سے ہندوستان واپس آنے پر آمادہ کیا اور خود ان کی قیادت میں ایک

پیرو کے طور پر عملاً پنجاب مسلم لیگ کی صدارت کے فرائض چھ برس تک ادا کیے، ورنہ انگریز ہندو گٹھ جوڑ، مسلمانان برعظیم کے خلاف ۱۷۵۷ء جنگ پلاسی کے بعد ایک سو برس تک بنگال سے دھیرے دھیرے بڑھتا ہوا ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی تک مسلم ہندوستان کو تاراج کرتا ہوا، بالآخر پورے برعظیم پر مسلمانوں کی صدیوں پرانی بادشاہی کو تباہی سے دوچار کر گیا یہ گٹھ جوڑ، کمپنی حکومت کے آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک مسلسل، مربوط اور منظم طور پر جاری رہا جس میں مسلم دشمنی کا تاریخ الاؤ مسیحی یورپ کے برطانوی حکمرانوں اور مسلم دشمنی کے ایک ہزار برس کے عناد کا نام، ہندو، انگریز اتحاد ہو گیا تھا۔ معروف دانشور قدرت اللہ شہاب نے اپنی خودنوشت میں بجا طور پر ایک گٹھ جوڑ کے جوڑ ڈھیلے کیے ہیں اور کھل کر بتایا ہے کہ

> ''برصغیر میں انگریزوں اور ہندو بنیوں کا گٹھ جوڑ تو تجارتی لین دین سے ہوا تھا، لیکن رفتہ رفتہ ایک عالمگیر بلا (Octopus) کی طرح اس نے باہمی خیرسگالی کے ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک بہت بڑی قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ یہ ملی بھگت خوب رنگ لائی، جب انگریزوں نے برصغیر پر اپنا تسلط جمانے کا آغاز کیا، تو تجارتی بنیا دان کا دست راست تھا، اور آزادی کے بعد جب انہوں نے یہ خطہ چھوڑا تو سیاسی بنیا ان کا ہمدم و ہمراز تھا۔ یہ محض حسن اتفاق ہی نہ تھا کہ ہندوؤں نے جس انگریز سے چھٹکارا حاصل کیا تھا اس انگریز کو برضا و رغبت بھارت کا پہلا گورنر جنرل بھی تسلیم کر لیا۔'' (۱۳۱)

جس شخص کو لارڈ ویول کے بعد بحریہ کی کمان سے ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجا گیا، اس سے جواہر لعل نہرو، ملائیشیا میں ہندوستان آنے سے پہلے ہی مل آئے تھے۔ تقسیم ہند کو روکنے کے آخری دم تک حربوں کی کانگرسی سیاست کا یہ برطانوی آلۂ کار جس سطح کا شہزادہ تھا اس کے نفسی ابتلاء پر کوئی سا تبصرہ تو تقسیم ہند کے مراحل پر ہی واجب ہے البتہ اس کی آخری عمر میں ایک عدالت سے جرمانے کی خبر ایسی ہے، جس کا تذکرہ کیے بغیر اس کی ذہنی فسطائیت کا ذکر یقیناً ادھورا رہے گا۔ لاہور کے انگریزی روزنامہ، پاکستان ٹائمز ۱۹ نومبر ۱۹۷۲ء کی سنگل کالمی خبر ہے۔

> ''لندن، ۱۸ نومبر۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جو ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے تھے اور جو ملکہ برطانیہ کے شوہر پرنس فلپ کے چچا ہیں آج عدالت نے اس جرم پر ان کو ۲۰ پونڈ جرمانے کی سزا دی ہے کہ انہوں نے اپنے فارم واقع کینٹ (واقع جنوب مشرقی انگلستان) سے دودھ میں پانی ملا کر فروخت کیا۔'' (۱۳۲)

برطانوی سامراج نے مسلمانوں کو نہ صرف برعظیم کے اقتدار سے بے دخل کیا، بلکہ انہیں زندگی کے ہر ہر شعبے میں بیدست و پا کر کے، نکال باہر کیا، دفتری بابوؤں سے لیکر، افسری عہدوں تک ہندو بنیئے ہی چھا گئے، یالائے گئے، اور مسلمانوں کو پوری منصوبہ بندی کی ساتھ عملی زندگی کے میدان سے فارغ کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس بھی

انگریز وائسرائے کے ایما اور اشارے پر ایک انگریز ہی نے بنائی، اولین سن وسال میں انگریز ہی اسکے صدر تھے، جنہوں نے اس کی نیو اٹھائی، اور ہندو سیاست کو برطانوی انتظام کے یمین ویسار فراہم کرنے کیلئے ہندو ذہانت کی مقامی قیادت تیار کی تاکہ مسلمان پھر سے منظم ہو کر، ہندوستان کی سیاسی قسمت کے مالک نہ بن جائیں نامور ادیب اور مجلس احرار اسلام کے سابق جنرل سیکرٹری آغا شورش کاشمیری نے انڈین نیشنل کانگرس کا تعارف بڑے جامع الفاظ میں کرایا ہے۔ لکھتے ہیں،

''انڈین نیشنل کانگرس، ہندوستان کی یورپی ذہانت اور سیاسی فطانت کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔'' (۱۴۳)

انہوں نے انگریزی استبداد اور استعمار پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ

''سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۷۹۹) سے لیکر بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری (۱۸۵۷ء) تک انگریزوں کا واحد نصب العین (Target) ہندوستان سے مسلمانوں کا خاتمہ تھا، پھر بیسویں صدی کے سال اول تک اس خاتمے کی مختلف شکلیں ڈھلتی رہیں، عجب نہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ہسپانیہ کے مسلمانوں کی طرح مٹ جاتے، لیکن قدرت کو منظور نہ تھا۔'' (۱۴۴)

یہی سبب ہے ہندو سیاستدانوں میں برطانیہ تیرا شکریہ کا تذکرہ تو سیاسی نوعیت کا ہے، البتہ فکری محاذ اور آئینی امور کے زیرک ہندو زعماء اس اعتراف کا اظہار اور اقرار کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے ہیں، اس سلسلے میں شری روی ایس سری نو اس شاستری (جس کی آئینی الجھنوں پر خطبہ الہ آباد میں اقبالؒ نے بھی تبصرہ فرمایا ہے) انگریزوں کے بارے میں ہندو اعتراف کا ایک کھلا اقرار نامہ ہے، کہتے ہیں:۔

''ہم بغیر کسی جھجھک کے حکومتِ برطانیہ اور انگریز قوم کے شکر گزار اور ممنون احسان ہیں کہ ان کے پادریوں اور حاکموں نے ہماری قومیت کو ابھارا اور ہماری سیاسی سربلندی اور کامیابی کیلئے کھل کر پوری مدد کی اور ہمیں آگے بڑھایا۔ اگرچہ تحریک بڑے نشیب وفراز سے گذری ہے لیکن انسانی تاریخ میں ہندوؤں کیلئے انگریزوں کی یہ کوشش بے مثال ہے۔'' (۱۴۵)

اور یہ امر کوئی ڈھکا چھپا راز تو نہیں کہ مسلم ہند کی بارہ صدیوں کے بعد برطانوی سامراج نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کیا جو دشمنوں کا دشمن اور وہ بھی مقتدر حکمران، دوست ہی نہیں سرپرست ہوتا ہے۔ اکثریت کے جمہوری رویوں کے برطانوی پارلیمانی نظام کی برکت کا یہ عصری اعجاز تھا کہ بارہ صدیوں بعد، انڈین نیشنل کانگرس کو برطانوی استعمار کی رخصتی پر جدید بھارت کا مسلمانوں کی لاشوں اور ہڈیوں پر بنایا گیا ملک بنام آزادی ملا، مگر حقیقت حال کا روشن چہرہ یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں نے برصغیر میں جو کچھ پایا وہ سراسر انگریزوں کے طفیل پایا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی سرپرستی ہی نہ کی، بلکہ انہوں نے ہندوؤں کو اکثریتی اصول کے تحت اپنا جانشین بھی بنایا۔ ہندوؤں کی سرپرستی میں

حضرت قائداعظمؒ محمد علی جناح، نماز کے لیے نیت کرتے ہوئے

انگریزوں نے اپنا فائدہ بھی پیش نظر رکھا۔ مسلمانوں سے مغربیوں کی ہمیشہ تصادم کی تاریخ رہی ہے، اس لئے اپنے عروج کے وقت یورپی اقوام نے مسلمانوں کے خلاف سدا غیر مسلموں کی امداد کی۔ مشرق وسطیٰ میں عربوں کے خلاف یہودیوں کا ساتھ دیا اور اس طرح برصغیر میں مسلمانوں سے جانب داری برتی۔ مشہور ہندو مصنف نرادی چودھری کا کہنا ہے کہ

> ''اگر برطانیہ، ہندوستان نہ آیا ہوتا تو ہندو سماج خود ہنوز ازمنۂ وسطیٰ کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہوتا۔ نراد جی نے (یہاں تک) کہا کہ بلکہ یہ تھیوری پیش کی ہے کہ آریہ نسل کے لوگ دراصل یورپی نسل کے لوگ ہیں اور جنوبی یورپ میں بستے تھے اور پھر ایران کے راستے شمالی ہند میں آباد ہو گئے۔''(۱۳۶)

مغربی غلبہ و استعمار کے (Response) میں اقبالؒ نے عالم نو کو پردہ تقدیر سے باہر لا کر مردِ مومن کا تصور عطا کیا ہے، جو عہد جدید میں انسان کی روحانی ضرورتوں اور اس کے تاریخی مطالبات کا پیکر محسوس بنکر کلام اقبال میں جلوہ فرما ہے۔ اس خضر راہ کو تاریخ اور تحریک دونوں کا جامع ہونا بھی لابدی ہے، اور مستقبل کا نقیب تو وہ اپنے عصر رواں کا قائد ہی نہیں قائداعظمؒ بن جاتا ہے، جو ایام گذشتہ کی کہانی بھی سناتا ہے، اور داستانِ امروز بھی یاد دلا کر دلوں کی دھڑکن، دماغوں کا شعور اور روشنی و نور کا مستقبل دکھاتا ہے۔ تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک کے ۱۰ سالہ عشرۂ سیاست کو ذرا اِس خضر راہ کی زبان سے سننا ہو تو اس کا عنوان سجے گا:

قائداعظمؒ کا فرمان اور تحریک پاکستان

> ۱۔ ۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے مخاطب ہیں، فرمایا۔ ''خوب یاد رکھیے یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، یہ سلطنت مغلیہ کے زوال سے لیکر اب تک سب سے بڑا کام ہے، جو آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے، کہ منزل تک پہنچنے کیلئے تمام وسائل کو کام میں لانا پڑے گا۔ ہر ممکن طریقے سے مکمل تیاری کرنا پڑے گی، میں آپ سے کہوں گا کہ جذبات کے دھارے پہ نہ بہہ جایئے، محض نعروں کی لپیٹ میں نہ آیئے۔''

اسی برس علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان پر ایک سال کی کانگرسی یلغار اور ہندو اخباروں کے ڈھول دھپے کی گرد بیٹھ جانے پر فرمایا:۔

> ۲۔ ''گذشتہ ایک ہزار برس سے اس برعظیم پر کسی بھی علاقے میں ہندوؤں کی حکومت قائم نہیں رہی، میں انہیں برعظیم کا ۳/۴ پیش کر رہا ہوں، یہ مجھے اس برعظیم کا ۱/۴ حصہ بھی نہیں دینا چاہتے۔''

مسلمان اور نوجوان طلبہ کی تنظیم کیلئے علی گڑھ یونیورسٹی اور پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے جواں جذبوں کو کس قدر تاریخی شعور اور حال کے دستور میں پرو کر مستقبل کی جھلک دکھاتے ہیں، وہ علی گڑھ ہی میں ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کا خطاب ہے

جس میں فرمایا:۔

۳۔ ''آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جدگانہ مملکت کی وجہ کیا تھی، تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔'' (۱۳۷)

اسی خطاب میں وہ مشہور جملہ بھی ارشاد فرمایا جس کی روحانی اور نظریاتی بلاغت نے صدیوں کی تاریخ کو ایک ہی جملے کے نظریاتی شہود میں سمودیا فرمایا،

''پاکستان تو اسی روز وجود میں آ گیا تھا، جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا، یہ اُس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی، مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے وطن نہیں اور نہ ہی نسل ہے۔'' (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۸ مارچ ۱۹۴۴ء)

جس طرح کی قیادت، قدرت نے اسلامیان ہند کو قائداعظمؒ کی شکل میں عطا کی تھی، پھر اس کے لئے اقبالؒ ہی کے خطوط، جناحؒ کے نام کافی اور شافی ہیں، جس میں وہ جناحؒ کو مسلمانوں کا قائداعظمؒ بننے ہی کی بات کرتے ہیں اور انہیں کے مصرع کے مطابق جناحؒ کو باور کراتے ہیں کہ

ع ترس گئے ہیں کسی مردِ راہداں کیلئے

اس کی تاریخی گواہی اور عینی شہادت ایک تاریخی مذاکرات کا تذکرہ ہے، کہ فقیر وحیدالدین شملہ کانفرنس سے عین پہلے حضرت قائداعظمؒ سے بمبئی میں ملے، وہ لکھتے ہیں کہ

''اس ملاقات میں کئی موضوعات پر باتیں ہوئیں، لیکن سب سے زیادہ اہم بلکہ گرم موضوع (Burning Topic) شملہ کانفرنس تھا، انہوں نے فرمایا،

''میں آج ہی شملہ کانفرنس میں شریک ہونے جا رہا ہوں، پھر قدرے رُک کر حسرت آمیز لہجے میں بولے!

''دیکھو میں یہاں تن تنہا ہوں اور مسلمانوں کا پورا مقدمہ (Case) تیار کر رہا ہوں، اور عین اس مکان کے سامنے انڈین نیشنل کانگرس کے بہترین دماغ مل جل کر جواب دعویٰ تیار کر رہے ہیں۔'' (۱۳۸)

مگر پاکستان ہی کیوں خود قائداعظمؒ نے میمن چیمبر آف کامرس بمبئی میں ۱۹۴۷ء کے اوائل میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

''میں پاکستان کیلئے لڑ رہا ہوں، کیونکہ ہمارے مسائل کا یہی ایک عملی حل ہے۔ متحدہ ہندوستان اور

پارلیمانی طرزِ حکومت ایک لایعنی خواب ہے، اور غیر ممکن بات۔ ہندوستان نہ تو ایک ملک ہے اور نہ ہی ایک قوم، اس میں بیسوؤں قومیں آباد ہیں۔''

برعظیم کی ملت اسلامیہ کے شعور کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے منظم کیا یہ نعرہ ہی وقت کی آواز بن گیا کہ

مسلم ہے، تو مسلم لیگ میں آ

سات برس کے قلیل عرصے میں مسلمانوں کو ایمان یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی بنیاد پر متحد اور منظم ہونے کا کام اتنی برق رفتاری اور بصیرت سے سرانجام دیا کہ یہی کلمہ طیبہ پاکستان کا سرِ عنوان بن گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ۔ تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک مسلم لیگ اور پاکستان بلکہ پاکستان اور قائداعظمؒ لازم و ملزوم ہو گئے۔ ایک شہادت سید ابن الحسن کے قلم سے:

''مسلم لیگ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک پُر آشوب اور تاریخ ساز زمانہ میں برصغیر کی سب سے زیادہ فعال، باوقار اور پُر اعتماد سیاسی تنظیم بن گئی، یہاں تک کہ انڈین نیشنل کانگرس جیسی ''ہم چو ما دیگر نیست'' قسم کی سکہ بند اور طاقتور سیاسی جماعت بھی احساسِ کمتری اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو گئی، اور اُسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ کانگرس کے بین الاقوامی مرتبہ کے باوجود اور ہندو قوم کے علاوہ بھی برصغیر کی دوسری اقوام اور اقلیتوں کی حمایت کے باوجود مسلم لیگ کی متحد اور پرعزم سیاست نے کانگرس کے ہوش گم کر دیے۔'' (۱۳۹)

معرکۂ دین ووطن۔۔۔تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور برعظیم پاک و ہند میں مسلم دورِ حکمرانی کی مکمل بربادی کے بعد یہاں کی ملت اسلامیہ کو دوہرے زوال کا سامنا کرنا پڑا، ایک تو سیاسی اقتدار سے محرومی ہی نہیں، انگریز استعمار کی طرف سے اجتماعی نسل کشی کے تاراج کے علاوہ معاشی، سماجی اور روزمرہ زندگی میں شدید جارحیت کا سامنا ہوا، وہاں صدیوں سے ہم وطن ہندوؤں نے نئے آقاؤں کو نمسکار کرنے میں دیر نہ کی۔ یہ درست کہ ہندویت (Hinduism) کی ریت اور روایت ہی یہی چلی آئی ہے کہ وہ اپنی دانش کے بل بوتے پر سدا اس روش اور رویے کی حامل تہذیب ہے کہ جسے اُردو زبان میں صحیح معنوں میں ''ابن الوقت'' کہا جا سکے جبکہ مسلمانوں میں مڈل کلاس کا یہ تاریخی رجحان ہے، البتہ ہندویت کا تاریخی ورثہ ہی یہ ہے کہ

ع چلو تم اُدھر کو، ہوا ہو جدھر کی

وجہ بھی تاریخی ہے کہ ہندومت یا ہندو کی مت (Mentelity) ہے ہی یہ کہ وہ عقل عیار کے ازلی ہتھیار سے مسلح ہے اور عقل ہی اس کی میزان و مضراب حیات ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہندویت نے اپنے ہاں سے اٹھتی ہر فکری تحریک، فلسفہ اور افکار و اقتدار تک کو نگل لیا، خواہ یہ بدھ مت ہو کہ جین مت، چارواک کا فلسفہ ہو کہ اشوک کا اقتدار بلکہ بدھ مت کو دیس نکالا بھی

ہندو تاریخ کا عصری جلوہ ہے۔ مگر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کو یہ الٰہی اور الہامی برکت حاصل تھی کہ جس کے آگے عقلِ عیار عرف ہندومت ٹھہر نہ سکتی تھی اور نہ ٹھہر سکی، نتیجۂ وہ مسلمانوں اور اسلام کو اپنے میں ضم کیا کرتی اسلام کے روحانی فیض اور مسلمانوں کے انسانی چلن نے انہیں بڑی تعداد میں اسلام کی طرف متوجہ کیا خاص طور پر اس خطۂ پاک و ہند میں مسلم صوفیاء کرام کے سلاسلِ اربعہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کا بڑا احسان ہے جو در حقیقت اسلام ہی کا دوسرا نام ہے۔ ذات پات اور بت پرستی کی دو ٹانگوں پر کھڑے ہندومت کے علاقے میں بند ماحول کو عالمگیر تصور انسان کے کُھلے دل و دماغ کا انسان کیا میسر آیا کہ اُس نے سکون کا سانس لیا۔ یہی راحت و رحمت کا پیام تھا، جو برعظیم پاک و ہند میں حضور سرکار دو عالم ﷺ کے اُس ارشاد پاک کا عصری ابلاغ ہے کہ ''مجھے ہند سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے'' (الحدیث)۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے اس کا ترجمہ اور تفسیر کی ہے، فرمایا:۔

میرِ عرب ﷺ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

گویا میرِ عرب ﷺ کی پسند، اقبالؒ کا وطن ہے، نہ کہ وطن کی مٹی اور دھرتی پوجا کی یہ تصریح کہ ہند کے بارے میں چونکہ ارشاد رسول ﷺ ہے اس لئے ہند کتنا بلند ہے۔ حضور ﷺ کے ارشاد میں ٹھنڈی ہوا ہے، بھلا اس ٹھنڈی ہوا کا کیا مطلب ہے یہی جو تاریخ کے جلو میں جلوے بکھیرتا ہے، کہ آپؐ کے فقر نے اس بتکدۂ ہند میں اللہ کی توحید اور آپ ﷺ کی نبوت کے فیض و فیضان سے مردہ دلوں کو زندہ کر دیا۔ وجہ بھی حقیقی تھی کہ عقل کا انہماک صرف اپنی ذات کا طواف ہے، جو خود پرستی اور خواہش نفس سے آگے جانے نہیں دیتا، سوچنے نہیں دیتا، دنیا اور مادی مفاد سے آگے بڑھ کر اُنس و انسانیت کی راہ پر چلنے ہی نہیں دیتا اور یہی عقل کی رہنمائی کا شیطان لعین ہے۔ یہ بنی آدم کا دشمن ازلی ہے بلکہ قرآن پاک کی زبان میں عدو مبین کھلا دشمن (Declared Enemy) ہے۔ اقبالؒ نے صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ

عقل در پیچاکِ اسباب و علل
عشق چوگان باز میدانِ عمل

ہندو معاشرت و معاصرت کا سکھ تجربہ، ہندو قوم کی نفسیاتی جھلک بنا ہے، حالانکہ انگریز بھی اس کی نفسانی تہہ تک پہنچ گئے تھے، سیاسی نہیں۔ نفسیات کا مطالعہ یہ طے کر چکا ہے کہ

> ''ہندو کی سوچ خود اپنی ذات کے گرد گھومتی ہے۔ ہندو کو کسی دوسرے کے بارے میں کوئی چنتا یا فکر نہیں ہوتی، وہ اپنی ذات کا ہی اسیر اور قیدی ہوتا ہے۔'' (۱۴۰)

کرم داس موہن چند گاندھی کے مہاتما ہونے پر جارج برناڈ شا نے گاندھی کے بارے میں جو جملہ کہا ہے، وہ دوغلی شخصیت یا دوہرے معیار کی حیثیت کا بھی غماز ہے، کہتے ہیں۔

"He is saint among politicians and politician among saints." (141)

اور انہیں تو جواہر لعل نہرو کا ایک جملہ گاندھی کی عقیدت کا ہے کہ عقدہ کشائی کا، جو کچھ ہے کم وبیش پیش کہنے میں کیا حرج ہے کہ

"As for Gandhi himself, he was very difficult person to understand; some times his language was almost incomprehensible to averag modern."(142)

یہی گاندھی ہی کیا خود انڈین نیشنل کانگرس کی ایجاد بھی برطانوی حکام کا تحفہ ہے سوراج اور آزادی کامل ۱۹۲۹ء میں کیوں اور کیسے یاد آیا، یہ تو بعد میں زیر بحث آئے گا مگر مسلمانوں کے ساتھ ہندو رویے کا جدید رشی اور مُنی (Saint) یا جدید ہندو دانش کے گاندھی کو کانگرس میں پرو کر دیکھیں تو حالتِ حالات اس سے زیادہ کیا ہوں کہ

گاندھی اور کانگرس

''کانگرس ۱۹۱۵ء کے زمانے میں برطانیہ ہی کی حلیف تھی اور مہاتما گاندھی بالکل غیر معروف شخص تھے، اور وہ فرنگی محل میں مولانا عبدالباری کے دولت کدے (لکھنؤ) میں اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ مولانا مرحوم نے مہاتما جی کو اُس زمانے میں بالخصوص عوام میں بہت متعارف کرایا، یہ کیا خبر تھی کہ بعد میں یہی شخصیت ہندوؤں کے لئے قابل پرستش اور مسلمانوں کے لئے بے حد مضر ثابت ہو گی۔''(۱۴۳)

مگر بات سر دست نہ کانگرس کی نہ گاندھی کی ہو رہی تھی بلکہ برعظیم میں اسلام کی برکات کی، جس نے صدیوں کے تاریک اور بند ہندو سماج میں، توحید و رسالت کی شمع جلائی، دلوں کو زندہ کیا، دماغوں کو منور کیا، اور انسان کامل ﷺ کے در اطہر ﷺ پر لا کھڑا کیا۔ اور وجہ صاف شفاف ہے کہ اسلام دنیا کا آخری دین ہے، خاتمیت کا مدعی اور تکمیل کا دعویدار۔ سراج منیر نے سچ کہا کہ

''فطرت انسانی میں کمال کے کیا معنی ہیں؟ مذہبی بیان سیاسی احسن تقویم کا راز ہے۔ ہبوط آدم علیہ السلام سے کچھ نتائج خارجی کائنات میں پیدا ہوئے جن میں سے تاریخ انسانی کا زمانی سفر خود سب سے بڑا نتیجہ ہے۔''(۱۴۴)

بلکہ انہی کے الفاظ میں

''اسلام کا تصورِ خاتمیت دراصل تصورِ جامعیت سے وابستہ ہے۔''(۱۴۵)

بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ

''خاتمیت کا تصور حصولِ کمال کا تصور ہے۔''(۱۴۶)

اسلام نے تہذیبی سفر میں برِعظیم میں تنگ و تاریک ہندو تہذیب کی جس کھلی فضا کا ماحول و معاشرہ پیش کیا، اسکی وسعتیں زمان و مکان یا تاریخ کے تاریک غار اور غور سے یکا یک، انسان کو وحی کے لحاتِ نور میں لے آئی ہیں، جہاں وقت کا عنصر ویسے بھی غائب ہوتا ہے اور لحہ موجود اور ذات باری الہ کا شہود، اقرار توحید و رسالت کے ساتھ ہی ملت اسلامیہ کا فرد اور امتِ مسلمہ کا حصہ بنا دیتا ہے، جہاں ملک، قوم، نسل اور زبان ویسے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ اسلامی تہذیب ہے کیا؟ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اِسے آسان زبان میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اسلامی تہذیب

''یہ کوئی قومی، ملکی یا نسلی تہذیب نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بحیثیت انسان خطاب کرتی ہے اور اُس شخص کو اپنے دائرے میں لے آتی ہے جو توحید و رسالت، کتاب اور یوم آخرت پر ایمان لائے۔ اس طرح اُس تہذیب نے ایک قومیت بنائی ہے، جس میں بلا امتیاز رنگ و نسل اور زبان ہر انسان داخل ہو سکتا ہے۔ اور جس کے اندر روئے زمین پر پھیل جانے کی استعداد موجود ہے اور جو تمام بنی آدم علیہ السلام کو ایک نظم ملت میں پیوستہ کر دینے اور ان سب کو ایک تہذیب کا منبع بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ عالمگیر انسانی برادری قائم کرنے سے اس کا مقصد اپنے متبعین کی مردم شماری بڑھانا نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کو اُس علم صحیح اور عمل صحیح کے فیض میں شریک کرنا ہے جو ان سب کے خدا نے ان سب کی بھلائی کیلئے عطا فرمایا ہے۔'' (۱۴۷)

برِعظیم میں ہندوؤں کا قبول اسلام ملاؤں کا نہیں صوفیاء کا روشن جہاں ہے، جو نگاہ سے دل کا فیصلہ کرتے اور صحبت کے فیض سے تزکیہ نفس کا وہ فریضہ سرانجام دیتے، جو فقرِ نبوی ﷺ کا تسلسل بھی ہے اور تحمل بھی، آپ کا منصب مبارک بھی، الہام و پیغام کی تلاوتِ آیات، نفس امارہ کی تہذیب اور قلب کی صفائی کے ساتھ ساتھ انسانوں کو ان کی کتاب پڑھانا ہی تو ہے، صوفیہ اور سلاسل اربعہ اپنے اپنے طریقہ اور طریقت سے جو شریعت مطہرہ کے اصول اور سنت رسول ﷺ (طریقہ ہی سے طریقت) ہے، گویا قرآن و سنت یا کتاب و سنت کا نبوی ﷺ طریقہ ہی سلاسل اربعہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ ہے۔ نگاہ کا کرشمہ اور صحبت کا فیض یہ ہی طریقت ہے یہی فقر ہے، جسے اقبالؒ نے دین و فقر کہا ہے اور اس کا جامع ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ دل کی دنیا کے انقلاب کو ''فقر'' کہہ کر لفظ ''عشق'' میں سمو دیا ہے یہی رمزِ مصطفیٰ ﷺ ہے۔

ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است
(اقبالؒ)

جس سے شرک ڈرتا ہے، دُور بھاگ جاتا ہے جبکہ اللہ پر ایمان اور رسول ﷺ کا ایقان ہی تو کلمہ طیبہ ہے۔ اللہ کے

بندوں بلکہ دوستوں کو خوف وحزن کہاں الاان اولیاء اللہ لاخوف علیھم و لاھم یحزنون o ترجمہ:۔''بیشک جو اللہ کے دوست ہیں انہیں نہ غم ہوتا ہے نہ خوف'' ظاہر ہے کہ غم ورثہ ماضی ہے، خوف اندیشہ فردا جبکہ اہل اللہ تو صاحب حال کا دوسرا نام ہے۔ یہ سراسر حال ہی حال ہے۔ عقل کیلئے ماضی، حال اور مستقبل کا پیمانہ شعور ہے، جبکہ دل کی زندگی اور کلمہ طیبہ کے حامل اور صاحب حال کا فرمان یہی ہے کہ حال ومقام(Time & Space) سے بلندتر مقام لا الہ ہے، فرمایا:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

جبکہ دل کو دین کا سرچشمہ بتایا ہے جو صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔ فقرِ مصطفیٰ ﷺ یا سنت (طریقہ اور طریقت) کیا ہے؟ مختصراً یہ کہ حق اصول ہے اور ذات رسول ﷺ ہے، صحابی کا لفظ بھی صحبت سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں وہ شخص جسے حضور سرکار دو عالم ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی ہو۔ فقر بھی اس صحبت کے فیض نبوی ﷺ کا نام ہے، جو تزکیہ نفس اور تہذیب نفس کیلئے اکسیر ہے اور یہی شریعت کے اصول اور ذاتِ رسول ﷺ کا تا قیامت جاری وساری سلسلہ ہے بلکہ سلاسل (Orders) بھی ہیں جو سنانے کے قال وقول نہیں، حالت اور حال کا دین ہے، معلومات نہیں کیفیات کا جہانِ باطن ہے، جو نیت ہے جس سے عمل پھوٹتا ہے۔ اقبالؒ ہی نے اس صحبت ومحبت کو خوبصورت اور کلیدی کلمات کا جامعہ پہنایا ہے، فرمایا:

دل ز دین سر چشمہ ہر قوت است
دین ہمہ از معجزاتِ صحبت است

اس لئے انہوں نے حکمران کے دربار، کیا سلاطین دہلی (۱۵۲۶ء۔۱۲۰۶ء) کیا مغل عہد (۱۸۵۷۔۱۵۲۶ء) بلکہ دونوں جہان کی بادشاہی سے صحبت کو اولین قرار دیا ہے۔ بہتر اور خوشتر کہا ہے، بلکہ برعظیم میں مسلمانوں کی سرگذشت، حکومت کا عروج وزوال (History) اور برعظیم میں اسلام کی پیش رفت (Movement) کا جائزہ لیں تو ان کا ایک شعر خود، ماضی اور حال دونوں کا جامع ہے، فرمایا

صحبت از حکم شاہی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

جبکہ مستقبل کیلئے ہر مسلمان کو یقین کی راہ دکھائی کہ فیض نبوی ﷺ اور تہذیب نفس کے لئے صرف اور صرف ایک ہی طریقہ مسنون ہے۔ معروف ہے، جو صحبت کا فیضان ہے۔ فرمایا

ع زندہ شواز صحبت آں زندہ مرد

جا، کسی صاحب حال اور زندہ مرد مومن کی صحبت میں جا کر، زندہ ہو جا! یہی طریقت اور فقر ہے، جو برعظیم پاک و ہند میں سلاسل اربعہ، چاروں سلسلہ ہائے فقر، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کا حاصل ہے اور یہی صدیوں سے ہجویریؒ

اور اجمیریؒ کے روشن کام کا صدیوں سے جاری فیض ہے، جو فی الحقیقت فیضِ مصطفیٰ ﷺ ہے۔ فقہ کے مسالک میں اہل سنت و الجماعت اور حنفی فقہ کے پیرو اپنی تعداد میں برعظیم میں صدیوں سے اکثریت میں ہیں اور یہی سوادِ اعظم یعنی عظیم اکثریت کا مسلک (School of Thought) ہے جبکہ اہل تشیع ہمایوں کے دور اور بعد ازاں جہانگیر کے دور میں ایران سے وارد ہند ہوئے، ویسے بھی عالم اسلام میں اہل سنت اور اہل تشیع دونوں مسالک کم و بیش موجود چلے آتے ہیں، درمیان میں بعض مواقع اور علاقوں میں ہر دو کے علاوہ بھی فقہی گروہ اور عقلی علوم اور نقلی علوم کے مباحث کے حامل بھی رہے ہیں مگر عام طور پر امام ابو حنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کی فقہ پر عامل مسلمان، آج عالم اسلام میں نمایاں تعداد کے ساتھ موجود ہیں۔ برعظیم میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تک بھی اہل سنت کا مسلک اعتدال حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مذہبی فکر کا اثاثہ ہے، البتہ ان کے مدرسے اور خاندان سے شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ نے ۱۸۳۱ء کی تحریک مجاہدین کے دوران میں سعودی عرب میں محمد بن عبدالوہابؒ کے خیالات سے متاثر ہو کر بدعات اور رسوم کی کتاب و سنت کی روشنی میں تبلیغ و تلقین اپنائی، تو ''وہابی'' کے لفظ کا آغاز و ابتداء ان کے مسلک کی پہچان بن گئی۔ جو آگے چل کر اہل حدیث مسلک کی صورت آج برعظیم پاک و ہند کے چیدہ چیدہ علاقوں کی ایک منظم اور موثر آبادی ہے، جو اب بھی سعودی عرب ہی کی اشاعتی، تدریسی اور سرکاری تائید و تعاون کی مرہون منت ہے۔ اہل حدیث مسلک کے پیرو، امام احمد بن حنبلؒ کے بعد امام ابن تیمیہؒ کے مسلک کے پیرو ہیں، البتہ برعظیم میں ان کا ظاہریت پر زور اور عقائد کی سختی نے انہیں اپنی پہچان کے دائرے میں محصور کر دیا۔ البتہ شاہ ولی اللہ کی فکر سے متاثر، مولانا محمد قاسم نانا تویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی تو فقہ حنفی پر زور اور صحبت شیخ اور بیعت کی طریقت کو زیادہ اہمیت دی، نتیجتاً حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے سلسلہ چشتیہ صابریہ کا سلوک، اہل دیوبند کا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آگے چل کر سیاسی میدان میں دینی فہم نے اس سلسلہ کے فقہی مرتبے اور مدرسے کے ساتھ وہی سلوک کیا جو تاریخ کا واضح نصاب ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے، خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون سے قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت و سیادت کو دینی اصطفیٰ (Selection) کے مرتبے کا حامل گردانا، اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ دیوبند مدرسے سے ہی مستعفی نہ ہوئے بلکہ جمعیت علماء ہند کے صدر اور دیوبند کے شیخ الحدیث اپنے ہم مسلک مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مدِ مقابل آکر، جمیع مسلمانان ہند کی حمایت اور حامی بن کر میدان عمل میں نکل آئے، جبکہ اہل سنت مسلک کے علماء اور مشائخ نے بحیثیت مجموعی تحریک پاکستان اور خاص طور پر ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے اہم سال میں انتخابات سے لیکر اجتماعات تک میں بھر پور طریقے سے قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان بلکہ مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ مفاد پسند اور دنیا دار مسلمانوں کے طبقات میں لکھنو کے شیعہ جاگیردار، پنجاب کے سنی جاگیردار اور یوپی کے نواب اور تعلقہ داریہ پبلک کے نہیں حکام کے غلام طبقات ہیں۔ ان کی حیثیت اس کے سوا اور کیا تھی کہ پنجاب میں یونینسٹ اور بنگال کے مسلم اکثریتی صوبے میں شیر بنگال کی پرجا سرامک پارٹی، ذاتی، خاندانی یا مفاداتی حکومتوں کا نام تھا۔ یہ مسلمان سیاست اور حکومت کا نقشہ لئے ہوئے

تھے جب ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء کے انتخابات ہوئے اور نتیجہ یہ کہ ہندوؤں نے اپنا اصل روپ گیارہ میں سے ۸ صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی مسلم دشمن روش سے ثابت کر دیا حالانکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے معاً بعد کانگرس ۱۸۸۵ء میں انگریزوں کے ہاتھوں تشکیل پھر برس ہا برس انگریزوں کی صدارت میں اس کی تنظیم، مستقبل میں ہندو انگریز گٹھ جوڑ کا وہی مقصد تھا، مطلوب تھا جو حالات وواقعات کی رفتار بن گیا۔ ہندوؤں نے روایتی عیاری کے ساتھ نئے آقاؤں سے تعاون کے نرت بھاؤ میں یہ پایا کہ مولانا عبدالمجید سالک نے بجا طور پر اس روش کا، رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''اور ہندو روز بروز حکمرانوں کے محبوب بن گئے، اب گویا یہ صورت پیدا ہوئی کہ مسلمان انگریزوں سے عدم تعاون پر کار بند ہو گئے اور ہندو انگریز کے دست و بازو بن گئے، انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے تمام ملازمتوں پر قبضہ جما لیا، اور انگریزی اقتدار کی بنیادوں کو استوار کرنے اور مسلمانوں کو اقتدار سے بے نشان کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔'' (۱۴۸)

مولانا عبدالمجید سالک نے اس تسلسل میں لکھا ہے کہ

> ''سرسید احمد خان نے اس تباہی سے متاثر ہو کر اپنی تحریک کا آغاز کیا اور غیروں سے زیادہ اپنوں کی مخالفت نے قدم قدم پر انکا ہاتھ روکا۔ لیکن یہ بندۂ خدا اپنے عزم پر مضبوطی سے قائم رہا، اور مسلمانوں کی ذہنی، تعلیمی، معاشرتی اور اقتصادی اصلاح میں مصروف ہو گیا، تاکہ مسلمان ملکی حقوق میں اپنا حصہ سنبھالنے کے اہل ہو جائیں۔ جب مسلمانوں نے تعلیم کے حصول پر اپنی توجہ مرتکز کر دی اور ہندوؤں کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا تو انہوں نے نیابتی اور نمائندہ اداروں میں جو اُس وقت منصۂ شہود پر آ گئے تھے، مخلوط انتخاب منظور کرایا جس کی وجہ سے ان اداروں کے دروازے مسلمانوں پر عملاً بند ہو گئے۔'' (۱۴۹)

وطن پرستی اور متحدہ قومیت

ہندو کانگرس مصلحتاً متحدہ قومیت کا پُر فریب نعرہ لگاتی تھی اور یہ حربہ انگریزوں کی مسلمان دشمنی اور ہندو دوستی کے مشترکہ درد مسلمان دشمنی کا سیاسی ہتھکنڈہ تھا۔ مغرب کے جمہوری اصولوں میں اکثریت کا مستقل اقتدار، ہوشیار رو عیار ہندو قوم کا مستقبل ہو گیا۔ انہوں نے ایک ہزار سال کے مسلم عہد سے انتقام کو اپنی چڑ بنایا، اور مسلم دور میں تو ہمت نہ ہوئی۔ انگریزوں کے اقتدار اور ایماء سے انہوں نے مسلمان قوم کو اپنے اندر جذب کرنے کیلئے اپنا تاریخی اور روایتی ہتھیار نکال لیا۔ یہی سبب ہے کہ ۱۸۸۵ء میں جوں ہی انڈین نیشنل کانگرس کی تنظیم کھڑی کی گئی، اس کے دو سال بعد ہی سرسید احمد خانؒ نے کانگرس کے صدر کے نام اپنے خط میں لکھا:

> ''میں نیشنل کانگرس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف

ذاتیں، فرقے، مذاہب کے افراد رہتے ہیں، وہ ایک قوم کے افراد ہیں، یہ ایک قوم بن سکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں یہ بالکل ناممکنات میں سے ہے۔'' (حیات جاوید)

وہ دن اور آج کا دن انگریز دشمنی کے نام پر، ایک مذہبی گروہ نے سرسید احمد خانؒ کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو آج بھی ہندوستانی مسلمانوں کا ملی شعور ہے اور جسے ہندو آج بھی ''منی پاکستان'' کہتے ہیں، دیوبند مدرسے کے چند مخصوص مذہبی مدرسین کے ایمان کا الاؤ بن گیا۔ سرسید احمد خانؒ سے لیکر قائداعظم محمد علی جناحؒ تک ان کی شعلہ نوائی اور ژاژ خائی سے کوئی نہیں بچ سکا، اس حد تک کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں کا مدعا ہی نہیں، عملاً انڈین نیشنل کانگرس کی ہم نوائی میں مسلم ملت کے جگر میں صدمات کے خنجر بھونکے، اور آج ۶۲ برسوں میں بھارت کی متحدہ قومیت کا مزہ چکھنے کے بعد بھی اپنے موروثی اور سیاسی ہفوات کو دماغوں میں اور دلوں میں لئے پاکستان، اقبالؒ اور قائداعظمؒ بلکہ سرسید احمد خانؒ ان کے ناقدین ہیں اور اکابر دیوبند ان کے قبلہ وکعبہ بلکہ بیت المقدس ہیں۔ اس سیاسی گروہ بندی یا دیوبندی سے اٹھ کر ذرا ملت اسلامیہ کی تہذیب وتقدیر کا فیصلہ سنیں، جو وقت نے کیا ہے، اللہ نے دیا ہے وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ روح عصر اس پر شاہد ہے کہ

> ''برصغیر کی صورتحال میں سرسید احمد خانؒ کی اہمیت یہ ہے کہ مسلم حکومت کے مٹ جانے سے جو خلا مسلمان معاشرے میں پیدا ہوا تھا، اُسے صرف سرسید احمدؒ کی تحریک نے پُر کر دیا۔ اس کا دوسرا پہلو وہ علمی تحریکیں ہیں جو دیوبند اور ندوہ کی شکل میں ظاہر ہوئیں، ان کی اصلاح مملکت نہیں معاشرہ ہے۔ ارباب دیوبند میں جو تقسیم واقع ہوئی وہ مسلم روح دو جائز طور پر مراتب کے تقاضوں سے پیدا ہونے والی تقسیم تھی۔ ایک کا تقاضا معاشرے کو درست کرنے اور دوسرے کا اقتدارِ اعلیٰ کو مصفّٰی کرنا تھا، اسلام کے تصورِ حقائق کے مطابق اقتدار اعلیٰ موثر ہے اور معاشرہ متاثر پہلو، لہٰذا آزادی کے بعد برصغیر میں مسلمان (Community) کے اعتبار سے پاکستان کو موثر عنصر سمجھنا چاہیے اور ہندوستانی مسلمان معاشرے کو متاثر۔ امکان غالب یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم معاشرے میں ایک تہذیبی (Reconsolidation) پیدا ہوگی، بنیادی طور پر یہ سیاسی اقتدار اعلیٰ سے کہیں زیادہ تہذیبی اقدار کا سوال ہوگا۔'' (۱۵۰)

وطن پرستی اور بُت پرستی

عجب حادثہ ہے کہ برعظیم کی ملت اسلامیہ کو حکومتی زوال کیا آیا کہ ہندو اکثریت نامہربان ہو جاتی تو بھی صدیوں کی رفاقت سے مکر جانے کا ڈھنگ کہیے لیتے مگر برطانوی سامراج اب ان کے نئے مہاراج تھے، پہلے مسلمان ان کا مہاراج تھا اور یہی ہندوریت و روایت کا تاریخی ہندوستان ہے مگر ہندوؤں نے اپنی اسی روایت کو جاری رکھتے ہوئے اب مغلوب مسلمانوں کو اپنے اندر مدغم کرنے کیلئے رسوا کن سیاسی ہتھکنڈے اور بعد ازاں تشدد اور ڈنڈے کا بھی استعمال کیا۔ وہ

مسلمانوں کو کسی کھاتے میں نہیں صرف سود در سود کے ہی کھاتے میں ڈالے رکھنا پسند کرتے تھے۔ اس لئے سر سید احمد خان کے شعورِ قوم و ملت اور مسلمان علیحدہ اور الگ قوم کے مدِ مقابل انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کے جھنڈے تلے ہندوستانی نیشنلزم کا پرچار اس سیاسی حکمت عملی سے کیا کہ انگریزوں کو اقتدار چھوڑ کر پورے کا پورا ہندوستان انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت کے حوالے کر کے جانا ہوگا۔ اس کا نام آزادی ہند رکھا گیا اور معروف معنوں میں ہندوستان کو سوتنتر تا اور سوراج جہاں مغرب کے جمہوری اصولوں کے تحت واحدانی طرز کے آئینی اختیارات اور انتخابات کے تحت منتظم مملکت آئندہ بھارت ہندو اکثریت کے ہاتھ میں اور ہمیشہ کیلئے ہوگی۔ اس لئے انڈین نیشنل کانگرس نے اولین کوشش تو یہ کی کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کا رجحان راہ نہ پا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید احمد خان کو مذہبی معنوں میں ملاؤں کے ایک خاص طبقہ سے دشنام اور الزام کی وافر مقدار میں صلواتیں بھجوائی گئیں کہ کفر و زندیقہ کی فراوانی جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی پہچان بنا دی گئی۔ بعض مذہبی ملاؤں نے برعظیم کی ملت اسلامیہ کے مستقبل کو ہندو یت (Hindusim) کے گہرے کھڈ میں دھکیلنے کے لیے ہندو نیشنلزم کے وطنی قومیت کے بت کو شرعی جواز عطا کرنے کیلئے اسے کتاب و سنت سے ثابت کرنے کی کوشش کی، جس کے نام اور کام کی وجہ سے عام مسلمانوں میں مذہبی طبقوں کے بارے میں احترام جاتا رہا۔ حالانکہ ان مذہبی ملاؤں کی عزت اور شہرت دین کی وجہ سے عام مسلمانوں میں حد درجہ قابل احترام تھی۔ یہی سب ہے کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے ہاں قوم پرستی اور وطن پرستی کے خلاف ایک پورا دینی ویژن (Vision) ہے جو نیشنلزم کے مادی بت کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند جیسے مذہبی مدرسے میں جہاں سے دین کی تدریسی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور جن کے بانیوں نے برصغیر میں اسلام کو بچانے میں بڑا موثر کردار ادا کیا تھا اُس کی ایک بڑی معروف ہستی مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے جب یہ کہہ ڈالا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" تو اقبالؒ تڑپ اٹھے اور ان کی مشہور رباعی کا یہ مشہور مصرع جس میں دارالعلوم دیوبند اور مولانا احمد حسین مدنی جیسے شیخ الحدیث کا نام لے کر کہا

ع　　حسین احمد ز دیوبند ایں چہ بوالعجبی است

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے اشعار ہی نہیں افکار میں بھی یہ موضوع اور مسئلہ پوری بلاغت اور شدت کے ساتھ جلوہ گر ہے، فرمایا

> "اسلام کا ظہور بت پرستی کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وطن پرستی بُت پرستی ہی کی ایک نازک صورت ہے۔ مختلف قوموں کے ترانے میرے دعوے کا ثبوت ہیں کہ وطن پرستی ایک مادی شے کی پرستش سے عبارت ہے۔ اسلام کسی صورت بت پرستی گوارا نہیں کر سکتا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا اپنی جائے پیدائش مکہ سے ہجرت فرما کر مدینے میں قیام کرنا اور وصال پانا غالباً اسی حقیقت کی طرف ایک مخفی اشارہ ہے۔" (۱۵۱)

حضرت علامہ اقبالؒ نے اس نظریے کو اپنے فارسی کلام میں جس حسن صوت کے ساتھ باندھا ہے یہ انہی کا کمال اور کرشمہ ہے۔ مسلم قومیت کی اساس توحید و رسالت بلکہ کلمہ توحید پر رکھی گئی فرمایا:۔

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است
این ز اسبابِ ثبات ملت است

بلکہ

عقدہ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

اور پھر اُردو زبان کے یہ اشعار کہہ فرمایا

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہیؐ
دے تُو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

مسلمانان ہند اور برعظیم کی ملت اسلامیہ کو انڈین نیشنل کانگرس کی سیاسی تحریک اور ہندو سیاست کی دانش جدید کے حربوں اور ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین فرماتے ہیں اور کھل کر کہتے ہیں کہ

از فریبِ عصرِ نو ہوشیار باش
رہ فتنہِ ای راہرو ہوشیار باش
''در معنی اینکہ وطن اساسِ ملت نیست''

بلکہ وہ مسلم قومیت اور مسلم ملت کی اساس و بنیاد رسالتؐ کے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنے پر رکھتے ہیں فرمایا

ملت ما را اساسِ دیگر است
این اساس اندر دل ما مضمر است
ما زحکم نیست او ملتیم
این عالم راہ پیام رختم

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک انڈین نیشنل کانگرس نے بالعموم اور ہندو قوم نے بالخصوص برعظیم کی ملت اسلامیہ کے علیحدہ اور الگ وجود کو نہ صرف تسلیم نہیں کیا بلکہ انہیں تقسیم کرنے پر جُت گئی۔ انہوں نے مسلمانوں کے مختلف قائدین کو متعدد بار اپنی سیاسی چالوں سے زِچ کیا۔ پہلے جناحؒ کانگرس سے فارغ ہوئے پھر محمد علی جوہرؒ۔ یہاں تک کہ برطانوی سامراج کی ہندوستان کیلئے تمام آئینی تجاویز اور منصوبوں میں کانگرس مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات، مسلم اکثریت کے صوبوں کی خودمختاری اور مسلم اکثریتی علاقوں میں اصلاحات یہاں تک کہ وفاقی طرز حکومت کے آئینی امور پر مخلوط انتخابات مسلم نشستوں اور پاسنگ کی سیاست بلکہ نہرو رپورٹ کے مقابلے میں دہلی تجاویز اور پھر قائداعظمؒ کے چودہ نکات اس سے پہلے میثاق لکھنو اس کی مثالیں ہیں۔ قائداعظمؒ نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد اور دونوں قوموں میں برابری کی سطح پر آئینی مسائل کے حل پر مسلمانوں کی ہمیشہ وکالت کی مگر کانگرس صرف مسلمانوں کے ادغام پر یقین رکھتی تھی ان کے علیحدہ وجود پر نہیں۔ یہی سبب ہے اُن سے مسلم ایک علیحدہ قوم ہی قبول نہ تھی چہ جائیکہ مسلمانوں کی ایک آزاد، الگ اور علیحدہ مملکت اور وہ بھی پاکستان! معاہدوں، سمجھوتوں کا پاس تو رہا ایک طرف، دھمکیاں، فسادات یہ سب کچھ انہیں مسلمان کی طرح محکوم ہندوؤں کا وطیرہ تھا اور ابھی دہلی میں انگریز مقتدر حکمران اور براجمان تھے ان حالات میں قائداعظمؒ نے لندن سے واپس آنے کے بعد ۱۹۳۵ء ہی میں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا بیڑا اٹھایا وہ خود فرماتے ہیں:

> ''۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا کام محض اللہ پر یقین اور بھروسہ کرتے ہوئے کیا تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوم کسی وقت دم توڑ دے گی۔ مسلمان قوم کی حالت اُس اکیلی اینٹ کی سی تھی جسے دیوار پر رکھ دیا گیا ہو اور جس کے گرنے کا ہر دم خطرہ ہو لیکن خدا کے فضل سے اب ایک منظم قوم ہیں جسے دنیا کی کوئی طاقت فنا نہیں کر سکتی۔'' (۱۵۲)

مرزا ابوالحسن اصفہانی نے مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ صرف قائداعظمؒ کی ذات تھی جس کی برکت اور حرکت سے مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک منظم اور عوامی جماعت بن گئی۔ وہ لکھتے ہیں۔

مسلم لیگ آرام کرسی سے عوام تک

> ''مسلم لیگ کے جس کے بارے میں جناحؒ اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ نزاع کی سی حالت میں ہے اور اُسے از سر نو منظم کرنے کا فیصلہ اپریل ۱۹۳۶ء میں کیا گیا، اس فیصلے سے مستقبل کی مسلم سیاست کے رجحان پر گہرا اثر پڑا اور مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نظر میں اس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ لیگ کی قیادت اب عملی سیاست کے میدان میں اُتر آئی اور اس کی دعوت روشن خیال لوگوں کے محدود حلقے سے نکل کر لاکھوں کروڑوں بااختیار ووٹروں کی جانب منعطف ہوگئی۔ اصفہانی مزید کہتے ہیں کہ کلکتہ کے شام کے وقت کے نکلنے والے اخبار ''اسٹار آف انڈیا'' نے ۱۲۲ اپریل ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں لکھا

کہ ''بڑے بڑے تاجروں، زمیندار، امراء، روشن خیال لوگوں اور مسلم لیگ کے بائیں بازو کا مسٹر جناحؒ کی قیادت میں یہ اجتماع (کلکتہ) اسلامی سیاست میں ایک ایسی زبردست قوت ثابت ہوگا کہ جس سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکے گی۔'' (۱۵۳)

بالآخر اسی نشاۃ ثانیہ نے برعظیم کی ملت اسلامیہ کو مسلم لیگ کے پرچم تلے اس طرح منظم، متحد اور یقین محکم کے ساتھ جمع کیا کہ پھر نہ انگریز کی طاقت چلی نہ کانگرس کی سازش کامیاب ہوئی، وہ لکھتے ہیں کہ

''۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دوران لیگ کو بہت سے تغیرات سے گزرنا پڑا لیکن وہ ایک طاقتور عوامی تنظیم کی حیثیت سے زیادہ مضبوط ہوتی چلی گئی۔'' (۱۵۴)

درود باد بروح مطہر اقبالؒ

امر واقع یہ ہے کہ برعظیم کا مسلمان اور مسلم لیگ اپنی بقاء کے لئے کوشاں تھے تو ہندو کانگرس اور ہندو قوم اپنی برتری کیلئے یکسو تھی۔ آخر وہ وقت آن پہنچا جب روح عصر بن کر اقبالؒ نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناحؒ کو ایک طویل خط لکھا جس میں مسلم لیگ میں ان کی تجویز کردہ تبدیلیوں پر اظہار تحسین کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کے مستقبل اور مسلم ملت کی سیاستِ دوراں پر ایک مفکرانہ اور مدبرانہ لائحہ عمل بھی تجویز کیا۔ ویسے تو پورا خط ہی اس شان کا ہے کہ اسے من وعن پیش کیا جائے کہ اس کے حصے اور پیرائے اپنی ترتیب میں حقیقتاً وقت کی رفتار ہیں۔ اقبالؒ محض تقسیم ہند کے مجوز (خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء) ہی نہیں بلکہ ۱۹۳۷ء کے اس خط میں وہ تقسیم ہند کی تحریک بھی اٹھاتے ہیں اور جناحؒ کو سمجھاتے ہیں کہ

تقسیم ہند۔۔۔دو قومی نظریہ کا وجود اور شہود

اقبالؒ کا خط جناحؒ کے نام

''لاہور ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

(بصیغہ راز)

محترم جناح صاحب

آپکے نوازش نامے کا بے حد شکریہ جو مجھے اس اثناء میں ملا۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ مسلم لیگ کے دستور اور پروگرام میں جن تبدیلیوں کے متعلق میں نے تحریر کیا تھا وہ آپ کے پیش نظر رہیں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانان ہند کی نازک صورت حال کا آپ کو پورا پورا احساس ہے۔ مسلم لیگ کو آخرکار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی رہے گی یا مسلم جمہور کی جنہوں نے اب تک بعض معقول وجوہ کی بنا پر اس جماعت میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ کوئی سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی حالت سدھارنے کی ضامن نہ

ہو ہمارے عوام کیلئے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ ۲ سو سال سے وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں، عام خیال یہ ہے کہ اس غربت کی وجہ ہندو کی ساہوکاری (سودخوری) اور سرمایہ داری ہے۔ یہ احساس کہ اس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی شریک ہے ابھی پوری طرح نہیں ابھرا لیکن آخر کو ایسا ہو کر رہے گا۔ جواہر لعل نہرو کی بے دین اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی، لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا علاج کیا ہے؟ مسلم لیگ کا سارا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے کیا کوشش کرتی ہے؟ اگر مسلم لیگ نے اس ضمن میں کوئی وعدہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اس سے بے تعلق رہیں گے۔

اولاً:۔ ''خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس کا حل موجود ہے اور موجودہ نظریات کی روشنی میں (اور اس میں) مزید ترقی کا امکان ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کیلئے کم از کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے لیکن شریعت اسلام کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر اس ملک میں ناممکن ہے''

ثانیاً:۔ ''موجودہ مسائل کا حل مسلمانوں کیلئے آسان طور پر کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ملک کو ایک یا زیادہ مسلم ریاستوں میں تقسیم کیا جائے، جہاں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت نہیں آن پہنچا؟ شاید جواہر لعل نہرو کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ ایک بہترین جواب ہے۔ بہر حال میں نے اپنے خیالات پیش کر دیے ہیں، اس امید پر کہ آپ اپنے خطبے یا مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں ان پر سنجیدگی سے توجہ دیں گے۔ مسلم ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی ذات موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔

آپ کا مخلص

اقبال

مکرر آنکہ: اس خط کے موضوع پر میرا ارادہ تھا کہ آپ کے نام اخبارات میں کھلا خط شائع کراؤں مگر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ وقت ایسے اقدام کیلئے موزوں نہیں۔'' (۱۵۵)

کچھ اکابر پرست اور مقابر پرست مذہبی دانشور متحدہ قومیت کے فلسفہ کے اس قدر پابند ہیں کہ پاکستان میں آ کر اور اس کا کھا کر بھی اقبالؒ و قائدؒ کے بنائے ملک کے معزز شہری ہوتے ہوئے بھی فکری انتشار کا بدستور نمونہ ہیں۔ اُن کا احساس یہ ہے کہ برِّعظیم پاک و ہند میں اصل تنازعہ دستوری معاملات و مسائل کا تھا۔ تقسیم ہند تو کانگرس یا ہندوؤں کے رویہ اور ردِّعمل کے طور پر سامنے آئی۔ نیز یہ کہ کوئی معرکۂ دین و وطن سرے سے تھا ہی نہیں۔ یہ تو بلکہ سراسر جناحؒ کی ضد اور انا نے اتنا بڑا ملک تقسیم کرایا اور مسلمانوں کی یکجا تعداد کو اور طاقت کو ہندوستان، پاکستان اور اب بنگلہ دیش میں تقسیم کروا دیا جس سے

اسلامیانِ ہند کی قوت اور عددی تعداد تین ملکوں میں بٹی پڑی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آزادی یا اسلام کی آزادی کو آزادیٔ ہند یا ہندوؤں کی آزادی اور مسلمانوں کی عددی اکثریت بھی مستقل طور پر ہندو نامہربان ہی نہیں، انتقام پر اُتری ہوئی واضح اکثریت کی غلامی انہیں نظر نہیں آتی؟ اس لئے یہ متحدہ قومیت کے ہندو نمستے کے مبلغ ہیں۔ آج ۶۲ برس بعد بھی ہندوستان کا مسلمان اس شقاوت قلبی کا شکار ہے، اور پاکستان بھی اس ہندو ذہنیت کا نشانہ ہے۔ افسوس کہ متحدہ قومیت کے پجاری اپنے عمل سے تو اپنی دھرتی سے ہجرت فرما کر پاکستان کو گوشۂ عافیت سمجھتے ہیں، مگر من مندر میں ابوالکلام آزاد کی رومانی شخصیت کا بُت سجائے، دوقومی نظریہ بلکہ دوقومی عمل پر ہنوز، ہندو کے فکر و فلسفہ کے فریب و فتنہ کا شکار ہیں، یہاں تک کہ را کے ایجنٹوں اور چانکیہ سیاست اور چانکیہ پوری راجدھانی کے سفارت خانوں کے علاقوں کے بعد اب پاکستان میں شاہ ولی اللہؒ کی فکر کے نام پر کچھ مذہبی مولانا عبیداللہ سندھی کے پرستار اور وارث یہ باور کرا رہے ہیں کہ تقسیم ہند غلط تھی۔ متحدہ ہندوستان اور فیڈریشن قائم کرنا گویا فکر شاہ ولی اللہ الٰہی ہے۔ اور یہی فلسفہ اکابر دارالعلوم دیوبند کا ہے، اور یہی اُن کا ''روحانی'' نکتہ نظر ہے۔ اکیسویں صدی میں الہیات میں حضرت علامہ اقبالؒ وہ نام ہے، جہاں اہل مدرسہ کی علم دشمنی اپنے بال کھولے رو رہی ہے۔ اقبالؒ اور جناحؒ اور پاکستان یہ تین نام ایسے ہیں جو عالم اسلام کی بالعموم اور پاکستان کی آئندہ نسلوں کی بالخصوص پہچان کا مقام ہے۔ دین کے نام پر مزے لوٹنے والے، ملت اسلامیہ کے بابِ زوال کا یہ علم دشمن طبقہ روایتی نصاب کی کتابیں رٹ کر منبر کے بعد اب کرسی مانگنے کو مذہبی حکومت یا ملاؤں کی حکومت کو اسلامی ریاست، دینی سیاست باور کرانے کے درپے ہیں، ایک ایسے ماحول، ملک اور معاشرے میں جس نے ۱۹۴۷ء میں پورے برعظیم میں اپنے اجماعِ امت کے ذریعے اس مذہبی پاپائیت اور مذہبی پیشوائیت کے بتوں کو کعبۂ دل سے دے پٹخا اور انہوں نے تو حضور سرکارِ دوعالم ﷺ ہی کو اپنا کعبۂ دل، قبلۂ جاں اور کامل و اکمل نمونہ جان بھی لیا اور مان بھی لیا جس کا عصری شہود یہ ہے کہ برعظیم کی ملت اسلامیہ نے حضور سرکارِ دوعالم ﷺ کے دو فقیروں اقبالؒ اور جناحؒ کی امامت میں اپنی صفیں سیدھی کر لیں۔ انہیں اقبالؒ و جناحؒ کی کلین شیو ہی نظر آئی، انہیں ان کے دلوں کا حال اور جذبوں کا کمال تب نظر آیا نہ اب۔ ان کے متبعین کے مذہبی بتکدے میں ان لوگوں کے فکر و نظر کا گذر کہاں ممکن ہے یہ تو ''مامقیماں اور پکی روٹی'' پڑھ کر یا پھر

ع طے ہو رہے ہیں کنز و قدوری کے مرحلے

میں ہیں جبکہ

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں بیچارے یہ دو رکعت کے امام
(اقبالؒ)

کا شعر ہی اُن کی حقیقت کا آئینہ ہے۔

جس کیلئے اقبالؒ بہت پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سُرور
ایسے امام سے گذر ایسی نماز سے گذر

اقبالؒ کی اپنی نماز کی حالت اور حال تو یہ ہے کہ فرمایا

شوق اگر ترا نہ ہو، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

یہ مذہبی سیاستدان دوقومی نظریہ کی مخالفت محض اپنی "تفسیر بالرائے" تک ہی رکھتے تو برعظیم کی ملت اسلامیہ کو شاید اعتراض نہ ہوتا، کہ یہ پہلے ہی معاشرے میں بہت تھوڑے اثرات کا خاص حلقہ تھا، مگر انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کے ایماء اور اشارے پر متحدہ قومیت کو مذہبی سند عطا فرمانے کیلئے "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کا دین ایجاد کر ڈالا۔ اکبر تو دین الٰہی کی بات کرتا ہوا پایا گیا، وہ تو صرف حکمران تھا اور بس۔ اکبر کا چشتی اولیاء سے عقیدت کا معاملہ بھی تو تھا مگر

ع حسین احمد زدیو بند این چہ بوالعجبی است
(اقبالؒ)

حالانکہ مولانا مدنی دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث ہی نہیں سلسلہ چشتیہ صابریہ کے پیر ہو کر بھی، وحدت ادیان کے عصری جال اور قوم پرستانہ سیاست کو دین بنا کر پیش کریں کہ "قومیں دین سے نہیں سرزمین سے بنتی ہیں" تو یہ بھی ان کی مذہبی رائے گردانی جاتی مگر افسوس کہ انہوں نے معرکہ دین و وطن میں وطن پرستی کے نام پر شرعی کمان سنبھال لی تھی اور پاکستان کے خلاف اپنی مذہبیت کا آخری تیر اور ترکش تک صرف کر ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کے تقوے اور فتوے کا بھرم عوام الناس میں پذیرائی نہیں پا سکا۔ جمعیت علماء ہند کے اخبار، مدینہ بجنور (یوپی) کا یہ غلیظ پروپیگنڈہ اسلامیان ہند کے عوامی قہر کا الاؤ بن گیا کہ ڈاکٹر اشتیاق قریشی نے لکھا ہے،

"کانگرسی علماء ہندوؤں کے اس بہتان کو قابل نفرت حد تک دہراتے تھے کہ پاکستان برطانوی دماغ کی ایجاد ہے۔" (۱۵۶)

یہ کانگرس ہی کیا پوری کی پوری ہندو قوم اور اسکا تہذیبی ارتقاء مغربی تہذیب سے کس قدر ہم آغوش ہے وہ اس کی صدیوں پرانی روش کا عصری نمونہ ہے۔ اس کی معاصر صورت بھارت کا داخلی ماحول و معاشرہ ہے، آج بیسوی صدی کا غروب اور اکیسویں صدی کے طلوع میں روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہے کہ خود ہندو تہذیب زمانے کے ساتھ دینے میں کس قدر متحرک ہے کہ اب بھی

''ہندومت کی خالص مذہبی اور تہذیبی صورتحال یہی ہے کہ وہ اپنی اصل میں ایک متحجر (Fossilied) ہیئت رہ گئی ہے۔اور وہ بھی تیزی سے مغربی اثرات کا شکار ہو کر ایک بڑے بین الاقوامی نظام کا حصہ بنتی جارہی ہے''(۱۵۷)

وہ طعنہ ہم کو دیتے تھے
قصور اپنا نکل آیا

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں کانگرسی وزارتیں قائم ہو چکی تھیں تو کانگرس نے یوپی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی سے ابوالکلام آزادؒ کے ذریعے جو شرائط اور تعاونکی صورت رکھی وہ بھی مسلم لیگ اور مسلمانوں کے ہندویت کے سمندر میں ادغام کا نمونہ ہے۔جبکہ حافظ ابراہیم جو بجنور ہی سے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (سیکرٹری جنرل جمیعت علماء ہند کے رشتہ دار تھے) کس طرح کانگرسی کیمپ میں جا شامل ہوئے کہ انہیں اپنی سیٹ سے مستعفی ہونا پڑا۔یہ کانگرس کا ہارس ٹریڈنگ کا وہ مالی آغاز تھا، جس کے بعد ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مذہبی چہرے یوپی اور پنجاب بلکہ سرحد اور سندھ کے مسلم، اکثریتی علاقوں میں بتانِ آزری سے خرچہ، پانی بٹور کر مسلم لیگ کے امیدواروں کے سامنے کانگرسی ٹکٹوں کا تماشا ہو گئے۔ادھر کانگرسی وزارتوں میں مسلمانوں کی اقتصادی بربادی، تعلیمی شدھی اور سیاسی سنگھٹن کا یہ عالم ہوا کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو ودیا مندر سکیم اور بندے ماترم جیسے اسلام اور مسلمان دشمن اور مشرکانہ ترانے گانے اور مورتی پوجا تک کے سرکاری احکام نے وہ جھلک دکھا دی کہ ابھی تو مرکز میں انگریز موجود ہے کہ صرف ۷ صوبوں میں کانگرس کی متحدہ قومیت کی سرکاری کاروائی کس قدر اسلام دشمن اور مسلمان دشمن ہے، اس پر ایک طویل اور صوبجاتی شواہد موجود ہیں، جس کے دستاویزی ثبوت پیر پور کمیٹی شریف کمیٹی کی رپورٹیں ہیں۔البتہ اس مرحلہ و مقام پر یہ حکیم الامت اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جناح کو ایک بار پھر پور خط لکھا اور فرمایا:۔

''لاہور، ۲۱ جون ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب،

کل آپ کا نوازش نامہ ملا، بہت بہت شکریہ! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں، مگر مجھے توقع ہے کہ میرے بار بار خط لکھنے کو آپ بار خاطر خیال نہ کرینگے۔اس وقت جو طوفان شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے اس میں صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔میں عرض کرتا ہوں کہ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی کی حالت میں ہیں۔اگر فوج اور پولیس نہ ہو، تو یہ (خانہ جنگی) دیکھتے ہی دیکھتے پھیل جائے۔گذشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔صرف شمال مغربی ہندوستان میں گذشتہ تین ماہ میں کم از کم تین (فرقہ وارانہ) فسادات ہو چکے ہیں۔اور کم از کم چار وارداتیں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسالت ﷺ کی ہو

چکی ہیں۔ ان چاروں مواقع پر رسول اللہ ﷺ کی اہانت کرنے والوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ سندھ میں قرآن مجید کو نذرِ آتش کرنے کے واقعات بھی سامنے آئے ہیں۔ میں نے تمام صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں نہ اقتصادی بلکہ خالص سیاسی ہیں یعنی مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف وہراس طاری کرنا ہے۔

(۱) کانگرس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود ہی سے انکار کر دیا ہے ہندوؤں کی دوسری بڑی (۲) جماعت ہندو مہاسبھا جسے میں ہندو عوام کا حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں نے بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ ہندو مسلم قوم کا وجود ناممکن ہے۔ ان حالات کا حل کیا ہے؟

کے پیش نظر بدیہی حل یہ ہے کہ ہندوستان میں قیام امن کیلئے ملک کی از سرِ نو تقسیم کی جائے، جس کی بنیاد نسلی، مذہبی اور لسانی اشتراک پر ہو لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریقہ عمل کی طرف اشارہ ضرور کرنا چاہیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر اختیار کرنا پڑے گا۔

آگے چل کر حضرت علامہ لکھتے ہیں کہ

''میرے خیال میں تو نئے دستور میں ہندوستان بھر کو ایک ہی وفاق میں مربوط رکھنے کی تجویز بالکل بے کار ہے۔ مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق کا قیام اس طریق پر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

واحد راستہ: صرف واحد راستہ ہے جس سے ہندوستان میں امن وامان قائم ہو گا۔ اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ وتسلط سے بچایا جا سکے گا۔ کیوں نہ شمال مغربی ہندوستان (موجودہ پاکستان) اور بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کے مسلمانوں کو (ہندوؤں سے) علیحدہ اقوام تصور کیا جائے۔ جنہیں ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری حاصل ہو، ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی طریق کو اختیار کرنے میں ہے۔ اس لیے مسلم لیگ کا آئندہ (سالانہ) اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبے کی بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہو گا۔ لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آپ لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوشگوار ہوتا ہے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد پر غور فرمائیں۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اور لاہور میں مسلم لیگ کے آئندہ سالانہ جلسے کا انعقاد پنجاب کے مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی بیداری کا باعث ہو گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال بار ایٹ لا

اگست ۱۹۳۷ء اگلے خط میں پھر لکھتے ہیں کہ

"واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کو اپنی تمام تر سرگرمیاں شمال مغربی ہندوستان (موجودہ پاکستان) کے مسلمانوں پر مرکوز کر دینی چاہئیں۔" (۱۵۸)

اقبالؒ کی آرزو

یہی وہ آرزو تھی جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کا باعث بنی اور جہاں قرارداد پاکستان کی منظوری سے ۱۹۳۰ء کے علامہ اقبالؒ کے خطبہ الہ آباد کو ۱۰ سال بعد واقعات کی دنیا میں ۱۹۴۰ء کی لاہور سیشن کی قرارداد نے عملی اور جغرافیائی ہیت عطا کی شکل دی اس اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی منظوری کے بعد ہی قائداعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا کہ اے کاش آج اقبالؒ زندہ ہوتے تو وہ یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوتے کہ بالآخر ہم نے آج وہی کچھ کیا جو وہ چاہتے تھے" جبکہ اس سے ایک سال قبل ۱۹۳۹ء میں عربک کالج دہلی میں اپنے خطاب میں قائداعظمؒ نے بالکل واضح الفاظ میں کانگرس اور ہندوؤں کی سیاست اور انگریزی حکومت کی مخاصمت پر مسلم ملت کا نقطۂ نظر دوٹوک انداز میں واضح کر دیا کہ

"دولتِ برطانیہ، ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی ہے اور گاندھی جی مسلم ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم دونوں کو اپنے اوپر حکومت نہیں کرنے دیں گے خواہ دونوں متحد ہو کر یا تنہا ہو کر سعی کر دیکھیں۔" (خطاب)

تحریک پاکستان ایک دینی تحریک

تحریک پاکستان کوئی ہنگامی یا دستوری الجھنوں کا ردِعمل نہ تھی، بلکہ اس کی تہہ اور باطن میں گہرا دینی ادراک (Vision) تھا۔ نامور آئینی ماہر، مولانا ظفر احمد انصاری کا یہ ارشاد اس دینی بصیرت کا اظہار ہی تو ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"تحریک پاکستان اصلاً ایک دینی تحریک تھی، جو برعظیم پاک و ہند کے تاریخی اسباب کا لازمی نتیجہ تھی" (۱۵۹)

یہی سبب تھا کہ

"حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تحریک پاکستان کی حمایت (۱۹۳۸ء سے تا حیات ۱۹۴۵ء تک) کی انہوں نے اس درپیش دینی مرحلے اور مسئلے پر مولانا حسین احمد مدنی اور جمعیت علماء ہند سے اپنے اختلاف کے باعث دیوبند مدرسے سے اپنے تعلقات تک ختم کر دیے۔" (۱۶۰)

یہی وہ مرحلہ اور مقصود تھا جو ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب اور سقوط دہلی کے بعد برعظیم کی ملت اسلامیہ کی اتحاد و تنظیم اور

یقین محکم کے عزم و ہمت کی داستان بن گیا، مسلم ملت اور مسلم مملکت ان دونوں کا نام پاکستان بن گیا، جس کا روحانی تصور اس ملک کی عصری پہچان اور شعر اقبالؒ کا جامع ہو گیا کہ

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ﷺ ہے

یہی وہ شعور ملت تھا جو مسلم مملکت کے قیام کی جانب یکسو ہو گیا اور یہ ہی برعظیم کی ملت اسلامیہ کی آزادی کا مطلب تھا اور یہی مسلمانوں کی آزادی کی بات تھی۔ علماء ہند پہلے آزادی پھر مسلمانوں کے آئینی حقوق کیلئے ''برادران وطن یعنی ہندو اکثریت سے بات کریں گے'' کہتے تھے یہ مذہبی مدرسین کی سادگی تھی کہ سادہ دلی، یا بصیرت و بصارت سے محرومی کہ ابتک اکابر پرستوں اور مقابر پرستوں کی طرف سے تحریک پاکستان اور مخالفتِ پاکستان کو صرف ''سیاسی اختلاف'' کے لفظ میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ گویا یہ کوئی وقتی سیاسی اختلاف تھا جو گاندھی اور جناح کی ضد کا نتیجہ ہے۔ اقبالؒ کی عمر رواں کے آخری برس میں ان کی صحبت پاک میں چلتے ہیں، وہاں اِس نقطۂ نظر پر کیا ارشادات ہیں؟ سید نذیر نیازی اپنے روزنامچے میں اقبال کے آخری سال ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کی روئیداد لکھتے ہیں کہ حضرت علامہؒ نے فرمایا:۔

> ''مجھے تو مسلمانوں کے مستقبل سے قطعاً مایوسی نہیں، ہمارا کوئی مسئلہ ہے تو قیادت! مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ ہم ہی میں سے کوئی صاحب ایمان اٹھ کھڑا ہوگا اور اس کا خلوص اور دیانتداری ساری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دے گی، ارشاد ہوا ''یہ محض خیال ہی خیال نہیں ہے حقیقت ہے۔'' (۱۶۱)

یہ الفاظ ہمارے ذہن میں گھوم ہی رہے تھے کہ پھر فرمایا:۔

> ''ہمارے مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ اتحاد ہے۔ مسلمان متحد ہو گئے تو ان کی جداگانہ قومیت تسلیم کر لی جائے گی۔ جداگانہ قومیت تسلیم کر لی گئی تو ہم آزادی سے اپنا مستقبل تعمیر کر سکیں گے۔''

کیا اسلامی ریاست قائم ہو گی؟

> ''کیوں نہیں بشرطیکہ ہم اپنا اتحاد قائم رکھیں۔ اور اس دعوے سے دستبردار نہ ہوں کہ ہندوستان میں ایک نہیں کئی قومیں بستی ہیں۔ ہندوستان محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس کا اتحاد بھی بیرونی حملوں سے خطرے کا نتیجہ۔ اسلام بھی مذہب نہیں کہ اس کی تعبیر تہذیب کے عام معنوں میں کی جائے، اس طرح اسکا تعلق فرد کی ذات سے ہے۔''

پہلے آزادی ہند پھر مسلمانوں کے مطالبات۔۔۔ کانگرسی علما کی بھول بھلیاں

> ''اسلام ایک نظام مدنیت بھی ہے، جس کی نفی اسلام کی نفی ہے۔ ہم اس نظام مدنیت سے انحراف نہیں کر سکتے یہی نظام مدنیت ہماری جداگانہ قومیت کا راز ہے۔ انگریز تو اس نکتے کو سمجھتا ہے، ہندو اسے

سمجھنا نہیں چاہتے۔" (۱۶۲)

پہلے آزادی ہند پھر مسلم مطالبات؟

اس پر حضرت علامہؒ نے تبسم فرمایا اور کہنے لگے:

"لیکن تم بھولتے ہو، اول تو کانگرس کا اعلان بجائے خود وضاحت طلب ہے، کانگرس کا موقف یہ ہے کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے۔ لہٰذا اس میں بسنے والے ایک قوم ہیں، مذہب افراد کا ذاتی معاملہ ہے۔ سیاست سے بے تعلق کانگرس کیسے گوارہ کرے گی کہ حصولِ آزادی کے بعد وہ اس وحدت سے دست کش ہو جائے جس پر آج اُسے اصرار ہے اور جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کے جداگانہ ملی وجود سے انکار کر رہی ہے۔ پھر صوبوں سے کانگرس کا مطلب صوبے ہیں نہ کہ باعتبار مذہب ان کی ایک الگ آبادی، کہ مذہب کہ بنا پر اس کا ایک حصہ دوسرے سے الگ ہو جائے، یا کسی ایسے نظام مدنیت کے نفاذ کا مطالبہ کرے، جن سے دوسرے کو اختلاف ہو۔"

ارشاد ہوا:۔

"صوبے مرکز سے ملحق رہیں یا بے تعلق ہو جائیں، اسکا مدار سیاست بہر حال وہی لادین سیاست ہو گی جو محض جغرافیائی قومیت کی قائل اور اُسے بنائے اجتماع سمجھتی ہے۔ لہٰذا نہ غیر مسلم کسی ایسے مطالبے میں جس کی بنا اسلام پر ہے مسلمانوں کا ساتھ دینگے نہ ان کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ بحیثیت مسلمان اپنے آپ کو ہندوستان سے الگ کر سکیں۔ اگر کانگرس فی الواقع سمجھتی ہے کہ حصولِ آزادی پر مسلمانوں کو حق ہو گا کہ اگر چاہیں تو اپنے مخصوص نظام مدنیت کے پیش نظر مرکز سے الگ ہو جائیں تو اسے آج ہماری جداگانہ قومیت سے انکار کیوں ہے؟ کیوں نہ آج ہی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ قومیں ہیں اور اس لئے سیاسی سمجھ بوجھ کا تقاضا ہے کہ ان میں باہم کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔" (۱۶۳)

"جیسے جیسے کانگرس متحدہ قومیت کی آڑ میں اپنا دست تغلب دراز کرے گی مسلمان خود ہی ان جماعتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونگے جن کا دانستہ یا نادانستہ خیال ہے کہ ہندو اور مسلمان باہم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں" فرمایا

"قوموں کی زندگی کا راز اس جدوجہد میں مضمر ہے کہ اپنا وجود ملی قائم رکھیں، اور نہیں بھولیں کہ اس کا ایک اپنا نصب العین ہے۔ لہٰذا اس موقع پر جب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ہماری جداگانہ قومیت کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے ہمیں اپنے موقف کا اعلان دلیری سے کرنا چاہیے۔"

حضرت علامہؒ نے پھر فرمایا:۔

''دراصل ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اپنا ملی نصب العین صحت کے ساتھ متعین نہیں کر سکے، ہماری نظر زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی مسائل پر رہی اور ہم سمجھے ہیں کہ یہ مقابلہ ہندوؤں اور ہمارے مابہ لاامتیاز ہے۔اس میں کچھ حالات کا بھی دخل ہے، کچھ ہمارے زوال اور تاریخی روایات کی بھی وجہ ہے کہ ہم وہ قیادت پیدا نہیں کر سکے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔''(۱۶۴)

۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء ارشاد ہوا:۔

اُردو، ہندی نزاع سے لیکر جب سال ہا سال ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور انہوں محسوس کیا کہ سرسید کا یہ قول کہ ''ہمارا اور ہندوؤں کا راستہ الگ الگ ہے'' حرف بحرف صحیح ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مفاہمت تو کر سکتے ہیں کہ باہم صلح وآشتی کی زندگی بسر کریں لیکن ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتے، سیاست کے ایک نہیں کئی دور گذر گئے، پھر بھی مسلمان نہیں سمجھے۔ یہ آئے دن کے بلوؤں، آریہ سماجی، شدھی، سنگھٹن کی تحریکیوں کے باوجود جن سے ہندو، مسلم اتحاد اور آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد کی تحریک ایک خواب پریشاں بن کر رہ گئی کہ انکا ملی نصب العین کیا ہے؟ وہ اپنی سیاست میں کیا لائحہ عمل اختیار کریں؟ بااین ہمہ انکا یہ احساس کہ ہمارے اور ہندوؤں کے مطمع نظر میں ایک بنیادی فرق قائم رہا یہ احساس اس وقت بھی قائم تھا، جب ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی، اور اُس وقت بھی جب کانگرس نے علی الاعلان مسلمانوں کی جداگانہ قومیت سے انکار کیا۔ جب نہرو رپورٹ پیش کی گئی اور جب سیاسی محاذ کے ساتھ ساتھ قومی تعلیم، قومی زبان کے نام سے ایک نیا محاذ ہمارے تہذیب وتمدن اور ہمارے اخلاق ومعاشرت کے خلاف قائم کیا گیا۔ یہی احساس تھا جس کی وجہ سے میں نے گول میز کانفرنس میں مسلمان مندوبین کو باوجود اختلاف رائے یکجا رکھا، اور کانگرس کی وہ سازش جو نیشنلسٹ مسلمانوں کی آڑ میں اس نے ہمارے جداگانہ وجود ملی کے خلاف کی تھی، ناکام رہی'' فرمایا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کا موقف بڑا غلط ہے۔''(۱۶۵)

جب عرض کیا گیا کہ ان میں تو بڑی بڑی مقتدر اور قابل قدر ہستیاں شامل ہیں جن کے خلوص و دیانت اور قومی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا:۔

''تعجب تو انہیں کی سمجھ بوجھ پر ہے وہ اپنی ہوش مندی، تجربے اور سیاست دانی کے باوجود قوم کو ایک بڑے غلط راستے کی طرف لے جا رہے ہیں اور اگر ایسا نہیں تو کسی بہت بڑے خوشی آمیز فریب میں مبتلا ہیں یا پھر محض جذبات کی رو میں بہہ رہے ہیں۔''(۱۶۶)

ارشاد ہوا:۔

''رہا یہ سوال کہ ان میں علماء کا ایک گروہ بھی شامل ہے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات میں اگرچہ ان کی مخصوص فرقہ بندی اور انگریز دشمنی کو بھی دخل ہے لیکن اس کی اصل وجہ برسوں کے تعطل اور

سیاست سے بے تعلقی کے خلاف وہ ردِ عمل جو انہیں مجبور کر رہا ہے کہ سیاسی اعتبار سے بھی اپنی ہستی منوائیں، لہٰذا وہ سمجھے بغیر کہ انہیں جس منصب کا دعویٰ ہے اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ محض، ایک جماعت کی حیثیت سے اپنا تشخص قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ جماعتی وقار کا اس درجہ پاس ہمارے ملی مفاد کے منافی ہے۔" (۱۶۷)

۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء

"ہاں پاکستان!(اقبالؒ)

فرمایا:۔

"تھوڑا بہت اتحاد جو مسلم لیگ کی بدولت قائم ہو گیا ہے بڑا امید افزا ہے۔ کانگرس کسی قدر مرعوب ہے۔ اس اتحاد کے نتائج بڑے شاندار ہوں گے اور اگر کہیں مسلمانوں کو ایک قطعہ ارضی مل جائے، تو اور بھی اچھا ہو"۔ میں نے کہا، "پاکستان؟ فرمایا "ہاں! پاکستان یا اُسے جو جی چاہے کہہ لو۔" (۱۶۸)

۲ فروری ۱۹۳۸ء

خواجہ حسن اختر نے مسلم لیگ کے اجتماع دہلی کا ذکر چھیڑ دیا کہنے لگے "جناح کی زبان سے دین کا لفظ کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا اب تو ان کی تقریروں میں "ایجی ٹیٹری کا رنگ آ چلا ہے۔" پھر اخبار میں جناح کی تقریر بھی جو روزنامہ انقلاب لاہور سے انہیں پڑھ کر سنائی۔ ارشاد ہوا

"دو باتوں سے جی بہت خوش ہوا ہے، ایک تو جناح کے اس کہنے پر کہ بندے ماترم سے شرک کی بُو آتی ہے۔ دوسرے اس پر کہ ہندی ہندوستانی کی تحریک دراصل اُردو پر حملہ ہے۔ اور اردو کے پردے میں بالواسطہ اسلامی تہذیب پر۔" (۱۶۹)

جمعۃ المبارک ۱۸ فروری ۱۹۳۸ء

"یہ سیاست کا چکر بھی عجب ہے، انگریزوں کی ضد میں کس طرح تلبیس حق بالباطل سے کام لیا جا رہا ہے مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ مسلمان کیوں نہیں سمجھتے، اسلام کی اجتماعی روح کیا ہے؟ وہ عالم اور صوفی کیا ہوئے، جو دین کے رمز شناس تھے؟

فرمایا

"کیسے کیسے الفاظ ہیں جو لوگوں کی زبانوں سے نکل رہے ہیں۔ قوم، متحدہ قومیت، وطن، وطنیت، آزادی، خودمختاری لیکن کوئی نہیں سمجھتا، آج کل کی سیاست میں ان کے معنی کیا ہیں؟ ارشاد ہوا "ان

الفاظ کے معنوں کا تعین ہو جانا ضروری ہے۔ انکا تجزیہ بھی ہو جانا چاہیے۔ یہ الفاظ عام بولے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے ان کو سمجھنے کی۔ لیکن مسلمانوں کو احساس ہی نہیں کہ انہیں کس قسم کی جدوجہد درپیش ہے۔ ازروئے سیاست ہی نہیں اخلاقاً اور ذہناً بھی، کاش مسلمان کوئی سیاسی فکر پیدا کریں۔'' (۱۷۰)

فرمایا:۔

''ملّا کا ذہن یوں عقیم (بانجھ) ہے کہ صدیوں کی فرسودہ اور لاحاصل بحثوں میں الجھ کر اس کی فکری صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں۔ وہ نہیں سمجھتا کہ اسے جن عقائد پر سختی سے اصرار ہے اسلام نے اس کا رشتہ زندگی سے کس طرح جوڑا، ان سے فی الحقیقت کیا مقصود ہے؟

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ وصوفی و مّلا کی کہنہ ادراکی

''کانگرس خیال علماء جس روش پر چل رہے ہیں اس سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ ان کا انداز فکر سلبی ہے'' (۱۷۱)

پھر فرمایا!

''البتہ سرسید اس نکتے کو خوب سمجھے انہوں نے نہایت صحیح کہا کہ مجھے ایسے آئین سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں میرا کوئی حصہ نہیں اور کہنے کو ہے بھی تو اپنا حق منوا سکوں، نہ اسے چھیننے سے روک سکوں'' ارباب دیوبند اگر ماضی ہی پر نظر ڈالیں تو ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ کانگرس نے آج سے ۲۵ سال پہلے جس آئینی جدوجہد کی ابتداء کی تھی آزادی ہند کا مطالبہ اُس جدوجہد کی مرحلہ بہ مرحلہ کامیابی کی آخری شکل ہے لیکن ان کی روح اور اساس وہی ہے جس کے پیش نظر سرسید نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم کانگرس سے الگ رہیں۔ کانگرس میں شرکت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس فرضی اور خیالی یعنی ہندوستانی قومیت کا وجود تسلیم کر لیا ہے جو دراصل ہندو قومیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ ہندوستانی قومیت کا اقرار امت کے جداگانہ وجود کا انکار ہے'' (۱۷۲)

پھر ارشاد فرمایا

''ہمیں ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے۔ ہمیں طے کرنا ہے کہ ہم جغرافیائی قومیت کا اصول تسلیم کر لیں یا جیسا کہ اسلام کا تقاضا ہے اپنا ملی اور سیاسی وجود قائم رکھیں۔ جغرافیائی قومیت میں اسلام کی حیثیت محض ایک نظام اخلاق کی رہ جائے گی جس کی انتہا بہت ممکن ہے لادینی پر ہو''۔

ارشاد ہوا:۔

''یا پھر مسلمان ہندو اکثریت سے دب کر رہ جائیں گے۔ یعنی ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی اختیار کر لیں گے۔'' قدرے سکوت کے بعد فرمایا:۔

''سرسید کی رائے نہایت صائب تھی۔ سر سیّد نے خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ کیا ہے؟ سرسید کو علماء نے کیا کچھ نہیں کہا۔ کافر'ملحد' کرسٹان لیکن سرسید کا کتنا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا جو بحیثیت مجموعی ایک قوم مسلمانوں کو درپیش ہوا۔ انہوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت پر زور دیا۔ اور وہ جب تعلیم پر زور دیتے، تہذیب و تمدن میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتے، جب ہی ان کا کہنا یہی تھا کہ ہم اپنا جداگانہ ملی وجود قائم رکھیں۔ ارشاد ہوا'' یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کی بدولت ایک عالم بیدار ہوا اور قوم کے قوائے علم و عمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی۔''(۱۸۳)

ارشاد ہوا:۔

''دیو بند ایک ضرورت تھی' اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل در روایت جس پہ ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم ہے۔ یہ ضرورت پوری ہوئی اور یوں بھی اس کا پورا ہونا ضروری تھا لیکن دیو بند کو چاہیے تھا، کہ اس روش پر قائم رہتا، سیاست کے چکر میں نہ آتا۔ دیو بند کدھر جا رہا ہے' مولانا حسین احمد مدنی یہ کہہ رہے ہیں کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔''(۱۷۴)

۷ مارچ ۱۹۳۸ء

حکیم محمد حسن قرشی کہہ رہے تھے کہ مسلمان صحیح قیادت سے محروم ہیں ارشاد ہوا:۔

''ٹھیک ہے قوم کو اس وقت قیادت کی ضرورت ہے' ایسی قیادت جس سے اس کے دل و دماغ میں جلا پیدا ہو، جو ان کی علمی اور عملی صلاحیتوں کو بیدار کر دے۔ ورنہ حالات بگڑ جائیں گے۔''

پھر فرمایا۔

''بظاہر حالات بڑے نامساعد بھی ہیں لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے' اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر دے گا۔''

دمہ کشی سے تنفس ٹھیک ہوا' تو جیسے کوئی بات با تاکید کہی جاتی ہے۔ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔

''سر دست ایک ہی صورت ہے' مسلمانوں کو چاہیے کہ جناحؒ کے ہاتھ مضبوط کریں! مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اب جس طرح حل کیا جا رہا ہے اس میں ہمارا متحدہ محاذ ہی انگریزوں اور ہندوؤں کی مخالفانہ کارروائیوں کا واحد جواب ہے۔ بغیر اس کے ہم اپنے

مطالبات کیسے منوا سکتے ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ان مطالبات میں فرقہ واریت کی بو آتی ہے تو یہ محض پروپیگنڈا ہے۔ ان مطالبات کا تعلق ہمارے قومی وجود کے تحفظ سے ہے۔"

"متحدہ محاذ لیگ ہی کی سربراہی میں قائم ہو سکتا ہے اور لیگ کامیاب ہوگئی جناحؒ کے سہارے! جناحؒ کے سوا اب کوئی شخص مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں۔" (۱۷۵)

علامہ اقبالؒ کا کارِاجتہاد

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اقبالؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے مغربی تہذیب کے طلسم پردار کے علاوہ علامہ اقبالؒ نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہے وطنی قومیت کی تردید اور تکذیب۔ مولانا مرحوم فرماتے ہیں۔

"علامہ اقبالؒ نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ یہ ہے کہ انہوں نے وطنی قومیت اور قوم پرستی پر ایک شدید ضرب لگائی ایسے حالات میں جبکہ علمائے دین اٹھ کر مسلمانوں کو وطنی قومیت کا درس دینے لگے تھے اور مسلمانوں کے بڑے بڑے مفتی علماء تک مسلمانوں یہ کہنے لگے تھے کہ وطنی قومیت سے تمہارے دین کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ صرف علامہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے پوری شدت کے ساتھ اس تباہ کن تصور کا تار پود بکھیرا اور لوگوں کو پوری قوت کے ساتھ بتایا کہ وطن بھی ایک بت ہے اور وطن کی پرستش کرنا بھی ایسا ہی شرک ہے جیسا کہ کسی بت کی پرستش کرنا شرک ہے۔ اگر اقبالؒ نے یہ تعلیم بروقت نہ دی ہوتی تو بعد میں کانگریس نے رابطہ عوام (Muslim Mass Contect) کی جو تحریک شروع کی اور جس میں علماء اور اشترا کی حضرات بھی شریک تھے وہ تحریک مسلمانوں کو ہندوؤں کے اندر اس طرح گھلا دیتی جیسے کہ نمک، پانی کے اندر گھل جاتا ہے۔ اقبالؒ نے مسلمانوں میں یہ احساس بیدار کیا کہ قومیت وطن اور زبان سے نہیں بلکہ دین اور عقیدے سے بنتی ہے۔ اس نے مسلمانوں میں شعور پیدا کیا کہ تم ایک عقیدہ اور ایک تہذیب رکھنے والی قوم ہو۔ تمہاری قومیت ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جن کی تہذیب اور عقیدہ اور مسلک تم سے جدا ہے۔"

قیامِ پاکستان اقبال کا مرہونِ منت ہے

مولانا مزید کہتے ہیں کہ

"اگر اقبالؒ نے بروقت یہ اقدام نہ کیا ہوتا اور اسلامی قومیت کا احساس بیدا نہ کر دیا ہوتا تو آج اس پاکستان کا کہیں وجود نہ ہوتا۔ آج اگر ہندوستان میں مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے اپنے تہذیبی

وجود پر اصرار کر رہے ہیں تو یہ اسی تعلیم کی وجہ سے کر رہے ہیں جو اقبالؒ نے اس وقت دی تھی اور یہ پاکستان بھی اسی تعلیم کی وجہ سے معرض وجود میں آیا جس نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا وہ کہ ایک اور قوم ایک ملت ہیں'۔(۱۷۶)

قیام پاکستان کا پس منظر

جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے گواہی دی ہے کہ ''۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک ایک صحافی کی حیثیت سے میں ہندوستان کے سیاسی حالات اور ان میں مسلمانوں کی حیثیت کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور مطالعے نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ ہندوستان میں تمام باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے یہاں برطانوی حکومت کے زیر اثر جو جمہوری نظام بنایا جا رہا ہے اس میں مسلمانوں کی کسی حیثیت سے بھی کوئی خیر نہیں ہے اور اس نظام میں ان کو خواہ کیسے ہی آئینی تحفظات دے دیے جائیں' غیر مسلم اکثریت کا غلبہ ان کے لیے درحقیقت کسی تحفظ کو بھی مفید اور موثر نہ رہنے دے گا۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ کچھ آئینی تحفظات حاصل کر کے انگریزی حکومت کے بل بوتے پر جینا سراسر نادانی ہے، کیوں کہ انگریزوں کو ہمیشہ یہاں نہیں رہنا ہے۔ ملک آخر کار آزاد ہو کر رہے گا اور آزاد ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کی حکمرانی مسلمانوں کے دین' اخلاق، تہذیب' تمدن' معاشرت اور معیشت سب کو تباہ کر کے رکھ دے گی یہاں تک کہ ان کا الگ امتیازی وجود تحلیل ہو کر رہ جائیگا۔''(۱۷۷)

وہ لکھتے ہیں

''۱۹۳۷ء میں وہ تمام خطرات سامنے آ گئے جن کے وقوع میں آنے کا اندیشہ تھا۔ برعظیم کے تمام لوگوں کو ایک قوم فرض کر کے غیر مسلم اکثریت کو حکمران بنانے کا عمل شروع ہوتے ہی اس کے فطری اور منطقی نتائج اندیشوں سے گزر کر حقیقت کی صورت میں نمودار ہونے لگے۔ مسلمانوں کے جداگانہ قومی وجود اور ان کی اپنی مستقل تہذیب کی نفی کی جانے لگی۔ غیر مسلم اکثریت نے ان پر اپنی زبان' تہذیب اور رسوم کو مسلط کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں سے اجتماعی طور پر کوئی معاملہ کرنے کی بجائے ان کے افراد کو براہ راست مخاطب کر کے ہندوستانی قومیت میں جذب کرنے کی کوشش بڑے پیمانے پر کی جانے لگی جس میں بدقسمتی سے علماء کا ایک گروہ بھی شریک ہو گیا۔''

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:-

''یہی وہ زمانہ تھا جس سے مسلم لیگ کانگریس کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک زبردست عوامی قوت کی

حیثیت سے قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں ابھری، وطنی قومیت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ مسلمان اس کے فتنے سے بچ گئے اور ان کے اندر یہ جذبہ شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ ہندوستان میں ان کی قومیت کے امتیازی وجود کو آزاد اور مستقل حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ ایک پر جوش تحریک آگے بڑھ رہی تھی اور مسلمانوں کا قومی مقصد بتدریج ایک شکل اختیار کرتا جا رہا تھا یہاں تک کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں وہ تقسیم ہند کی تجویز پر مرتکز ہو گیا۔ ابتداً اس تجویز میں ''پاکستان'' کا نام شامل نہ تھا مگر یہ نام پہلے ہی سے عوام میں مقبول ہو رہا تھا اس لئے آپ سے آپ زیر تجویز ملک کا یہی نام چسپاں ہو گیا اور اس طرح یہ تحریک ''تحریک پاکستان'' بن گئی۔''(۱۷۸)

قائداعظمؒ اور ان کی قیادت

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کو یہ شرف تا قیامت حاصل رہے گا کہ انہوں نے بیسوی صدی عیسوی میں ملت اسلامیہ ہند کی بقا اور سلامتی کے لئے عملاً کارزار سیاست میں عیار ہندو اور مکار انگریز کے چنگل سے مسلمانان برعظیم کو اسلام ایک نظریہ حیات و کائنات اور اسلام کا انسان مطلوب بتا کر انہیں اور ان کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک دارالسلام کا نظریہ بھی پیش کیا اور اس کا بانی بھی چن کر دیا۔ الٰہیات میں اسے اصطفیٰ (Selection) اور چن لینا کہتے ہیں۔ محض تصوف تو لفظیات کا الجھاؤ ہے جو دین و فقر پر منہ مارنے والے سطحی اور دنیا پرست علماء اور صوفیوں کا دھندہ اور چندہ ہے وجہ اقبالؒ ہی بتاتے ہیں کہ:

ع خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

ورنہ ''تصوف'' کے نام تک کو معلومات کے ظاہر پرست اور سخت گیر اور غیر مقلد ادّعا کے نزدیک ''شرک و بدعت'' سے کم کا مقام حاصل نہیں ہے مگر حقیقت میں اہل سنت و الجماعت اور اہل تشیع میں روحانیت اور فقر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امام حسینؓ، امام عالی مقام کے مرکز پر یکجا ہیں جن کے مابین فقہی اور مسلکی نقطہ نظر اور تاریخ میں اختلاف کے باوجود خلافت راشدہ کا دور حضورؐ کے ارشاد پاک کی روشنی اور الفاظ میں ۳۰ برس تک خلافت راشدہؓ حضرت امام حسنؓ پر ختم ہو جاتا ہے۔ خلافت راشدہ کا خوبصورت تعارف ہی نہیں معارف بھی حضرت علامہ اقبالؒ کا ایک مصرع ہے۔ فرمایا:

ع ''مسلمان فقر و سلطانی بہم کرد''

یہی وہ صورت احوال ہے جو حضرت علی ﷜ کے دور میں مسلمانوں میں باہمی جدل پر ایک مشیر نے کہا کہ امیر المومنین پہلے شیخین ﷠ کے دور میں تو اسلام کی فتوحات ایران و افریقہ تک گئیں مگر آپ کے دور میں مسلمان باہم دست و گریبان ہیں، کیوں؟ حضرت علی ﷜ کا مشہور جملہ ہے، فرمایا ''ان کا مشیر میں تھا میرے تم ہو اس لئے یہ باہمی جنگ و جدل ہے''۔ حکومت، انتظامیہ اور علم و حلم جب بھی یکجا ہونگے تو اُس مملکت اور ماحول دونوں کو سلامتی اور سکون مل کر رہے گا۔ ورنہ حضرت علیؓ ہی کا شعر سیاسی مسخروں کے ہاتھ میں حنظل کا پتا ہے کہ فرمایا

رضینا بقسمة الجبار فینا
لنا علم و للجهال مال

کہ ہم اللہ کی اس حتمی تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم سے نوازا اور جاہلوں کو دولت دی ہے۔ اقبالؒ ہی کا شعر اس کا ترجمہ کر سکتا ہے۔

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے؟
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے؟

دین وفقر جب اظہار کی صورت اختیار کرتا ہے تو اشعار وافکار کے گوہر ہی نہیں ڈھلتے قائد اور قیادت بلکہ مملکت وریاست بھی ظہور میں آتی ہیں۔ انہیں کا ایک مصرع کافی ہے۔

ع فقر کے ہیں معجزات لشکرو سریروسپاہ

مردقلندرؒ کی بارگاہ

اس لئے یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ کم وبیش ایک ہزار سال کے بعد برعظیم پاک وہند میں پھر مسلمانوں کو اپنی مملکت پاکستان کی صورت میں اقتدار نصیب ہوا ہے۔ ان کی اپنی حکومت، اپنا معاشرہ اور اپنی ریاست وجود میں آئی' یہاں تک کہ بنگلہ دیش بھی اپنے اسلامی تشخص پر اصرار کے ساتھ وقت کی رفتار کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ کوئی بھارت کے مغربی بنگال (کلکتہ) کا مشرقی بنگال (ڈھاکہ) صوبہ تو نہیں بلکہ ۱۲ کروڑ سے زائد مسلمانوں کا اپنا آزاد' خود مختار ملک ہے جہاں بھارت سے معاہدہ دوستی کی تجدید شیخ مجیب الرحمٰن کی وزیراعظم بیٹی سے ہونا ممکن نہیں رہا۔ ایک انچ زمین پر بھی کسی مسلمان کا ڈنڈا اور جھنڈا قائم ہے تو اسلام آزاد ہے۔ مسٹر محمد علی جناحؒ سے قائداعظم بننے کا راز بھی یہی رمز مصطفیٰ ہے۔

باز نور مصطفیٰ اورا بہا است
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است
(اقبالؒ)

یہی راز ہے جو تحریک پاکستان کا دینی سرمایہ ہے۔ اقبالؒ نے جناح کا اصطفیٰ فرمایا حقیقتاً یہ کام تو رسالت ﷺ کے فیضان کا ہے فی الواقعہ بقول اقبالؒ اور حقیقتاً یہ میر حجاز ﷺ کا اصطفیٰ ہے جس کی تصدیق حضرت علامہ اقبالؒ کا عمل ہے۔ اعلان ہے کہ جناحؒ کے سوا کوئی بھی اس دور میں مسلمانوں کی رہبری کے لائق نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل ہو کر جناحؒ کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہیں۔ بقول اقبالؒ

ع ہوتا ہے جادہ پیما' پھر کارواں ہمارا

مگر قائداعظمؒ خود کیا فرماتے ہیں

ع سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا

ڈاکٹر بدرالدین احمد نے ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ء کو حضرت قائداعظمؒ سے ان کی دہلی کی اقامت گاہ ۱۰۔ اورنگ زیب روڈ پر ایک انٹر ویو لیا جو ہفت روزہ چٹان لاہور ۹ فروری ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں قائداعظمؒ نے فرمایا

''میں تو اسلام کے کامل زندگی' خدائی قوانین کی بادشاہت پر ایمان رکھتا ہوں۔ مجھے عظیم فلاسفر اور مفکر ڈاکٹر اقبالؒ سے نہ صرف پوری طرح اتفاق ہے بلکہ میں ان کا معتقد ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اسلام ایک کامل ضابطہ حیات ہے۔ رہنمائی کی تمام مصیبتوں اور مشکلوں کا حل اسلام سے بہتر کہیں نہیں ملتا۔''

پھر فرمایا مسٹر بدر! خوب یاد رکھو!

''دنیا کی تمام مشکلوں کا حل اسلامی حکومت کے قیام میں ہے۔ اس کے قیام کی خاطر میں لندن کی پر سکون زندگی کو ترک کر کے عظیم مفکر علامہ اقبالؒ کے اصرار پر واپس آ گیا۔'' انشاءاللہ تعالیٰ پاکستان کے نظام حکومت کی بنیاد لا الہ الا اللہ ہی ہوگی۔ اور اس پر ایک ایسی فلاحی مثالی سٹیٹ قائم ہوگی کہ دنیا اس کی تقلید کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔'' (۱۷۹)

قرارداد پاکستان

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس جس میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی وہ فی الواقعہ اقبالؒ ہی کی خواہش اور آرزو کا انعقاد تھا جو ۱۹۳۷ء کے ان کے خطوط میں مذکور ہے۔ اور یہی طریق اور ایک علیحدہ مسلم اکثریت پر مشتمل مسلمانوں کی مملکت کا قیام اور تقسیم ہند کے حتمی مطالبے کی صورت ۱۹۴۰ء کی قرارداد ہے جو فی الحقیقت کانگریس اور ہندوؤں سے مسلمانوں کی آزادی کا حقیقی مقصد تھا۔ اب مسلم لیگ اور کانگریس کی راہیں جدا ہی نہیں ہوئیں انگریزی زبان میں (Parting of the Ways) ہو گیا۔ بلکہ قرآن پاک نے عملاً اپنا حکم نافذ کر دیا۔ لکم دینکم ولی دین تمہارے لئے تمہاری راہ اور ہمارے لئے ہمارا راستہ!

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد قائداعظمؒ نے اپنے سیکرٹری ایم ایچ سید سے فرمایا۔

''آج اقبالؒ نہیں ہیں اگر وہ زندہ ہوتے تو انہیں خوشی ہوتی کہ ہم نے ان کی خواہش پوری کر دی۔'' (۱۸۰)

۱۹۴۰ء آل انڈیا مسلم لیگ کا خطبہ صدارت

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قائداعظمؒ کے خطبۂ صدارت پر اظہار

خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں جو نظریہ واقعات ماضی ایک تاریخی اجلاس تھا پہلی مرتبہ تقسیم کے خیال کو اپنی منزل مقصود بنا لیا۔ قائداعظمؒ نے اس اجلاس میں خطبہ صدارت دیا۔ وہ ہندوستان میں مسلم قوم پروری کی تاریخ کا ایک سنگ میل ہے کیونکہ اس میں ایک جداگانہ مسلم قومیت اور مسلم ہندو مملکتوں میں ہندوستان کی تقسیم کا مقدمہ ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ:

''ہندوستان کے مسلمان واضح طور پر آزادی ہند کے حامی ہیں مگر آزادی تمام ہندوستان کے لئے ہونی چاہیے نہ کہ صرف ایک طبقے کے لئے۔ اگر ہندوؤں کو آزاد ہونا ہے اور مسلمانوں کو ان کا غلام بن کر رہنا ہے تو یہ ایسی آزادی نہیں ہے جس کے لئے مسلمانوں سے کہا جا سکے کہ وہ لڑیں۔ قوم کی ہر تعریف کے مطابق مسلمان ایک قوم ہیں۔ اگر ہندوستان کے مسئلے کو ایک مملکت کا بین الملّی مسئلہ سمجھا جاتا رہا تو یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اس پر غور اسی حیثیت سے ہونا چاہیے۔ یہ خیال کہ ہندو اور مسلمان کبھی کوئی مشترک قومیت پیدا کر سکیں گے محض ایک مہمل خواب ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی روایات اور ادبوں سے ہے۔ وہ نہ آپس میں شادیاں کرتے ہیں نہ مل بیٹھ کر کھاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق دو مختلف تہذیبوں سے ہے۔ خاص طور پر متصادم خیالات و تصورات پر مبنی ہیں۔ زندگی پر اور زندگی کے متعلق ان کے تصورات مختلف ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ہندو اور مسلمان تاریخ کے مختلف ماخذوں سے فیضان حاصل کرتے ہیں۔ ان کی مختلف رزمیہ داستانیں ہیں، مختلف ہیرو ہیں، مختلف قصے ہیں۔ اکثر ایک قوم کا ہیرو دوسری قوم کا دشمن ہوتا ہے اور اسی لئے ان کی فتوحات اور شکستیں ایک دوسرے پر منطبق ہوتی ہیں۔ اس قسم کی دو قوموں کا دو قوموں کے کاندھوں پر ایک واحد مملکت کا جوا سطرح رکھ دینا کہ ان میں ایک عددی اقلیت ہو اور دوسری اکثرت ہو، بڑھتی ہوئی بے اطمینانی پر اور اس قسم کی مملکت میں جو حکومت تشکیل پائے گی بالآخر تباہی پر لازماً منتج ہو گی۔ قوم کی ہر تعریف کے مطابق مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کے پاس اپنے وطن' اپنا علاقہ اور اپنی مملکت ضرور ہونی چاہیے۔ ہم بحیثیت ایک آزاد و خود مختار قوم کے اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن و امان اور ہم آہنگی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگ اپنی روحانی' ثقافتی' معاشی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کو زیادہ سے زیادہ مکمل نشو و نما دیں اور اس کے لئے جو طریقہ ہمارے خیال میں بہترین اور خود ہمارے نصب العین سے ہم آہنگ اور ہماری قوم کی ذہانت کے مطابق ہو اسے اختیار کریں۔ اس لئے مسلم ہندوستان کسی ایسے دستور کو قبول نہیں کر سکتا جو لازماً ایک مستقل اکثریت کی مستقل حکمرانی پر منتج ہو۔

سب کے لئے صرف ایک راستہ کھلا ہوا ہے اور وہ ہے کہ بڑی بڑی قوموں کو اس کی اجازت دی جائے کہ وہ ہندوستان کو مقتدر مملکتوں میں تقسیم کر کے اپنے الگ الگ وطن (ملک) قائم کریں۔''(۱۸۱)

۱۹۴۰ء میں کانگریس کا خطبہ صدارت

ذرا اسی ماہ انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء کا صدارتی خطبہ بھی ایک نظر دیکھ لیں تو عجب نہیں کہ مسلمانوں میں معروف ایک مذہبی سکالر ابوالکلام آزادؒ اپنا علم الکلام امت مسلمہ کے حلقوم میں ہندو مسلم ادغام کا خنجر بھونکے دیتے ہیں۔فرماتے ہیں:

مسلمان اور متحدہ قومیت

''ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور نا قابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔''(۱۸۲)

قدرت کا فیصلہ

تو یہ ہے کہ خود مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اپنے الفاظ میں

''پاکستان بن گیا' یہی مشیت الٰہی کو منظور تھا''(۱۸۳)

لیکن یہ صرف مولانا ابوالکلام آزادؒ اور ہندوؤں کو منظور نہ تھا اور یہی قدرت فیصلہ تھا۔اس خطبہ رام گڑھ میں خاتمہ کلام ہے:

''حضرات! میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔میں اب اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں' مجھے ایک بات کے یاد دلانے کی اجازت دیجئے' آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے،اتحاد' ڈسپلن اور گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا کہ صرف اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔''(۱۸۴)

مسلمانوں کے قائد یعنی قائداعظمؒ نے مسلمانوں کو تین اصول دیئے: جس میں ایمان' اتحاد اور تنظیم بڑے معروف الفاظ ہیں اور قائداعظمؒ کا مشہور زمانہ قول ہے۔ مولانا آزادؒ کے خطبہ میں مسلمان اور متحدہ قومیت کا وطنی مغلوبہ سے مملو خطاب تو اپنے فکر وفلسفہ کا دریچہ وا کئے ہوئے ہے۔ فرق صاف ظاہر ہے کہ قائداعظمؒ جسے ایمان کہتے ہیں وہ اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان ہے۔ توحید و رسالت ﷺ کا اقرار و اعلان کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ مولانا آزادؒ کا ''اعتماد و اعتقاد' حضرت گاندھی کی رہنمائی پر ہے اور یہی فرق ہے کانگریس کے صدر ایک عالم دین کا اور مسلمانوں اور مسلم لیگ کے صدر کا جو فی الواقعہ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس برعظیم میں ملت کے پاسبان ثابت ہوئے ہیں۔ یہی اور یہی دو خطبوں کی عصری جھلک کا نمونہ اور شہکار ہے۔

کہاں قائداعظمؒ کہ رہبر بنا کے شاہ امم کو کہاں ابوالکلام آزاد کے رہبر گاندھی اور ہندوؤں کو! اس آئینے میں مسلمانوں کا قائداعظمؒ خود

ع سالار کارواں ہے میر حجازؐ اپنا

کے سبز ہلالی جھنڈے تلے ملت اسلامیہ کا قائداعظمؒ اور پاسبان ہے جو ۱۹۴۰ء ہی کے لاہور اجلاس میں:

ع ملت کا پاسبان ہے محمد علی جناحؒ

میاں بشیر احمد کی نظم کا نہیں پورے برعظیم کے مسلمانوں کا عزم بن گیا۔ اس کی پشت پر کروڑوں مسلمانوں کی دعائیں اقبالؒ کے آنسو اور آہیں ساتھ تھیں۔ یہی رمز مصطفیٰ ہے جو اقبالؒ کا اصطفٰی ہے، چناؤ ہے (Selection) ہے جو فی الحقیقت روحانیت میں الٰہیات بلکہ فقر و دین میں یہی تو رمز مصطفیٰ کا معجزہ ہے جو فیض خاص ہے۔ روحانیت کیا ہے، فقر کیا ہے؟ اقبال کے ہاں یہ لفظ عشق ہے مگر کس، کا اپنی ذات کا کہ جماعت کا' دنیا کے مال وزر کا یا کسی فقہی مسلک کے مقتدر کا۔ یہ فقر سراسر عشق مصطفیٰ ہوتا ہے۔ یہ حال و مقام (Time and Space) کا کمال ہے بلکہ کرم بھی کہ عقلی، نسلی اور شکلی اسلام نہیں جو عقائد کا معلوماتی نصاب یا رواج ہے۔ یہ کتاب و سنت کا اصلی اور کیفیاتی اسلام ہے جو فیضان نبوت ﷺ کا تا قیامت جاری و ساری فیض مسلسل ہے اور خود برعظیم پاک و ہند اسی نور نبوت اور ظہور رسالت ﷺ کے جلوؤں اور آپ ﷺ کے فقر کا شاداب چمن ہے' جس سے آپ کو ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ (الحدیث)

میر عرب ﷺ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
(اقبالؒ)

یہ روحانیت' فقر و دین یا الٰہیات بلکہ اسلام کیا ہے؟ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر ﷺ ہے یا بقول اقبالؒ

ع بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ ''دیں ہمہ اوست''

کہیں یہی روحانی سلسلے ہیں جو نسبت اور صحبت کے طریقے ہیں۔ یہ کتاب وسنت کے کتابی الفاظ کی تفسیر و تشریح نہیں ہے بلکہ یہ وارفتگی اور لگن ہے جو ذات مصطفیٰ تک خود پہنچنے کی خود سپردگی یا عشق رسول ﷺ ہے۔ اقبالؒ نے فرمایا کہ شریعت علم ہے مگر سنت محبت ہے۔

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

محبت دل کی کیفیت ہے عقل کا عقیدہ نہیں۔ یہ روحانیت کیا ہے، فقر کیا ہے، دین کیا ہے، بلکہ اسلام کیا ہے؟ اقبالؒ نے فرمایا۔

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشہ دامان اوست
سوز صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرہ عشق نبیؐ از حق طلب

مولانا مودودیؒ ہی نے اقبالؒ کے عشق رسولؐ کے بارے میں ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر یہ شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے سارے تفلسف پر اپنی تمام عقلیت کو رسول اللہ کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔“ (۱۸۵)

اور اسے کہتے ہیں

ع عقل قربان کن بہ پیش مصطفیٰ

فقر سے کیا مراد ہے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہی سے تحریراً سوال کیا گیا کہ ”علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں فقر کا لفظ کثرت سے استعمال کیا ہے، آپ کے نزدیک فقر سے کیا مراد ہے؟“ وہ جواب میں لکھتے ہیں۔

”فقر“ کے لغوی معنی تو احتیاج کے ہیں لیکن اہل معرفت کے نزدیک اس سے مراد مفلسی اور فاقہ کشی نہیں ہے بلکہ خدا کے سوا ہر ایک سے بے نیازی ہے۔ جو شخص اپنی حاجت مندی کو غیر اللہ کے سامنے پیش کرے اور جسے غنا کی حرص دوسروں کے آگے سر جھکانے اور ہاتھ پھیلانے پر آمادہ کرے وہ لغوی حیثیت سے فقیر ہوتا ہے جس کا اعتماد ہر حالت میں اللہ پر ہو، جو مخلوق کے مقابلے میں خود دار اور خالق کے آگے بندہ عاجز ہو، خالق جو کچھ دے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اس پر قانع اور شاکر رہے اور مخلوق کی دولت و جاہ کو نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھے، وہ اللہ کا فقیر ہوتا ہے نہ کہ بندوں کا۔“ (۱۸۶)

فقرِ اقبالؒ

لیکن فقر اقبالؒ کا نمونہ ان کی عملی زندگی میں قلندرانہ طریقت ہے' جو آج بھی ان کے کلام ارمغان حجاز (اُردو) میں سرا کبر حیدری اعظم حیدر آباد دکن کے نام اک نظم کا آئینہ اور عکس و نقش ہے جو غیرت فقر کا کامل نمونہ ہے۔ یوم اقبال کے موقع پر نظام حیدر آباد کے خزانے سے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا وہ سر اکبر حیدری کو شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔ اس پر ایک نظم لکھی جس کے اشعار ہیں:

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حُسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ
(اقبالؒ)

تحریک پاکستان اور ہندو حکمت عملی

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی وزارتوں کی تشکیل اور ے صوبوں میں کانگریسی راج وہ عملی تجربہ تھا جس نے تین برس کے قلیل عرصہ میں یہ حقیقت عملاً ثابت کر دکھائی کہ ہندو اور مسلم فی الواقعہ دو الگ قوموں کے ایسے متوازی کنارے ہیں جو ایک ہزار برس سے کبھی بھی آپس میں نہیں ملے اور اگر کانگریس کو ہندوستان کی آزادی ملی تو اس کے اقتدار میں مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا' کانگریسی وزارتوں کا تین سالہ تجربہ اس کی ریہرسل کا وہ عملی تجربہ تھا جس نے اسلامیان ہند کو اپنی حقیقی آزادی کا راستہ اس بات میں نظر آیا کہ ان کی اپنی مسلم مملکت کے سوا ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ نامہربان ہندو اکثریت انہیں ہڑپ کرنے کے درپے ہے اور اس ''سموک سکرین'' کا نام متحدہ قومیت' آزادی ہند اور کانگریس تمام ہندوستانیوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ تھا جو وقت کے سامنے بے نقاب ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں جب ان وزارتوں نے استعفیٰ دیا تو قائد اعظمؒ نے اسلامیان ہند کو یوم نجات منانے کا حکم دیا۔

اقبالؒ و جناحؒ کے نام پر کانگریسی استدلال

کچھ دانشور اپنی ذہنیت کو منطقی استدلال کی پرتوں میں لپیٹ کر عجب تاویلات پیش کرتے ہیں اور حادثہ یہ ہے کہ وہ عملاً اپنے وجود اور عمل سے اپنے ہی نظریات کی ضد بلکہ تکذیب ہوتے ہیں۔ عبدالحمید کمالی 'جناحؒ، اقبالؒ اور تصور پاکستان' کے زیر عنوان اپنے ایک مضمون میں یہ انکشاف فرماتے ہیں کہ "اس عنوان کے انتخاب میں سب سے اہم تاریخ کا یہ لطیفہ غیبی ہے کہ لالہ لاجپت رائے کا سی آر داس کے ایک خط' دیکھتے دیکھتے ہمارے شعور کا سرچشمہ بن گیا" اقبال ریویو کے شمارہ جنوری ۱۹۷۳ء میں وہ لکھتے ہیں کہ "لاجپت رائے کا وہ مشہور خط جو ہمارے ملی شعور کا جزو بن گیا ہے وہ اس طرح ہے "گذشتہ چند ماہ سے میں نے اپنا بہت سا وقت مسلم قانون اور مسلم تاریخ پڑھنے میں صرف کیا ہے اور اب میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ ہندو مسلم ایکا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب اس اتحاد میں مطلقاً حارج ہے۔" (۱۸۷)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ "اجتہاد تو تھا یہ لالہ لاجپت رائے کا' مگر ہمارے ملی تخیلات میں اس کا پیوند اس طرح لگا کہ گویا ہمارے دین کا یہی روحانی اصل اصول ہے۔" وہ اس بات پر بھی حیران ہیں کہ جن سے ہمارا ملی شعور متاثر ہوا ہے وہ اقبالؒ کے چند ابیات ہیں جن کی روشنی میں عامتہ الناس سے "بے وطن قوم" بننے کو کہا جاتا ہے۔ وہ ابیات یہ ہیں:

عجم ہنوز نہ داند رموز دین ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ "دیں ہمہ اوست"
اگر با او نرسیدی' تمام بولہبی است

ظاہر ہے کہ دیوبند کے مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیت علماء ہند کے بارے میں یہ حضرت علامہ اقبالؒ کی معروف و مشہور رباعی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ "جناحؒ کی طرح اقبالؒ بھی 'ہندو مسلم اتحاد' کو برصغیر کی ترقی سیاسی اعلان اور آزادی کی بنیاد شرط سمجھتے تھے۔ شروع ہی سے اقبالؒ کے اس مسلک اور ان کی بعد کی سیاسی وفکری زندگی میں کوئی تعارض نہیں ہے"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اس لئے ہمارے بیدار مغز رہنما اس اتحاد کے لئے کوشاں تھے۔ عبدالرشید گنگوہیؒ جو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بعد دیوبند کے صدر ہوئے انہوں نے ۱۸۸۵ء میں ہی مسلمانوں کا کانگریس میں شرکت کا مشورہ دے دیا تھا۔" (۱۸۸)

پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کا مولانا حسین احمد مدنیؒ کے استدلال کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کی رباعی ہی قابل اعتراض کیوں بلکہ بسترِ علالت سے ۱۹۳۸ء میں اس پر روزنامہ احسان لاہور میں ان کا مضمون پھر

ع خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

سمیت کتنے ہی فارسی کے اشعار اور حضرت علامہ کے افکار ہیں جس پر اسلامی نظریہ قومیت کی بنیاد کلمہ طیبہ قرار دی گئی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے نام پر اکادمی اور رسالے میں جناحؒ کے پاکستان میں، ہندو دانش کا سیاسی حملہ ''متحدہ قومیت'' تھی جس کے سار بان اور مذہبی ترجمان تو مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے تو کانگریس میں شمولیت کے خواہاں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے جبکہ اقبالؒ و جناحؒ مسلمانان برعظیم کی آزادی اور ملی تشخص و تحفظ کی بقا قوم رسول ہاشمیؐ کے علیحدہ وطن میں پاتے تھے۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے بارے میں محولہ بالا دانشور کا یہ جملہ بھی خاصے کی چیز ہے کہ ''تیسری اہم بات ایک بڑا التباس ہے جس کے ذریعے اقبالؒ کو وطن ناآشنا قومیت کا امام قرار دیا گیا۔'' (۱۸۹)

اولاً: ''یہ کہ لالہ لاجپت رائے کا ''اجتہاد'' ایک تین ماہ کے مطالعہ اسلامی قانون اور اسلامی تاریخ کا حاصل تحقیق ہے جس پر وہ سی آر داس (بنگالی کانگریسی رہنما جسے مولانا آزادؒ نے اپنی کتاب ''ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے'' کانگرسی قیادت میں قابل ذکر قرار دیا ہے) کو خط لکھ کر بتایا ہے کہ مسلمان مذہباً ہندوؤں سے اتحاد نہیں کر سکتے کہ ان کا مذہب اس میں حارج ہے۔ افسوس کہ یہ بات مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کو کیوں پتہ نہ چلی؟ کیا وہ اس حقیقت سے ناآشنا تھے یا سادگی یا سادہ دلی بلکہ انگریز دشمنی میں اس قدر بہہ گئے تھے کہ مسلمانوں کے مستقبل کی ہوش تک نہ رہی کہ وہ گنگا جمنا تہذیب کے دھارے میں متحدہ قومیت کے علمبردار بن گئے۔ ''قومیں دین سے نہیں زمین سے بنتی ہیں۔'' گویا کہ بھارت کا معاصر مسلمان ہندی تو بن گیا ہے جس کو تاحال اقتدار اعلیٰ کا نہیں تہذیبی بقا کا مرحلہ درپیش ہے۔

ثانیاً: یہ کہ حضرت قائداعظمؒ نے ۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک کانگریس سے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل پر باوقار اور برابر کی سطح پر مفاہمت پر سمجھوتے کی بار بار کوشش کی۔ انہیں اس وجہ سے ہی ''ہندو مسلم اتحاد کے سفیر'' کا لقب بھی دیا گیا مگر پنڈت موتی لعل نہرو نے جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے کے عوض مسلمانوں کے سیاسی حقوق کانگریس سے دلوانے کی حامی تک بھر لی تھی مگر نہرو رپورٹ میں جس طرح ہندو ذہنیت کا مسلم دشمن چہرہ بے نقاب ہوا، اس کے بعد قائداعظمؒ اس امر سے قطعاً مایوس ہو گئے کہ ان کی عمر بھر کی ہندو مسلم اتحاد کی سعی لا حاصل ثابت ہوئی ہے، رائیگاں گئی ہے۔

ثالثاً: یہ کہ اقبالؒ نے اپنی پوری سیاسی زندگی میں کبھی بھی مسلمانوں کے مخلوط انتخاب کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کی تو جناحؒ کے مقابلے میں اس لحاظ سے یہ انفرادیت اپنی جگہ اٹل ہے کہ وہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے مقابلے سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہوئے یہاں تک کہ شفیع لیگ اور جناح لیگ کے اختلاف کی بنیادی وجہ بھی یہی جداگانہ انتخاب ہی تو تھا۔

اقبالؒ کے چند ابیات پر معترض دانشور کا یہ لکھنا کس قدر ذہنی چابکدستی ہے کہ ''حسین احمد ز دیوبند'' کی رباعی سے اپنے دل کی بھڑاس تو نکال نہیں سکے البتہ یہ ضرور لکھا ہے ''یوں نظر آتا ہے کہ ہم نے اقبالؒ سے بس ان ہی شعروں کی حد تک استفادہ کیا

ہے اور ان شعروں کو بھی ہم لالہ لاجپت رائے کے ارشادات کی روشنی میں معانی پہناتے ہیں اور ملت اسلامیہ میں وطن ناشناس قومیت کی آبیاری کرتے ہیں۔"(۱۹۰)

ملت اسلامیہ کا موقف اقبالؒ کے ہاں سے

۱۰ مارچ ۱۹۳۸ء کی حضرت علامہ اقبالؒ کی محفل میں چلتے ہیں جہاں متحدہ قومیت کا کانگرسی نقطہ نظر اور کانگریس کے ہم نوا علماء کا تذکرہ ہے۔ سید نذیر نیازی روایت کرتے ہیں کہ:

"سلسلہ گفتگو پھر مسلمانوں کے اتحاد اور اتحاد سے متحدہ قومیت کے طرف داروں اور کانگریس کے ہم نوا علماء کی طرف پھر گیا۔ حضرت علامہؒ نے فرمایا:

"وطنیت پسند مسلمان تو خیر اپنی تعلیم و تربیت سے مجبور ہیں' ان کا دل' دماغ مغربی تعلیم کے زیر اثر اس حد تک بدل چکا ہے کہ وہ کسی دوسرے رنگ میں سوچ ہی نہیں سکتے۔ یوں بھی دنیا میں ہر کہیں وطنیت کا غلبہ ہے اور بلادِ اسلامیہ میں بھی یہ جذبہ ہر کہیں ابھر رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محکوم قومیں جب کسی قوم کے ہاتھوں اپنی آزادی کھو بیٹھی ہیں اور دوسری قوموں کو آزاد ہوتے دیکھتی ہیں تو ان کے اندر بھی قومی اور نسلی عصبیتوں کو تحریک ہوتی ہے۔ لہٰذا آج کل کے نوجوان اگر نشہ قومیت میں سرشار ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں' لیکن علماء کو کیا ہو گیا ہے؟ علماء کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اور وطنیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام لا وطن ہے۔"(۱۹۱)

"ہم نے عرض کیا یہ بھی ایک وجہ ہے کہ علما کا ایک طبقہ کانگریس کی طرف کیوں مائل ہے ان کے لئے اس کے نعرہ آزادی اور انگریز دشمنی میں بڑی کشش ہے، یہ نہیں کہ انہیں وطنیت کے لادینی سیاسی تصور یا متحدہ قومیت کی تائید منظور ہو۔

فرمایا "لیکن انگریز دشمنی کوئی مثبت اصول نہیں' نہ آزادی کے کچھ معنی' جب تک یہ طے نہیں ہو جاتا کہ ہم کس مقصد کے لئے آزادی حاصل کر رہے ہیں اور کس سے"۔

فرمایا "ہندوؤں کا ایک نقطہ نظر ہے ان کے ذہن میں متحدہ قومیت کا ایک مثبت تصور ہے۔ وہ جانتے ہیں آزادی کے بعد اس تصور کی عملی تعبیر کیسے ہو گی یعنی وہ نیا معاشرہ کس طرح وجود میں آئے گا اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہیں۔ کیا ان کو دیکھتے ہوئے کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ جب اس ملک کا اقتدار کانگریس کے ہاتھ میں آیا تو وہ اس متحدہ قومیت کو جو شکل دے گی منتہائے اسلام کے عین مطابق ہو گی۔"(۱۹۲)

فرمایا "ہندوؤں کی طرح ہمارا بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ اس ملک کے بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر کو خود بھی سمجھیں اور دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کریں۔ ہمارے ذہن میں بھی آزادی کا کوئی مثبت تصور ہونا چاہیے۔

فرمایا "آزادی سے مراد ہے اس امر کا اختیار کہ جہاں کسی قوم کا کوئی سیاسی اور اجتماعی نصب العین ہے اور جیسے جیسے ان کے اخلاق اور مذہبی تصورات ہیں وہ معاشرے کی تعمیر ان کی بنا پر کرے۔ لہٰذا شرط اول یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو اسلام کا نکتہ نظر اس

باب میں کیا ہے؟ اگر معلوم ہے تو سوچنے کی بات ہوگی کہ کانگریس کی متحدہ یا زمانہ حاضرہ کی وطنی قومیت کی صورت میں ہم اپنے معاشرے کی تعمیر کیا اس نقطہ نظر کے مطابق کرسکیں گے؟ کیا آزاد ہندوستان میں جیسا کہ کانگریس کی خواہش ہے حیات فرد اور جماعت کی وہی شکل ہوگی جو از روئے اسلام ہونی چاہیے۔'' فرمایا:

''یہ آزادی کا معاملہ محض آزادی یعنی انگریزی اقتدار سے نجات کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کیلئے جیسے بھی آئندہ حالات ہونگے ان کو اپنے اپنے طریق زندگی کے مطابق ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا معاملہ ہے۔ ایک ہمارا طریق زندگی ہے ایک ہندوؤں کا۔ بظاہر اس کا زور سیاسی اتحاد پر ہے بہ باطن ایک نئے طریق زندگی پر۔ فرض کیجئے ہمارے سامنے سرے سے ایک نیا طریق زندگی ہے اور زمانے کا تقاضا یہ کہ ہم اسے اختیار کرلیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرح سوچنا چھوڑ دیں۔ اس صورت میں ہی یہ نیا طریق زندگی جب ہی اختیار کیا جاسکتا ہے کہ ہندو مسلمانوں یا مسلمان ہندوؤں میں جذب ہو جائیں لیکن ہندو تو مسلمانوں میں جذب ہونے سے رہے۔ البتہ ان کی یہ ضرور خواہش ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کرلیں' یا اگر جذب نہ ہوسکیں تو بطور ایک سیاسی عنصر کے ان کی ہستی کالعدم ہو جائے۔ دراصل وہ جب ایک نئے طریق زندگی کا نام لیتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں چاہیے ہندوؤں کی طرح سوچیں نہ مسلمانوں کی طرح، تو اس لئے کہ عصر حاضر کے سیاسی، معاشی تصورات کی بنا پر ایک متحدہ قومیت کا نشوونما اور مذہب سیاست کی علیحدگی کا مغربی اصول اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ یوں ہندو معاشرہ کی ہستی جوں کی توں قائم رہے گی' نہیں رہے گی تو مسلمانوں کی''۔(۱۹۳)

''اس پر شاید قریشی صاحب نے کہا کہ' کانگریس خیال مسلمان بالخصوص ان کے ہم خیال علماء کو اس خطرے کا بخوبی احساس ہے لیکن ان کا خیال ہے کہ ہماری اوّلین ضرورت آزادی ہے۔ ہندوستان آزاد ہوگیا تو ہم اپنے طریق زندگی کا تحفظ کرلیں گے''۔

ارشاد ہوا ''یونہی سہی لیکن کیسے؟ از روئے مفاہمت یا خانہ جنگی؟ مفاہمت کا خیال ہے تو اس کی ابتداء ابھی سے ہو جانی چاہیے، کیوں نہ اس جدوجہد کے لئے جو کل پیش آنے والی ہے' ہم آج ہی اپنے آپ کو تیار کریں۔ کیوں نہ ہم آج ہی سمجھ لیں کہ آزاد ہندوستان میں اسلامی معاشرے کی تعمیر کن حالات میں ممکن ہے۔ ہمارا کوئی سیاسی اجتماعی نصب العین ہے تو کیا یہ لازم نہیں آتا کہ آزادی کی اس جدوجہد میں جو اس وقت درپیش ہے ہم اپنے مقاصد کا تعین اس نصب العین کے حوالے سے کریں۔'' ارشاد ہوا۔

''قوموں نے اس معاملے میں اکثر غلطیاں کیں اور نقصان بھی اٹھایا کہ حالات کے غلط اندازے یا کسی خیال اور فرضی

مصلحت کی بنا پر بعض باتوں کا فیصلہ ملتوی رکھا حالانکہ یہ بات ضروری طور پر فیصلہ طلب تھی۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ ہمیں ان مسائل کا کوئی واضح تصور بھی نہیں جو کل پیش آنے والے ہیں اور جو اس ملک میں اسلامی معاشرے کے تحفظ کے لئے ناگزیر ہیں۔ اب اگر ہندوستان میں آزادی کی وہی صورت ہے جو کانگریس کے سامنے ہے تو یہ حضرات کس کا اور کیسے تحفظ کریں گے۔''

ارشاد ہوا۔ ''یہ سیاست اور اقتدار اور آئین و قانون کی بحثیں تو بڑی دقت طلب ہیں۔ علماء حضرات اتنا تو سمجھیں کہ انگریز دشمنی کے جذبے میں اگر ہم نے وہی راستہ اختیار کیا جس پر کانگریس چل رہی ہے تو یہ راستہ مغرب کی لادین اور لااخلاق سیاست کا تو ہوگا، کتاب و سنت کا تو نہیں ہوگا۔''

ارشاد ہوا ''یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ مسلمان جب کبھی اپنے تصورات اور ملی نصب العین یا جداگانہ قومی وجود کے تحفظ کی بحث چھیڑیں تو اسے انگریزی اقتدار کی حمایت یا مفاد پرستی پر محمول کیا جائے تو محض انگریز دشمنی پر، انگریز دشمنی کوئی مثبت اصول سیاست نہیں ہے۔''(۱۹۴)

متحدہ قومیت کے بارے میں فرمایا ''یہ اصول کیا ہوسکتا ہے۔ یہی کوئی نسلی اور وطنی گروہ بندی' یا جہاں تک اس ملک کا تعلق ہے' ہندوستانی قومیت جسے اگر قبول کر لیا گیا' تو مسلمانوں کی حیثیت قوم کی نہیں بلکہ ایک مذہبی گروہ کی رہ جائے گی۔ شریعت کے چند ذاتی اور شخصی قوانین، عقائد اور مراسم تک' یہ جو کچھ ہوگا نہایت افسوسناک ہوگا۔ لیکن سب سے بڑھ کر افسوسناک ہمارا یہ فیصلہ کہ جہاں تک روح دین یعنی اس نصب العین کا تعلق ہے جو عام انسان کو خیر و صداقت، شرافت اور نیکوکاری کی دعوت دے رہا ہے اسلام میں اس کے حصول کا کوئی مخصوص اور متعین راستہ نہیں' یہ مقاصد سیاسی' اجتماعی حد بندیوں' انسانی روابط کی نئی نئی اساسات اور تہذیب و تمدن کی نشوونما کے باوجود دوسروں سے مل جل کر خود بخود پورے ہوتے رہیں گے۔''

فرمایا یہ حد درجے کی خود فریبی ہے بلکہ اسلام نافہمی۔ اسلام کے سامنے اپنے معاشرے اور فرد کا ایک مخصوص تصور ہے اور اس تصور کی عملی ترجمانی کا ایک متعین راستہ یعنی شریعت''!(۱۹۵)

فرمایا: ''یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ متحدہ قومیت کے باوجود جب مذاہب کا الگ تھلگ وجود بہرحال قائم رہے گا' گو بسبب و صورت ادیان کسی کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں ہوگی۔ جب بھی بااعتبار ایک مذہبی تنظیم یا بااعتبار ایک سیاسی اقلیت کے وہ چھوٹی سی گروہ بندی' جو اس بڑی گروہ بندی کے اندر جسے ہم ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں قائم رہے گی۔ کیا اس کل سے متاثر نہیں ہوگی جس کا وہ ایک جزو ہے؟ ہوگی اور ضرور ہوگی۔''

بڑی گروہ بندی سے چھوٹی گروہ بندی کا وجود یقیناً مجروح اور مضمحل ہوتا رہے گا۔ لہٰذا اس کی حدود بھی سمٹی رہیں گی۔ وہ آگے تو بڑھے گی نہیں' پیچھے ضرور ہٹے گی۔''(۱۹۶)

یہ اُن کی وفات سے کم و بیش ایک ماہ قبل کے ارشادات ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ تقسیم ہند کے معاً بعد بھارت میں مسلمانوں کا پہلا اجتماع لکھنؤ میں منعقد ہوا' جس میں مولانا ابوالکلام آزادؒ (شکستہ منتری) نے مسلمانوں کو اپنے خطاب میں یہی کہا کہ ''آئندہ مذہب کی بنیاد پر کوئی سی تنظیم یا سیاسی اقلیت کے طور پر گروہ بندی بند کر دیں' اور اہل وطن کے ساتھ مل کر بھارت کی ترقی میں جت جائیں گے۔''

اسلام کا تصور آزادی

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آزادی جس طرح انڈین نیشنل کانگریس کی سیاسی چالوں کی زد میں آئی اس کی تاریخی جھلکیاں ۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک کے ۳۰ برس کا وہ بہی کھاتہ ہے جس میں مسلم دشمنی کا ہندوالاؤ نفرت کی چتا ہے' جس میں مسلمانوں کی برعظیم میں ایک ہزار سالہ تاریخ ہندو عناد و نفرت کا وہ نمونہ ہے جو میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء بلکہ قائداعظمؒ کی تجاویز دہلی' ان کے چودہ نکات ہوں' کہ مذاکرات' خطوط بلکہ ملاقاتیں' ان کا انجام نہرو رپورٹ اور بالآخر عملی نمونہ کانگریسی وزارتوں کا تین سالہ مسلم دشمن عرصہ اقتدار یا پھر ۱۹۳۸ء میں جواہر لعل نہرو کا یہ بیان کہ ہندوستان میں دو ہی طاقتیں ہیں' کانگریس اور انگریز۔ جس کے جواب میں قائداعظمؒ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں ایک تیسری طاقت بھی ہے مسلمان' جس کی نمائندہ مسلم لیگ ہے۔''

ہندوستان کی آزادی' ہندو قوم کی آزادی مگر مسلمانوں کی آزادی کا کوئی سوال تو تھا ہی نہیں جبکہ مسلمان اپنے دینی تصورات اور اس کے عصری تقاضوں کے ماتحت اس مقام اور منزل تک آ گئے تھے کہ مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ' خود مختار مملکت کا قیام ان کی آواز اور آرزو بن گیا اس میں لالہ لاجپت رائے کی تقسیم پنجاب کی بات جو کہ سی آر داس کے نام خط کا تین ماہ کا ''مطالعاتی اجتہاد'' کہ ہندو مسلم ایک نہیں ہو سکتے کہ اسلام اس کی راہ میں حارج ہے یا کانگریس کے ہم خیال علماء پہلے آزادی ہند پھر برادران وطن سے مسلمانوں کے بارے میں بات کریں گے۔ یا ہندوؤں کی تنگ نظری نے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کے حصول کیلئے تیار کیا یہ سب باتیں ہی باتیں تھیں۔ حالانکہ سچ یہ ہے جو اقبالؒ کی دینی بصیرت اور جناحؒ کی عملی قیادت کا اعجاز ہے کہ برعظیم کی ملت اسلامیہ اپنے سرچشمہ حیات اسلام کے تصور آزادی کے مثبت اور فیصلہ کن اصول کے ماتحت آزاد ہو کر رہی۔ سراج منیر کا تجزیہ' دینی فکر کے ماخذ تک رسائی کو آسان بناتا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ

> ''جب اس علاقے میں مسلمانوں کی آزادی کا سوال پیدا ہوا تو اس کی بنیاد کسی معاشی' یا معاشرتی سوال کی مرکزیت پر نہیں تھی۔ بلکہ ایک فیصلہ کن اصول کے تعین پر تھی۔ چونکہ اصولی سوال تھا' لہٰذا مسلمانوں کی معاشی مصلحتیں' سیاسی ترجیحات' معاشرتی اسالیب حیات' سب کے سب اپنی جگہ شامل تھے۔ لیکن انگریز' کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان جو کشاکش پیدا ہوئی اس کی بنیاد بہت گہرے اصول تھے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے تصور کے مطابق انسان کی جہت خلافت کا تقاضا یہی تھا

کہا قتدار اعلیٰ طلب کیا جاتا۔ آزادی کی یہ طلب جیسا کہ بعض حلقوں میں گمان کیا جاتا ہے کہ ہنگامی صورتحال کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس شعور کا لازمی تقاضا تھا' جس کی تربیت اسلام کی وحی نے خاتمیت کے تقرر کے تحت ڈیڑھ ہزار برس تک کی تھی۔'' ڈاکٹر امبیڈکر جب یہ کہتا ہے کہ ''پاکستان مسلمانان برصغیر کی تقدیر تھا' اور ایک پراسرار ہاتھ انہیں رفتہ رفتہ اس تقدیر سے قریب تر کرتا جا رہا تھا۔'' تو مسلمانوں کی تاریخ کا اس کا فہم ہمارے نام نہاد دانشوروں سے کہیں بہتر محسوس ہوتا ہے۔'' (۱۹۷)

پاکستان کی نظریاتی اساس

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جب ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں اپنے خطبہ صدارت میں قائداعظمؒ نے جس طرح اور جن الفاظ میں دوقومی نظریہ کو جامعیت کے لفظوں میں پرو دیا ہے' یہ ان کی ذات ستودہ صفات کا حصہ ہے۔ اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان منظور کی گئی تو گاندھی ہی کیا خود مولانا ابوالکلام آزاد تک کا لہجہ مذہبی ہو گیا۔ گاندھی کا اس قرارداد پر یہ تبصرہ کہ ''وہ بھارت ماتا کو ایک وحدت سمجھتے ہیں' کہ بھارت کے ٹکڑے کرنا گئو ماتا کے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہوگا۔'' یا مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ کہنا ہے کہ

''مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میرے حلق سے نیچے نہیں اترتا' اس سے یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک کی تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے بلکہ اسلام سے انحراف ہے اسلام ایسی کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔''

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سابق صدر شعبہ تاریخ پروفیسر محمد اسلم مرحوم کا اس بیان پر تبصرہ ہے کہ

''کاش! اس وقت کوئی مسلمان طالب علم بزعم خویش اسلام علوم کے اس ''سب سے بڑے سکالر'' کو یہ بتلاتا کہ دارالسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات ہم نے نہیں گھڑیں' پاک و ناپاک زمین کی تقسیم ہے جو ہمارے آئمہ کرام نے کی تھی' اور فقہ میں ان کے مسائل الگ الگ ہیں۔'' (۱۹۸)

یقیناً یہی سبب تھا کہ: ''ابوالکلام آزاد کی ۱۲ جولائی ۱۹۴۰ء کے تار کے جواب میں قائداعظمؒ نے یہ کہہ کر ان کے کسی قسم کی خط و کتابت یا بات چیت سے انکار کر دیا کہ آپ نہ مسلمانوں کے نمائندے ہیں نہ ہندوؤں کے۔ آپ کانگریس کے مسلمان ''دکھاوے کے صدر'' ہیں' تاکہ کانگریس کو ایک قومی رنگ اور غیر ممالک کو دھوکہ دیا جائے۔ اگر آپ میں عزت نفس ہے تو فوراً استعفیٰ دے دیں۔ آپ نے آج تک مسلم لیگ کے خلاف کام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی آپ کو علم ہے آپ بری طرح ناکام رہے ہیں' آپ اب بھی باز آ جائیں۔'' (۱۹۹)

کیادوقومی نظریہ برعظیم کی تاریخ سے خاص ہے

سراج منیر نے ایک مسلم سکالر کا سا تجزیہ کیا ہے لکھتے ہیں۔ایک اہم سوال یہ ہے کہ آیا ''دوقومی نظریہ صرف برصغیر کی ایک مخصوص تاریخی صورتحال سے خاص ہے۔یا یہ اسلام کے تصور قومیت کا لازمہ اور اس کا بنیادی تقاضا ہے ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ مغربی استعمار کا سب سے اہم Response ''مردمن'' کی اصطلاح کے تحت اسلام کے تصور انسان کی بازیافت ہے۔یہاں اس سے بڑھ کر یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ملکتِ مدینہ کے بعد دوقومی نظریے کا سوال پہلی مرتبہ تحریک حصولِ پاکستان کے دوران عملی حقیقت بن کر سامنے آیا اور اس اعتبار سے یہ ایک اصول قدیم کی بازیافت کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۲۰۰)

پاکستان کیلئے ہجرت کے بارے میں منیر نیازی کا ایک شعر ہے۔جو اس کی عملی تائید ہے۔

تو بھی ہے ہجرت کدۂ شہر مدینہ کی طرح
ہم نے بھی دہرائی ہے اک رسم آباء کی طرح

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک کا عرصہ جہاں آل انڈیا مسلم لیگ قائداعظمؒ کی زیر قیادت مسلم قوم ایک علیحدہ مسلم مملکت کے حصول کو اپنا نصب العین بنا کر آگے بڑھتی ہے وہاں انڈین نیشنل کانگریس اور گاندھی اپنے پورے داؤ پیچ آزمانے کیلئے میدان سیاست کو مارنے کے جتن کرتے نظر آتے ہیں۔جب سے مسلم لیگ نے تقسیم ہند اور حصول پاکستان کو اپنی منزل بنایا' کانگریس نے خود ہندوؤں کی صفیں دوسطح پر ہموار کرنا اور تیار کرنا شروع کر دیں۔۱۹۳۷ء کے انتخابات اور پھر صوبائی وزارتوں کا تین برسوں کا کام وہ عملی تجربہ تھا جس کے تحت کانگریس کے آنگن میں اقتدار اور ہندوستان بھر کا اقتدار ایک خمار کی صورت چھا گیا۔مسلمانوں کی صفیں ٹیڑھی کرنے کی خاطر' کانگریس نے مولانا ابوالکلام آزاد کو حسب سابق استعمال کیا اور وہ سرحد کے سرخ پوشوں' پنجاب کے احرار' یو پی میں جمعیت علماء ہند بلکہ نیشنلسٹ نظریے کی مومن کانفرنس، لکھنؤ کے تعلقہ دار اور جاگیرداروں کی شیعہ پولیٹیکل پارٹی تک کو متحرک کرنے پر جت گئے۔وہاں صوبوں کی حد تک یو پی میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کو غتر بود کرنے کی ۱۹۳۷ء کی کاروائی اور پھر جمعیت علماء ہند کے حافظ ابراہیم اور ان کے عزیز مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی' مولانا حسین احمد مدنی کانگریس کی طرف لے آئے، وہاں پنجاب میں یونینسٹیوں اور اپنی کانگریسی قیادت سے بعض اہل حدیث علماء خصوصاً مولانا داؤد غزنویؒ کے ذریعے مسلم اکثریت کے صوبے پنجاب میں بھی اپنے علم الکلام کے جوہر دکھائے۔ ۱۹۴۲ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے ۸ اگست کو انگریزوں سے اقتدار چھیننے کیلئے ''ہندوستان چھوڑ دو اندولن'' شروع کر دیا۔یہ تحریک کن حالات اور ان مقاصد کیلئے تھی۔

ہندوستان چھوڑ دو تحریک ۱۹۴۲ء۔۔۔Quit India Movement

آغاز ۸ اگست کو کرانتی میدان بمبئی سے کیا۔ ایک طرف کانگریس انگریز سے اقتدار لینے کیلئے دباؤ ہی نہیں ڈال رہی بلکہ انگریز حکمرانوں کو پوری طرح بلیک میل کرتی نظر آتی ہے۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں انگریزی زبان اور قائداعظمؒ کے فرمان سے مدد لیں تو۔

"Quit India movement was an attempt to bargain by pressure."

کے الفاظ موزوں لگتے ہیں۔

یہی وہ عملی نمونہ تھا انڈین نیشنل کانگریس کا کہ وہ ہندوستان کا اقتدار ہتھیانے کیلئے تشدد ہڑتال، ریلوے کا بلائکٹ سفر دھرنے تک کے حربوں پر اتر آتی ہے۔ وجہ بد یہی تھی کہ گاندھی نے یہ تاثر لیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں تھکن اور کمزوری کے باعث یہ وہ صحیح صورتحال ہے جس سے انگریزوں سے ہندوستان کا اقتدار ہتھیانے کیلئے ہتھیار تک اٹھائے جاسکتے ہیں' یعنی گاندھی نے انگریزوں کو لندن میں ''محصور'' اور ہندوستان میں مجبور'' حالات میں پاکر اسے ہندوستان کی حکمرانی سے ''معذور'' جان کر بھگانے کی شروعات کیں۔ یہاں تک کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی' کے تحت اپنے سمدھی راجہ راج گوپال اچاریہ کو دوسرے محاذ پر لگایا کہ بالواسطہ طور پر اور وقتی طور پر ''پاکستان بھی قبول ہے'' کا فارمولہ لئے وہ بمبئی ہوائی اڈے پر کیا اترا کہ کانگریسی کارکنوں نے گندے انڈوں اور ٹماٹروں سے اس کا استقبال کیا۔ آغا خان' پیلس، پونا میں نظر بند گاندھی کی مشاورت ہی کیا خود اسکے اشارے پر یہ تمام ''راجہ جی فارمولا'' تیار ہوا تھا' جو راج گوپال اچاریہ کو اس بظاہر کانگریس مخالف فارمولا پر کانگریس کمیٹی تک سے نکال باہر کیا گیا تاکہ کانگریسی کارکن بھی مطمئن رہیں' اور اگر پاکستان بن جائے تو ذہن اس کے لئے بھی تیار رہیں۔ جس کا کام اس کو ساجے کا ہندو ذہن دیکھنا ہو تو ایسے کہ ہندوستان کا مکمل قبضہ و اقتدار لینے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رخصتی پر پہلے ہندوستانی گورنر جنرل یہی راجہ جی راج گوپال اچاریہ ہی ہوتے ہیں۔ جو گاندھی ہی کے سمدھی اور کانگریس کے ۱۹۳۷ء۔۱۹۳۹ء میں مدارس کے وزیر اعلیٰ بھی تھے، بلکہ تاریخ میں راجہ جی' فارمولا کے محرک اور حوالہ بھی یہی راجہ جی بنے ہوئے ہیں۔

دوسری طرف اسی گاندھی نے ۱۹۳۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے منتخب صدر بنگالی لیڈر 'نیتا جی سبھاش چندر بوس کے خلاف راج کوٹ میں بھوک ہڑتال کر ڈالی' کانگریس وزارتوں کے دورانیہ میں آتشی مزاج کا بنگالی بابو صدر کانگریس کے طور پر موزوں طبیعت نہیں تھا اس لئے جواہر لعل نہرو کی دھیمی طبیعت کو اس مرحلہ سیاست وحکومت میں موزوں جان کر صدر کانگریس بنایا گیا۔ اب دوسری عالمی جنگ میں جاپان جنوب مشرقی بھارت میں میگھالے اور شیلانگ ہی کیا مغربی بنگال میں کلکتہ تک بمباری کر گیا' گویا برطانیہ کو جاپان کی مار پڑنے ہی کو تھی کہ سوبھاش چندر بوس، انڈین نیشنل آرمی بنا کر، جاپان اور جرمنی کی امداد لئے بھارت کو آزاد کرانے کیلئے ہتھیار اٹھا کر انگریز حکمرانوں اور خاندانوں کو تشدد سے بھگانے پر اتر آیا۔ اس

فوج میں مسلمان کرنل شاہنواز، سکھ جنرل ڈھلوں، اور ہندو کرنل سہگل تو بڑے نامور لوگ تھے۔ یہ ۱۹۴۵ء کی آزاد ہند فوج اور اس کے نیتاجی سوبھاش چندر بوس جو شروع ہی سے تشدد پسند تھے' کانگریس کا عسکری بازو ثابت ہوئے۔ یعنی آزاد ہند فوج! آئی' این' اے! کانگرس کی عسکری طاقت نام ہے۔

۱۹۴۲ء کو ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے بعد ۱۹۴۵ء میں آزاد ہند فوج کا عمداً بندوق کی نالی پر ہندوستان کا اقتدار انگریزوں سے چھیننے کا مسلح حربہ کوئی وقتی اور عصری مرحلہ نہ تھا بلکہ کانگریس کے منظم منصوبے کا سیاسی زاویہ تھا، عسکری حربہ تھا یہاں تک کہ عدم تشدد کی نام لیوا کانگریس کا صدر اور گاندھی پر چارک' جواہر لعل نہرو' اپنی زندگی میں پہلی دفعہ وکالت کا گاؤن پہن کر لال قلعہ دہلی میں آزاد ہند فوج کے باغی نوجوانوں کے خلاف مقدمہ قتل کی پیروی کیلئے پیش ہو گیا۔ یہی وہ سیاسی اور عوامی حیلہ تھا کہ جس نے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں انڈین نیشنل کانگریس کو ہندو عوام میں زیادہ کام نہ کرنا پڑا اور آزاد ہند فوج کی عوامی ہمدردی کانگریس کی فتح کا باعث بن گئی۔ یہاں تک کہ انتخابات کے بعد یہ اسی پر تشدد ''آزاد فوج'' نے مسلمانوں کے پنجاب اور دہلی کے قتل عام میں منظم اور مربوط طریقے سے کام سرانجام دیا جسکی تصدیق مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی ہیں۔

۱۹۴۵ء میں شملہ مذاکرات کا مرحلہ آیا تو مولانا ابوالکلام آزاد کو صدر کانگریس کے طور پر قائداعظمؒ کے سامنے لا بٹھایا گیا۔ یہی تاریخی مرحلہ تھا جہاں قائداعظمؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا' بلکہ کانفرنس کے دوران اپنے سامنے رکھے کاغذات پر ابوالکلام کی تقریر کے دوران (Show Boy) کے الفاظ انگلیوں سے لکھتے رہے۔ جب اس نے ہاتھ ملانا چاہا تو قائداعظمؒ نے مسلمانان برعظیم کے ملی جذبات کا وہ ایمانی مظاہرہ کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کیلئے کانگریس کا فرد نمائش یا نمائشی گڈا (Show Boy) تاریخ اور سیاست کا اچھوتا عنوان بن گیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وقت نے اس لفظ کو مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا تاریخی تعارف بنا دیا۔ اب تک اس مرحلہ پر بھی قائداعظم جو کبھی لڑائی لڑتے نظر آتے ہیں۔ وہ مسلم قوم اور مسلم مملکت پاکستان کیلئے تقسیم ہند کے داعی بن کر انگریز حکمران' ہندو کانگریس اور اس کے نمائشی پردھان (صدر) مولانا ابوالکلام آزاد، یہاں تک کہ ادھر مسلم اکثریتی صوبوں میں برسر اقتدار اور روایتی جاگیردار' عوام دشمن ٹوڈی حکمرانوں سے بھی نبرد آزما نظر آتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء میں کابینہ مشن ہندوستان آن پہنچا۔ کم و بیش ۳ ماہ وہ ہندوستان میں رہا اور اس نے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے ملاقاتیں کیں۔ ایک واقعاتی شہادت' قدرت اللہ شہاب سے ہے۔ قدرت اللہ شہاب اپنی خودنوشت' شہاب نامہ میں رقمطراز ہیں کہ

''جب سے لاہور میں ۱۹۴۰ء کا پاکستان کا ریزولیشن منظور ہوا تھا اسی وقت گاندھی جی لنگر لنگوٹ کس کر اسے ناکام بنانے کے لئے میدان عمل میں اتر آئے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب برطانیہ کو جرمنی اور جاپان کے ہاتھوں چاروں طرح سے شکست پر شکست نصیب ہو رہی تھی تو انہوں نے ایک منجھے ہوئے جواری کیطرح حالات کو آنک تول کر اپنا پانسہ پھینکا۔ اور

مسلمانوں کو اعتماد میں لئے بغیر ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' کا کھڑاک کھڑا کر دیا۔ جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر انگریز واقعی چلے جائیں تو ہندوستان کس کے حوالے کر جائیں؟ تو گاندھی کے چلے چانٹوں کا جواب بڑا جازم اور غیر مبہم ہوتا تھا۔

"To god or Anarchy" طوائف الملوکی کی صورت میں بوبارہ اکثریت ہی کی تھی، کہ برصغیر میں ہندو قوم کی اکثریت تھی۔''(۲۰۱)

انارکی اور طوائف الملوکی محض الفاظ نہیں تھے بلکہ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا سارا منظر ہی تشدد، طوائف الملوکی کا سامان لئے ہوئے تھا۔ حکومت نے اس تحریک پر ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دیکر اس کے بڑے لیڈروں کو احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ البتہ گاندھی کے ساتھ یہ رعایت کی گئی کہ انہیں پونا میں آغا خان پیلس میں نظر بند کر دیا اور ان کی کبرسنی کی بنا پر ان کی دھرم پتنی (بیوی) کستورا بائی کو ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی۔ اب ذرا کانگرس کے جوہر کھلتے ہیں۔ پروفیسر محمد اسلم بتاتے ہیں کہ:

''کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دینے اور کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد کانگریسیوں نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ یوپی کے مشرقی اضلاع غازی پور، اعظم گڑھ، جونپور، بنارس اور الٰہ آباد میں باقی علاقوں کی نسبت زیادہ تشدد کے مظاہرے ہوئے۔ کانگریسیوں نے ستیہ گرہ اور اہنسا کے دیوتا گاندھی کے ایماء پر ریلوے لائنیں اکھاڑ دیں۔ پلوں کو شدید نقصان پہنچایا، ریلوے اسٹیشن جلا دیئے اور سگنل کا نظام تباہ کر دیا۔ عدم تشدد کی پرچارک کانگریس کے تشدد پسند کارکنوں نے بنک اور ڈاکخانے لوٹے اور جلائے، ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کا نظام معطل کر دیا۔ بجلی کے کھمبے اکھاڑ ڈالے، ہوائی اڈوں کو بھی نقصان پہنچانے سے گریز نہ کیا۔ برسات کا موسم تھا، ریلوے لائین بند ہو جانے سے عوام کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ ایک کانگریسی کارکن مولانا مفتی ظفر الدین مفتاحی، مفتی اعظم دیوبند نے ماہنامہ ''برہان'' دہلی میں بڑے فخریہ پیرائے میں روئیداد قلمبند کی ہے۔ حالانکہ وہ خود سینکڑوں میل پیدل چل کر گرتے ہوئے بھوکے پیاسے اور گرفتاری کے خوف سے چھپتے چھپاتے مسجدوں میں راتیں بسر کرتے ہوئے اپنے وطن پہنچے تھے۔''(۲۰۲)

پروفیسر محمد اسلم ہی رقمطراز ہیں کہ:

تحریک چلانے کیلئے وقت کا انتخاب

''اس زمانے میں عالمی جنگ ایک نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، جاپانی افواج بڑی برق رفتاری کے ساتھ انڈونیشیا، جزائر انڈیمان ونکوبار، ملایا، سنگاپور اور برما پر قبضہ کرتی ہوئی آسام میں داخل ہو چکی تھیں۔ آسام کے علاقوں منی پور اور امپھال پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا جاپان کی فضائیہ نے کلکتہ پر بمباری کر کے وہاں ہلچل مچا دی، گاندھی جی اور ان کے رفقاء کا یہ خیال تھا کہ اس بار برطانیہ کو فیصلہ کن شکست ہوگی اور وہ ہندوستان خالی کر کے بھاگ جائیں گے۔ جاپانی افواج کے آسام میں داخلے سے گاندھی جی کو اپنی امید بر آتی نظر آنے لگی اور وہ لنگوٹ کس کر سیاسی اکھاڑے میں اترے۔ انہوں نے

ہندوستان چھوڑ دو تحریک کو کھلی بغاوت سے تعبیر کیا۔'' (۲۰۳)

گاندھی سیاست کا زاویہ معکوس

قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں ''مگر ڈیڑھ دو برس بعد جب جنگ عظیم کا پانسہ پلٹنا شروع ہوا اور برطانیہ کا پلہ بھاری دکھائی دینے لگا تو گاندھی جی نے بھی پینترا بدلا۔ جس وقت برطانیہ شکست پر شکست کھا رہا تھا' گاندھی جنگ کے بائیکاٹ کا پرچار اس اصول کی بنا پر کر رہے تھے کہ جنگ وجدال اہنسا پرم دھرم کے منافی ہے۔ لیکن لڑائی کا نقشہ بدلتے ہی اہنسا کا اصول بھی موم کے ناک کی طرح مڑ گیا۔ اب گاندھی جی نے برٹش حکومت کو یہ پیش کش کی کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر کے اقتدار فوراً منتقل کر دیا جائے تو جنگ کے ہر شعبے میں برطانیہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا جائے گا۔'' (۲۰۴)

قدرت اللہ شہاب مزید لکھتے ہیں کہ:

''جنگ عظیم دوم بند ہو گئی۔ جنگ ختم ہوتے ہی انگلستان میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ اس پارٹی کے ساتھ کانگریس کے گہرے تعلقات تھے۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر گاندھی جی نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔ اب انہوں نے برملا یہ رٹ لگانی شروع کر دی کہ انگریزوں کے بعد ہندوستان میں بھی اقتدار کی وارث صرف آل انڈیا کانگریس ہے۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے اقتدار حاصل کرنے کے لئے کانگریس خود اس سے نپٹ لے گی۔'' (۲۰۵)

پاکستان کا مطالبہ اور کانگریسی مسلمان

پاکستان کے نصب العین کا حقیقی جائزہ احرار کے معروف رہنما آغا شورش کاشمیری کے قلم سے ہے وہ لکھتے ہیں کہ

''ہندوؤں کا مجلسی نظام' معاشی دستبرد اور تعلیمی برتری کچھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کو مشخص کرنے کا سوال پیدا ہوتا' تو ہندو' متحدہ قومیت کی آڑ لیتے' حقوق یا سلوک کا مرحلہ آتا تو آنکھیں پھیر لیتے۔ گویا مسلمانوں کا ہندوستان پر کوئی حق نہیں۔ جناح نے سیاسیات میں ہندو ذہنیت کی تلخیاں چکھی تھیں۔ مسلمانوں کی پس ماندگی کا انہیں احساس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس پسماندگی کو اب تک مسلمانوں کے رجعتی عناصر نے اپنی موت ٹالنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اس ہتھیار کو حکومت' کانگریس اور رجعتی مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح چھینا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ جداگانہ انتخاب کی شناخت کرنے کے بعد پاکستان کا نصب العین ہو گیا اور جناح اس استقلال کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹ گئے کہ انہیں ڈرانا یا جھکانا ناممکن ہو گیا۔'' (۲۰۶)

یہاں تک کہ شورش ہی کا کہنا ہے کہ:

''مسلم لیگ سے باہر مسلمانوں کی جتنی جماعتیں تھیں' قائداعظم نے انہیں لیگ میں شامل ہونے

کیلئے کہا' نیشنلسٹ مسلمانوں کی طاقت کو عملاً کمزور کردیا''۔(۲۰۷)

بلکہ انہوں نے بڑی دیانت داری سے پنجاب میں خود احرار کے بارے میں لکھا ہے:

''مسلم لیگ نے اوائل ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا نصب العین اختیار کیا' احرار اس سے متفق نہ تھے' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ احرار مسلمانوں میں سیاستاً کمزور ہوئے۔ تا آنکہ مسلمان ان سے برگشتہ ہو گئے۔''(۲۰۸)

لہٰذا جبکہ ہندوستان بھر میں نیشنلسٹ سیاسی قائدین اور کانگریس کے ہمنوا علماء دین تک پر شورش ہی کا تبصرہ قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پاکستان کے مطالبے نے کانگریس پر ہندو جماعت ہونے کی چھاپ لگا دی' نیشنلسٹ مسلمانوں کو متروکات سخن بنا دیا۔ جمعیت علماء' احرار' خاکسار' سب لیگ کے جلال کی تاب نہ لا کر ماند پڑ گئے۔ قائداعظمؒ نے مسلمان عوام کی عصبیت کو اتنا مضبوط کر دیا کہ ان کے سامنے ابوالکلام کا تبحر' حسین احمد کا تقویٰ' عطاء اللہ شاہ کی خطابت اور علامہ مشرقی کی عسکریت کا ٹھہرنا' ناممکن ہو گیا۔ ان سب کے چراغ گل ہو گئے۔ پاکستان کے مطالبے میں اتنا سحر تھا کہ قربانی و ایثار، جرأت و استقامت کا جادو بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ قائداعظمؒ نے ان سب کو ہرا دیا۔''(۲۰۹)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اسی ماحول اور منظر کی گواہی دیتے ہیں کہ:

''یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلم لیگ کانگریس کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک زبردست عوامی قوت کی حیثیت سے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ابھری۔ وطنی قومیت کا طلسم ٹوٹ گیا اور مسلمان اس فتنے سے بچ گئے اور ان میں یہ جذبہ شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ ہندوستان میں ان کی قومیت کے امتیازی وجود کو ایک آزاد اور مستقل حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ ایک پرجوش تحریک آگے بڑھ رہی تھی اور مسلمانوں کا قومی مقصد بتدریج ایک شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء میں وہ تقسیم ہند پر مرتکز ہو گیا۔ ابتداً اس تجویز میں پاکستان کا نام شامل نہ تھا مگر یہ نام پہلے سے عوام میں مقبول ہو رہا تھا۔ اس لئے آپ سے آپ زیر تجویز ملک پر یہی نام چسپاں ہو گیا۔ اور اس طرح یہ تحریک ''تحریک پاکستان'' بن گئی۔''(۲۱۰)

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مسلم لیگ کے لئے تائید وحمایت

دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اعلیٰ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۹۴۳ء) نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پٹنہ سیشن ۱۹۳۸ء میں باقاعدہ ایک وفد بھیج کر مسلم لیگ اور خاص طور پر قائداعظمؒ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ جس کی وجہ سے

جمعیت العلماء ہند کے دیوبندی گروہ کی کانگریسی سیاست کو زبردست دھچکا لگا' یہاں تک کہ انہیں قتل تک کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ پروفیسر محمد اسلم لکھتے ہیں کہ:

''حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ' (م ۱۹۴۳) حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ (م ۱۸۹۹ء) کے خلیفہ مجاز اور بیسوی صدی کے نصف اول کے عظیم روحانی پیشوا تھے۔ وہ سلسلہ چشتیہ صابریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں افراد کی روحانی تربیت فرمائی۔ موصوف نے مسلم لیگ کی کھل کر حمایت کی جس سے مسلم لیگ کا دینی حلقوں میں وقار بڑھ گیا۔ حکیم الامت اور اس کے خلفاء و مریدین نے قائداعظمؒ کا بھرپور ساتھ دیا اور بڑھ چڑھ کر تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ کانگریس کے زلہ ربا مولویوں نے انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی' لیکن ان پر بھلا ایسی گیڈر بھبھکیوں کا کیا اثر ہوسکتا تھا۔ حکیم الامتؒ نے ۱۹۲۸ء ہی میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی (م ۱۹۷۷ء) سے فرمایا تھا کہ برعظیم میں ''خالص دارالسلام'' قائم ہونا چاہیے۔'' (۲۱۱)

چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دارالعلوم دیوبند کے نامور اساتذہ کرام مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ جیسے اجل علماء نے تحریک پاکستان کی تائید وحمایت کے لئے ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں علماء کا ایک بڑا اجتماع منعقد کیا جس میں جمعیت العلمائے اسلام (پاکستان کی آجکل جمعیت علماء اسلام جو کانگریس کی ہمنوا ہے جمعیت علماءِ ہند کی وارث ہے) اس اجتماع کے سب سے بڑے محرک مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تھے۔

جمعیت علماء اسلام (حقیقی)

''جمعیت علماء اسلام کا قیام پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ علماء کی شرکت سے عام مسلمان جن پر علماء کا اثر رہتا ہے تحریک پاکستان کے ہمنوا بن گئے۔ نظریہ پاکستان زیادہ وضاحت سے منظر عام پر آیا اور ساتھ ہی علماء کی ایک بڑی تعداد کانگریس اور جمعیت علماء ہند سے کنارہ کش ہوکر مسلم لیگ اور جمعیت علماء اسلام سے وابستہ ہونے لگی۔ قوم پرست علماء کا اثر بڑی حد تک زائل ہوگیا' اور تحریک پاکستان کو خاص تقویت پہنچی۔'' (۲۱۲)

پروفیسر محمد اسلم نے دسمبر ۱۹۴۵ء کے مرکزی اسمبلی کے انتخابات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

انتخابات کے نتائج

''دسمبر ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کے مسلمانوں کی ۳۰ میں سے ۳۰ نشستیں حاصل کر کے سوفی صد کامیابی حاصل کر لی۔ اپنے مخالفین کی ضمانتیں تک ضبط کرادیں۔ مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۹۴ء کو

ہمارے اخبارات میں جمعیت العلماء ہند کی پاکستان میں صحیح جانشین جمعیت العلماء اسلام کے ایک رہنما مولوی فضل الرحمٰن کا بیان شائع ہوا ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی دوسری تمام جماعتیں قیام پاکستان کے خلاف تھیں۔ اس سے قبل مولوی فضل الرحمٰن کے والد مفتی محمود (م ۱۹۸۰ء) کا ایک بیان اخبارات میں چھپا تھا جس میں مفتی محمود صاحب نے یہ کہا تھا: ''خدا کا شکر ہے کہ وہ پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔''

دسمبر ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی سو فیصد کامیابی اجماع امت کا درجہ رکھتی تھی اور ان انتخابات میں مفتی محمود والد مولانا فضل الرحمٰن کی جماعت کے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئی تھیں اور قیام پاکستان کی مخالف کوئی بھی جماعت اپنا ایک بھی امیدوار مرکزی اسمبلی میں بھجوانے میں ناکام رہی تھی۔ ان انتخابات نے مسلم لیگ کے اس دعوے کی تصدیق کردی کہ یہی مسلمانوں کی واحد جماعت ہے اور پاکستان مسلمانوں کا واحد مطمع نظر ہے۔ عوام نے ان انتخابات میں مسلم لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو مسترد کردیا۔'' (۲۱۳)

کابینہ مشن ۱۹۴۶ء

حالانکہ اس صورتحال کے ذرا ایک سال بعد وزارتی مشن کے احوال میں دیکھیں تو کانگریس کے ہمنوا' علماء کا لب ولہجہ' مولانا مفتی محمود اور ان کے سیاسی جانشین مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علماء ہند یہاں یکجا اور یکجان نظر آئے گی' بلکہ وہ جماعتیں بھی بے نقاب ہوگئیں جنہوں نے پاکستان کے خلاف اپنے شرعی جبہ ودستار کے باوصف' سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دکھانے کا کام کیا۔ وزارتی مشن مارچ ۱۹۴۶ء کے اوائل میں ہندوستان آیا اور سچ یہ ہے کہ اس وفد کی آمد ہی آزادی ہند کا سرعنوان تھا کہ برطانیہ اب آزادی کا اعتراف کررہا تھا۔

قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ:

''کیبنٹ مشن ہندوستان میں تین ماہ کے قریب رہا اس عرصے کی داستان انگریزوں اور ہندوؤں کی سیاسی چیرہ دستیوں' منافقتوں' ریاکاریوں' دغابازیوں' فریب کاریوں کی عجیب وغریب بھول بھلیاں ہیں۔ کانگریس نے اپنا دام تزویر قدم قدم پر بچھا رکھا تھا۔ برٹش حکومت کے نمائندے مسلم لیگ کو گھیر کر اسے اس میں پھنسانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کررہے تھے۔ قائداعظمؒ نے ان سب کا مقابلہ بڑی بے لاگ راست بازی اور ثابت قدمی سے کیا۔'' (۲۱۴)

برعظیم میں مسلمانوں کا قتل عام۔۔۔ہندو کانگریس بے نقاب ہوگئی

۱۹۴۶ء کے اوائل میں برطانوی حکومت نے ایک تین رکنی وزارتی مشن ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا جائزہ لینے اور ملک کے مختلف طبقات کی نمائندہ تنظیموں سے بات چیت کیلئے ہندوستان بھیجا۔ وفد نے تین ماہ تک کم وبیش ملک کی تمام

سیاسی جماعتوں خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ اور اس کے زعماء سے ملاقاتیں کیں اور ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر تبادلہ خیالات جاری رکھا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کا متحدہ محاذ خواہاں تھا کہ وزارتی مشن سے ان کی ملاقات ہو۔ آغا شورش کاشمیری کی روایت کے مطابق:۔

''چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر مولانا حسین احمد مدنی' صدر جمعیت العلماء ہند، شیخ حسام الدین صدر مجلس احرار اسلام' شیخ ظہیر الدین (صدر مومن کانفرنس) اور خواجہ عبدالمجید' صدر مسلم مجلس کا چار رکنی وفد ۲۶ اپریل کو مشن سے ملا۔ اس ملاقات میں لارڈ پیتھک لارنس غیر حاضر تھے۔ لارڈ ویول اثنائے گفتگو میں اٹھ کے چلے گئے۔ سر کرپس کے استفسار پر ارکان وفد نے اپنا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا۔ مولانا مدنی علیہ الرحمۃ کی ترجمانی کے فرائض حافظ ابراہیم نے انجام دیئے۔ مولانا سے کرپس نے سوال کیا آپ کی جماعت کے متبعین کی تعداد کتنی ہے؟

مولانا نے فرمایا ''دو کروڑ''۔

شیخ ظہیر الدین نے کہا کہ وہ انصار کے رہنما ہیں ان کی تعداد ساڑھے تین کروڑ ہے۔

خواجہ عبدالمجید نے دو کروڑ کے لگ بھگ اپنے ہم خیالوں کی تعداد بتائی۔

شیخ حسام الدین نے کہا احرار نے پنجاب میں پچیس فیصد ووٹ حاصل کیے ہیں اور گلہ کیا کہ آج تک انہیں اپنا اخبار نکالنے کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ کرپس نے تعجب کا اظہار کیا اور روزنامہ آزاد اس استعجاب ہی کا نتیجہ تھا۔ کرپس نے شیخ صاحب سے پوچھا آپ کے پیروکار کتنے ہونگے۔

شیخ صاحب نے کہا ''پچاس لاکھ''

کرپس مسکرائے' کہنے لگے آپ لوگوں نے اپنے اپنے پیروکاروں کی جو تعداد بتائی ہے وہ مل جل کر آٹھ کروڑ بنتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مسٹر جناح کس خطے کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ بہرحال اس ملاقات کا ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ روزنامہ آزاد کا ڈیکلریشن مل گیا۔ زمانہ ایسا تھا کہ جنگ کی وجہ سے کوئی نیا اخبار مرکزی کی حکومت کی اجازت کے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔ نیوز پرنٹ کنٹرول تھا۔ اور اس کا پرمٹ مرکزی حکومت کے پرمٹ سے جاری ہوتا تھا۔

شیخ حسام الدین صاحب اور شیخ ظہیر الدین صاحب کے درمیان کچھ دنوں تک انگریزی استعداد کے متعلق لطیفہ بازی رہی۔ شیخ حسام الدین کہتے آپ کا لہجہ اس طرح تھا گویا کرگا چل رہا تھا۔ شیخ ظہیر الدین کہتے آپ نے انگریزی کوئی صرف ونحو مہیا کی۔ جس سے کرپس کی اصلاح ہوگئی ہے۔'' (۲۱۵)

برعظیم پاک وہند میں انگریزوں کی آمد اور اس مرحلہ واپسی تک کم وبیش ۱۹۰ برس ہوتے ہیں۔ سر سید احمد خانؒ سے لیکر آغا خان تک کے مسلم رہنماؤں کو شرعی بت خانے سے اس قدر کاسہ لیساں فرنگ کا طعنہ عطا ہوا ہے کہ ملت فروشی تک کے الزامات بھی ان رہنماؤں کیلیئے روا رکھے گئے۔ مگر جب برعظیم کے مسلمانوں کے تشخص کا مرحلہ تاریخ بن رہا تھا تو شریعت

مآب رہنماؤں کی ایک نمایاں کھیپ کانگریسی آنگن میں رسوئی (باروچی خانہ ہندو جہاں کسی غیر ہندو کو جانے نہیں دیتے) سے دوررہ کر بھی متحدہ قومیت کی آڑ میں ہندو کا شکار بنی۔ وہ برعظیم کی ملت اسلامیہ کے مستقبل کا گلہ گھونٹنے کا جس طرح کا متحدہ محاذ بنا کر وزارتی مشن سے گفتگو کرتی نظر آتی ہے اس کے بعد یہ تبصرہ خود تاریخ سے مذاق ہوگا۔ اس کینڈے (Calibre) کے لوگ اگر قوموں کی امامت اور رہنمائی کے منصب پر فائز ہوں تو قوموں کا حشر کیا ہوتا ہے۔ کانگریس پورے ہندوستان اوراس کے باشندوں کی اکثریت کی دعویٰ دار بن کر انگریزوں سے برعظیم کا اقتدار نہیں گویا چارج لینے کے درپے تھی۔ مسلمانوں کی برعظیم میں قومی شناخت اور تشخص کے مسئلے پر وہ متحدہ قومیت کی آڑ لیتی تھی۔ جس کے لئے چند چہرۂ تقویٰ وتدین کے مہرے ثابت ہوئے۔ یہ صرف وزارتی مشن سے ملاقات ہی نہ تھی' بلکہ یہی باور کرانے کی بالواسطہ کوشش تھی جس کا موثر جواب کرپس کی ذہانت ہے کہ اس نے مسٹر جناح کے بارے مس بالآخر جملہ کس مارا کہ ''اگر آٹھ کروڑ مسلمانوں (تب برعظیم کے مسلمانوں کی تعداد لگ بھگ اتنی ہی تھی) کے نمائندے آپ لوگ ہیں تو مسٹر جناح کس خطے کے مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں؟ بلاشبہ یہ نیشنلسٹ رہنما اور علماء مسلمان ضرور تھے بلکہ متقی اور پرہیز گار اور عبادت گزار سب کچھ تھے مگر مسلمانوں کے نمائندے ہرگز نہ تھے۔ یہی واقعات' حالات اور انتخابات تک نے ثابت کر دکھایا کہ پاکستان کا مطالبہ اور دوقومی نظریہ کی منزل جو بعید کہاں قریب آ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی مسلم لیگ کی صوبائی اسمبلی پارٹیوں کا ایک اجلاس ان ہی دنوں دہلی عربک کالج میں ہوا جس میں پاکستان کیلئے بڑی زوردار تقاریر کی گئی۔ اسی اجلاس میں مسٹر فیروز خان نون نے کہہ دیا اگر پاکستان نہ بنا تو ہم چنگیز اور ہلاکو بن جائیں گے۔ یہ تو معروضی صورتحال تھی جس میں برعظیم اپنی سیاسی تقدیر کے حتمی مرحلہ پر کھڑا اپنا فیصلہ سنانے کیلئے لب کشاں ہونے کو تھا۔ مگر متحدہ قومیت کا دام ہمرنگ زمین بدستور کانگریس سیاست کی شرعی بیساکھیاں تھیں۔ کرپس سے ملاقات کے بعد وزارتی مشن کو مزید متاثر کرنے کیلئے دہلی کے آزاد پارک میں مجلس احرار اسلام نے عام جلسہ کا انعقاد کر ڈالا۔ جس میں نامور خطیب اور مجلس احرار اسلام کے رہنما عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے خطاب کیا جن کے بارے میں گاندھی نے کہا تھا کہ:

> ''تالیاں پیٹنے والے مسلمان ان (عطاء اللہ شاہ بخاری) کے ساتھ ہیں اور ووٹ دینے والے قائداعظمؒ کے ساتھ۔'' (۲۱۶)

شورش لکھتے ہیں کہ ''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے طور پر گاندھی جی، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی دعوت دے آئے۔ مہاتما اور مولانا کہاں آتے؟ جواہر لعل اپنی بیٹی اندرا کو لے کر آئے۔ اور اپنے ساتھ کرپس کو بھی لے آئے تا کہ وہ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیں۔ کرپس تو مجمع پر نگاہ ڈال کر واپس چلے گئے' لیکن نہرو ایک کونے میں کھڑے ہجوم اور اس کا تاثر دیکھنے لگے۔ شاہ جی کو پتہ چلا تو پنڈت جی کو سٹیج پر بلا لیا۔ عوام نے نعرہ ہائے تحسین سے خیر مقدم کیا۔ پنڈت جی نے حاضرین کے اصرار پر چند کلمات کہے اور وہ بھی فیروز خان نون کے جواب میں:

''افسوس اس قوم کے فرزند چنگیز اور ہلاکو کا نام لیتے ہیں
جن کی تاریخ میں عمر فاروقؓ جیسے حکمران گزرے ہیں۔''

مجمع پھڑک اٹھا۔ جواہر لعل چند الفاظ کہہ کر چلے گئے' واہ واہ بھی خوب ہوئی' لیکن فضا میں ہلاکو' چنگیز اور شیوا جی اور بندہ بیراگی پھڑک رہے تھے۔''(۲۱۷)

آغا شورش کا اشارہ دہلی اور ان کے نواح میں ہندو مسلم فسادات کیلئے تنی ہوئی فضا سے تھا۔ جس میں سکھ اور ہندو ریاستوں سے مسلح غنڈے دہلی راجدھانی پر دھاوا بولنے کو تھے۔ یہ حالات کا وہ آئینہ تھا جس میں متحدہ قومیت کے پرفریب جال میں دھنسے اور پھنسے نیشنلسٹ رہنما اور علماء ہند' ہندو قوم کی سان پر کسی مسلم قوم سے گریزاں ہی نہیں ان کے خلاف متحدہ محاذ بنائے پھرتے تھے۔ اور حالات نے بھی ثابت کیا کہ کوتاہ فکر' یہ شرعی بزرگ ہندو کانگرس کی سیاست وفراست کی الف۔ ب تک سے ناآشنا تھے۔ شورش کاشمیری ہی کی روایت ہے کہ ''ان حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لارڈ ویول وائسرے ہند نے پنڈت نہرو سے کہا کہ ملک میں سول وار چھڑ جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔''

پنڈت نہرو نے جواب دیا۔''سول وار کا اندیشہ محض اندیشہ ہے جس چیز کو آپ سول وار کہتے ہیں اس سے ہندوستان ابھی آشنا نہیں' زیادہ سے زیادہ یہاں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات ہونگے' ملک کا مزاج جس سطح پر آ گیا ہے اس کے پیش نظر ایسا ہونا ناگزیر سمجھنا چاہئے۔''

لارڈ ویول کا خیال تھا کہ مسلمان جسمانی طور پر ہندوؤں سے مضبوط ہیں۔ پنڈت نہرو کا خیال تھا۔

''مسلمان اپنے تمام خصائص کے باوجود انقلابی نہیں رہا۔ اس کی رجعتی لیڈر شپ نے اس کو من حیث الکل کوتاہ فکر اور کوتاہ ہمت کر دیا ہے۔ اس کے برعکس ہندو انقلابی لیڈر شپ کی وجہ سے تنظیما بہت آگے نکل چکے ہیں۔ جہاں کہیں فساد ہوا۔ چند ایک مستثنیٰ صورتوں کے سوا علاقائی اکثریت ہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔''

یہ تمام باتیں پنڈت نہرو کی زبانی میر احمد حسین شملوی کے مکان پر معلوم ہوئیں۔''(۲۱۸)

متحدہ قومیت کا فریب کھلتا ہے، ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے

''وزراتی مشن رخصت ہوا' تو فسادات کا لاوا پک چکا تھا۔ لیگ اور کانگریس دونوں عبوری حکومت میں شریک تھیں۔ لیکن دونوں کی آستینوں میں خنجر تھے یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہندو ذمہ دار تھے یا مسلمان، آخر ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔''

گویا دن گنے جاتے تھے اس دن کیلئے۔ کلکتہ پہلا شہر تھا جہاں زندہ مسلمانوں کو آگ میں بھونا گیا اور سرانڈ دیتی ہوئی لاشوں نے پکار پکار کر کہا:

تو نیز بر سر عام آ کہ خوش تماشائیت

کلکتہ کا ردعمل نواکھالی میں ہوا۔ نواکھالی کا ردعمل پٹنہ (بہار) میں سامنے آیا۔" (۲۱۹)

آغا شورش لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزادؒ کے کہنے پر میں احرار کا ایک ریلیف وفد لیکر پٹنہ گیا۔ کانگریسی وزیراعلیٰ شری کرشنا سنہا سے کھل کر باتیں ہوئیں۔ وہ مانتے تھے کہ بے رحمانہ قتل و خون ہوا ہے۔ مولانا آزادؒ سے ان کی ملاقات کا حوالہ دیا تو ذرا اور کھل گئے اور تسلیم کیا کہ اس خون خرابہ کی ذمہ داری ان کے وزارتی رفقاء پر ہے۔

یہ بات لیگ کے رہنماؤں نے کہی، فسادات میں ذمے دار وزیراعلیٰ سنہا کا ہاتھ نہیں بلکہ وزیر خزانہ انوگرا نارائن نے اس کا اہتمام کیا اور نیو اٹھائی۔ میں ابھی کرشنا سنہا وزیراعلیٰ سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ انوگرا نارائن بھی آ گیا۔ میں نے انوگرا سے کہا کہ:

"کیا مسلم لیگ کا یہ دعویٰ سچا ثابت نہیں ہو رہا کہ ہندو مسلمانوں کو ہندوستان سے مٹا دینا چاہتے ہیں اور کانگریس کی آزادی کے معنی مسلمانوں کی غلامی کے ہیں؟ بہار نے انگریزوں کے اس دعویٰ کو بھی سچا ثابت کیا ہے کہ وہ ہندوستان سے گئے تو خونریزی ہوگی۔"

انوگرہ نے کہا، جو کچھ ہوا ناگزیر تھا ہم اس کو ٹال ہی نہیں سکتے تھے۔ بہار بنگال کا پڑوسی ہے جب نواکھالی اور کلکتہ کے واقعات یہاں پہنچے تو یہ ایک قدرتی ردعمل تھا۔ میں نے کہا افسوسناک پہلو صرف اتنا ہے کہ لاکھوں انسانوں کے قتل عام پر آپ کا نظم و نسق مفلوج رہا۔

انوگرا نارائن، جو کچھ ہوا، اس کی خرابی تسلیم کرتے لیکن ساتھ ہی جواز پیش کرتے، ان کے استدلال سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ اس خون خرابہ کے محرک و مسئول ہیں۔ ان ملاقاتوں سے اگلے روز میں نے پٹنہ کے متاثرہ مضافات کا دورہ شروع کیا۔ بہار شریف گیا، چھپرا دیکھا۔ گیا پہنچا، بھاگل پور پھرا، سبھی علاقے یکساں انداز میں نشانۂ ستم ہوئے تھے۔ تمام برباد گاؤں ایک دوسرے سے مشابہ تھے، مثلاً ہم پٹنہ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں گئے، سارا گاؤں آباد و شاد نظر آیا، کھیت لہلہا رہے تھے، درخت سنتریوں کی طرح کھڑے تھے، پرندوں کی چہچہاہٹ سننے میں آ رہی تھی، کمسن بچے اڑے پھر رہے تھے، لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے، کنیائیں چوپال کے نزدیک زاویے بن رہی تھیں، سب کے چہرے ہشاش بشاش تھے، کسی کے چہرہ پر کسی صدمہ کا نشان تک نہ تھا کہ یہاں کوئی حادثہ ہوا ہے۔

شورش کاشمیریؒ کا ادبی شہ پارہ

"ہم ایک حویلی پر رک گئے۔ باہر سے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس پر کیا بیتی ہے؟ اندر قدم رکھا تو ویرانی ہی ویرانی تھی، تمام چوبی دروازے نکال دیئے گئے تھے، سامان لوٹ لیا گیا تھا، دیواروں پر لہو کی دھاریں تھیں، کپڑوں کو آگ لگا دی گئی تھی، معلوم ہوتا تھا، تماش بین ایک عفیفہ کو لوٹ کر اس کو ننگا کر گئے اور اس کے جسم پر زخموں کی چنت پڑی ہے، میں اس لرزہ خیز

حالت کو دیکھ کر سہم گیا' اور جب گاؤں کا مسلمان محلہ دیکھا تو میرے بند کا انگ انگ کانپ اٹھا' جنگ کی تباہ کاریوں کا نقشہ یاد آ گیا کہ فاتح قومیں کس طرح آبادیوں کو برباد کرتی ہیں' برقعوں میں دوڑتی ہوئی لڑکیوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے' پستانوں کا ڈھیر' انگلیوں کی پوریں' سروں کا انبار' منجمد چہروں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں' اوپلوں کی آگ سے جلی ہوئی لاشیں' کتابوں کی راکھ' ٹوٹے پھوٹے برتن' پھٹی ہوئی دیواریں' چھتوں کے بڑے بڑے شگاف' مکانوں سے شہتیر غائب' زنانے میں کنواں' اور کنوئیں میں تعفن' انسان کے گوشت کی سڑانڈ' ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا بجھا ہوا الاؤ' آگ کے ہاتھوں ساز و سامان پر کئی پھٹی عبارتیں' فضا میں نالہ کشیدہ اور ہوا میں آہ نارسیدہ' شقاوت' وبربریت' تعدی' استبداد' ہلاکت' بے رحمی' سنگدلی اور خونریزی کی منہ بولتی تصویریں' کیلوں سے ٹھکے ہوئے بچے' مقتول سہاگنوں کا لٹا پٹا سہاگ' مردہ چہروں پر خون آلود لٹیں' سورہ الّیل کا نالہ اضطراب بچوں کے پنجر' آنکھوں میں حیا کی آخری ہچکی کا انجماد' جان بچاتی ہوئی عصمتوں کے پیازی آنسو' اور آنسوؤں میں خون کی ملاوٹ' کٹے ہوئے کانوں میں ٹھیری ہوئی بالیاں اور ٹوٹے ہوئے ہاتھوں میں پٹی ہوئی تالیاں' یہ سب کچھ دیکھا تو میرے ہوش پراں ہو گئے۔ سیاست کا طوفان اس خوفناک حد تک چلا گیا تھا کہ خود خوف خدا تھرا رہا تھا' ہندو اس المیہ پر ہنستے اور مسلمان اس سانحہ پر روتے تھے۔'' (۲۲۰)

بہار کے وزیر اعلیٰ کرشنا سنہا بظاہر ذمہ دار تھے یا نہیں' یہ مسئلہ صرف پٹنہ یا صوبہ بہار کا تو تھا نہیں۔ قبل ازیں پنڈت جواہر لعل نہرو' لارڈ ویول سے سول وار کے اندیشہ پر گفتگو میں اس طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ مسئلہ ہندوستان کی سطح پر ایک منظم صورت میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ طے کیا جا چکا تھا۔ کیونکہ ہندو عوام اپنی انقلابی لیڈرشپ کے زیر اہتمام ''تنظیماً'' اس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ وہ علاقائی اکثریت کے باعث مسلمانوں کا پاکستان بنا کے رہے! اور ان کو یہاں سے مٹا کر رہیں گے۔

صاف بات یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے بقول ان ہندو' مسلم فسادات میں علاقائی اکثریت کا پلہ بھاری رہا۔ آغا شورش کاشمیری نے اپنے خوبصورت قلم سے ہندوؤں کی شقاوت قلبی کا نقشہ بڑی دلسوزی سے کھینچا ہے۔ مگر ان کے ہاں کانگریس کی مرکزی سطح پر قیادت کو مطعون کرنے کی بجائے صوبائی سطح پر فسادات کے ذمہ دار وزیروں پر انسانیت کا ماتم کرتے دیکھتے ہوئے یہ مزید باور آتا ہے کہ کانگریس کی مرکزی قیادت' گاندھی' نہرو' پٹیل یہاں تک کہ صوبہ بہار میں کانگریس کے مرکزی سطح کے معروف رہنما بابو راجندر پرشاد اور جے پرکاش نارائن تک بڑے قدر آور رہنما تھے۔ مگر سادہ دل نیشنلسٹ رہنماؤں کی طرح خود آغا شورش کاشمیری ان مرکزی رہنماؤں پر براہ راست خود بوجھ ڈالنے سے گریزاں ہیں۔ اس لئے کہ کانگریس کی مرکزی قیادت نے مولانا ابوالکلام آزاد سے بالا بالا اس قدر انتظام و انصرام کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کو ان کے اس مسلم دشمن منصوبے کی کانوں کان خبر تک نہ ہوئی یا بے خبر مولانا ابوالکلام آزاد کو کیوں کر خبر نہ ہوئی تھی حالانکہ کانگریس کی مرکزی کمیٹی کے اپنے صوبائی وزرائے اعلیٰ کے نام سرکلر نے اس سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ ان دنوں اڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری

مسٹر قدرت اللہ شہاب کو وزیر اعلیٰ کے نام ایک ایسی دستاویز ہاتھ لگی جو وہ نوکری اور جان کی پرواہ کئے بغیر قائد اعظمؒ تک دہلی لے اُڑے۔ اس روئیداد میں قائد اعظمؒ واقعتا قائد اعظمؒ نظر آتے ہیں۔ ذرا قدرت اللہ شہاب کی شہادت ملاحظہ فرمائیں۔

کانگرسی کمان کی سازش اور مسلمانوں کا قتل عام

''اڑیسہ کے چیف منسٹر شری ہری کرشن مہتاب کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ایک بار دہلی سے وہ کانگرس کی کسی میٹنگ سے واپس آئے تو اپنے معمول کے مطابق انہوں نے کاغذات کی کالی صندوقچی میرے حوالے کر دی۔ ہمارا طریق کار یہ تھا کہ سیاسی کاغذات چھانٹ کر میں ان کے پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری کے سپرد کر دیتا تھا اور سرکاری کاغذات متعلقہ محکموں کو بھیج دیتا تھا۔ ان کا پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری بڑا متعصب ہندو تھا۔ وہ اکثر اس بات پر سر پیٹتا تھا کہ مہتاب صاحب کے سیاسی کاغذات میرے ہاتھ سے کیوں گزرتے ہیں۔ چند بار اس نے چیف منسٹر کے پاس اس طریق کار کے خلاف بڑا سخت احتجاج بھی کیا' لیکن مہتاب صاحب نے کبھی سنجیدگی سے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ جب کبھی میں سیاسی نوعیت کے کاغذات کا پلندہ پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری کے حوالے کرتا تھا تو وہ ماتھے پر ہاتھ مار مار کر بڑی فوں فاں کرتا تھا۔ ''گجب ہو گیا۔ گجب ہو گیا۔ اپن نے تو سینت سینت کر ایک ایک لائیچ جرور پڑھ لیا ہوگا۔ اپن نے تو ایک ایک کاگج کی نقل بھی رکھ لی ہوگی۔ بڑے گجب کی بات ہے۔ مہتاب جی کی بدھی تو بالکل ماری گئی ہے۔ اس بار جو میں نے چیف منسٹر کے کاغذات کا جائزہ لیا' تو ان میں ایک عجیب دستاویز ہاتھ آئی۔ یہ چھ سات صفحات کا سائیکوسٹائلڈ انتہائی خفیہ حکم نامہ تھا' جو کانگریسی چیف منسٹروں کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ ہر چیف منسٹر اسے اپنی ذاتی تحویل میں رکھے۔ اس میں لکھا تھا کہ تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے۔ اس لئے جن صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہیں وہاں پر مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے۔ خاص طور پر ہوم ڈیپارٹمنٹ' فنانس ڈیپارٹمنٹ اور پریس ڈیپارٹمنٹ میں با اعتماد ہندو افسروں کو تعینات کیا جائے۔ ڈی۔ سی' آئی جی اور ایس پی عموماً ہندو ہوں۔ تھانوں کے انچارج بھی زیادہ سے زیادہ ہندو ہوں۔ محکمہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں مسلمانوں کو فیلڈ ورک سے ہٹا کر بے ضرر قسم کے دفتری کام کاج پر لگا دیا جائے اور پولیس کی نفری میں مسلمان سپاہیوں کو بتدریج غیر مسلح کر کے پولیس لائن اور تھانوں کے اندر معمولی فرائض پر مامور کیا جائے۔ جن صوبوں میں سرحدی مسلمانوں سے بھرتی شدہ ماؤنٹڈ ملٹری پولیس ہے اسے فوراً توڑ دیا جائے اور افسروں اور نفری کو اختتام ملازمت کی مناسب رقم یکمشت ادا کر کے رخصت کر دیا جائے' سرکاری خزانوں' اسلحہ خانوں اور محکمہ مال کے ریکارڈ آفسوں کی حفاظت کے لئے ہندو گارڈ تعینات کئے جائیں۔ اسلحہ رکھنے والے مسلمان لائسنس ہولڈرز کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جائے۔ ایسے ہنگامی منصوبے تیار رکھے جائیں جن کے تحت ان لائسنس داروں سے قلیل ترین نوٹس پر ہر قسم کا اسلحہ قریبی تھانے میں جمع کروایا جاسکے۔ کاروں' بسوں' ٹیکسیوں اور ٹرکوں کے مسلمان مالکوں کی فہرستیں بنا کر ان پر کڑی نظر رکھی جائے۔ مسلمان آتشبازوں کے لائسنس معطل کر دیئے جائیں' اور ان کا آتشگیر سٹاک فوری طور پر پولیس کی حفاظت میں لے لیا

جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیف منسٹر کو نہایت سخت تاکید کی گئی تھی کہ وہ ان ہدایات پر ایسی خوش اسلوبی سے عملدرآمد کرے کہ اس سے آبادی کے کسی فرقے کے خلاف کسی قسم کے امتیازی سلوک کا پہلو مترشح نہ ہو! بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کا اس سے بہتر ظہور چشم تصور میں لانا محال ہے۔ یہ حکم نامہ پڑھ کر مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔ مہاتما گاندھی کی نام نہاد بے تعصبی کی لنگوٹی باد مخالف کے جھونکوں میں اڑ کر دور جا پڑی' اور وہ اپنے اصلی رنگ وروغن میں بالکل برہنہ ہو گئے۔ اہنسا پرم دھرم کے اس جھوٹے پجاری کے اشاروں پر ناچنے والی انڈین نیشنل کانگریس کے عزائم مسلمانوں کے خلاف اتنے ہی خطرناک اور سنگین نکلے جتنے مہا سبھا یا راشٹر سیوک سنگ کے سمجھے جاتے تھے بلکہ کانگریس کے سازشانہ منصوبے دوسری فرقہ وارانہ جماعتوں سے بھی زیادہ پر خطر اور ہولناک تھے' کیونکہ ہندوستان کے کئی صوبوں میں کانگریس کی حکومت تھی' اور مرکز کی عبوری گورنمنٹ میں ۱۴ میں سے چھ کانگریسی اور دو مزید غیر مسلم وزیر تھے۔ فوج کا محکمہ سردار سر بلدیو سنگھ کے قبضے میں تھا اور سارے ہندوستان کی پولیس سی آئی ڈی ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کی مشین سردار ولبھ بھائی پٹیل کے متعصبانہ ہاتھوں میں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس اپنی قوت کے تمام وسائل مسلمانوں کا سر کچلنے کے لئے ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس ہو رہی تھی۔

یہ دستاویز پڑھ کر تھوڑی دیر میرے دل میں ایک عجب سی کشمکش ہوتی رہی۔ ڈپٹی ہوم سیکرٹری پیشہ وارانہ ضمیر میرے اندر چھپے ہوئے بے عمل' ناقص اور خوابیدہ سے مسلمان کے ضمیر کے ساتھ ٹکرا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تھوڑی سی لڑائی کے بعد جیت ٹوٹے پھوٹے مسلمان ہی کی ہوئی۔ چنانچہ میں نے یہ دستاویز اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی' اور اسی رات قائداعظمؒ سے ملاقات کرنے کی نیت سے دہلی روانہ ہو گیا۔ ان دنوں مسٹر کے' ایچ خورشید قائداعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اگر وہ دہلی میں موجود ہوتے تو غالباً مجھے قائداعظمؒ سے ملنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ لیکن وہ موجود نہ تھے۔ ایک دو روز کی تگ و دو' منت سماجت اور حیلے بہانوں کے بعد آخر بڑی مشکل سے مجھے قائداعظمؒ تک رسائی ہوئی۔ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ فارغ ہو کر ایک نظر مجھ پر ڈالی اور گرجدار آواز میں بولے "کیا بات ہے"؟ سر' میں آپ کے لئے ایک مفید دستاویز لے کر آیا ہوں۔ میرا نام قدرت اللہ شہاب ہے۔ میں اڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری ہوں۔" میں نے ایک ہی سانس میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہنے کی کوشش کی۔

"کیسی دستاویز"؟

میں نے آگے بڑھ کر کانگرس کا سرکلر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ بڑے سکون سے اسے پڑھتے رہے۔ میں کھڑا ہوا ان کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ ان کے جذبات میں ہلکا سا ارتعاش بھی پیدا نہ ہوا۔ ایک بار پڑھ چکے تو مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا' اور فرمایا "ہاں' یہ ہمارے لئے مفید ہو سکتی ہے"۔

یہ کہہ کر وہ دوبارہ اس کے مطالعے میں مصروف ہو گئے اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا "یہ تم نے کہاں سے حاصل کی ہے؟"

میں نے فر فر ساری بات کہہ سنائی۔

''ویل ڈیل۔۔۔تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"This is breach of Trust" میں اپنا قومی فرض پورا کرنے کے موضوع پر تقریر کرنے کی کوشش کی' تو قائداعظم نے مجھے کسی قدر سختی سے ٹوک دیا اور فرمایا

"Don't you see each copy is numberd? its Disappearance would be easily tracked down to you. Are your prepared to face the consequences?

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔"Yes Sir' I am fully prepared"

''کیا میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟'' قائداعظمؒ نے دستاویز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جی ہاں' سر۔ یہ میں آپ ہی کے لئے لایا ہوں''۔

''آل رائٹ۔ تم جا سکتے۔'' قائداعظمؒ نے حکم دیا۔

میں دروازے سے باہر نکلنے لگا' تو قائداعظمؒ نے بلند آواز سے پکار کر پوچھا۔''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''قدرت اللہ شہاب''

''بوائے' دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔'' قائداعظمؒ نے فرمایا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت ان کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ تھی یا نہیں تھی لیکن انکے لہجے میں مجھے شفقت کا ہلکا سا گداز ضرور محسوس ہوا۔ یہ اپریل ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ اس وقت ہندوستان کی بساط سیاست پر مسلمانوں کے خلاف جو خطرناک چالیں چلی جا رہی تھیں ان کا پس منظر بڑا سبق آموز ہے۔''(۲۲۱)

فسادات بہار کی ایک واقعاتی رپورٹ

پٹنہ (بہار کے دارالحکومت) اور اس کے نواح میں ہندو بلوائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو قیامت گزری وہ یکا یک تصادم کا الاؤ نہ تھا بلکہ اندر کھاتے ایک طویل اور خفیہ منصوبہ بندی کا واشگاف اظہار تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی وزیراعلیٰ کے نام سات صفحاتی دستاویز اس خفیہ منصوبہ بندی کا نکتہ آغاز تھا جو کلکتہ' پٹنہ' گڑھ مکتیشر پھر پنجاب' دہلی اور اس کے نواح میں ایک بارودی سرنگ کے پھٹنے کی طرح بتدریج پھیل کر چتا کے شعلوں کی طرح مسلمان بستیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی گئی۔ ہندو کانگریس اپنے بھارت دیش میں ہندو' مسلم قصہ مستقل طور پر حل کرنے کے لئے ان علاقوں میں بطور خاص ہدف مقرر کر چکی تھی جہاں پر مسلمان قدرے زیادہ تعداد میں تھے جن میں بنگال (کلکتہ)، بہار (پٹنہ)، یوپی (گڑھ مکتشیر)، اور پنجاب (امرتسر وغیرہ) کے علاقوں کے علاوہ دہلی اور اس کے نواح کو بطور خاص مسلم کش اور اس کے خون آشام ماحول سے تاراج کر کے ہندوؤں نے اپنی ایک ہزار سالہ تاریخ کا تاریک چہرہ خون مسلم کی ارزانی اور فراوانی سے مل مل کر دھویا۔ اس جانگسل ماحول اور معاصرت و معاشرت میں پاکستان ایک گوشہ عافیت بھی تھا اور جنت گم گشتہ بھی۔ سور ماؤں کے ہاتھوں معاشی' اور مجلسی چیرہ دستیوں کے بعد اب جان و آبرو کے نذرانوں کو پیش کرتے ہوئے کلمہ گو مسلمانوں کے قتل عام پر ایک رپورٹ آغا شورش

کاشمیری کی ہے جو حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ وہ لکھتے ہیں۔

میری رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا۔

۱۔ ''مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ باہمی صلاح مشورہ سے بنایا گیا' جن علاقوں میں فساد کرانا مقصود تھا وہاں کے ذاتی معتمدین کو پٹنہ طلب کیا گیا' جہاں انوا گرانارائن کے ہاں سارا پروگرام طے ہوا' پھر اس پروگرام کو انتہائی رازداری کے ساتھ کارکنوں تک پہنچایا گیا' علاقہ وار فساد کی کمان ان لوگوں کے سپرد کی گئی جو کانگریس اور سوشلسٹ ہونے کے باوجود غالی ہندو تھے۔''

۲۔ جہاں فساد مقصود تھا وہاں مسلمانوں کے مکانوں پر حملہ کرنے سے ایک روز پہلے رات کے وقت کراس کا نشان لگا دیا گیا۔

۳۔ جن گاؤں میں مسلمانوں کو لوٹا اور کاٹا گیا وہاں مقامی باشندوں کو اجتماعی یلغار میں مطلقاً شریک نہ کیا گیا بلکہ دوسرے گاؤں کے لوگ ان پر یلغار کرتے رہے۔ ان لوگوں کو بہت دنوں پہلے اس غرض سے ٹریننگ دی گئی۔

۴۔ حملہ آوردل کو کئی کئی دستوں میں تقسیم کیا گیا' ایک دستہ سامنے سے فائر کرتا' ایک پیچھے سے مکانوں میں نقب لگاتا' ایک آگ لگاتا' ایک قتل کرتا' ایک لوٹتا' ایک اغوا کرتا' فسادیوں نے آپس میں تقسیم کار کی ہوئی تھی۔

۵۔ حملہ آور ہزاروں کی تعداد میں جلوس بنا کر چڑھائی کرتے' گاؤں سے باہر کھلے میدان میں پڑاؤ ڈال دیتے۔ بلم لہراتے' تلواریں چمکاتے' نیزے اٹھاتے' برچھیاں گھماتے' بندوقیں تانتے' نعرہ بجرنگی گونج جاتے' چولہے دہکاتے' کڑاہیاں گرم ہوتیں' پوریاں پکتیں' شکم سیر ہو کر ہلہ بولتے' پہلے فائروں کو بوچھار کرتے' پھر قلیل التعداد مسلمانوں کو سامنے سے تھکا کر پیچھے سے دیوار پھاڑتے اور اندر گھس جاتے' عورتوں کو عمر کے لحاظ سے صف آرا کر لیا جاتا' بوڑھیاں قتل کر دی جاتیں' جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے' مردوں کو تہ تیغ کیا جاتا' بچوں کے کلیجے چیر دیئے جاتے' بوڑھوں کو اپاہج کر کے سسک سسک کر مرنے کے لئے پھینک دیتے۔

۶۔ ہفتہ پہلے ہندی میں اشتہارات تقسیم کئے گئے کہ نواکھالی میں ان کی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ مسلمانوں نے زنا بالجبر کیا ہے ان کا بدلہ لینا ہر ہندو کا دھرم ہے۔

۷۔ ہر گاؤں کے مکانات کی بیرونی دیواروں کو قائم رکھا گیا' لیکن اندر تمام سوخت کر دیا گیا' چوکھٹوں اور کھڑکیوں کی لکڑی سے مکینوں کو جلایا گیا' قرآن مجید خاکستر کئے گئے۔

۸۔ ہر مکان سے سونا، چاندی، روپیہ، پیتل، تانبہ لوٹا گیا' لیکن کسی مکان کی کراکری کو ملیچھ ہونے کی وجہ سے ہاتھ نہ لگایا گیا بلکہ توڑ تاڑ کر وہیں پھینک دیا۔ کپڑوں اور لاشوں کو ایک ساتھ جلا دیا گیا۔

۹۔ مسلمانوں کے مکان اس طرز پر تھے کہ شروع میں پھاٹک' پھاٹک کے اندر بیٹھک' پھر دیوار میں دروازہ' اس کے

پیچھے کھلا صحن' اس میں کوئی نہ کوئی درخت' بیچ میں کنواں' سہ طرف کمرے' ایک طرف گندم کوٹھیاں' حملہ آوروں نے ان کوٹھیوں کو جلا دیا تھا۔

۱۰۔ عام مکانوں کی کچی دیواروں میں خون سرایت کر چکا تھا' جن مکانوں کے بستر جلائے نہیں تھے وہ خون سے تر بتر تھے لیکن خون خشک ہو چکا تھا۔

۱۱۔ خواتین نے دیکھا کہ ان کے بچنے کی کوئی سی امید نہیں رہی ہے تو اکٹھی ہو کر چوڑیاں توڑیں' پھر کنوئیں میں چھلانگیں لگا دیں اکثر مکانوں کی دیواروں پر چوڑیاں ٹوٹی ہوئی پڑی تھیں اور خواتین کی لاشیں کنوؤں میں بدبو دے رہی تھیں۔ ان لاشوں کو ڈبونے کے لئے چارپائیاں باندھ کر ان پر پتھر رکھ دیئے گئے تھے۔ عورتوں کے قتل کا منظر انتہائی ہولناک تھا۔ ان کے بال اور کھوپڑیاں سڑاند دے رہی تھیں۔ ایک جلے ہوئے برقع کی آنکھ سے نوعمر بچی کے ڈیلے نظر آ رہے تھے۔

۱۲۔ مسوڑی کی مسجد میں شیر خوار بچوں کو کیل ٹھونک ٹھونک کر محراب کے ساتھ گاڑا گیا تھا۔ اس قصبہ ہی میں ٹرین روک کر مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ آبادی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور بیس مربع فٹ کے احاطہ میں پانچ سو افراد دفن کئے گئے۔ یہاں صرف ایک مسلمان بچہ باقی رہ گیا تھا۔

میں نے اس سے کہا "ہمارے ساتھ چلو گے؟"

اس نے کہ "یہاں میرے ابا ہیڈ ماسٹر تھے' اب سامنے کے کنوئیں میں ان کی لاش بدبو دے رہی ہے اور میری بہن پاس کے گاؤں میں ہریا چمار کے ہاں ہے۔

"ہریا چمار"؟"

"جی ہاں"

مسوڑی سے مشرق کی سمت دو میل کے دائرے میں انسانی ہڈیوں اور انسانی کھوپڑیوں کے ڈھیر لگے تھے' جنہیں درندوں' چرندوں اور پرندوں نے بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

۱۳۔ اس قصبہ میں پورے فساد کے سرانجام دینے کا ذمہ دار مقامی سوشلسٹ لیڈر تھا۔ میں نے اس سے بعض تفصیلات معلوم کرنا چاہیں' اس نے انکار کر دیا۔ کہنے لگا یہ مکافات عمل ہے نوا کھالی کا جواب۔

۱۴۔ بعض سوشلسٹ لیڈر اس کو گوریلا جنگ کی ریہرسل قرار دیتے تھے۔

۱۵۔ ایک گاؤں کے مویشی دوسرے گاؤں میں دے دیئے گئے اور فصلیں کاٹ کر ان کے دام ری ہرسل کا صرفہ ہو گئے۔

۱۶۔ نوجوانوں لڑکیوں کو خاندانی حد بندی کے تحت تقسیم کیا گیا۔ اونچے گھروں کی بیٹیاں نیچے گھروں میں تقسیم کی گئیں۔

اکثر فروخت کی دی گئیں' بیشتر دلال خرید کر لے گئے۔ کئی چھ سات روزہ عشرت کے بعد گنگا برد کر دی گئی۔

۱۷۔ تمام مکانوں کی دیواریں پھاڑ کر ان کا سونا نکالا گیا اور پنچایت میں تقسیم کیا گیا۔

۱۸۔ ان گھرانوں میں ننانوے فی صد کتابیں دینیات اور اسلامیات پر تھیں' انہیں قرآن مجید کے نسخوں سمیت جلا دیا گیا۔

۱۹۔ بعض دیہات یا قصبات میں مسلم لیگ کے دفتر کی عمارت پر لہو سے پوچا گیا' اور بورڈوں کے نیچے دو دو بچوں کے پنجر کیل ٹھونک کر لٹکائے گئے ان کے نیچے درج تھا۔

''لے کے رہیں گے پاکستان'' (۲۲۲)

کانگرس اپنے پرت کھولتی ہے

مولانا ابوالکلام آزاد کابینہ وفد تک کانگریس کے صدر رہے۔ ۱۹۴۶ء کے بعد یہ ۱۹۵۸ء تک اپنی عمر مستعار کے آخری لمحہ تک وہ نہرو کی کابینہ میں وزیر تعلیم کے منصب پر فرائض انجام دیتے ہوئے راہی ملک عدم ہوئے۔ کانگرس کی صدارت پر اب ابوالکلام کی ضرورت اس لئے نہ رہی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے خلاف، مسلمانوں میں متحدہ قومیت کی تفسیر کا سمبل تھے۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ثابت ہوگئی ساتھ ہی یہ کہ مسلمان ایک اقلیت نہیں ایک قوم ہیں اور تقسیم ہند مسلم لیگ کا مطالبہ بن گیا۔ اسلامیان ہند نے جس طرح قائداعظمؒ کی قیادت میں اجماع امت کے ذریعے پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ اور

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

کی عملی تفسیر کو اپنے عزم میں پرو دیا، یہ برعظیم کی ملت اسلامیہ میں روحانی روشنی کا عصری ابلاغ تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانان برعظیم نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ قرآن پاک کی اس آیت کا عملی نمونہ ہیں۔

انفروا اخفافا و ثقالا و جا ھدو باموالکم و انفسکم فی سبیل اللہ

(آیت ۴۱، سورۃ التوبہ، پارہ ۱۰)

ہلکے ہو یا بوجھل اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو

آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس اور اجمیر شریف

پروفیسر محمد اسلم سابق صدر پنجاب یونیورسٹی لاہور نے دیوبندی مسلک سے اپنی وابستگی کے باوصف یہ سچ لکھا کہ

''تحریک پاکستان کے پیچھے بھی دینی عصبیت کارفرما تھی تحریک کے رہنماء پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کا فلک شگاف نعرہ بلند کر رہے تھے اس

نعرے نے رنگ، نسل علاقائیت، لسانی اور فرقہ وارانہ اختلاف حرف
باطل کی طرح مٹا دیئے تھے۔“(۲۲۳)

بحیثیت مجموعی برعظیم کے مسلمانوں کا سوادِ اعظم (Absolute Majority) اہل سنت والجماعت بریلوی مکتبہ فکر کی حامل ہے اس لئے وہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ

”ابھی کابینہ مشن ہندوستان میں تھا کہ بنارس میں سنی علماء اور خاص طور پر پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری کی قیادت میں سات ہزار علماء اور ۲ لاکھ کے قریب سنیوں کا اجتماع ہوا جس میں پاکستان کے مطالبہ کی پرزور تائید کی گئی۔“(۲۲۴)

علماء اہل سنت اور مشائخ عظام کا کردار

”علماء اہل سنت والجماعت نے ۱۹۴۰ اور ۱۹۴۷ کے دوران میں جس سیاسی بصیرت اور دوراندیشی کا ثبوت دیا وہ ان کے معاصرین سیاست اور قوم پرست علماء میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ چنانچہ تحریکِ ترک موالات میں جو حضرات ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے وہ بعد میں یہ سوچنے پر آمادہ ہوئے، جو کچھ لوگوں نے کیا اس میں عقل سے زیادہ تجربات کی آمیزش تھی۔“(۲۲۵)

یہی سبب ہے کہ تحریک پاکستان کے حتمی مراحل اور خاص طور پر انتخابات عام کے موقع پر مشائخ عظام خواہ ان کا تعلق سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تھا کہ سلسلہ عالیہ چشتیہ سے، سلسلہ عالیہ سہروردی سے کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے، واقعتاً خانقاہوں سے باہر نکل آئے، اور انہوں نے قائداعظمؒ کی قیادت میں عملاً پاکستان کے حصول کے لئے اس طرح سرگرمی دکھائی، جیسے فقہی طور پر ایک اسلامی ملک کے امیر المومنین کے حکم پر، جہاد کرو، اللہ کی راہ میں اپنی جانوں سے اور مالوں سے کا سماں پورے ہندوستان اور خاص طور پر سندھ، سرحد، پنجاب میں اور عموماً مشرقی پاکستان میں بندھ گیا جس کے لیے مولانا ظفر احمد عثمانی جیسے علماء نے خصوصاً مسلم لیگ اور پاکستان کے لئے، کانگرسی سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ قائداعظمؒ پر برسرعام تبرئی احرار کے مولانا مظہر علی اظہر کا تھا کہ وہ قائداعظمؒ نہیں کافراعظم ہے۔

مگر برعظیم کی ملتِ اسلامیہ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ احرار کے اس کانگرسی کرایہ دار مقرر اور ذاکر نے مبلغ ۹۰ ہزار روپے اس الیکشن میں کانگرس سے بٹورے تھے۔ مسلمانان برعظیم کے دلوں کی دھڑکن اور عصری قیادت کو وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کا ظاہری تقویٰ اور فتویٰ سراسر مسلمانوں کے لئے ایک شرعی تماشہ ثابت ہوا، اور مسلم عوام نے مذہبی پیشوائیت کے کانگرسی کارندوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیا۔ ۱۰ سال کے عرصہ سیاست نے قائداعظمؒ کا یہ ارشاد سچ کر دکھایا جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء کلکتہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ

”کانگرس سراسر ہندو جماعت ہے مسلمانوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ کانگریس کو جتا دیا ہے کہ ان کی

آئندہ تقدیر کا دارومدار حکومت اور ملک کے انتظام، ان کے سیاسی حقوق کے حصول اور قومی زندگی میں واجب حصہ حاصل ہونے پر ہے۔"

کانگریس اور جناحؒ، مولانا مودودیؒ کی تقریظ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے کہ

"مسٹر جناحؒ کا سب سے بڑا الزام کانگریس پر یہ تھا کہ وہ دراصل ایک متعصب ہندو قوم پرست جماعت ہے اور اس نے محض منافقت کے ساتھ ہندوستان کی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ کانگرسی اس الزام کو بالکل غلط کہتے تھے لیکن وزارتی مشن (Cabinet Mission) کی آمد کے بعد تقسیم ہند تک کانگرس اور اُس کے لیڈروں نے جو کچھ کیا وہ جناحؒ کے الزام کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ انہوں نے خود اپنے اوپر سے اس لبادے کو اتار پھینکا جسے مسٹر جناح منافقت کا لبادہ کہتے تھے۔" (۲۲۶)

کانگریس کے ہمنوا نیشنلسٹ مسلمان

برعظیم کی ملت اسلامیہ اس خطے میں کم وبیش ایک ہزار برس تک برسر اقتدار رہی۔ سلاطین دہلی کا دور ہو کہ مغلیہ عہد، مسلمانوں نے اپنی دینی چھاپ، اور فکری روایت کے علمی خزانے برعظیم پر نچھاور کر دیئے۔ وہ فاتحین کی صورت میں وارد ہوئے مگر یہیں رچ بس گئے۔ مقامی ہندو رعایا سے انکا سلوک حد درجہ فیاضانہ رہا، مگر ہندو مزاج کا تاریخی المیہ یہ رہا ہے کہ وہ کسی دوسرے مذہب، تہذیب یا دین کو برداشت نہیں کرتا، صرف اسے ہڑپ کرنے اور خود میں ضم کرنے کے تاریخی کردار کا حامل ہے۔ حقیقتاً یہاں اسلام فاتحین سے کہیں زیادہ اصل میں اہل اللہ اور بزرگان دین کا مرہون منت ہے، جنہوں نے سروں پر نہیں دلوں پر حکمرانی کی ہے اور برعظیم میں اسلام کا پیغام دلوں تک پہنچایا، نفوس کا تزکیہ کیا، اور انہیں کتاب کا علم دیا، حکمت سکھائی، اور یہی فقر نبوی ﷺ کا منصب اور فیضان ہے۔ خود مسلمانوں کے دور حکومت میں درباری علماء اپنے منصب اور جاہ یا معاصرانہ چشمک کے گواہ ہیں۔ البتہ عمائدین سلطنت کے ساتھ مل کر، تعلیم وتدریس اور مذہبی علوم کی اشاعت، مساجد کا انصرام بہر حال حکومتی سطح کا مذہبی رویہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد علماء مدرسہ نے جس رجعت قہقہری کا ثبوت دیا اُس سے یہ بات عصر حاضر کا بدیہی ثبوت ہے کہ حکومت سے وابستہ اور حکومت سے پیوستہ طبقات میں علماء کا کردار، دینی سے زیادہ درباری کا رہا ہے، الا ماشاء اللہ تاریخ میں علماء حق اور حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی، مگر بحیثیت مجموعی یہ کردار علماء دربار سے وابستہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ انگریز سامراج کے خلاف روایتی مذہبی علماء کا عناد مذہبی غیرت کا نمونہ تو ہے مگر دینی بصیرت سے مملو ہرگز نہیں تھا۔ انگریز دشمنی کا مطلب ملت فراموشی یا ملت فروشی تو نہیں ہونا

چاہیے۔

اور وہ بھی کہ یہ

ع حضرت گاندھی کے ماتو ہیں

نیشنلسٹ سیاست اور مسلم عوام

اس حلقے کے نامور خطیب وادیب آغا شورش کاشمیری ہی کا تجزیہ اس قابل ہے کہ اس میں بیک وقت نیشنلسٹ فکر کے مسلمانوں کے ایک خاص حلقے میں استعمار دشمن رہنماؤں کا فکری خلاصہ بھی میسر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''استعمار دشمن مسلمانوں رہنماؤں نے تب محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ مسلمان قوم کہاں کھڑی ہے؟ اس کی شکایات کیا ہیں اور پاکستان کا مطالبہ دراصل ہے کیا؟ پاکستان کا مطالبہ ہندوؤں کی بالادستی کے خلاف مسلمانوں کی نفرت کا احتجاج و اظہار نہیں بلکہ گمشدہ اسلامی سلطنت کی بازیافت کا ایک دلفریب تصور تھا۔ نیشنلسٹ مسلمان ابھی تک ماضی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے لئے ۱۹۴۰ء کا زمانہ بھی ۱۸۵۷ء کا زمانہ تھا۔ وہ باتیں اسلام کی کرتے تھے، لیکن انہیں ایک اسلامی ریاست کے مطالبہ سے اتفاق نہ تھا۔ ان کے ذہین میں صورتحال کا تجزیاتی نقشہ کوئی ہو لیکن عوام کی نفسیات سے انہیں کوئی رابطہ نہ تھا۔ وہ غالباً اس سے بے گانہ تھے کہ عوام نظریوں سے زیادہ نتیجوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ انہیں مستقبل قریب سے دلچسپی ہوتی ہے مستقبل بعید سے نہیں۔ سیاسی تحریکیں افکار سے زیادہ جذبات پر چلتی ہیں۔ اور قومی تحریکیں فکر کے بجائے سیاست سے اٹھتی ہیں۔'' (۲۲۷)

برعظیم کی ملت سلامیہ کے مستقبل کے معمار اولین اگر فکر میں اقبالؒ ہیں تو عصری قیادت اور سیادت قائداعظم محمد علی جناحؒ ہیں۔ یہ کسی فقہی مسلک یا مدرسے کی پیداوار نہیں، دین کی دین ہے، یہ اللہ پاک کا اصطفیٰ (Selection) ہے۔ وہ اپنے جس بندے سے کوئی کام لینا چاہتا ہے، لے لیتا ہے۔ کسی پارٹی کی قرارداد، کسی مدرسے کی شوریٰ یا کسی مذہبی جماعت، مسلک کی مجلس عاملہ سے نہیں پوچھتا۔ یہ قائداعظمؒ تا قیامت تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں جو برعظیم کی ملت اسلامیہ کا جلی نام ہے۔ برعظیم کے مسلمانوں نے اس کی آوازیں پر تن، من، دھن جس طرح نچھاور کیا اس میں مقلب القلوب، ذات باری الہ کا کرم اور کرشمہ کارفرما ہے۔ نہیں تو خانقاہ امدادیہ صابریہ، تھانہ بھون سے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی گواہی سن لیں تو کلین شیو جناح کا روحانی وجودان کے رویاء صادقہ کا منظر ہے۔ حضرت مولانا تھانویؒ کے خواہرزادہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ

''میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں۔ مگر آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے۔ گویا کہ میدان حشر سا معلوم ہو رہا ہے۔ اس مجمع میں اولیاء، علماء اور حکمران

کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح بھی اسی مجمع کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے تو مجھ سے کہا گیا کہ محمد علی جناحؒ آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اس واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا۔'' (۲۲۸)

مولانا شبیر علی تھانویؒ اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ :۔

''میرے ایک معتبر دوست نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ ان سے مولانا حسرت موہانی صاحب نے بیان کیا کہ میں ایک دن جناح صاحب کو کوٹھی پر صبح ہی صبح ایک نہایت ضروری کام سے پہنچا اور ملازم سے میں نے اطلاع کرنے کو کہا۔ ملازم نے کہا ہم کو اس وقت اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ تشریف رکھیئے، تھوڑی دیر میں جناح صاحب خود تشریف لے آئیں گے۔ چونکہ مجھے نہایت ہی ضروری کام تھا، اور میں اس کو جلد سے جلد جناح صاحب سے کہنا چاہتا تھا، اس لیے مجھے ملازم پر غصہ آیا، اور میں خود کمرے میں چلا گیا۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، پھر تیسرے کمرے میں پہنچا تو برابر کے کمرے سے مجھے کسی کے بہت ہی بلکہ بلک بلک کر رونے اور کچھ کہنے کی آواز آئی۔ آواز چونکہ جناح صاحب کی تھی اس لئے میں گھبرایا اور آہستہ سے پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جناح صاحب سجدے میں پڑے ہیں اور بہت بیقراری کے ساتھ کچھ دعا مانگ رہے ہیں۔ میں دبے پاؤں وہیں سے واپس آ گیا اور اب تو بھائی! جب جاتا ہوں اور ملازم کہتا ہے کہ ''اندر ہیں'' تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ سجدہ میں پڑے دعا کر رہے ہیں، مگر تصور میں ہر وقت وہی تصور اور وہی آواز رہتی ہے۔'' (۲۲۹)

خود مولانا حسرت موہانی کا روحانی مشاہدہ بھی یہی ہے ادریس صدیقی، تحریک آزادی کے قافلہ سالار، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ۱۹۹۰ رقم طراز ہیں:۔

''مولانا حسرت موہانیؒ، روحانی اعتبار سے بھی نہایت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ان کے خواب اکثر سچے ہوتے تھے اور وہ انہیں اشارہ غیبی تصور کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کے زمانے میں انہوں نے انکشاف کیا کہ اب قیام پاکستان مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔ البتہ پاکستان کے بعد اس کی تعمیر اور ترقی کے بارے سوچنا چاہیے۔ واضح رہے کہ ۳ جون ۱۹۴۰ء سے پہلے کوئی بھی قیام پاکستان سے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن مولانا حسرت موہانیؒ کا ارشاد یہ تھا کہ ''میں نے خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت کی ہے اور دیوان حافظ سے فال نکالی ہے۔ اس شعر پر میں نے تضمین بھی کر دی ہے جو یہ ہے کہ

جب کہے خواب میں خود آ کے وہ شاہِ خوباں ﷺ
جبکہ حافظ بھی مصدق ہو یہ فالِ دیواں
تجھ کو حسرت یہ مبارک سند مہر و نشاں

پردہ بردار کہ تا سجدہ کند جملہ جہاں
طاق آبروئے تو محراب جہاں خواہد بود"

خود حضرت قائداعظمؒ آخری وقت میں فرماتے تھے کہ:۔

"یہ مشیت ایزدی ہے، یہ حضرت محمد ﷺ کا روحانی فیض ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے قرطاس سفید سے حرف غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی آج وہ آزاد ہے، اسکا اپنا ملک ہے، اپنا جھنڈا ہے۔ جب میں محسوس کرتا ہو کہ میری قوم آج آزاد ہے، تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے بارگاہ رب العزت میں سجدۂ شکر بجالانے کیلئے فرطِ انبساط سے جُھک جاتا ہے۔" منشی عبدالرحمٰن نے آگے جملہ لکھا ہے کہ اتنے بڑے انعام اور اتنی عظیم کامیابی پر فخر کی بجائے عجز و نیاز کا اظہار کرے اور سجدہ شکر بجالانے کی ایک غیر مومن سے کب توقع ہو سکتی ہے۔" (۲۳۰)

ایسے قائد کی قیادت میں مسلمان کا دینی ولولہ کیا تھا؟ کسی مسلم لیگی فکر کے مصنف کی بجائے، انتخابی معرکے میں خطیب احرار آغا شورش کاشمیری کی شہادت اُس منظر اور ماحول کو زیادہ جامعیت کے ساتھ بیان کرتی ہے، جو انہیں یوپی اور نیپال کی سرحد کے پاس ایک مسلمان کسان کی زبان سے تحریک پاکستان کا مطلب کیا؟ کلمے کا ساتھ دینا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"قائداعظم مسلم لیگ اور پاکستان کے نام میں بلا کا جادو تھا، عام مسلمان انہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہ پہلا الیکشن تھا جو ہندوستان کے مسلمان کسی اصول، کسی جماعت کسی قائد اور کسی موقف پر لڑ رہے تھے۔ جب سے ہندوستان میں انتخابات کا نظام رائج ہوا مسلمانوں نے کبھی اتحاد، تنظیم و یکجہتی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ اس کے وجوہ تھے، ایک تو ملک کی سیاسی جدوجہد ستاسی، اٹھاسی برس بعد آخری مرحلہ میں داخل ہو گئی تھی دوسرے ملک کی آزادی کے آثار صاف نمایاں ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کو آزادی کے اس نقشے میں اپنا مقام متعین کرنا تھا۔ لیگ کے پاس مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کا نصب العین تھا۔ کانگریس سے مسلمان واقعتہً دل برداشتہ بلکہ بدظن ہو چکے تھے اس کی وجہ ہندو اکثریت کی تنگ نظری، مسلمانوں کا معاشی مقاطع اور مجلسی کوتاہ اندیشی تھی۔" (۲۳۱)

آغا شورش کاشمیری نے احرار کے جنرل سیکرٹری کے طور پر یوپی، بہار، یہاں تک کہ نیپال کی سرحد تک سفر کیا، اس کے خطاب کے ساتھ مسلم عوام کی سیاسی بیداری کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہے وہ لکھتے ہیں کہ:۔ بہار اور یوپی تک مسلم عوام میں پاکستان کا نشہ کیسا تھا؟

"میں اپنی رائے کو چھپانا نہیں چاہتا کہ ان دُور افتاد سے مسلمانوں کو پاکستان کا نشہ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ وہ اس کیلئے اپنے مستقبل سے غافل ہو گئے تھے۔ انہیں آئندہ حادثات و سانحات کا قطعی احساس نہ

تھا وہ جذبات کے نشے میں بہہ رہے تھے۔ انہیں قطعی احساس نہ تھا کہ وہ من حیث المجموع ہندوؤں کے چنگل میں ہیں۔ اُن کے پاس تعلیم نہیں، روپیہ نہیں، ذہن نہیں، ان کے مکانوں سے پاکستان کا راستہ بہت دور، بہت کٹھن ہے لیکن ہزار کی ہندو آبادی میں ایک مسلمان کیلئے بھی یہ نعرہ بہت پرکشش تھا کہ "جیسے لیا تھا ہندوستان ویسے ہی لیں گے پاکستان" یا "بولو بھیا ایک زبان۔۔۔بن کے رہے گا پاکستان۔"

ان لوگوں کے ذہین میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ لیگ انکا جوابی حملہ اور پاکستان ان کی عافیت کا حصار ہے۔ ان علاقوں کے مسلمان عوام، بالخصوص مسلمان کسان اندوہناک غربت کا شکار تھے۔ ان کی وضع قطع یکساں تھی، لباس بھی تقریباً ایک سا تھا۔ کوئی بنیان تھی بھی تو ایک خاص قسم کی، دو پلی یا گٹھے پر سجدوں کی رگڑ۔ نیپال کی سرحد سے ذرا ادھر میں نے ایک مسلمان کسان کو روک کر "السلام علیکم" کہا تو وہ رک گیا اور "وعلیکم السلام" کہا، فرمایئے، اُس نے پوچھا،

"کہو بھائی طبیعت کیسی ہے؟"

وہ تاڑ گیا الیکشن کے شکاری ہیں

"اللہ کا شکر ہے" اس نے جواب دیا۔

اللہ کا شکر ہے، ایک پاکیزہ کلمہ جو مراکش سے چین تک کا مسلمان زبان کے اختلاف لیکن معنی کی ہم آہنگی کے ساتھ بولتا ہے۔

"ووٹ کسے دو گے" میں نے سوال کیا۔

اس نے غور سے دیکھا اور لاٹھی بڑھا کر چل پڑا۔ میں نے پیچھے سے آواز دے کر پوچھا،

"بھائی کچھ تو کہہ جاؤ"

"میاں! ہمارا ووٹ کلمہ کے ساتھ ہے"

"کلمہ کے ساتھ"

"جی ہاں"

"کلمہ سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"مسلم لیگ" (۲۳۲)

یہ تھا پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ

اُردو کے نامور نعت گو، حفیظ تائب نے اس ارضِ لا الہ کو حقیقت کی زبان میں

ع ارض پاک ہے کہ مملکت عشق رسول ﷺ

کہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے فکر اور فقر دونوں کا اعجاز ہے۔ جبکہ بانی پاکستان حضرت

قائداعظمؒ ان کا چناؤ ہے، اصطفیٰ ہے (Selection) ہے۔ نظریہ پاکستان اور بانی پاکستان دونوں اقبالؒ ہی کی دریافتیں ہیں۔ اقبالؒ کے لئے قائداعظمؒ کی معنوی زبان سے بات کریں تو پاکستان کے ترانے کے خالق ابوالاثر حفیظ جالندھری کا یہ شعر، قائداعظمؒ کا اقبالؒ کے لئے خراج عقیدت معلوم ہوتا ہے، قیام پاکستان پر وہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ

جرم ہے مجھ پہ عشق کا میرا، گناہ بھی تو دیکھ
اُسکی نگاہ بھی تو دیکھ، جس نے یہ گُل کِھلا دیا
(حفیظ جالندھری)

بھارتی مسلمان۔ وطن میں غریب الوطن

بھارت میں آزادی کے بعد وہاں مسلمانوں کو جس تنگ نظر اکثریت کے تعصب کا سامنا ہے اس سے بھارتی مسلمان ایک سہمی ہوئی اقلیت بن کر رہ گئے ہیں جن کی جان و مال اور آبرو، آئے دن کے مسلم کش فسادات کی نذر ہوتی رہتی ہے۔ بھارت ہی سے ایک نحیف آواز بتاتی ہے:...... ”گذشتہ پچاس برسوں (اب باسٹھ برسوں) سے ہندوستانی مسلمان ایک اجنبی ثقافت کے نرغے میں ہیں۔ ان کے اردگرد جو دنیا وجود میں آئی ہے، وہ ان کے ملی و اسلامی مزاج سے اتنی مختلف ہے کہ انہیں ہر لحہ ایک دل آزار اجنبی ماحول میں رہنے کا احساس ہوتا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ قوم پرستی کے حوالے سے جو مظاہر سامنے آتے ہیں وہ ہر لحہ اس ملک میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کی نفی کرتے ہیں۔“

(راشد شاذ، ہندوستانی مسلمان، ایام گم گشتہ کے پچاس سال، حوالہ مذکور صفحہ ۷۷)

ایں چہ بوالعجیست؟

اور تو اور بھارت میں متحدہ قومیت کے نامور رہنما حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پوتے کے ساتھ جو سلوک ستمبر ۲۰۰۶ء میں کیا گیا، اسکے بعد بھارت میں متحدہ قومیت کا اصلی اور نسلی پھل، حنظل کا پتہ ہے، جو واقعات و حالات کی رفتار بن کر بھارتی مسلمانوں کا مقدر بن گیا ہے۔ خبر کے مطابق:۔

”ستمبر ۲۰۰۶ء کے ابتدائی دنوں میں بھارتی صوبے اتراکھنڈ (ڈیرہ دون) میں تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے پوتے مولانا مسعود مدنی کو پولیس نے پکڑا، تھانے لے جا کر انہیں ننگا کر کے مارا، پیٹا، یہاں تک کہ خود ایس ایس پی نے انہیں مخاطب ہو کر کہا!

”سالے تم اتر اکھنڈ کو بھی پاکستان بنانا چاہتے ہو!“

۶۲ برس بعد بھی پاکستان اپنی حقیقت منوا رہا ہے بلکہ پاکستان زبان حال سے یہ پکار رہا ہے کہ

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

اختتامیہ

ہندوستان نہیں فی الواقعہ پاکستان تقسیم ہوا ہے

وزارتی مشن ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچا، اس مشن کی آمد ہندوستان کی آزادی کا اعتراف تو تھا، جو عملاً مسلمانوں کی آزادی کے خلاف ثابت ہوا۔ ۱۶ مئی کو اس نے اپنے پلان کا اعلان کیا۔ مشن نے اپنے پلان میں سب سے پہلے، برطانیہ کے وزیر اعظم اٹلی کی اُس تقریر کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ،

> ''وزارتی مشن ہندوستان کو آزادی سونپنے جا رہا ہے لیکن اس حق آزادی کے خدوخال بنانے اور سنوارنے کا واحد حق خود ہندوستان کو حاصل ہے'' شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ وزارتی مشن نے سب سے زیادہ بحث پاکستان کے موقف پر کی، بظاہر پاکستان کے مطالبے کو تسلیم نہ کیا، لیکن پلان کے خاکے میں پاکستان کے مطالب ضرور مضمر تھے۔'' (۲۴۳)

شورش کاشمیری کا کہنا ہے کہ

''وزارتی مشن پلان کے شائع ہوتے ہی ایک سناٹا چھا گیا۔ کانگریس اور لیگ دونوں کے رہنما کچھ دنوں کے لئے لیے دیئے رہے، ہندو اخباروں نے ابتداً خوشی محسوس کی کہ پاکستان کا استرداد ہو گیا ہے۔ لیکن جب لیگ نے پلان پر صاد کر دیا تو انہیں رفتہ رفتہ پلان میں پاکستان نظر آنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ لیگ نے فیصلہ کرنے میں پہل کی۔ کانگریس کے رہنما توجیہوں، تعبیروں اور تاویلوں کے چکر میں پڑ گئے۔ اصل بگاڑ عبوری حکومت کے مسئلے پر ہوا۔ لیگ نے شمول پر رضامندی ظاہر کی۔ کانگرس بگڑ گئی، ویول منحرف ہو گیا، پنڈت نہرو دوبارہ مان گئے تو لیگ شمول کی قرارداد واپس لے چکی تھی۔ قائداعظمؒ نے لارڈ ویول کو اس بدعہدی پر آڑے ہاتھوں لیا۔ کچھ دنوں بعد لارڈ ویول اور پنڈت نہرو میں نہ جانے کیا باتیں ہوئیں، کہ انہوں نے عبوری حکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ پنڈت نہرو رسمی دعوت لے کر قائداعظمؒ کے پاس گئے، قائداعظمؒ شمول کی قرارداد واپس لے چکے تھے، انہوں نے انکار کر دیا۔'' (۲۴۴)

اس صورت حال میں سارا برٹش انڈیا ایک بارود خانے اور خانہ جنگی کی مہیب لپیٹ میں گھرا ہوا تھا۔ برعظیم کے ان بگڑے ہوئے حالات پر کنٹرول کرنا لارڈ ویول کے بس کا روگ نہ رہا تھا، خود کانگریس اسے پسند نہیں کرتی تھی، وہ فوجی ذہن کا آدمی تھا، اور انتظامی حقائق سے آگے جانے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ سیاسی سطح پر عبوری حکومت میں مسلم لیگی اور کانگرسی گروپوں کی باہمی کشمکش اور چپقلش روز بروز تلخ سے تلخ تر ہوتی جا رہی تھی۔ ان تمام حقائق ہی کے باعث لارڈ ویول نے برطانوی ہند کی بساط لپیٹنے کی سفارش کی، جس کے نتیجے میں برطانوی اقتدار کو اقتدار مقامی لوگوں کو سونپنے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس پس منظر کا نتیجہ وہ اعلان تھا، جو وزیر اعظم اٹیلی نے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو کیا تھا کہ حکومت برطانیہ ۱۵ جون ۱۹۴۸ء تک لازمی طور پر

ہندوستان کے اقتدار سے دستبردار ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی وزیر اعظمؒ ایٹلی نے یہ اعلان بھی کیا کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس اعلان پر کانگرس نے خوشی کے شادیانے بجائے قدرت اللہ شہاب کہتے ہیں کہ

''اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ لارڈ ویول کی معزولی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کا پنڈت جواہر لعل نہرو کو پہلے سے علم تھا اور اس فیصلے کو ان کی اشیر باد حاصل تھی۔'' (۲۳۵)

آگے چل کر قدرت اللہ شہاب نے تبصرہ کیا ہے کہ

لارڈ ویول کا حشر دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن نے یہ سبق پلے باندھ لیا تھا کہ اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے اسے کانگرس کی خیر سگالی اور خوشنودی کو ہر قیمت پر خریدنا پڑے گا۔ یہ قیمت نے اس نے بڑی فراخدالی سے مسلمانوں کے کھاتے سے ادا کی۔'' (۲۳۶)

۳ جون پلان اور قائد اعظمؒ

۳ جون پلان پر تا حال قلمی اور علمی جدل کا موضوع، مباحثہ کی زد میں ہے۔ کیا قائد اعظمؒ نے ۳ جون کے منصوبے کو مان کر دراصل اپنے موقف پاکستان سے انحراف کیا تھا؟ یہ انحراف تھا کہ کفاف، درپیش مرحلۂ تاریخ میں یہ تقسیم ہند اور ہندو اکثریت کے مرکز سے اقتدار سے علیحدگی کی آگے چل کر کوئی صورت ہو سکتی تھی کہ نہیں؟ اس پر قائد اعظمؒ کی ژرف نگاہی پر اپنی کوتاہ اندیشی کی فلکاری اب بند ہو جانی چاہیے۔ حادثہ یہ ہے کہ ایسا سوچنے اور لکھنے والے قائد اعظمؒ ہی کے بنائے ملک پاکستان میں اس کی تصویر کے کرنسی کے نوٹ جیبوں اور بنکوں میں بھر کر کہتے ہیں تو قائد اعظمؒ ایسے ''کمرشل کلرکوں'' کے ذہن کی گرفت میں کہاں آ سکتے ہیں۔ انہیں صرف قائد اعظمؒ ہی کا ارشاد سنایا جا سکتا ہے جس پر انہیں طوعاً و کرھاً ہی سہی، صاد کرنا ہو گا کہ قائد اعظمؒ نے فرمایا۔

''بعض لوگ سوچتے ہوں گے کہ ۳ جون کے منصوبے کو قبول کرنا مسلم لیگ کی غلطی تھی۔ میں انہیں بتاتا ہوں، اس کے سوا کوئی اور اقدام اتنا خطرناک اور تباہ کن ہوتا کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' (جلسہ عام لاہور، ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

معترضین کو ان معروضی حالات اور اس کے منجدھار میں جوار بھاٹا کی سیاسی لہروں کا احساس بھی نہیں اور شعور بھی، کہ ہندو کس قدر سازش، رشوت، سفارش اور منصوبہ بندی کے ساتھ مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے، اور اقتدار انگریزوں سے ہتھیانے کے جتن کر رہا تھا۔ ان کی راہ کا واحد روڑا قائد اعظمؒ کی مسلم لیگ اور اس کا پاکستان تھا۔ یہی وہ معروضی مجبوری تھی، جو کانگرس، گاندھی، نہرو اور پٹیل بلکہ ان کی ٹیل (Tail) تنظیم اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی آکاس بیل کا حاصل ہے۔ وجہ یہ تھی کہ عبوری حکومت میں کانگرس کا مسلمان تجربہ یا مسلم لیگی تجربہ ان کے برسوں کے آدرش اور عندیے میں، ذبیحہ کا

ماس (گوشت) تھا، جس کی وجہ ان کے عزائم میں سدراہ کا باور ہونا کانگرس یا ہندو مقاصد کا ''بھر شٹ'' تھا۔ یہی سبب ہے کہ جلدی جلدی تقسیم کی گرم گرم جلیبیاں مسلمانوں یا مسلم لیگ کے ہاتھ تھمانے کا معروضی منظر ان کے ہاتھ جلانے کا باب تھا، نہ کہ منہ میٹھا کرانے کا ظاہری عمل اور دوسرے پاکستان ناگزیر جان کر اس سے جان چھڑانے کی مستعدی بھی اس کا ''کارن'' تھا۔ البتہ اس منصوبہ اور سازش کے ساتھ، کہ ''کٹا پھٹا'' پاکستان دے کر، اُسے آنکھ کھولتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اولاً تو پاکستان بننے ہی نہ دیا جائے، بنے بھی تو ایسا کہ چلنے نہ پائے، چل پڑے تو اُسے اپنے قدموں پر جھکانے پر مجبور کیا جائے اور پاکستان کی بقا، بھارت کی برتری میں مضمر قرار دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ

''مارچ ۱۹۴۷ء میں جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے کا عہدہ سنبھالا تو تقسیم ہند کا اصول قریباً قریباً طے شدہ امر تھا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ پاکستان کا مطالبہ تو مسلم لیگ نے کیا تھا، لیکن اس مطالبے کو جلد از جلد پورا کرنے کی فکر اب کانگرس کو لگی ہوئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ہندوستان کی تقسیم پر کانگرس اس لئے آمادہ نہیں ہوئی تھی کہ اسے مسلمانوں کے ساتھ کوئی منصفانہ یا فیاضانہ یا دوستانہ سلوک کرنا منظور تھا۔ کانگرسی لیڈروں نے یہ کڑوا گھونٹ بڑے غم وغصہ سے شدید مجبوری اور معذوری کے عالم میں اپنے گلے میں اتارا تھا۔ عبوری حکومت کے تجربے سے پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور ان کے ساتھیوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کر کے کانگرس کبھی بھی اپنی من مانی کاروائیاں کرنے پر قادر نہ ہو سکے گی۔ عبوری حکومت میں مسلم لیگی وزیر کانگرس کی بالادستی تسلیم نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی وہ اپنی پالیسیوں میں کانگرس کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتے تھے۔ وہ آخری تنکا جس نے عبوری حکومت کے اونٹ کی کمر توڑ دی، لیاقت علی خان کا بجٹ ثابت ہوا جو انہوں نے ۲ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر خزانہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اُسے عام طور پر ''غریب آدمی کے بجٹ'' سے یاد کیا جاتا ہے۔ بجٹ کا اعلان ہوتے ہی ہندو سرمایہ داروں کے حلقے میں کہرام مچ گیا۔ انہوں نے کانگرسی لیڈروں کو آڑے ہاتھوں لیا اور کانگرس کی مالی امداد بند کرنے کی دھمکی دی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کابینہ میں اودھم مچایا۔'' (۲۴۷)

قدرت اللہ شہاب ہی کہتے ہیں:۔

''کانگرس کے ''مرد آہن'' سردار ولبھ بھائی پٹیل اب اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی شراکت بالکل لایعنی اور عبث ہے۔ مسلمان اکثریت کے جو علاقے پاکستان بننے کے خواب دیکھ رہے تھے، وہ بھارت ماتا کے پوتر بدن پر گلے ہوئے، سڑے ہوئے ناسور ہیں۔ مناسب

یہی ہے کہ ان ناسوروں کو جلد از جلد کاٹ کر الگ کر دیا جائے تا کہ ان کا زہر صحت مند حصوں تک پہنچ نہ پائے۔ پنڈت نہرو پہلے ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو زبان دے چکے تھے کہ اگر پنجاب اور بنگال تقسیم کر دیا جائے تو انہیں پاکستان کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کانگرس نے ایک ہاتھ سے مطالبہ پاکستان کو طوعاً کرہاً تسلیم کیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے فوراً سر توڑ کوششیں شروع کر دیں کہ کہ یہ نوزائیدہ ملک زندہ رہنے کے قابل نہ ہونے پائے۔ اس کوشش میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی صورت میں بڑا کارآمد معاون مددگار مل گیا۔'' (۲۳۸)

نیا وائسرائے بھیجا گیا تھا کہ لایا گیا تھا، اس کا حتمی فیصلہ مراحلِ تقسیم سے تفہیم تک سے بخوبی دیکھا جا سکتا ہے یہ کانگرسی سیاست کے داؤ پیچ کا ''خدنگ آخریں'' تھا کہ کابینہ مشن پلان یا ہندوستان کے باشندوں کو حقیقی آزادی دینے کے برطانوی عندیہ وعزم پر عمل درآمد کیلئے جس شخص کو بطور وائسرائے نامزد کیا گیا وہ عملاً ثالث سے کہیں زیادہ کانگرس کا طرفدار اور ہندوستان کا حقیقی دوست اور حلیف ثابت ہوا جبکہ مسلمانوں کے ساتھ، پاکستان کے بارے میں اس نے اپنے روایتی مذہبی تعصب، سیاسی عداوت اور قلبی شقاوت کا بدیہی ثبوت دیا، کہ کروڑوں انسان، انگریز ہندو گٹھ جوڑ کے باعث تہ تیغ ہو گئے، خون کی ندیاں نہیں گنگا کا اشنان ہو گیا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے نئے وائسرائے کے علیہ ماعلیہ کو بڑے جامع جملوں میں باندھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''وائسرائے کے عملے میں واحد ہندوستانی ایک کانگرسی ذہن کا ہندو، وی۔ پی مینن تھا، جو ماؤنٹ بیٹن پر بڑا اثر رکھتا تھا۔ کیمبل جانسن، جو اس زمانے میں اپنا با مقصد روزنامچہ لکھ رہا تھا، ''نہرو کے خاندان سے ایک خاص غیر محتاط تعلق رکھتا تھا، اور نہرو کے ناشتے کی میز کا مہمانِ عزیز، نہرو کی بیٹی اندرا جو اپنے باپ پر معتدبہ اثر رکھتی تھی کا پکا دوست اور نہرو، ماؤنٹ بیٹن خود اس کام کیلئے کامیاب چکنائی مہیا کرنے والا بن گیا'' لیڈی۔ ماؤنٹ بیٹن نہرو کے قریب ترین دوستوں میں شامل ہو گئی اور ابوالکلام آزادؒ ہمیں بتاتے ہیں کہ کانگریس کے صدر پر اس کا اثر پٹیل یا ماؤنٹ بیٹن سے زیادہ تھا۔'' (۲۳۹)

ایسے چالاک، اور سفاک، گرگوں کے تصرف میں انسانی مسائل کا وہ مرحلہ درپیش تھا، جسے بعد میں برطانوی قلمکاروں نے Mission with Mount Batton از کیمبل جانسن، اور The Great Divide از ہڈسن جیسی تصانیف اور بعد ازاں The Transfer of Power جیسی کتب کو علم و تحقیق پر سچ کا بیان بنانے کا نام عہد جدید کی علمی دیانت قرار دیا ہے۔ اگر برطانوی غلبہ واستیلاء کا اندرون چنگیز سے تاریک تر چہرہ محض برعظیم کے افق پر ۱۸۵۷ء کی جنگ

پلاسی سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک ہی کے سو برس میں دیکھا جائے تو استعماری حربوں کی منظم، مسلسل اور ظالمانہ کارروائیاں اور سازش اور طاقت کے بل بوتے پر، کس ضابطے، قانون، آئین یا انسانی اقدار کے بعد سفاک رویہ بھی اسکی شہادت دیتا ہے کہ کس قدر شقاوت قلبی کے ساتھ انہوں نے کروڑوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ اپنی ظاہری قوت اور طاقت بلکہ حیثیت کے ناجائز استعمال کو بروئے کار لاکر کیا۔ بے بسی اور اور بے کسی کی تصویر کروڑوں انسان، کانگرس کی خواہش اقتدار جو برطانیہ کے اس خطے میں آخری وائسرائے کے در پردہ یار تھے کہ ان کے ہاتھ میں آلۂ کار بن گئے۔ نتیجہ معلوم کہ یہ حقائق اب تاریخ کے ایوان میں اپنے صحیح مقام پر مھکے ہیں، ٹھسے ہیں

جو صرف تقسیم کے نقشے بدلنے کی معنوی بلاغت سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

اولاً:۔ ہندو کانگرس کی ذہنی فسطائیت

ثانیاً:۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا نفسی ابتلاء ان دو پاٹوں میں کروڑوں انسان پس کے رہ گئے، اور یہی تقسیم ہند کے مراحل اور مسائل کا حقیقی عنوان بھی ہے۔ خاکسار فکر کے معروف صحافی مولوی سعید احمد نے اپنی خودنوشت میں انگریز، ہندو اور مسلم، تینوں کو بصورت رویے ایک پیراگراف میں سمیٹا ہے، جو تینوں قوموں کے فکر و فلسفہ کا بھی دریچہ وا کیے ہوئے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

> ''انگریز یہاں آئے بھی اجنبی بن کر، اور یہاں رہے بھی اجنبی بن کر، انہوں نے یہاں کا مذہب اختیار کیا اور نہ بود و باش، نہ اس خطے کو اپنا وطن بنایا۔ چنانچہ ایسی پابہ رکاب قوم کا جانا (زود یا بدیر) مقدر تھا۔ یورپ کی پے در پے جنگوں نے نو آبادیوں پر ان کی گرفت نرم کر دی تھی۔'' ''ہندو نے سمجھ لیا کہ چونکہ بدلے ہوئے نقشے میں بنائے حکومت ان کی تعداد ہوگی اور وہ تعداد میں زیادہ ہے اس لئے اس کی حکمرانی اٹل ہے۔ ہندو ان حالات کے پیش نظر اپنے دو قومی نظریے کو کہ جس پر وہ ایک ہزار برس سے عمل پیرا تھا، بیک قلم ترک کر دیا۔'' ادھر مسلمانوں کے لئے اس خوابیدہ حقیقت کا احساس ضرور ہو گیا، اس لئے کہ ہندو کو غلبہ اس نظریے کے ترک کرنے سے حاصل ہوتا تھا، اور مسلمانوں کو تحفظ اس کے اپنانے سے ملتا تھا۔'' (۲۴۰)

اسی فکر و نظر کا ایک سو برس کا عرصۂ سیاست تھا، جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کی برعظیم کی سیاستِ دوراں کا کبھی جوار بھاٹا، کبھی باہمی اتحاد، کبھی باہم دست و گریبان کبھی مکمل سکوت اور سناٹا، ان تین قوموں یا تین کونوں کی مثلث تھی، جس کا برٹش راج، آریہ سماج اور مسلم نزاع اور بغاوت کارفرما رہی ہے۔ اسی سے تینوں قوموں کے مزاجی رُخ، سیاسی اِدعا اور فکری خلفشار کو بخوبی دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ مولوی سعید احمد ہی اس رُخ سے برعظیم کی سیاسی قوتوں کے قومی رویے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''مسلمان انگریز سے ناراض تھا کہ اُس نے اُس سے تخت کیوں چھینا، ہندو اس لئے ناراض تھا، کہ وہ اس کے لئے تخت خالی کیوں نہیں کرتا۔ مسلمانوں میں غیظ و غضب تھا، ہندوؤں میں بے صبری تھی۔ مسلمانوں میں ماضی کا ماتم تھا، ہندوؤں میں مستقبل کے لئے بے قراری تھی۔'' (۲۴۱)

ایسے فکری زاویے میں تحریک پاکستان برعظیم کے مسلمانوں کی بقا کی دفاعی تدبیر کہہ لیں تو بھی ایک نقطۂ نظر سے اثبات کی حامل ہے، وگرنہ قومیں دین سے بنتی ہیں کہ سرزمین سے، یہ مملکتِ مدینہ کے بعد پہلی دفعہ تاریخِ اسلامی میں ایک اصولِ قدیم کی بازیافت تھی، جبکہ قائداعظمؒ عصری لحات کے دھارے اور وقت کے چیلنج کا (Response) بن کر اقبالؒ کے مردِ مومن کا روپ دھارے، ملتِ اسلامیہ برعظیم کا پاسبان بن گیا۔ مسلمانوں کی سلامتی کا عصر رواں میں اس سے بڑھ کر نظریاتی تحفظ تھا ہی نہیں جو فی الواقعہ ''اسلام نے مسلمانوں کا تحفظ کیا'' اور یہی خطبہ الہ آباد میں اقبالؒ کا حقیقی پیغام ہے، اسلام مسلمانوں کی کس طرح حفاظت کرتا ہے۔ یہ اقبالؒ و جناحؒ کی سیادت و قیادت کا عصری مقام ہے کہ تاریخ تحریک ہے کہ اجتہاد، بہرحال اور بہرطور یہ اسلام کا عصری شہود ہے، نظریاتی وجود ہے جو دو قومی نظریے اور پھر ہجرتِ مدینہ کی طرح ہجرت الی اللہ کے مہاجرین کی صورت ارضِ لا الہ کی طرف جان، مال، عزت و عصمت کی قربانی کا وہ لازوال باب ہے، جو واہگہ سے والٹن تک کی تاریخ نہیں، تحریکِ ہجرت کا باب بھی اور مستقر بھی! یا پھر پروفیسر مزار منور کے بقول مجملاً یوں بھی کہا جا سکتا ہے۔

تحریک پاکستان کے محرکات

''تحریک پاکستان، مسلمانوں کی دفاعی تدبیر تھی تاکہ وہ اپنی دینی، تہذیبی، علمی، لسانی اور تاریخی روایات کا تحفظ کر سکیں۔ اپنی ہستی کو ہندو جاتی کی بھاری اکثریت میں ضم ہونے سے بچا سکیں۔ تحریک پاکستان محض روٹی اور نوکری کا مسئلہ نہ تھا۔ یہ ملتِ اسلامیہ کی کثرتِ کثیرہ کی اجتماعی بقاء کا سوال تھا۔'' (۲۴۲)

کانگرس نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور انگریز دشمنی میں اندھی قیادت کو اپنے مقاصد کیلئے خوب خوب استعمال کیا۔ یہاں تک کہ

''کانگرس نے تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کو ختم کر کے مسلمانوں کے کچھ حصے کو کانگرس کے قوم پرستانہ مفادات میں جذب کر لیا اور باقیوں کیلئے ہجرت کی حوصلہ افزائی کر کے اپنا میدان صاف کرنے کی کوشش کی۔'' (۲۴۳)

وقت کی رفتار اور سیاست کی یلغار کو سن و سال کے تجزیہ و تاویل میں باندھنے کے باوصف پاکستان اور تحریک پاکستان اور اس کے بانیان (Founding Fathers) کے ہاں یہی نظریاتی جہت تو اس قدر شفاف ہے کہ برعظیم پر

انگریزی سامراج کے ایک سو نوے برس ہوں کہ پاکستان کی تحریک یا اب تک پاکستان کی تاریخ، برعظیم کی ملت اسلامیہ کا نظریاتی شہود اور پاکستان کی صورت میں جغرافیائی وجود، اقبالؒ و قائدؒ کے دو بیانات کے کوزے میں بند ہے۔

اقبالؒ خطبہ الہ آباد میں فرماتے ہیں

''میں یہ دیکھنا پسند کرونگا کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ مجھے تو شمال مغربی ہندوستان (موجودہ پاکستان) میں ایک منظم، مسلم ریاست کی تشکیل کم از کم مسلمانانِ ہند کا آخری مقدر معلوم ہوتی ہے'' کہہ کون رہا ہے؟ وہ ہستی جو خود اپنے بارے میں بتاتی ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینہ ادراک ہے
(اقبال)

قائداعظمؒ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں

''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا، جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔'' (۸ مارچ ۱۹۴۴ء)

تقسیم ہند کے کانگرس منصوبے اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ثالثی کا مدعا بن گئے، یہاں تک کہ وی، پی مینن کیا نہرو، کیا گاندھی، اپنے اپنے ایجنٹوں، رسوخ، سلوک روابط کے ساتھ ہندوستان ہتھیانے اور ''پنڈت ماؤنٹ بیٹن'' کو پوری طرح کانگرسی شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گئے، جس نے مسلمان اکثریت کے علاقوں کو اپنی وائسریگل لاج میں نقشوں اور منصوبوں کی سان پر کس لیا۔ ریڈ کلف ایوارڈ پر کانگرس انگریز گٹھ جوڑ اب کوئی راز نہیں رہا۔ چھ دہایاں گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ حقائق دوہائی دے رہے ہیں، کٹا پھٹا لولا (Truncated) پاکستان دیا گیا، جو زیادہ دیر زندہ رہنے کی صلاحیت اور توانائی سے عاری ہو اور وہ دوبارہ بھارتی یونین میں شامل ہونے پر مجبور ہو جائے، یا پھر بھارت کی بالا دستی کے آگے گھٹنے ٹیک دے، اسکی برابری کہاں بالا دستی قبول کرے ورنہ ختم ہو جائے یا لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا دستبرداری منصوبہ (Demission Plan) دوسری ترجیح بھی تھی اور تاویل بھی، جس میں اقتدار دو ماہ میں منتقل کر دیا جائے گا۔ جس میں مسلمان کُلی طور پر ہندو اکثریت کے سامنے ایک اقلیت کا درجہ رکھیں گے، یہ دو دھاری تلوار تھی۔

جسے (No Choice) کی صورت حالات نے قائداعظمؒ کے سامنے دو راستے رکھ دیئے تھے، یا پارٹیشن پلان یا (Demission Plan)!

قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ :۔

"قائداعظمؒ کے سامنے دوراستے تھے۔ایک پارٹیشن پلان(Partition Plan) تھا،اس کے تحت ہندوستان ۱۴اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت اور پاکستان کی دوآزاد خودمختار مملکتوں میں تقسیم ہورہا تھا، پاکستان میں صرف مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ اور بلوچستان براہ راست شامل تھے، سہلٹ (مشرقی بنگال) اور صوبہ سرحد میں ریفرنڈم ہونا تھا،سرحدوں کے تفصیلی تعین کیلئے باؤنڈری کمشن قائم کیا جانا تھا،اگر مسلم لیگ فوری طور پر پارٹیشن پلان کو منظور نہ کرتی،تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا Demission plan یکطرفہ عمل درآمد کے لئے میز پر تیار پڑا تھا۔اس منصوبے کے تحت صوبہ سرحد سمیت ہندوستان کے آٹھ صوبوں کا کنٹرول ۱۴اگست سے براہ راست کانگرس کے ہاتھ میں چلا جاتا وہاں پر کانگرسی وزارتیں قائم تھیں، پنجاب میں گورنر راج تھا،لیکن وہاں بھی یونینسٹ پارٹی کے گرگے موجود تھے جو ہندو کانگرس اور سکھ اکالیوں کیساتھ ملکر ہر چڑھتے سورج کو سلام کرنے کا عملی تجربہ رکھتے تھے۔صرف سندھ اور بنگال میں مسلم لیگی وزارتیں تھیں، جن کے خلاف کانگرسیوں اور دوسری ہندو پارٹیوں کے پریشر گروپ زبردست ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔"(۲۴۴)

قدرت اللہ شہاب شہادت دیتے ہیں کہ اس صورتِ حالات میں قائداعظمؒ نے ایک عظیم مدبر، عملی سیاستدان اور صاحب فراست مسلمان کے شایانِ شان راستہ اختیار کیا۔ان کے مطابق :۔قائداعظمؒ کے لئے اقبالؒ کا شعر سمجھتا ہے کہ

کار ملت محکم از تدبیر او
حافظ دین مبین شمشیر او

۱۔ایک طرف Truncated پاکستان تھا، دوسری طرف ہندوؤں کی ابدی غلامی کا عفریب منہ کھولے بیٹھا تھا۔ان دو متبادل صورتوں کے درمیان قائداعظمؒ نے وہی راستہ اختیار کیا، جو ایک عملی سیاستدان، دوراندیش مدبر، اور صاحب فراست مسلمان کے شایان شان تھا۔انہوں نے بڑے واضح احتجاج کے ساتھ پارٹیشن پلان منظور کرلیا۔" وہ مزید لکھتے ہیں کہ

۲۔جن لوگوں کے دل میں اب بھی یہ وہم ہے کہ اس وقت Truncated پاکستان قبول کرنے کے سوا اور بھی کوئی چارہ کارتھا انہیں ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس کی ملی بھگت کے پس منظر میں Demission Plan کا تفصیلی مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔"

۳۔"آخر کار ۳ جون ۱۹۴۷ء کا تاریخی دن طلوع ہوا، اور تقسیم ہند کے منصوبے کا باضابطہ سرکاری پر اعلان کردیا گیا۔"(۲۴۵)

اس میں تقسیم بنگال اور تقسیم پنجاب کی ہندو، سکھ آبادی اور مسلم اکثریت کی حد بندی کے مراحل و مسائل رہے۔
باؤنڈری کمیشنوں کی صوابدید پر جہاں تقسیم پنجاب کا ریڈکلف ایوارڈ، دیانت و انصاف اور انسانی وقار کے علاوہ عدلیہ کے نام پر دھبے کا تاریخی سمبل ہے وہاں ہندو، انگریز گٹھ جوڑ کی مسلم دشمنی بلکہ مسلم مملکت دشمنی کا مسیحی یورپ اور ہندی ترشول یکساں دردِ مشترک کی روائیداد ہے۔ کس طرح پنجاب کے ضلع گورداسپور کو آخری وقت میں انسانوں اور انصاف کا خون کر کے زبردستی اور اپنے منصب اور مقام کے ''انقلاب تام'' کا یہ المیہ ہے۔ صرف اس لئے کہ بھارت کو کشمیر کا زمینی راستہ دیا جائے، بلکہ راستہ ہموار کر دیا گیا۔ البتہ صوبہ سرحد کا ریفرنڈم اور مشرقی پاکستان کے ضلع سہلٹ کا ریفرنڈم کس برتے یا بل بوتے کا شاخسانہ ہے۔ وہاں متحدہ قومیت کا ہندو سرمایہ و سیاست، اور مذہبی خاندانی سیادت کا دامِ ہمرنگ زمین، مسلم اکثریت، مسلم علاقے اور مسلم ملت کے درمیان مسجدِ ضرار کے ٹولے نہ کہیں تو اور کیا کہیں، نہیں بلکہ درسِ نظامی کا طائفہ بھی کہا جا سکتا ہے۔
سہلٹ میں جمعیت علماء ہند کے صدر اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے مریدوں کا علاقہ خاص تھا، چائے کے باغات اور ٹھنڈک اور خنکی کی مرطوب نمی، حضرت مولانا کے ایامِ رمضان المبارک کا قیام ہوا کرتا تھا۔ جبکہ سرحد میں سرخ پوش سرحدی گاندھی، خان عبدالغفار خان اور ان کے بھائی ڈاکٹر خانصاحب کی کانگرسی وزارت تھی۔ خان عبدالغفار خان نے اولین کوشش تو یہ کی کہ صوبہ سرحد کی صوبائی اسمبلی کے کانگرسی اکثریت کے ارکان کی رائے سے اُسے بھارت میں شامل ہونے کی منظوری دی جائے۔ گاندھی سے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک نے اسے محال جانا، البتہ مسلم مملکت پاکستان میں صوبہ سرحد کی شمولیت کی بجائے، خان عبدالغفار خان کو کانگرس نے یہ نسخہ کیمیا عطا کیا کہ وہ پختونستان کے نام پر ایک علیحدہ ملک بنانے کا مطالبہ کریں، اعلان کریں۔ لگتا ہے کہ کانگرس نے جمعیت علمائے ہند کے ضلع سہلٹ، اور سرحد کے عبدالغفار خان کی کانگرسی قیادت اور ان کے بھائی ڈاکٹر خانصاحب کی کانگرسی وزارت کو آخری لمحوں میں بھی ان سے وہ سب کچھ وصول کرنے کی کوشش کی، جو ان پر صرف کر چکی تھی، خرچ کر چکی تھی، ورنہ سرحد اور سہلٹ کا ریفرنڈم کس کے ایماء، اشارے اور عزائم کا تلاطم تھا۔ یہ سراسر اکابر پرستی اور مسلک بلکہ خاندان پرستی کا سیاسی شہکار تھا۔

سہلٹ کا ریفرنڈم

پروفیسر محمد اسلم لکھتے ہیں کہ

> ''سلہٹ، جو جمعیت العلماء کا عظیم مرکز سمجھا جاتا تھا، جہاں مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) کے ہزاروں مرید موجود تھے اور مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ رمضان المبارک سلہٹ ہی میں گذارا کرتے تھے وہاں پر مولانا ظفر احمد عثمانی (م ۱۹۷۴ء) نے قائداعظمؒ کے ایماء پر عوام کو پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کے لئے تیار کیا۔ جب وہاں ریفرنڈم ہوا تو وہاں کے عوام کی اکثریت نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔'' (۲۴۴)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ

صوبہ سرحد میں ریفرنڈم

''صوبہ سرحد میں کانگرس کی وزارت قائم تھی اور ڈاکٹر خان صاحب وزیراعلیٰ تھے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزادؒ کہ کانگرس اس غلط فہمی میں رہی کہ صوبہ سرحد مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں ہے۔ جب صوبہ سرحد میں ریفریڈم ہوا، تو سرحدی گاندھی عبدالغفار خان نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ سرحدی گاندھی نے کہا کہ سرحد کے عوام کو پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے کے علاوہ پختونستان کے حق میں بھی ووٹ دینے کا موقع دیا جائے۔ اس پر وائسرے نے ہندوؤں کا طرفدار اور پاکستان کا مخالف ہونے کے باوجود رولنگ دی کہ ۳ جون کے پلان میں اس کا ذکر نہیں آیا اس لئے وہاں کے عوام بھارت یا پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کے مجاز ہیں۔ اس زمانہ میں حضرت محمد امین الحسنات پیر صاحب مانکی شریف (م ۱۹۶۰ء) اور حضرت عبدالطیف پیر صاحب زکوڑی شریف (م ۱۹۷۸ء) نے سرحد کے عوام کو پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کیلئے تیار کیا۔ جب سرحد میں ریفرنڈم ہوا تو ۲۸۷۴ کے مقابلے میں ۲۸۹۲۴۴ ووٹوں سے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ ہوا۔ اس سے سرحدی گاندھی اور ڈاکٹر خان صاحب کی صوبہ سرحد میں مقبولیت کا بھرم کھل گیا۔'' (۲۴۷)

کانگرس سرحد میں خان غفار یا کانگرسی وزارت کی وجہ سے کسی غلط فہمی میں تھی کہ نہیں البتہ ان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے کانگرس کے اندرونِ خانہ سے ''غلط فہمی سے حساب فہمی'' کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ارشاد ہے کہ ۴۶۔۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں غفار خان نے مال بنایا، کانگرس کا پیسہ انکی تجوریوں کی نذر ہو گیا۔ کانگرسی پیسہ کانگرسی امیدواروں کو ملا ہی نہیں مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

غفار خان نے مال بنایا

''عام انتخابات کے دوران میں کانگرس نے بڑی بھاری رقوم خان برادران کی تحویل میں دی تھی۔ لیکن انہوں نے ان رقوم میں کم سے کم خرچ کیا۔ انتخابات میں ہارنے والے امیدواروں کو مدد نہیں ملی۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ کثیر رقوم (ان کی تجوری) میں موجود تھیں، تو وہ خان برادران کے شدید مخالف ہو گئے۔'' (۲۴۸)

یاد رہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ بذات خود صوبہ سرحد اور پنجاب میں کانگرسی امور کے انچارج بھی تھے، بلکہ وہ پہلی دفعہ صوبہ سرحد ہی کی سیٹ پر مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن بنے تھے۔ آزادی کے بعد پہلے گڑگاؤں اور پھر رام پور سے

بھارتی لوک سبھا (ایوانِ زیریں) کے رکن منتخب ہوئے، اور جادووہ جو سر چڑھ کر بولے، کہ مولانا آزاد کو پارلیمانی نشست کیلئے گڑگاؤں یا رام پور کے حلقوں سے اس لئے کھڑا کیا گیا کہ وہاں ووٹروں کی اکثریت مسلمان تھی۔ اسے کہتے ہیں دوقومی نظریہ بلکہ دوقومی عمل جو بھارت کے اندر تا حال دوقومی جدل کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صدر جمہوریہ ہند، ڈاکٹر ذاکر حسین تک نے رام پور پارلیمانی حلقے سے مولانا آزادؒ کے امیدوار ہونے پر اظہار تاسف کیا تھا کہ اس سے متحدہ قومیت کے تصور و تخیل کی عملی نفی بلکہ تکذیب واقع ہوئی ہے۔ اس لئے اگر مسلم دانشور، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پاکستان دشمن رویے پر اظہار تاسف کریں تو اُسے علماء دشمنی کہہ کر چپ نہیں کرایا جاسکتا حالانکہ روایتی، ملائیت کا چیچک زدہ چہرہ روشن کرنے کا آخر حاصل کیا ہے؟ اسی لئے متحدہ قومیت پر ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ کہنا کہ

''جمعیت العلماء ہند کے مولانا حسین احمد مدنی اور ابوالکلام آزاد مسلمانوں کی الگ مملکت کے حامی نہ تھے، سو یہ وہی طرز فکر تھا، جو اکبر اور دارا شکوہ کے ہاں موجود تھا'' (۲۴۹)

تو بات ایسی بے جا بھی نہیں اور تو اور شیخ الہند، امام الہند کی اصطلاحیں بھی وطنی قومیت کا ادعا ہی نہیں اسکا کھلا اظہار بھی تو ہے۔ فقہ، مصالحت کے تقاضے، مدرسہ کی مجبوری یا مسلک کی تاویل و تعبیر ہو، تو ہو، امتِ مسلمہ کے درد کا درمان نہ ہو، تو پھر سالارِ کارواں حضور سرکار دو عالم ﷺ ہیں جو عصرِ رواں میں اسلام کی تا ابد جامعیت کا منبع، مرکز اور مدینہ ہیں۔ ان کے فیض سے ساری کائنات روشن ہے مگر اقبال نے سچ فرمایا

زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم الا کلام

مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنے سوانح نقش حیات جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ

مولانا حسین احمد مدنیؒ اور کانگرس سے تعلق

''میں اگرچہ پہلے سے کانگرس میں شامل نہ تھا، مگر مالٹا سے واپسی پر کانگرس کا باقاعدہ ممبر بن گیا اور ہمیشہ جدو جہد آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کے مصائب بھی اہل ملک کے ساتھ ساتھ جھیلتا رہا۔ بفضلہٖ تعالیٰ اس میں کامیابی ہوئی اور انگریزوں کی غلامی سے تمام ہندوستان آزاد ہو گیا فالحمد للّٰہ اولاً و اخراً o ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ'' (۲۵۰)

یہی سبب ہے کہ سلہٹ کو جمعیت علماء ہند کا قلعہ اور مولانا حسین احمد مدنی کے مریدوں کا علاقہ گردانا جاتا تھا۔ بتایا گیا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی روحانی بیعت کا یہ عالم تھا کہ سلہٹ کے عوام ان کی ارادت میں ٹوٹے پڑتے تھے، مگر جب پاکستان کے لئے ووٹ دینے کے ریفرنڈم کا مرحلہ آیا تو ان مریدوں نے مرشد کی سیاسی تائید کی بجائے، ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، صدر جمعیت علمائے ہند، برطانوی کیبنٹ مشن سے ملاقات کے بعد
وائسرائے لاج دہلی سے باہر آتے ہوئے۔

پروفیسر محمد اسلم لکھتے ہیں کہ

''مولانا حسین احمد مدنیؒ جب بیعت لینے بیٹھتے تو لوگ اپنی پگڑیاں کھول کر ایک دوسری کے ساتھ باندھتے جاتے اور اس ''حبل اللہ'' کو پکڑ کر بیک وقت ہزاروں افراد ان کے دامن ارادت سے وابستہ ہو جاتے۔ کانگرس اور اس کی ذیلی جماعت جمعیت علماء ہند اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ سلہٹ تو گھڑے کی مچھلی ہے اور استصواب میں وہاں کے مسلمان ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر دینگے۔ قائداعظمؒ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خواہرزادے مولانا ظفر احمد عثمانی کو سلہٹ بھیجا کہ وہ وہاں کے عوام کو پاکستان کے ساتھ الحاق کا مشورہ دیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی خود بھی مشرقی بنگال سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر مرکزی اسمبلی میں پہنچے تھے۔ سلہٹ میں ریفرنڈم ہوا تو مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مخلص مریدوں نے بھی پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا''(۲۵۱)

یقیناً یہی سبب تھا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان قائم ہوا تو بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ''کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کو یہ اعزاز بخشا کہ وہ ایک آزاد اسلامی مملکت کا پرچم لہرائیں۔''(۲۵۲)

جمعیت علماء ہند اور مسلم لیگ

ع این چہ بوالعجبی است؟

ابوالحسن اصفہانی، اندر کی کہانی سناتے ہیں، اپنی مشہور کتاب'' قائداعظم محمد علی جناحؒ جیسا کہ میں انہیں جانتا ''ہوں میں ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے آل انڈیا مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کی روائیداد بتاتے ہوئے خوف آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"Before I pass on from the Lahore meeting of the All-India Muslim League Parliamentary Board, I shall record an incident which both surprised and hurt me to the quick.

In the course of the Parliamentary Board meeting several speeches were delivered in keeping with our tradition and weakness for speech-making. On the first day, I remember Mufti Kifayathullah and Maulana Husain Ahmad Madani supporting Mr. Jinnah and welcoming his move to bring the Muslim League into the arena of live politics. But on the last day, one of these two men of

learning put forth the suggestion that to ensure the success of the League as a party at the polls, effective and relentless propaganda would be necessary and, for that purpose, Deobund would place its machinery at the League's disposal on condition that the cost of the propaganda be borne by the League. To start with, it was estimated that Rs. 50,000 would be necessary. The League had not, of course, fifty coppers in its coffers. The President and Secretary, both honorary, carried their offices in their respective portmanteaux.

The Maulanas knew the financial position of the League better than most of us present. So they must have expected the obvious response to their proposal. Mr. Jinnah had to tell them that no such funds were available nor did he entertain hopes of collecting the amount in the immediate future. He appealed to all to work with whatever resources that could muster and to produce some positive results. "If people know that we sincerely mean to work for their good", he said, "Money would come without doubt. But let us first work."

How true his words were was proven in later years when he succeeded in making the Muslims the third power in the land, the British and the Hindus being the other two. The people's response to his appeals for funds in later days was always prompt and generous. Money poured in from two annas to lacs from all corners of the country. But, as I have said, this was in later years. In June, 1936, however, the Muslim League had no funds and Mr. Jinnah could not, therefore, accept the offer of the Maulanas to place the propaganda machinery of the Deobund Seminary at his disposal condition of financial support.

The Maulanas appeared disappointed. They drifted in the direction of the Hindu Congress and conducted propaganda for the Congress Party which,

of course, could meet their financial demands. This was a bitter shock to me as I did not expect men learned in religion to become obstacle in the way of Muslims who were struggling for their national freedom. I could never dream that such venerable gentlemen could place personal and parochial interests before those of the nation." (253)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یاد ہے کہ پہلے روز مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مسٹر جناح کی تائید کی اور ان کی اس تحریک پر کہ مسلم لیگ کو زندہ سیاست کے اکھاڑے میں لایا جائے، خوشنودی کا اظہار کا لیکن آخری روز ان دو عالموں میں سے ایک نے یہ تجویز پیش کی کہ چونکہ انتخابات میں ایک جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے موثر اور مسلسل پراپیگنڈہ کی ضرورت ہوگی لہذا دیوبند اپنے تمام ذرائع لیگ کی خدمت میں پیش کر دے گا بشرطیکہ پروپیگنڈہ کا خرچ لیگ برداشت کرے۔ اندازہ لگایا گیا کہ شروع میں کوئی پچاس ہزار روپے درکار ہوں گے۔ ظاہر ہے اس وقت لیگ کے صندوقچے میں پچاس تانبے کے سکے بھی نہ تھے۔ صدر اور جنرل سیکرٹری جو دونوں اعزازی تھے، اپنے دفتر اپنے تھیلوں میں اٹھائے پھرتے تھے۔ مسٹر جناح کو انہیں بتانا پڑا کہ ایسی کوئی رقم موجود نہ تھی اور نہ ہی انہیں یہ امید تھی کہ وہ مستقبل قریب میں اتنا روپیہ جمع کر سکیں گے۔ انہوں نے سب سے اپیل کی کہ وہ جو بھی ذرائع خود فراہم کر سکیں، ان سے کام لیں اور کوئی مثبت نتائج کر کے دکھائیں، جون ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے پاس کوئی روپیہ نہ تھا، لہٰذا مسٹر جناح، مولانا کی یہ پیش کش منظور نہ کر سکے، کہ مالی امداد کی شرط پر کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے تمام ذرائع تبلیغ ان کے لئے وقف کر دینگے۔'' (۲۵۴)

مسٹر ابوالحسن اصفہانی نے اپنا نقطۂ نظر یہ لکھا ہے کہ

''معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؤں کو اس سے مایوسی ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ ہندو کانگرس کی طرف ڈھلتے چلے گئے، اور کانگرس پارٹی کیلئے پرچار کرنے لگے جو ظاہر ہے اس کے مالی تقاضے پورے کر سکتی تھی۔ یہ میرے لئے ایک تلخ صدمے کا باعث ہوا کیونکہ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ خود علماء دین مسلمانوں کے راستے میں جو اپنی قومی آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے۔ حائل ہو جائیں گے۔ مجھے کبھی یہ یقین نہ آتا تھا کہ ایسے قابل تعظیم حضرات، ذاتی اور جماعتی مفادات کو قوم کے مفادات پر مقدم رکھیں گے۔'' (۲۵۵)

جھانسی الیکشن

یو پی میں چوہدری خلیق الزمان اپنی خودنوشت شاھراہ پاکستان میں رقمطراز ہیں کہ ''خان بہادر حبیب اللہ جو جھانسی سے ہمارے ممبر منتخب ہوئے تھے ان کا انتقال ہو گیا اور جون میں ان کی خالی نشست کے لئے انتخاب ہوا۔ اس زمانہ سے مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء میں کھلی رسہ کشی شروع ہو گئی تھی اس لئے دونوں جماعتیں طاقت آزمائی کے لئے جھانسی پہونچیں۔ کانگریس کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی مگر شکر ہے کہ اس وقت راجہ محمود آباد راجہ امیر احمد خان بالغ ہو چکے تھے اور ان کا تعلقہ ٹرسٹیوں نے واگزار کر کے ان کے حوالہ کر دیا تھا۔ ان نوجوان راجہ صاحب نے اپنے منیجر اے۔ بی حبیب اللہ کو ہدایت دے کر روانہ کیا کہ وہ جھانسی الیکشن کا تمام صَرفہ برداشت کر لیں دوسری طرف مولانا شوکت علی مع اپنے رفقاء مولانا جمال میاں مفتی عنایت اللہ مولانا حامد بدایونی سیّد ذاکر علی اور مولانا کرم علی کے جا کر جھانسی کے میدان میں ڈٹ گئے۔ جمعیۃ العلماء نے بھی اپنی پوری قوت صَرف کر دی ہے مگر بالآخر مسلم لیگ امیدوار کامیاب ہوا۔ اس الیکشن کے سلسلہ میں پنڈت جواہر لال کا ایک خط رفیع احمد کے نام مسلم لیگ والوں کے ہاتھ لگ گیا جس میں مولانا حسین احمد کو روپیہ دینے کے متعلق ذکر تھا اس کو مسلم لیگ والوں نے خوب خوب اُچھالا تا کہ عوام یہ سمجھ لیں کہ نثار احمد شیروانی جن کی جمعیۃ العلماء تائید کر رہی تھی وہ دراصل کانگریسی نمائندے ہیں۔ یہ تو واقعہ تھا کہ وہ کانگریسی نمائندے تھے مگر مولانا حسین احمد کو روپیہ دینے کے معاملے میں ان پر الزام صحیح نہیں تھا کیونکہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کبھی میں ان کو انتخابات کے دورے وغیرہ کو مصارف کے متعلق روپیہ دیا تو اس کا ایک ایک پیسہ کا انھوں نے مجھے حساب دیا اور بقیہ رقم مجھے واپس کر دی۔ اس لئے میرے خیال ہے کہ جس روپیہ کا ذکر تھا وہ انھیں الیکشن کے مصارف کے متعلق دیا گیا ہوگا۔'' (۲۵۶)

مسلم بیداری

''البتہ یو پی میں اندرون خانہ مسلمانوں میں سیاسی بداخلاقی اور نفسیانیت چل رہی تھی مگر مسلم عوام میں بیداری کی ایک لہر خود کانگریس اور انگریز کے قوانین اور اعمال اور افعال سے پیدا ہوئی جارہی تھی جس میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا تھا صدیوں ہندوستان میں حکومت کرنے کے بعد جب وہ تھک کر چور ہو گئے اور انگریز کی سیاسی چالوں سے زک کھا کر ان کے سامنے ہتھیار ڈال کر بیٹھ گئے تو وہ اس کو اپنا دائمی مستقبل سمجھنے لگے کیونکہ دنیا کی کوئی اور قوم اس وقت تک انگریز کو چراغ دکھا سکتی تھی اور خود ہندوؤں کو وہ کبھی اس قدر طاقتور نہ سمجھتے تھے کہ وہ انگریزوں سے بغاوت کر کے انگریز کے جانشین بن جائیں گے انھیں کیا معلوم تھا کہ انگریز ہندو اخبارات کے اپنے خلاف مضامین کو توپ کا گولہ سمجھتا ہے اور جیکارے کے نعروں کو انفیلڈ رائفل کی گولیاں سمجھتا ہے۔ مگر جب کانگریس کے انتخابات کے نتیجہ میں ان کو معلوم ہوا کہ اب انگریز محل میں زنانخانہ میں رہے گا اور ہندو وزارت ملک کا کام سنبھالے گی تو ان کو اپنا سیاسی مستقبل بھیانک شکل میں نظر آنے لگا اور ان کے چائے خانوں، ہوٹلوں

دوکانوں چوراہوں پارکوں اور گھروں تک میں انہیں حالات پر تبصرے ہونے لگے۔ میں مسلمان کی نبض پہچانتا تھا اور جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا بلکہ اس سے زائد مگر میرے پاس اب کانگریس کو سمجھانے کے لئے کوئی ذریعہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اگر صرف ہندوؤں کا معاملہ ہوتا تو پھر بھی کوئی راہ نکالنے کی کوشش کرتا مگر مولانا ابوالکلام اور جمعیۃ العلماء نے میری ٹانگ توڑ دی تھی۔"

رفیع احمد قدوائی نے پنڈت نہرو کے خط میں کہا تھا اُسکا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے کہ:

"علامہ نے پاکستان کا تصور پیش کیا اور ملت اسلامیہ کے لئے سیاسی استقلال اور آزاد سلطنت کے طالب ہوئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل دین سب سے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کریں لیکن علماء میں بڑے بڑے اکابر نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ امام ہند بننے کے خواب دیکھنے والے، ہندوؤں کے وظیفہ خوار اور دین سے ہٹی ہوئی وطن پرستی میں ان کے ہم کلام ہی نہیں بلکہ ابوالکلام یعنی کلام کے باپ ہوگئے۔ جن کے علم وتقویٰ پر مدینے کی مہر ثبت تھی، ان کی بابت جواہر لال نہرو کا ایک خط شائع ہوگیا کہ حسین احمد کو اتنے روپے دے چکا ہوں، اب وہ اور مانگتے ہیں۔ نہرو نے ان کے نام کے ساتھ نہ مولانا لکھا نہ جناب اور صاحب، اس سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ ایسے علماء کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ بے چارے اقبالؒ کے مقابلے میں عمامہ والوں کی صفیں آمادہ بہ پیکار ہوگئیں۔

اقبال نے ملائیت کے اس مظاہرے سے جل کر کہا:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ھمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بو لہبی است (۲۵۷)

یوپی اسمبلی

چوہدری خلیق الزماں، ۱۹۳۷ء کے یوپی الیکشن کے بعد اب یوپی اسمبلی کا ذکر کرتے ہیں کہ

"اپنی پارٹی کے ممبروں کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں مگر میرے مقابل بیٹھنے والوں میں پنڈت گوبند ولبھ پنت ڈاکٹر کاٹجو سمپورنانند مسز پنڈت مہابیر تیاگی، کیشو دیومالویہ، اجیت پرشاد، لال بہادر شاستری، گوپی ناتھ سری واستو، ڈاکٹر جواہر لال اور تقریباً تمام اور لوگ سب وہ تھے جو میرے دوست اور ساتھ کے کام کرنے والے تھے مسلمانوں میں رفیع احمد قدوائی اور حافظ ابراہیم تھے۔ حافظ ابراہیم نے اپنے ایک عزیز کو میرے پاس بھیج کر الیکشن کے لئے کچھ روپیہ طلب کیا تھا جو

میں نے انھیں فوراً بھیج دیا تھا اور وہ لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے۔ مگر جمعیتہ العلماء کی شہ پا کر وہ مسلم لیگ کو چھوڑ گئے رفیع احمد قدوائی میرے عزیز ترین دوست ولایت علی بمبوق مرحوم کے سگے بھتیجے تھے انکے تمام اعزا میرے دوست یا عزیز تھے وہ خود میرے ساتھ خورد کی حیثیت سے پیش آتے تھے۔ اور میرے چھوٹے بھائی مشفق سے ان کے عزیزانہ تعلقات تھے۔ ان تمام آدمیوں کے مقابلہ میں بیٹھ کر ہر روز ہر مسئلہ پر ہم لوگوں کا مخالفت میں لمبی لمبی تقریریں کرنا سخت فقرے کہنا اور سننا مہا بھارت کی یدھ کی یاد دلائی تھی۔ صدیوں ایک ہی سر زمین میں رہنا یوپی میں ایک ہی زبان بولنا ایک ہی کلچر اور ثقافت کو فخر کے ساتھ اپنانا ایک ہی موسم کے گیت گانا۔ ایک ہی زمین اور پہاڑوں کو دیکھ کر خوش ہونا ایک ہی چاند اور سورج کو دیکھ کر ان کے گن گانا اور اب کانگریس کا مغربی جمہوریت کی بدولت انھیں کو ایک دوسرے سے بیگانہ بنانا حیرت اور استعجاب کا ایک بڑا پہاڑ تھا جو ہمالیہ سے کہیں زیادہ اونچا تھا۔ اور باوجود اپنی تمام مضبوطی کے اس کے پھٹ جانے کا خوف۔ یہ سمجھنا کہ مسلم لیگ والوں کو اس لڑائی سے دکھ نہیں ہوتا تھا مہا سبھائی افسانہ ہے ہمیں بھی قلق تھا ہم بھی اپنے دلوں میں اس منظر سے پژمردہ تھے مگر ہمارے لئے موت اور زیست کا سوال تھا۔ ہندو ہم کو کچھ دے کر بھی زندہ رہ سکتے تھے مگر ہم سب کچھ کھو کر بھی ہندو حرص کا پیٹ نہیں بھر سکتے تھے۔

میں خود تو اسمبلی میں بہت کم پہنچ سکتا تھا کیونکہ میرے دن رات زیادہ تر تانگہ اور بیل گاڑی کی سواری کے نذر رہتے تھے میں اپنے چھوٹے سے قافلہ کے ساتھ جس میں زیادہ تر مفتی عنایت اللہ، جمال میاں، عبدالعزیز وکیل ایوب قریشی، ڈاکٹر نعیم انصاری وغیرہ شامل ہوتے تھے شہر قصبات اور دیہات میں مارا مارا پھرا کرتا تھا ان دوروں میں میرے کام میں مولانا آزاد کا شرائط نامہ بہت بڑی مدد کرتا تھا۔ مسلم ممبران کی اسمبلی کی تقریریں اب یوپی میں گھر گھر پہنچنے لگی تھیں۔ اور جب وہ ہماری کانگریس سے شکایت کو میری زبان سے جن کو وہ اب تک خلافتی اور کانگریس سمجھتے تھے سنتے تھے تو وہ متحیر ہو جاتے تھے۔ اور اس زمانہ میں ہم ہندو ذہنیت کو اس سے زیادہ اور کیا کہتے تھے جو آج آزاد ہندوستان میں خود اکثر ہندو زعما اپنی قوم کی فرقہ واریت کے متعلق نہیں کہتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ہم وہ سب کچھ ۱۹۳۷ء میں کہنے لگے تھے۔ جو اب بعض ہندو محب وطن ہندوستان میں ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۱ء میں کہنے لگے ہیں۔ اگر اس خلیج کو اس وقت پاٹ دیا گیا ہوتا تو آج فرقہ واریت ہندوستان کو اس طرح بدنام نہ کرتی۔ اس کے باوجود ہماری اسمبلی پارٹی کی زور آزمائی برابر جاری تھی ظہیر الحسن لاری محمد اسحٰق خان ظہیر فاروقی عزیز احمد خان۔ کریم الرضا خان۔ رضوان اللہ سب کے سب اچھے بولنے والوں میں تھے مگر ظہیر الحسن اور محمد اسحٰق اسمبلی کے کام کے لئے ہمارے بہترین مقرر تھے۔ ظہیر الحسن لاری میری پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے اور رضوان اللہ مسلم لیگ کے سیکرٹری ۱۹۴۶ء میں میرے استعفٰی کے بعد ظہیر الحسن لاری پارٹی لیڈر بھی ہو گئے تھے۔

میرا گھر خیالی گنج میں پورا ریڈیو اسٹیشن ہو گیا تھا میری ایک ایک منٹ کی زندگی اور خیالات کا حال شہر میں فخریہ بیان ہونے لگا تھا۔ مسلمان جاگنے لگے اور خوب جاگنے لگے۔ اس وقت میری قسمت میرے ساتھ تھی داؤں پر ایک لگا تا تھا تو

مشیت مجھے دس واپس کرتی تھی ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ مہینہ دو مہینہ کی دوڑ دھوپ میں یو پی سے کئی لاکھ ممبر مسلم لیگ کے بن جائیں۔اس لئے میں اب شکر کرنے لگا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے شرائط نامہ پر دستخط نہ کر کے میں نے اپنی قوم کو بچالیا۔ بچارے مولانا آزاد جب مجھ سے مل کر ۱۳/ جولائی کو الہ آباد پہونچے تھے تو ان کو ڈاکٹر محمد اشرف ۔نریندرا پرشاد سنگھ نریندر دیو ور پرشوتم داس ٹنڈن نے گھر لیا تھا اور اس کمیونزم اور ہندوازم کے اتحاد نے ان کو بالکل پسپا کر دیا اور اس وقت ان کے سامنے صرف ایک راہ عمل کھلی ہوئی تھی یعنی یا تو وہ ان سے اتفاق کریں یا اپنی زونل صدارت سے مستعفی ہو جائیں ۔مگر مولانا کی ہمت جواب دے گئی کیونکہ میرا آج بھی اعتقاد ہے کہ اگر ایک مضبوط راہ پکڑ لیتے اور استعفیٰ پیش کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تو جواہر لال ان کو دل برداشتہ کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوتے کیونکہ اس وقت مولانا کے ساتھ پنڈت جی کو جمعیۃ العلماء سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا۔اب کچھ عرصہ سے مولانا نے پنڈت جواہر لال پر سارا الزام لیگ کانگریس کی لڑائی کا تھوپ دیا ہے مگر اس کا ان کے پاس کیا جواب ہے کہ پنڈت جواہر نے ۱۲/مئی ۳۷ء کی میری ملاقات کے بعد مولانا کو اجازت دی کہ وہ مجھ سے صلح کی گفتگو کریں۔بہر نوع مولانا سے یہ نہ ہو سکا۔مشیت ہمارا کارواں کہاں لیجارہی ہے ہمیں اس وقت کیا معلوم ہو سکتا تھا۔

میرا دورہ علی گڑھ

جمعیۃ العلماء کی طرف سے پوری امداد کی امید پر مسلم ماس کنٹیک کی تحریک کانگریس نے بڑی شدت سے شروع کردی جس کا مدعا یہ تھا کہ وہ مسلم عوام کو مسلم زعماء کے اثرات سے بچا کر ان کو علماء کی گود میں لا ڈالا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں ہمارے ان فہیقوں اور محدثوں کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے اپنی عقل سلیم کو بالکل خیر باد کہہ دیا تھا اور کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ ان کی تحریک اگر کامیاب ہوئی تو بالآخر وہ مسلم عوام ان کے ہو کر بھی نہ رہیں گے۔خواہ مسلم لیگ کے رہیں یا نہ رہیں بہر نوع اس ماس کنٹیک کا ہمیں مقابلہ کرنا ہی تھا اور شکر ہے کہ وہ تحریک چند ہی دن میں کھوکھلی ہو کر مرگئی۔

اودھ کے چند اضلاع کے دورے کے بعد ماس کنٹیک سے اختلاف کے سلسلہ میں میں علی گڑھ یونیورسٹی گیا جو میری سیاست کی اوّلین تعلیم گاہ تھی اور میں بخوبی سمجھتا تھا کہ علی گڑھ کو اگر میں نے مسلم لیگ کے لئے خاص نہ کر لیا تو کانگریس سے لڑائی میں ہماری شکست یقینی ہے۔وہاں پہنچ کر میں اپنے ماموں زاد بھائی محمد حبیب صاحب کے یہاں جو وہاں تاریخ کے پروفیسر تھے ٹھہرا۔لڑکوں نے دوسرے دن چار بجے شام کو اسٹریچی ہال میں ایک جلسہ منعقد کیا جس کی صدرات پروفیسر اے۔بی۔اے حلیم نے کی جو اس وقت وہاں تاریخ کے پروفیسر تھے اور اس کے بعد پاکستان میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اب ریٹائرڈ ہو گئے ہیں۔اتفاق سے سید حسین جو علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور الہٰ آباد کے انڈی پنڈنٹ اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اس جلسہ میں موجود تھے موصوف نے صدر صاحب کی اجازت سے میرا تعارف کرایا حالانکہ یہ غیر

ضروری تھا۔ میرے تین چار برس کے فٹ بال کے سیکرٹری اور فٹ بال کیپٹن کے نام کے بورڈ اس وقت تک ڈائینگ ہال میں لگے ہوئے تھے۔ جلسہ کے وقت اسٹریچی ہال لڑکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جن میں سے بہت سے لڑکے وہ تھے جو میری عزّت محض خلافتی اور کانگریسی کی حیثیت سے کرتے تھے اور اب وہ یہ سننے کے مشتاق تھے کہ اب میں اپنی نئی سیاست لڑکوں میں کیسے مقبول بنا سکوں گا میں نے ڈرتے ڈرتے شروع کیا کیونکہ لڑکے اگر شروع ہی سے میرے بیچّے سے اکھڑ گئے ہوتے تو پھر کام بہت خراب جاتا۔ رفتہ رفتہ اور ٹھیر ٹھیر کر جب میں نے مولانا آزاد کا شرائط نامہ ان کو سنایا تو ان کے چہروں سے میں نے پہچان لیا کہ گولی ٹھیک نشانے پر لگ گئی ہے شرائط نامہ ختم ہوتے ہی ایک اودھم مچ گیا اور جب میں اپنی تقریر ختم کر کے باہر نکلنے کے لئے چلا تو لڑکوں نے میرے پاؤں زمین پر نہ ٹکنے دیئے اور میں اُن کے کندھوں پر ہال کے باہر آیا یہ ایک بہت بڑا میدان تھا جو میں نے جیت لیا میں علی گڑھ دو ایک دن اور ٹھہرا جہاں لڑکوں کی کثیر تعداد سے نجی ملاقاتیں اور بحث اور مباحثے ہوئے۔

مولوی محمد اسمٰعیل سنبھلی

سعید الدین وکیل پرتاپ گڑھ ہماری پارٹی کو چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو گئے تھے اور اس سے بہت قبل حافظ ابراہیم بھی ہم کو چھوڑ چکے تھے۔ اب مولانا اسمٰعیل سنبھلی کی باری آئی۔ مولانا حسین احمد کے کہنے سے میں نے انھیں مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا تھا اور انہیں کی سفارش پر مبلغ تین ہزار روپے الیکشن کے اخراجات کے لئے بھی دیئے تھے اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے کانگریس سے بھی تین ہزار کی رقم لی تھی۔ یہ رقم لے کر وہ سنبھل پہنچے اور وہاں اپنے کو ایک غریب مسلم لیگ کا نمائندہ کہہ کر مسلم کھنڈا ساری کے بیوپاریوں سے ۹۰ من شکر بھی حاصل کی۔ مسلمانوں سے آیات قرآنی پڑھ کر خوب ووٹ لئے اور اسمبلی کے ممبر بن کر لکھنؤ پہنچے۔ یہاں انھوں نے مراد آباد کانفرنس کے بعد مولانا حسین احمد نے مجھ سے پھر سفارش کروائی کہ ان کی کچھ اور مدد کردوں میں وقتاً فوقتاً ان کو کچھ اور روپے دیئے یہاں تک کہ جس سن میں مبلغ تین سو روپیہ جو میں نے ان کو دینے کو کہا تھا ادا کر دئے تو دوسرے دن وہ مجھے کانگریس بنچز پر بیٹھے نظر آئے۔ مجھے امید ہے کہ مولانا حیات ہیں اور شاید اس کو پڑھ کر وہ توبہ اور استغفار کرلیں۔ یوپی اسمبلی میں اپنی قسم کا یہ آخری سانحہ تھا۔ اس کے بعد میری پارٹی کی تطہیر ہوگئی اور بجائے کمزور ہونے کے وہ اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔

۱۹۳۷ء کا اجلاس مسلم لیگ

مسلم لیگ کی قوت میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا اور صوبہ کے عوام اب بے طرح جگ پڑے تھے تقریباً تمام شہروں، قصبوں اور ضلعوں میں مسلم لیگ کی شاخیں اُبھر چکی تھیں جن کے بنانے میں کسی نظام کا دخل کم اور لوکل جذبات کا عمل دخل زیادہ تھا۔ بہر صورت یہ حال دیکھ کر میں نے طے کیا کہ اب ایک مسلم کانفرنس مسلم لیگ کی قیادت میں لکھنؤ میں منعقد کی جائے جس کے لئے راجہ محمود آباد نے تمام ذمہ داری اخراجات کی اپنے سر لے لی اور ہم نے اس جلسہ کی صدارت کیلئے

مسٹر جناح کو دعوت دیدی میں جانتا تھا کہ میرے اس انتخاب پر سب سے زیادہ اعتراضات جمعیۃ العلماء کی طرف سے ہوں گے کہ مسلم لیگ جس کو مسلم عوامی جماعت کہا جاتا ہے اس کے صدر نماز روزہ سے بے بہرہ عربی اور اردو زبان سے بھی واقف نہیں ہیں مگر مجھ کو یقین تھا کہ اب جمعیۃ العلماء اپنا اثر و وقار کھو چکی ہے اور ان کے اعتراضات کا کوئی اثر مسٹر جناح کی صدارت پر نہیں پڑے گا۔

ایک دن راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں کچھ اور احباب کے ساتھ جلسہ کے انتظامات کے سلسلہ میں میں ان سے گفتگو کر رہا تھا کہ مجھے ایک صاحب نے یہ بتلایا کہ شہر میں ایک ڈھنڈورہ پیٹا جا رہا ہے کہ اگلے جمعہ کو ٹیلے کی مسجد میں بعد نماز جمعہ ایک جلسہ ہوگا۔ اس کے بعد ایک جلوس چودھری خلیق الزمان کے گھر جائے گا کہ وہ کانگریس میں واپس جائیں اور مسلم عوام کو گمراہ کرتے نہ پھریں میرے احباب نے اس اسکیم کے خلاف ایک عام جلسہ کرنے کی خواہش ظاہر کی جس کو میں نے اس لئے قبول نہیں کیا کہ چند گمنام اشخاص کی اس اہمیت بڑھ جائے جو کسی طرح مناسب نہیں۔

۱۹۳۷ء کا اجلاس مسلم لیگ

میں کسی کو بلا اطلاع دئے ہوئے جمعہ کے دن تن تنہا نماز کے لئے ٹیلے مسجد چلا گیا۔ بعد نماز فرض جمعہ ایک صاحب نے جو کھدر میں سرتاپا ملبوس تھے یہ اعلان کیا کہ حاضرین بعد ختم نماز چلے نہ جائیں کیونکہ اس کے بعد ایک جلسہ ہوگا یوں بھی اس مسجد میں جمعہ کے دن ہزار ڈیڑھ ہزار نمازی ہوتے تھے اور آج بھی اس سے زائد تعداد نہ تھی سنتوں کے ختم کے بعد جن صاحب نے جلسہ کا اعلان کیا تھا انھوں نے جلسہ کی صدارت کے لئے ایک دوسرے صاحب کا جو انھیں کی طرح سر سے پاؤں تک کھدر میں ملبوس تھے ایک نام تجویز کیا جو منظور ہو گیا پھر تقریر بازی شروع ہوئی۔ ایک سرخ کھدر پوش احراری صاحب نے مسلم لیگ کی ساری سیاسی پالیسی کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ ان کی تقریر کے ختم ہونے پر صاحب صدر کی اجازت سے میں نے کھڑے ہو کر صرف تین چار منٹ تقریر کی جس میں میں نے حاضرین کو یہ یاد دلایا کہ میں نے ان الیکشن کے دوران یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اسمبلی میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کروں گا اور اسی تحفظ کی خاطر میں نے کانگریس سے گفت و شنید کی مگر اس نے میرے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا جس کے بعد میں نے ان کی وزارت کو لات مار دی آج یہاں ایک صاحب کی تقریر سے یہ معلوم ہوا کہ ایک لمبی چوڑی تنخواہ بڑی موٹر کار اور رہائش کے لئے ایک محل چھوڑنے میں میں نے بڑی حماقت کی۔ مسلم تحفظات کو گولی مارنا ان کے لاشے روندتے ہوئے حلوے مانڈے کا انتظام کرنا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اگر صرف آپ لوگ جو یہاں موجود ہیں مجھے لکھ کر دیں کہ آپ کانگریس سے مخالفت ختم کر کے وزارت پر براجمان ہو جائیں تو میں اسے قبول کرلوں گا۔ اتنا کہہ کر میں بیٹھ گیا اور مجمع سے غول اُٹھ کر جانے لگے داعیان جلسہ نے آوازیں لگانی شروع کیں کہ ٹھہریئے ٹھہریئے اور تقریریں ہوں گی مگر مسجد میں دو چار منٹ بعد آٹھ دس افراد منہ لٹکائے کھڑے رہ گئے۔ میں مسجد سے باہر نکلا تو

میرے ماموں اپنی موٹر کار پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے وہ اس تمام صورتحال سے بہت خوش ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ ڈالی باغ اپنے مکان لے گئے۔

اس واقعہ سے میں ہوشیار ہوگیا کہ غالباً اب احراری اور جمعیۃ العلماء والے جناح صاحب کی آمد پر جلوس اور مسلم لیگ کے جلسہ میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ میں خود شہر کے کونے کونے میں بارہ ایک بجے رات تک پھر کر مسلمانوں کو جلوس میں شرکت کے لئے دعوت دینے لگا جس میں یہ واقعہ ہے کہ میری میونسپلٹی کی چیرمینی کے اثرات نے مجھے بڑی مدد دی۔ ورنہ شاید جمعیۃ العلماء کانگریس اور احراریوں کی متحدہ کوششوں نے مسٹر جناح کے جلوس اور لیگ کے جلسہ کو ناکامیاب بنادیا ہوتا۔

میں نے مسلم لیگ والنٹیر بھی بنانے شروع کردئے پہلے تو لوگ کچھ ہچکچائے لیکن جب ایک دن میرے چھوٹے بھائی مشفق الزماں۔ عبدالعزیز وکیل۔ ایوب قریشی اور ملک قریشی نے یونیفارم پہن کر امین آباد کے چوراہے کے کئی چکر لگائے تو دوسرے دن اتنے نوجوان والنٹیر آئے جن کی کوئی حد نہ رہی اور سب نے اپنے اپنے خرچہ سے یونیفارم بنوالی۔

جلسہ کے لئے پنڈال میں نے لال باغ میں بنوایا جو ایک زمانہ میں میری فٹ بال فیلڈ تھی اور اس کی حفاظت کے لئے مسلم لیگ والنٹیر اور راجہ محمود آباد کے سپاہی تعینات کئے۔

مسٹر جناح ۱۳/اکتوبر کو بمبئی سے شام کی گاڑی سے پہنچے جہاں ان کے استقبال کے لئے ہزار ہا مسلمان کھڑے ہوئے تھے جس شان سے ان کا استقبال کیا گیا اسی شان سے ان کا جلوس بھی نکالا گیا۔ امین آباد پہنچ کر پارک کے پیچھے سے کچھ لوگوں نے آوازے کسے جن پر مسلم لیگ والنٹیر جھپٹ پڑے اور وہ فرار ہوگئے۔ مسٹر جناح راجہ محمود آباد کے قیصر باغ کے مکان میں ٹھیرے۔

سر سکندر حیات خان اور مسٹر فضل الحق بھی دوسرے دن پہنچ گئے اور ان کے علاوہ تمام صوبوں کے زعما اس تعداد میں لکھنؤ آگئے کہ ہمارے لئے ان سب کا انتظام کرنا بھی دشوار ہوگیا اتنا بڑا اجتماع اس سے پہلے مسلمانوں کا کبھی نہیں ہوا تھا ان سب کے نام لکھنا بہت دشوار ہے۔'' (۲۵۸)

مولانا مفتی کفایت اللہ

اصفہانی نے یوپی کے انتخابات میں جمعیۃ العلماء ہند کے مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں امر واقع تذکرہ کیا ہے۔ اس میں مفتی کفایت اللہ کی شخصیت اور طبیعت کی بریت ہوجاتی ہے خاص طور خود مفتی کفایت اللہ کا عمل اسکی صداقت ہے بلکہ تحریک پاکستان کے دو نامور مویدین بھی اسکی تائید کرتے ہیں۔

معروف اور ممتاز ادیب مختار مسعود کی بہت زیادہ پڑھی جانے والی کتاب 'آزاد دوست' میں ملا واحدی مرحوم کے حوالے سے مفتی کفایت اللہ کی شخصیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے جسکے مطابق دہلی مرحوم کی دو متوازن اور متدین شخصیات کا

ملا واحدی نے بطور خاص ذکر کیا ہے۔

''دو آدمی میں نے اپنی زندگی میں بڑی متوازن طبیعت کے دیکھے ہیں ایک مفتی کفایت اللہ اور دوسرے حکیم اجمل خان۔ مفتی صاحب اس معاملے میں حکیم صاحب سے بھی بازی لے گئے تھے مفتی کفایت اللہ جمعیۃ العلماء ھند کے صدر تھے قوم پرست اور کانگریسی تھے۔ مگر حالات کی رفتار پر نظر رکھتے تھے۔ نئی صورتحال کے بارے میں انکی رائے میں ہمیشہ توازن ہوتا۔ انکے ساتھیوں میں یہ خوبی نہ تھی۔'' (۲۵۹)

''مفتی صاحب دیوبند سے تھے، مولانا احمد سعید، حفظ الرحمٰن اور جمعیت کے دوسرے اکابر بھی اسی درجے کے تھے۔ دیوبند پر خواہ مخواہ کانگریس کی چھاپ لگ گئی حالانکہ یہ دوسرے ولی اللہ کی تحریک کا ثمر تھا۔ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) اور دارلعلوم (دیوبند) میں بھی ٹھن گئی۔ دین اور سیاست میں دونوں کی راہیں جدا ہوگئی۔ حالانکہ ان دونوں درسگاہوں کے بانی یعنی سر سید احمد خانؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ایک استاد کے شاگرد تھے۔'' (۲۶۰)

مفتی کفایت اللہؒ جس بصیرت کے انسان تھے اس سے حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے تقسیم ہند سے کہیں پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاملات کو بخوبی بھانپ لیا تھا، بظاہر معاملہ ایک مسلمان کو شنکر لال ہندو کے مکان کرایہ پر نہ دینے اور انکار کرنے کا تھا مگر مفتی صاحب کے کہنے سننے سے واحدی صاحب حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آنے والا زمانہ مسلمانوں کیلئے کتنا خراب اور تکلیف دہ ہوگا مفتی صاحب نے جو یہ بدلتے اور بگڑتے حالات دیکھے تو جمعیۃ العلماء ھند سے استعفیٰ دے دیا۔ مسلم لیگ میں تو شامل نہ ہوئے لیکن سیاست سے کنارہ کش اور کانگریس سے دل برداشتہ ہوئے۔ آزادی کے دو ایک برس بعد انتقال کیا۔ دینی حلقوں میں وہ بڑے نیک نام ہیں۔ اور سیاسی حلقوں میں بھی ان کا نام سب بڑی عزت سے لیتے ہیں۔ سیاست میں حریف اور مخالف کے حصے ایسی عزت کہاں آتی ہے۔ یہ تو مفتی صاحب کے مزاج کا فیضان ہے اور مزاج جیسا کہ میں نے کہا بڑا متوازن تھا'' (۲۶۱)

پنجاب یونیورسٹی شعبہ تاریخ کے نامور استاد پروفیسر محمد اسلم اپنی کتاب، سفر نامہ ھند میں، بائیس خواجہ کی چوکھٹ دہلی کے زیر عنوان رقمطراز ہیں کہ:

''دہلی پہنچتے ہی میں نے ندوۃ المصنفین میں اپنا سامان رکھا اور نہا دھو کر اردو بازار کی طرف نکلا، کتب خانہ عزیزیہ پر مولوی سمیع اللہ مرحوم کے، دونوں فرزند عبدالسلام اور عبدالحکیم تشریف فرما تھے۔ دونوں بھائی بڑے تپاک سے ملے اور اگلے روز دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ اگلے روز میں مقررہ وقت پر ان کی دوکان پر پہنچا تو دونوں بھائی مجھے کوچہ چیلان میں اپنے عظیم المرتبت نانا مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ مرحوم (م ۱۹۵۲) کے گھر لے گئے۔ کھانے کے دوران انہوں نے مجھے

بتایا کہ اسی کمرے میں علماء کرام کی نشست ہوا کرتی تھی۔سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی (م ۱۹۵۹) مولانا حفظ الرحمٰن سیوھاروی (م ۱۹۶۲) مولانا اسعد مدنی مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (م ۱۹۸۴) مفتی ضیاء الحق دہلوی اور دوسرے علما کرام کی نشست گاہیں خالی دیکھ کر یوں ہونے لگا جیسے دنیا سے علم روٹھ گیا ہو، عبدالسلام اور عبدالحکیم نے مجھے بتایا کہ ان کے نانا ابا (مفتی کفایت اللہ) نے ۱۹۴۲ میں قیام پاکستان کی مخالفت ترک کر دی تھی۔اس سے میرے دل میں ان کی عزت اور بڑھ گئی" ۲۶۸

پروفیسر محمد اسلم مرحوم نے مفتی کفایت اللہ کے لوح مزار پر لکھی عبارت بھی درج کی ہے۔جو بیرون دہلی مہرولی نزد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ مدفون ہیں۔لوحِ مزار حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ۔۔۔۔

"مفتی اعظم حضرت علامہ کفایت اللہؒ مہتمم شیخ الحدیث مدرسۂ امینیہ دہلی صدرِ اول جمعیت علماءِ ہند ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ ھجری ۱۳/ دسمبر ۱۹۵۲"

(ایضاً)

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

"ممتاز ادیب اور مبصر، جناب مختار مسعود نے اپنی ہر دل عزیز کتاب آواز دوست میں بتایا ہے کہ جب وہ ملتان میں ڈپٹی کمشنر تھے تو انہوں نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے ملنے کی استدعا کیونکر کی؟ باقی انہیں کے قلم سے "میں نے آٹوگراف البم بند کر دی۔خلا میں نظریں آوارہ پھرنے لگیں۔ذہن البتہ ایک خاص نقطہ پر جما ہوا تھا۔مجھے اس لمحے بہت کچھ یاد آیا۔

ایک لڑکے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔وہ بڑا ہٹیلا اور سر پھرا تھا مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔طبیعت ایسی پائی تھی کہ شرارت کرنے اور سزا پانے میں خوش رہتی۔ڈانٹ کھا کر فوراً اسی کام میں لگ گیا جس سے اسے منع کیا تھا۔یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ڈانٹنے والا زچ ہو کر بولا: بھلا تم کب باز آنے والے ہو، تم سے بھلمنسات کی امید کون رکھے، تم تو احراری ہو احراری۔یوں میں نے احراری کا لفظ پہلی بار سُنا اور اسے بدی کا ایک استعارہ سمجھ لیا۔چند دنوں بعد جب میں نے سنا کہ مولانا محمد علی کو رئیس الاحرار کہتے ہیں اور اقبال کے کلام میں مردِ مومن کے ساتھ مردانِ حُر کا ذکر بھی ہے تو اس لفظ کے معنی میں شبہ پیدا ہو گیا۔اس شبے کو پیر جو گوٹھ کی گدی سے بڑی تقویت ملی کہ وہاں بھی حُر کہلاتے ہیں۔کچھ مدت اور گزری تو یہ عقدہ کھلا کہ تشبیہ اور استعارے کا درست ہونا ضروری نہیں صرف نادر اور پر اثر ہونا لازمی ہے۔یہی وجہ ہے کہ تشبیہات اور استعارے کا استعمال ہماری شاعری اور دشنام طرازی میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔اس نتیجہ پر پہنچا تو میں نے اشتباہ کو دور کرنے کی کوشش بے سود سمجھ کر ترک کر دی مگر اس کوشش کا ایک فائدہ ضرور ہوا، میں نے الفاظ کی درجہ بندی کر لی ہے اور اس طرح بہت سی مشکلات آسان ہو گئی ہیں۔الفاظ کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ایک تو وہ لفظ جو ابن الوقت اور مرزا ظاہر دار بیگ ہوتے ہیں۔ان کے معنی

وقت اور موسم کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ظالم و مظلوم۔ دوسرے وہ معنی خیز لفظ جن کا مطلب علم اور تجربے کے ساتھ واضح اور وسیع ہوتا جاتا ہے مثلاً حسن و عشق۔ تیسرے وہ تہ دار لفظ ہیں جن کا سادہ اور قطعی مفہوم کبھی گرفت میں نہیں آتا مثلاً عوام اور استحصال۔ اس درجہ بندی کے بعد میں نے احرار کو دشنام کے استعارے سے خارج کیا اور تیسری قسم کے الفاظ شامل کر لیا۔ اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ جماعتِ احرار نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۳ء تک کیا کھویا اور کیا پایا اور لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کم از کم میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ آخر یہ کہاں ضروری ہے کہ انسان ہر موضوع بحث اور ہر اختلافی مسئلہ پر ایک قطعی اور حتمی رائے کا مالک ہو اور اپنے برتاؤ میں اتنا خشک اور درشت ہو جائے کہ احراری کہلانے لگے۔

جب میں ملتان میں تعینات ہوا تو ضلع کے اہم افراد کی ایک فہرست پیش ہوئی۔ اس میں سرکردہ افراد بھی تھے اور سرکش اشخاص بھی۔ بڑے سے بڑے ٹوڈی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے باغی کا نام درج تھا۔ ایک نام دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام تھا۔ وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے اور اس انجمن کا نام مجلسِ احرار تھا۔ ظفر علی خاں نے اسی مجلسِ احرار کا قافیہ بیزار، اشرار، غلط کار، چندے کے طلبگار اور رسوا سرِ بازار سے ملایا تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں نے اس شخص کا نام جسے بہت سے لوگ امیرِ شریعت کہتے ہیں ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیا۔ ان دنوں الیکشن کے انتظامات کی مصروفیت تھی۔ چند ماہ گزرے تو الیکشن اور آئین دونوں منسوخ ہو گئے۔ مصروفیت زیادہ ہو گئی۔ بنیادی جمہوریت اور زرعی اور اصلاحات کی پہلی قسط کے ساتھ کئی دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری کاموں میں یوں لگا رہا کہ سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ کام معمول پر آیا تو یادداشت سے ایک نقطہ ابھرا اور خلش بن گیا۔ شاہ جی سے ملاقات کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کا اظہار منشی عبدالرحمان خاں سے کر دیا۔

مجلسِ احرار کو غیر قانونی قرار دیئے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے، جماعت اپنے انجام کو پہنچی تو گویا جلسہ برخاست ہو گیا۔ نعرے گم، لیڈر اوجھل، جلوس منتشر۔ ایک دور تھا کہ ختم ہو گیا اور اس کی صرف دو یادگاریں رہ گئیں۔ مجلس کی فروگذاشتیں اور میرِ مجلس کی خطابت۔ شاہ جی ملتان میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ان کی تقریریں کچھ قانونِ وقت نے بند کر دیں اور کچھ اس قانونِ قدرت نے جو ہر بوڑھے آدمی پر لاگو ہوتا ہے۔ شاہ جی کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ عشاء سے فجر ہو جاتی مگر طبیعت سیر نہ ہوتی۔ خوش الحان اور خوش بیان تھے، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی محاورے پر قادر تھے۔ قرات، نثر، نظم، لطیفہ، ہجو اور تشنیع کو حسبِ ضرورت استعمال کرتے تھے۔ احتیاط کا دامن اکثر ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور کبھی کبھی اسے دانستہ اپنے ہاتھ ہی سے چاک کر دیتے اور اس بات کی بھی پروا نہ کرتے کہ یہ کام بر سرِ عام ہو رہا ہے یا بر سرِ منبر۔

شاہ جی اپنے زمانے کے سب سے معروف و مشہور مقرر تھے۔ عوام نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا اور خواص نے ان سے ہمیشہ خم کھایا۔ میں نے ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اکثر سنتا رہتا اور سوچتا تھا کہ وہ خطابت کس پائے کی ہو گی، جسے مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور بہادر یار جنگ کا زمانہ ملا پھر بھی وہ سب پر بھاری رہی۔ مولانا محمد

علی، علی گڑھ اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ابوالکلام آزاد الہلال نکالتے اور امام الہند کہلاتے تھے۔ محمد بہادر خاں نواب اور جاگیردار تھے۔ شاہ جی کے پاس کیا رکھا تھا۔ پٹنہ میں داغِ یتیمی، بنارس میں ورق کوٹنے کی مشقت اور امرتسر میں ایک چھوٹی سی مسجد کی امامت۔ اس کے باوجود شاہ جی جس نے سنا اس نے یہی کہا:

چہ جادوئیست ندا نم بطرزِ گفتارش
کہ باز بستہ زبانِ سخن طرازاں را

فیضی

ذاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند پیش کرنے کے موقع پر کہا تھا کہ اردو زبان کو ہمیشہ اس پر فخر رہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی۔ اردو نے جب بھی اپنے سرمایۂ افتخار پر ناز کیا تو اسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے۔ ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی شامل ہوں گے جن کے لیے سیاست دراصل ایک اسٹیج، سیاسی جماعتیں صرف منتظمینِ جلسہ، ملک بھر کی آبادی محض سامعین اور زندگی ایک طویل اردو تقریر تھی۔ اس خطیبانہ زندگی میں ان کے ہم عصر تو بہت تھے مگر ہمسر کوئی نہ تھا۔

عرصہ ہوا میں نے شاہ جی کو ایک بار کراچی میں سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجھے یہ فکر تھا کہ جلسہ رات گئے ختم ہوا تو واپسی کی بس نہیں ملے گی۔ اتنے میں ضابطۂ فوجداری حرکت میں آیا، جلسہ منسوخ ہو گیا اور شاہ جی غالباً پکڑے گئے۔ بے بسی کی جگہ محرومی نے لے لی۔ یہ اوائل ملازمت کی بات ہے جب شاہ جی کے بولنے اور ہمارے سننے کے دن تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ خطابت کی راہ میں پیری حائل ہونے لگی اور سماعت کی راہ میں ملازمت کے آداب اور ضابطے حائل ہونے لگے۔ آج اگر تقریر نہ سنی تو کل کیسے سن سکیں گے جب ہم اس نظام کا حصہ بن چکے ہوں گے جہاں حسنِ انتظام کا معیار صرف یہ ہے کہ کسی مخالف کی تقریر نہ ہونے پائے۔ تقریر کا جواب تقریر سے دینے میں محنت صرف ہوتی ہے اور یہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ گول باغ اور موچی گیٹ میں پانی چھوڑ دیا جائے۔

شاہ جی کی تقریر سے محروم رہا تو تقریب بہر ملاقات نکال لی۔ یہ ملاقات منشی عبدالرحمان خاں کے ذمہ تھی۔ انھوں نے شاہ جی سے بات کی تو وہ ٹال گئے، کہنے لگے کہ میں ساری عمر انتظامیہ سے لڑتا آیا ہوں، ڈپٹی کمشنر اگر بلانا چاہے تو وارنٹ گرفتاری نکالے۔ منشی صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا دیکھئے ہوئی نا احراریوں والی بات۔ یہ ان کی مرضی کہ وہ عہدے کو انتظامیہ کی علامت جانتے ہیں اور انتظامیہ کو ہر حال میں قابل ملامت سمجھتے ہیں مگر یہ کہاں کی بالغ نظری ہے کہ عہدے اور عہدہ دار کے فرق سے بھی انکار کر دیا جائے۔ اگر مجھے ان کی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تو انھیں میری ملازمت سے کیا غرض۔ ایک نوجوان دورِ حاضر کے عظیم خطیب سے ملنے کا خواہشمند ہے اور بوڑھا خطیب اس کے اشتیاق کا حال پوچھتا ہی نہیں، بس اتنا سن کر کہ وہ سرکاری ملازم ہے اسے فوراً رد کر دیتا ہے۔ رہا حفظِ مراتب کا سوال تو میں نے پہلی ہی شاہ جی

سے حاضری کی اجازت چاہی تھی، سلام نہیں بھیجا تھا۔ پیغام بر نے یہ باتیں سنیں اور اُلٹے پاؤں پھر گیا۔ اگلے ہی روز سید عطاء اللہ بخاری میری یہاں مہمان بن کر تشریف لے آئے۔ میں نے موٹر کار کا دروازہ کھولا، پہلے ایک پھڑکتا ہوا فارسی شعر برآمد ہوا اور اس کے پیچھے شعر پڑھنے والا اترا۔ ڈھیلا ڈھالا کھدر کا کرتا، سبز چارخانہ تہ بند، دیسی جوتی، دراز قد اور دراز ریش، کشادہ جبیں اور خندہ رو۔ شاہ جی نے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا، دوسرے سے کچھ بوجھا اپنے عصا پر ڈالا، کمر ذرا سی خم ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر گیلری سے ہوتے ہوئے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے دوسرے سرے تک چلتے گئے اور وہاں پہنچ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ جوتی اتاری اور پالتی مار لی۔ میں نے انھیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور ان کی پرانی تصویروں کو یاد کیا۔ دونوں میں تھوڑی سی مشابہت ضرور ہے مگر مناسبت کوئی نہیں۔ کہاں وہ کیم شحیم گیسو دراز اور عصا بردار جسے دیکھ کر دیو جانس کلبی، برنارڈ شا، ٹیگو اور ٹالسٹائی یاد آتے تھے اور کہاں یہ سُتا ہوا بے وزن ڈھانچا جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے شاہ جی سے اپنے اشتیاق کا قصہ بیان کیا۔ ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اتنی سنی ہے کہ زبانِ خلق پر ایمان لے آیا ہوں۔ جس نے ان کی تقریر سنی اور پسند کی اس کے لیے علم حاضر اور جس نے کبھی نہ سنی مگر اوروں سے زیادہ متاثر ہوا اس کے لیے ایمان بالغیب۔ شاہ جی نے میری بات کا اعتبار اور میرے جذبات کا احترام کیا، وہ ذرا سی دیر میں یوں گھل مل گئے گویا میری نیازمندی کو ایک زمانہ بیت چکا ہو۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ان کی بیماری اور کمزوری کے پیش نظر میں نے اسے طول دینے سے احتراز کیا مگر جب باتیں ختم ہوئیں تو شام ہو چکی تھی اور شاہ کو آئے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ لحہ بھر کے لیے بھی منقطع نہ ہوا اور اس میں میرا حصہ اسی قدر تھا جتنا ایک میزبان اور سامع کا ہونا چاہیے۔ منشی صاحب محض سننے اور سر دھننے کے قائل نہیں۔ ان کا اُصول ہے کہ اچھا انسان، اچھی کتاب اور اچھی گفتگو جہاں میسر آئے اس میں دوسروں کو بھی شریک کرو، ان سے تنہا فائدہ اٹھانا کم ظرفی کی دلیل ہے۔ ملاقات شروع ہوئی تو منشی صاحب مسکرا رہے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے پھر کاغذ نکالا اور یادداشت لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ وہ جو ایک نوجوان اور تھا، وہ تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ چائے دو تین بار آئی مگر یوں دبے پاؤں کہ گفتگو میں کوئی خلل نہ پڑا۔ ان تین گھنٹوں میں شاہ جی نے آیات، احادیث، اشعار اور چٹکلوں سے ایک جادو جگائے رکھا۔ میں ان کی خطابت کا راز جاننا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ موضوع اتنی تیزی سے بدلتے رہے کہ خطابت پر جم کر بات نہ ہو سکی۔ گفتگو شاہ جی کی صحت سے شروع ہوئی اور توکل سے ہوتی ہوئی سیرت تک پہنچی، وہاں سے تاریخ کا ذکر آ گیا اور اس میں مختلف تحریکیں شامل ہو گئیں، ہر تحریک کے ساتھ اس سے وابستہ افراد کا جائزہ شروع ہو گیا اور بات ایک پورا چکر لگا کر شاہ کی ذات پر واپس آ گئی۔ اس مرحلے پر شاہ جی نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔ ملاقات ختم ہونے والی تھی، اس وقت شاہ جی جوتیاں اتارے صوفے پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ ابھی وہ پیر نیچے اتاریں گے، چڑھی ہوئی آستین بھی نیچے اترے گی۔ گلے کا بٹن بند ہو گا۔ پان کا ڈبیہ جیب میں ڈالی

جائے گی اور پھر وہ عصا کا سہارا لے کر اُٹھیں گے جو تمام عرصہ ان کے ہاتھ ہی میں رہا تھا۔ میں نے کہا اجازت ہو تو چند سوال پوچھ لوں۔ اجازت ملی تو میں نے دو سوالوں سے تمہید باندھی اور جواب ملنے پر تیسرا سوال داغ دیا۔ اس سوال و جواب کے دو سال بعد میں نے منشی صاحب کو خط لکھا کہ اپنی تحریری یادداشت مجھے بھیج دیں۔ منشی صاحب نے بہت ڈھونڈا مگر ایک مختصر ورق کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ گفتگو جسے میں نے محفوظ سمجھا تھا اس کے الفاظ گم ہو گئے اگرچہ اس کا حاصل حافظے میں محفوظ ہے اور اس کا تاثر دل پر نقش ہے۔ مشاہیر کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے سلسلے میں حافظے پر زیادہ اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ حافظہ بھی خواہشات کے تابع ہوتا ہے اور بسا اوقات خواب و خیال کو واقعات اور واردات میں منتقل کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس کا کہا مانیں تو نفس اور تاریخ دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔

میں نے شاہ جی سے جو سوال کئے وہ سب سود و زیاں کے بارے میں تھے، پہلا سوال یہ تھا کہ گزشتہ چالیس برس میں جو آپ کی عوامی زندگی پر محیط ہیں آپ نے برِ عظیم کے مسلمانوں کو اسلام سے قریب آتے ہوئے دیکھا ہے یا دور جاتے ہوئے پایا ہے۔ جواب ملا کہ مسلمانوں میں دو طبقے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں، ایک مذہب سے قریب دوسرا اس سے کچھ دور۔ ان دونوں طبقوں کا درمیانی فاصلہ اس چالیس میں بہت بڑھ گیا ہے یہی نہیں بلکہ جو لوگ مذہب سے بیگانہ ہیں ان کی تعداد اور قوت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ میں نے دوسرا سوال پوچھا۔ برِ عظیم کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ میں زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں ایسے نامور مسلمان ایک ہی وقت میں جمع ہو گئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر ان سب کی موجودگی میں اسلام سے بیگانہ ہو جانے والوں کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوا ہے تو اس مستقبل کے بارے میں آپ کے معیار سے کم مایہ ہوں گے۔ کیا یہ بات قابلِ افسوس نہیں کہ جو ملّی سرمایہ آپ کو اسلاف سے ملا تھا اس سے آپ کا ترکہ کمتر ہوگا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ہمیں اپنے مقصد میں اس لئے کامیابی نہ ہو سکی کہ دو سو ۲۰۰ برس کے عرصے میں فرنگی کی تعلیم اور تہذیب نے اپنا پورا تسلط جما لیا تھا۔ آسودہ حال لوگ علی گڑھ کی طرف چلے گئے اور ناکارہ آدمی دینی مدارس کے حصے آئے۔ جنگِ آزادی کی ہمہمی میں سیاست دین پر اور منافقت دنیا پر غالب آئی۔ ساری توجہ اور توانائی نئی تعلیم اور نئی سیاست کی نذر ہو گئی۔ جو لوگ باقی رہے ان میں سے کچھ ہندو تمدن کے زیرِ اثر رہ کر گمراہ ہو گئے، صرف بچے کچھے اور لٹے پٹے لوگ ہی دین کے قافلے میں شامل ہوئے۔ ہمارا سرمایہ خوب تھا مگر نسل ناخوب تھی، نتیجہ ظاہر ہے، آبائی ورثہ بھی کھویا اپنی کمائی بھی گنوائی اور مستقبل کو بھی مخدوش بنا دیا۔ میں نے آخری سوال کی اجازت چاہی اور اسے دو طرح سے پوچھا، ایک شکل یہ تھی کہ اگر قیامت کے دن آپ سے پوچھا گیا کہ اے وہ شخص جسے بیان و کلام میں چالیس کروڑ افراد پر فوقیت دی گئی تھی اس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ ناکام تحریکوں کے علاوہ کیا پیش کریں گے۔ اسی سوال کی دوسری شکل یہ تھی کہ آپ نے اپنی جدوجہد کا انجام دیکھ لیا۔ اب اگر زمانہ چالیس برس پیچھے لوٹ جائے تو آپ اپنی خطابت اور طلاقت کا دوبارہ وہی استعمال کریں گے یا آپ کی زندگی بالکل نئی ہوگی۔ شاہ جی یکایک خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی میں آزردگی بھی شامل تھی۔ میں نے موضوع بدل دیا اور اپنی آٹوگراف البم ان کے سامنے

پیش کر دی۔شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا:

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اوّل اوّل　　وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر
قیامت کا طوفان صحرا میں اوّل　　غبارِ رہِ کارواں آخر آخر
چمن میں عنادل کا مسجودِ اوّل　　اور گیاہِ رہِ گلرخاں آخر آخر

ان تین اشعار کے نیچے ایک طویل کشش کے ساتھ سید لکھا اور سید کے اوپر عطاء اللہ بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیئے۔یہ بات ۲۸ رجون ۱۹۵۹ء کی ہے۔دو تین برس بعد میں اور منشی عبدالرحمان خاں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔شاہ جی زندہ تھے تو اپنے سامعین کو کبھی بنجر زمین کبھی صحرا اور کبھی قبریں کہہ کر پکارتے تھے،آج ہم ان کے سرہانے خاموش کھڑے تھے۔قبر سے آواز آئی،تمہارے تیسرے سوال کا جواب اس روز نہ دے سکا تھا،لو آج سنو،الفاظ اقبال کے ہیں،قصۂ مسلم ہندی کا اور حاصل ایک عمر کی خطابت کا:

مسلمِ ہندی چرا میداں گذاشت　　ہمت او بوئے کراری نداشت!''۲۷۸

جبکہ دارالعلوم دیو بند کے ہی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ۱۹۴۶ء میں لاہور میں جمیعت علماء اسلام کے جلسے میں اپنے صدراتی خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

> ''یاد رکھیئے!مسلمان اب بیدار ہو چکا ہے۔اس نے اپنی منزلِ مقصود معلوم کر لی ہے اور اپنا نصب العین خوب سمجھ لیا ہے۔وہ اس رستہ میں جان و مال نثار کرنے سے بھی دریغ نہیں کریگا۔خوش قسمتی سے بہت سے علماء امت اور اکثر مشائخ طریقت نے مذہبی نقطۂ نظر سے پاکستان کی تائید اور حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے اور وہ اپنے پیروؤں کو برابر تلقین کر رہے ہیں کہ پاکستان اور مسلم لیگ کو کامیاب بنانے کی انتہائی سعی کریں اور کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائیں،کیونکہ اس وقت مسلمانانِ ہند کی موت وحیات کا مسئلہ ہے۔''(۲۶۲)

نظریہ پاکستان اور علماء حق

سوائے کانگرس کے فردِ نمائش(Show Boy) حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ اور جمیعت علماء ہند کے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ اور مجلس احرار اسلام کے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ،سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ اور دیگر کانگرس کے ہمنوا علماء کے کم و بیش تمام مشائخ عظام،اور اہل سنت کے جملہ علمائے کرام کے علاوہ دارالعلوم دیو بند کے مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ علماء قاری محمد طیب،مولانا شبیر احمد عثمانیؒ،مولانا ظفر احمد عثمانیؒ،مولانا مفتی محمد شفیعؒ،مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ،بدایوں کے علماء اور فرنگی محل کے صوفیاء تو باقاعدہ مسلم لیگ میں شامل و داخل بھی تھے اور پاکستان اور مسلم قوم کے مفادات کے لئے لیگ کے پلیٹ فارم سے کوشاں بھی۔آل انڈیا مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری اور معروف

پارلیمانی ماہر، مولانا ظفر احمد انصاری لکھتے ہیں کہ:۔

''مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا جمال الدین فرنگی محل (لکھنو) تو باقاعدہ مسلم لیگ میں شامل ہوکر اس کی تائید کرر ہے تھے۔ ورنہ اکثر حضرات اپنی اپنی خانقاؤں، درسگاہوں اور حلقہ متوسلین میں کام کرتے رہے۔ جب کانگرس اور مسلم لیگ میں شمولیت کی شرعی بحث طویل ہوئی تو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایماء پر مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے باضابطہ کانگرس کی مخالفت اور مسلم لیگ کی حمایت میں فتویٰ مرتب کیا جو کہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے جو''مسئلہ قومیت'' پر لکھا، وہ اپنے دلائل کی محکمی، زورِ استدلال اور زورِ بیان کے باعث مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔'' (۲۶۳)

لیکن آزادئ ہند کے بعد اور برادارانِ وطن سے مسلمانوں کے حقوق کی بات کرنے کے دعویدار حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ وزیر تعلیم ہوکر بھی مسلمانوں کی حفاظت کے لئے کچھ کر نہ سکے۔ وہاں مولانا حسین احمد مدنیؒ کی متحدہ قومیت عملاً کس کام آئی؟ یہی بھارت میں مسلمانوں کی ۶۲ سالہ تاریخ ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے نامور استاد اور اُردو کے ممتاز نقاد، پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں، پہلے تو مولانا آزاد کی طبع مبارک کا''تذکرہ'' ہے۔ لکھتے ہیں:۔

آزادئ ہند اور مسلمان

''مولانا ابوالکلام آزاد میں پیغمبرانہ طریق دعوت کی بجائے آمرانہ شان اور کبریائی ادا تھی۔ وہ اتنے پبلک کے نہیں، جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مولانا اپنے آپ کو عوام سے زیادہ خواص کی رہنمائی پر مامور سمجھتے تھے۔'' (۲۶۴)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی آزادی

پروفیسر رشید احمد صدیقی، تعلیم ہی کے شعبے سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا کے معمولات اور خدمات کو یکجا کرتے ہیں۔

''قطع نظر اس کے کہ مولانا حکومت سے کس درجہ وابستہ ہو گئے تھے، اس سے باہر نکل سکتے ہیں یا نہیں، ان کو نکلنے بھی دیا جاتا یا نہیں، یا ان کی صحت اس کی کہاں تک متحمل ہوتی، کبھی کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے، کہ کاش! وہ حکومت کے محدود اور گلو فشار حلقے سے باہر نکل کر ہندی جمہوریہ کے دستور میں ہندی مسلمانوں کو وہ مشکل لیکن مہتم بالشان مقام دلا سکتے جو مسلمانوں کا حق بھی تھا، اور ذمہ داری بھی۔'' (۲۶۵)

آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں مولانا سے فجر کے بعد ملاقات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، جس میں ان سے سوالات کرتا تھا، ''میرا سوال تھا، ''بعض علماء بھی تو قائداعظمؒ کے ساتھ ہیں''

فرمایا ''علماء اکبر اعظم کے ساتھ بھی تھے۔ اُس کی خاطر انہوں نے ''دین اکبری'' ایجاد کیا تھا۔'' (۲۶۶)

حالانکہ قائداعظمؒ خادم شریعت تھے، جبکہ اکبر اعظم حادم (حد کو توڑنے والا) شریعت تھا! قائداعظمؒ کو دفنانے کے موقع پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا یہ ارشاد، تاریخ کے جھروکے میں مسلمانوں کے خدنگِ آفرین، اورنگ زیب کا خفی نہیں جلی اشارہ ہی تو تھا کہ

''آج ہم اورنگزیب کے بعد برعظیم کے سب سے بڑے مسلمان کو دفن کر چلے ہیں۔''

خود حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کس سیکولر جمہوریہ کے آئین اور کابینہ کے پابند تھے، ان کے علم و فضل کو دربار اکبری کے ابوالفضل تک کا سیاسی سیکولر سفر خود کیسے راس آیا، انہیں تو سبھاش چندر بوس نے اپنے صدر کانگرس کے عزل پر، خود اکبر اعظم لکھا اور بار بار، گاندھی کے نام اپنی خط و کتابت میں یہ نام رکھا، البتہ قائداعظمؒ کو اپنے طور مولانا آزادؒ نے اچھے الفاظ سے نوازا ہے، شورش کاشمیری ہی رقم طراز ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ:۔

> ''پاکستان فی الجملہ جناح کے سیاسی تجربات کا ردِّعمل ہے۔ وہ میرے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں انہیں حق پہنچتا ہے۔ لیکن مجھے ان کی ذاتی ذہانت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ انہوں نے ایک سیاستدان کی حیثیت سے مسلمانوں کی عصبیت (دینی عصبیت نہیں کہا، حالانکہ مولانا تاریخ کے شناور ہو کر بھی ابن خلدون کے تجزیے پر صاد کرتے) کو مضبوط کیا۔ اور پاکستان کو اٹل بنا دیا۔ اب یہی چیز ان کی انا ہو گئی ہے۔ وہ کسی قیمت پر یا کسی حالت میں اس انا سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں''۔ (۲۶۷)

مولانا انا کو قائداعظم کی ضد کے معنوں میں لائے ہیں، افسوس کہ خود ان کی شخصیت کا بت ایسا تھا کہ یہ خود اسی کے ہو کے رہ گئے۔ قائداعظم نے مسلمانوں کی دینی عصبیت کو جوان کیا تو یہ ابوالکلام آزاد کی فکر معکوس یا انقلاب نام میں جہل ہو گیا۔ انا بن گئی، قائداعظمؒ انا تھے کہ ضد حالانکہ دینی عصبیت سے جب قومیں بنتی ہیں تو اُس ملت کے پاسبان اپنے موقف کی صداقت پر اُسی طرح استقامت کا پہاڑ ہوتے ہیں، جسطرح ۱۹۴۰ء کی آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارتی تقریر ہے۔ جس میں مسلمانوں کا قائداعظمؒ

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی ﷺ

کا مقدمہ پیش کر رہا ہے، اور خود مولانا کا ۱۹۴۰ مارچ میں خطبہ رام گڑھ اسلامیان ہند کو ہندوؤں میں ضم ہونے کی

راہ دکھا رہا ہے۔تحریک پاکستان اور پھر قیام پاکستان کی راہ میں مسلمانوں کی صفوں میں جس طرح انتشار اور عملاً نقصان حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے پہنچایا ہے اس پر اسلامیان ہند نے اُس عرصہ سیاست کے دوران میں اپنی عوامی زبان میں ہدیہ دل اور نقد جاں حاضر کر دیا تھا۔جس پر ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند نے کہا تھا کہ

''اُردو کے سب سے بڑے خطیب کو وہ کونسی گالی ہے جو مسلمانوں نے اُردو زبان میں (یوپی بمعہ کلکتہ) نہیں دی،البتہ اُردو کے اس خطیب نے عوام کو اپنی تنہائی میں جس خوبصورت اردو میں مخاطب فرمایا وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے لولوئے لالہ ہیں کہ کلوخ اندازی،اُنہی کی کہانی،شورش کاشمیری کی زبانی:۔

''میں جانتا ہوں آپ لوگوں کو مجھ سے اخلاص وارادت ہے مگر اس کی راہیں دوسری ہیں۔طیش وغصہ نہیں جن لوگوں کو جذبات نے اندھا کر دیا ہے جو دماغ کی بجائے پیٹ سے سوچ رہے ہیں اور دل کی جگہ زبان سے محسوس کر رہے ہیں،انہیں ایک دن اس کا شدید احساس ہوگا اور تب وہ اپنے ہی تجربوں سے تاریخی سبق حاصل کریں گے۔بہر حال یہ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی ہے کہ آپ لوگ برہنہ دماغوں اور آوارہ زبانوں کے سامنے بازار میں ڈنڑ پیلیں۔'' (۲۶۸)

آغا شورش کاشمیری مزید لکھتے ہیں کہ،مولانا آزادؒ نے

''سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ کو راقم کی موجودگی میں کہا کہ ''شاہ جی خطابت آپ کو عطیہ الٰہی ہے اور جو چیز عطیہ الٰہی ہے تو اس میں درشتی نہ ہونی چاہیے،جو لوگ حریف بذلہ نہیں،ان کے ذکر سے اجتناب ہی بہتر ہے۔طعن وطنز کمزور انسانوں کی بیمار زبانوں کا ہذیان ہے۔آپ ماشاء اللہ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں،آپ کو ان چھوٹی موٹی ندیوں سے کیا نسبت؟ جو صرف سنگ ریزے اگلتی اور ریت پھنکتی ہیں۔''

ممتاز ادیب مختار مسعود بتاتے ہیں کہ:

''میں ابوالکلام آزاد کا معترف ہوں مگر نثر کی حد تک۔الہلال کی جلدیں بندھی ہوئی گھر میں رکھی تھیں۔میں ۱۹۱۱ء کا پہلا پرچہ نکالتا،پڑھتا اور سر دھنتا۔میں نے الہلال کو اس کے بند ہو جانے کے برسوں بعد پڑھا تھا اور اس میں مجھے اس قدر تازگی نظر آئی کہ میں مولانا کا قائل ہو گیا۔سیاست کی بات البتہ بالکل مختلف ہے۔علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر جب طلبہ نے مولانا کے ساتھ گستاخی کی تھی ان دنوں میں بھی طالب علم تھا اور اس گروہ میں شامل تھا جو کمک کے طور پر اسٹیشن پہنچا تو گاڑی چھوٹ چکی تھی۔مجھے دیر تک اس موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس رہا۔ہم قائداعظم کے مقتدی تھے،ہمیں امام الہند کی امامت گوارا نہ تھی۔

آزادی ملی اور فسادات شروع ہو گئے۔پاکستان تحریک کے چھوٹے بڑے سبھی رہنما پاکستان چلے آئے۔

مولانا آزاد نے دلی کی شاہ جہانی مسجد میں ایک زوردار تقریر کی اور سارا الزام مسلم لیگ اور مسلم عوام پر رکھا۔ تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ تم میری مخالفت اور مسلم لیگ کی موافقت کرتے رہے ہو اب اس کا مزہ چکھو۔ کہنے لگے پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ ان سنتوں کو تازہ کرنے والوں میں علی گڑھ کے طلبہ پیش پیش تھے مگر آزادی کے بعد مولانا سے مفاہمت کے بغیر علی گڑھ کا گزارہ کیسے ہوتا۔ مولانا کو جلسۂ تقسیم اسناد کا مہمان خصوصی بنا کر بلایا گیا اور اعزازی ڈاکٹریٹ پیش کی گئی۔ طلبہ میں اسناد تقسیم ہوئیں تو ایک سند اور تمغہ میرے حصے میں بھی آیا۔ مولانا نے اس جلسہ میں ایک خطبہ پڑھا جسے سن کر بہت سے لوگ اداس ہو گئے۔ مولانا کے اشارے علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے اور ان الزامات کو ثابت کرنے کے لیے وہ تاریخ میں الٹے قدم بہت دور تک چلے گئے۔ میں چند دن کے لیے پاکستان سے آیا ہوا تھا۔ فساد، مہاجرین، نہروں کا پانی، اثاث کی تقسیم، کشمیر کا مسئلہ، سارے زخم ہرے تھے۔ ممکن ہے مولانا آزاد بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کے زخموں پر مرہم لگا رہے ہوں مگر پاکستان بسنے والوں کے زخموں پر انھوں نے اس روز بہت نمک پاشی کی۔ مولانا اپنی دلیل کی سند تاریخ سے لا رہے تھے، ہم بھی ان کی نمک پاشیو کی سند ان کی تحریر سے لا سکتے تھے۔ مولانا آزاد نے ۱۹۲۱ء میں مجلس خلافت کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ علی گڑھ کی قومی پالیسی یہی سمجھی جاتی ہے کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ رہیں حالانکہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جانا مسلمانوں کے مذہبی عمل میں شامل ہے۔ ہندوؤں کی غلامی کو مولانا اپنے علم و انشا کے زور سے عین عبادت ثابت کر رہے ہیں۔ جہاں تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تعلق ہے مولانا اس کے وجود میں آنے سے پہلے اس کے بہت بڑے مخالف بن گئے تھے۔ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا آزاد نے اتحاد اسلامی کے موضوع پر ایک خطبہ دیا جس میں عالمانہ طنز کے سارے حربے اور وار مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی خواہش رکھنے والے مسلمانوں کے حصے میں آئے۔ فرماتے ہیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ 'مسلم یونیورسٹی' ہمارے قومی مقاصد کا اصلی نصب العین، کعبۂ علی گڑھ کے شب زندہ داران عبادت کی چہل سالہ تہجد گزاری کی مراد، آرزو اور ہمارے رہنمائے اول کی دی ہوئی شریعتِ تعلیم کا یوم تکمیل ہے۔ جس دن یونیورسٹی بن جائے گی اس دن الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا کی وحی اسٹریچی ہال کی چھت پر نازل ہو گی۔ جلسہ تقسیم اسناد کا پنڈال یونیورسٹی کی کرکٹ گراؤنڈ میں لگا ہوا تھا۔ اسٹریچی ہال بھی نزدیک تھا۔ جلسہ ختم ہوا اور طلبہ مولانا کے آٹوگراف لینے کے لیے آگے بڑھے۔ میں خاموش اپنی جگہ کھڑا رہا۔''

عجب نیرنگیِ دوراں ہے اسی مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کی مین لائبریری مولانا آزاد کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ، کے آزادی ہند، وزیر تعلیم ہند، اور آل انڈیا کانگرس کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر کے منصب و ماحول کا حاصل کیا ہے؟ صرف پاکستان مولانا کی طبیعت مبارک کا ہیجان تھا، مگر مسلمان بھارت میں کس بھاؤ اور داؤ کی زد

میں رہے ہیں۔صرف اس کی عصری جھلک،مولانا کی سیاست پر ہی نہیں،ان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے کہ معاصر بھارت میں مسلمان خود ماضی کے مزار ہیں۔

آزادیٔ ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ سلوک

یہ عنوان ایک معاصر بھارتی،مسلمان سہ روزہ اخبار کا باقاعدہ اداریہ ہے،جس کی ابتداء میں بھارت میں مسلمانوں کا تعارف کیا ہے،معارف کیا ہے یہ متحدہ قومیت کی جنم بھومی بھارت میں مسلمانوں کے چھپن سالہ احوال کا آنکھوں دیکھا نہیں،تن بیتی کا ہندوستان ہے۔

۱۴ اگست ۲۰۰۰ء کا سہ روزہ دعوت دہلی لکھتا ہے۔

''ہندوستان میں آئی ایس آئی اور مسلمان کو ایک دوسرے کا لازم بنادیا گیا ہے۔ایک کا نام آتے ہی دوسرے کا تصور آپ سے آپ ذہن میں آجاتا ہے'' اس عصری جھلک کے بعد اخبار لکھتا ہے کہ ''آزادی کے فوراً بعد سے ہی ہندوستانی مسلمانوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جا تا رہا ہے۔ایک طویل عرصے تک انہیں ملک کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیکر احساس جرم میں مبتلا رکھا گیا۔فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ ان کی معیشت کو تباہ کر دیا گیا۔عقائد اور عبادت گاہوں پر حملے کر کے ان کی شناخت مٹا دینے کی کوشش کی گئی،نتیجتاً ہندوستانی مسلمان جو پہلے ہی مختلف میدانوں میں انگریز دشمنی کے سبب کافی پچھڑ چکا تھا،مزید پس ماندہ ہو گیا۔کھاتے پیتے گھرانے کے مسلمان سڑکوں پر آگئے، جن کے باپ دادا اور پردادا زیور تعلیم سے آراستہ ہوا کرتے تھے وہ ناخواندہ اور جاہل رہنے پر مجبور ہوگئے۔حکومت (ہند) اور میڈیا نے ان کی پس ماندگی سے فائدہ اٹھا کر ان کے اندر جرائم کا گراف بڑھا دیا ہے۔روزگار کے دروازے پہلے ہی مسلمانوں پر بند کر دیئے گئے تھے،جن چھوٹی صنعتوں سے مسلمان وابستہ تھے انہیں دانستہ ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔''(۲۶۹)

گیارہ برس تک وزیر تعلیم رہنے والے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی محض تعلیم کے شعبے میں مسلمانوں کی خدمت کا یہ عصری زاویہ بدرجہ باعث تشویش ہے۔البتہ جناح کی قومی سیاست یا مسلمانوں کی سیادت پر مولانا ابوالکلام آزادؒ نے انا کی بات فرمائی ہے ان کی تفسیر ادھوری ہے ورنہ ان الذین قالو ربنا اللہ ثم استقاموا.............الخ (القرآن)

ترجمہ: وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے۔اور پھر وہ اس پر ڈٹ گئے،تو ہم ان پر فرشتے نازل کرتے ہیں، جوان کے پاس یہ کہتے ہوئے آتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم زدہ ہو،ان کو اُس جنت کی بشارت دیتے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔(سورہ حم سجدہ،آیت ۳۰،پارہ ۲۴)

افسوس کہ مولانا بقید حیات نہیں کہ انہیں اقبالؒ و قائد کا پاکستان اور ابوالکلام آزادؒ اور حسین احمد مدنیؒ کا ''ہندو، ہندی، ہندوستان'' آج ۶۲ برسوں کا نقشہ دکھایا جاتا، کہ برعظیم پاک وہند میں مسلمان کی آزادی اوران کے آزاد وطن پاکستان یہاں تک کہ بنگلہ دیش کا مسلمان، اپنے معاش و مفاد سے لیکر تہذیبی طور پر کس طرح اور کس حال میں ہے! قوم رسول ہاشمی ﷺ! اور ابھی بھارت میں مسلمانوں کی حالتِ معاش ہی نہیں، جان و آبرو کے درپے، متحدہ قومیت کے عفریت کا انجام، ایک آئینہ امروز ہے، جس میں مذہبی بتوں کی انا کا حشر اور دینی بصیرت کے حامل دو کلین شیو (Clean Shaved) مسلمان، عبقری اور نابغہ جنہیں ایک زمانہ اور ایک جہاں بانیان پاکستان (Founding Fathers of Pakistan) اقبالؒ و قائدؒ کہتے ہیں، یہ ان دونوں ہی فنافی الرسول ﷺ انسانوں کا زندۂ جاوید معجزہ ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ جو دم توڑتی بیسوی صدی میں دنیا کی ساتویں بڑی ایٹمی قوت ہے۔ جو بقول بانی پاکستان اسلام کا قلعہ، اور اسلام کی تجربہ گاہ ہے۔ بلکہ تمام عالم اسلام کی پناہ گاہ بھی!

تاہم یہ نظری اور نظریاتی نقصان، برعظیم میں ملت اسلامیہ کا ہوا کہ ان کی صفوں سے نامور علماء کانگرس کے ہمنوا تھے، اور یہ بات کوئی ذاتی پسند و ناپسند کی نہ تھی، کہ اپنے مسلکی، مزاجی اور طبعی احوال کو ہندوؤں کے ساتھ ادغام کی شخصی کاوش کو محض سیاسی اختلاف کہا جائے۔ اگر اقبالؒ و قائدؒ کی صورت میں ملتِ اسلامیہ کو برعظیم میں عصری رہنمانہ ملتے تو برعظیم کی ملت اسلامیہ کا حشر سپین سے زیادہ عبرت ناک ہوتا، سچ تو یہ ہے کہ بقول اقبالؒ ''اسلام نے مسلمانوں کی حفاظت کی'' ورنہ ہندو اکثریت کا خمار اور مستقبل کا اقتدار سراسر ہندوؤں کی یلغار نہ تھی تو اور کیا تھا؟ یہی قائداعظمؒ کی انا تو مولانا ابوالکلام کی معاصرانہ چشمک کا ادعا ہے، ورنہ سچ کیا ہے گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل اور صوفی دانشور ڈاکٹر نذیر احمد کلام بلھے شاہؒ کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

ہندو ذہنیت اور اکثریت کا خمار

> ''ہندو ذہن میں جوں جوں اپنی اکثریت کی اہمیت کا غلط احساس بڑھتا گیا اور وہ یہ سمجھنے لگ بیٹھے کہ ہندوستان میں برطانوی سیادت کے تو ہم ہی وارث بننے والے ہیں تو اسکا لہجہ مسلمانوں کے بارے میں گستاخ ہوتا گیا۔ ہردیال نے کہا ''مسلمان یا تو ہندو ہو جائیں یا بحیرہ عرب میں اپنا مقام تلاش کریں۔'' بھائی پرمانند نے کہا ''مسلمان ہم سے ایک الگ قوم ہیں، ہم ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ انہیں ملک کے کسی ایک کونے میں بسانا چاہیے۔''(۲۷۰)

قائداعظمؒ نے قراردادِ لاہور میں بڑے واضح انداز میں فرمایا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں ہے یہ ایک برعظیم ہے جس کے نقشے میں یورپ کے کئی ملک سما سکتے ہیں۔ اگر جزیرہ نما یونان میں سات آٹھ آزاد مملکتیں قائم ہوسکتی ہیں تو برعظیم میں دو مملکتیں کیوں قائم نہیں ہوسکتیں؟ انھوں نے بارہ سوسالہ تاریخ کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کبھی بھی ایک اکائی

نہیں رہا۔اس کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے۔اس لیے ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے تا کہ مسلم ہندوستان کے باشندے اپنی عظیم روایات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ قائداعظم نے مسلم ہندوستان کی اصطلاح استعمال کی ہے انھوں نے 'پاکستان' کا نام نہیں لیا۔

۲۲مارچ کو قائداعظم کا خصوصی پیغام:

اس روز قائداعظمؒ نے صدارتی خطبہ ختم کرنے سے پہلے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

دوستو! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم قطعی فیصلہ کرلو اور پھر تدابیر پر غور کرو اپنی تنظیم کو مستحکم کرو۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو متحد کرو۔ میرا یہ خیال ہے کہ عام مسلمان بالکل بیدار ہیں وہ صرف تمہاری رہنمائی اور قیادت چاہتے ہیں۔اسلام کے خادم بن کر آگے بڑھو اور اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی تنظیم کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم وہ طاقت بنو گے جس کو ہر شخص تسلیم کرے گا۔

قرار دادِ لاہور کی تیاری:

قائداعظمؒ کی اس ولولہ انگیز تقریر نے قوم کو ایک نیا عزم دیا۔اسی رات مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں قرار دادِ لاہور پر غور وخوض ہوا۔اگلے روز یہ قرار داد سبجیکٹس کمیٹی کے روبرو پیش ہوئی۔ وہاں اس پر بڑی بحث ہوئی اور خاص طور پر ہندو اکثریت کے صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کی مشکلات اور ان کے مستقبل پر غور وخوض ہوا۔ سبجکٹس کمیٹی کے اراکین قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے بارے میں بڑے متفکر تھے اور اس وقت ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہندو اپنے علاقے میں مسلمانوں کو جس قدر مراعات دیں گے مسلمان اپنی مملکت میں ویسی ہی مراعات ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کو دیں گے۔

اس موقع پر ہندو اکثریت کے صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کے نمائندوں نے یہ کہا کہ ان کی فکر نہ کریں۔ مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کے حصول کی خاطر اگر انہیں مزید قربانیاں بھی دینا پڑیں تو وہ اس سے گریز نہیں کریں گے۔وہ تو پہلے ہی ہندوؤں میں رہ کر مصائب برداشت کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم لکھتے ہیں کہ ''راقم الحروف کو بھارت کے نامور عالم دین پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ، استاد سینٹ سٹیفنس کالج دہلی، ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دیوبند (م۱۹۸۵ء) نے بتایا کہ ان کی تمام زندگی ہندو اکثریت کے صوبے یوپی میں گزری اور کلکتے میں انہوں نے جو دس سال بطور پرنسپل کام کیا وہ آزادی کے بعد ہندوؤں کی وزارت کے زمانے میں کیا۔اس لئے وہ بچپن ہی سے ہندوؤں کی ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں کے عادی ہو چکے تھے لہٰذا قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ہجرت کرنا مناسب سمجھا۔

وہ جانتے تھے کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ سے ناروا سلوک کرتے چلے آئے ہیں۔آزادی کے بعد اس میں قدرے اضافہ ہوجائے گا اور بس)۔"

قرارداد لاہور کا متن:

سبجکٹس کمیٹی نے بڑی بحث کے بعد عام اجلاس میں پیش کرنے کے لئے ایک قرارداد تیار کی اور اسی رات یعنی ۲۳ مارچ کے اجلاس میں قائداعظم کی صدارت میں شیر بنگال مولوی ابو القاسم فضل الحق (م۱۹۶۲ء) نے وہ تاریخی قرارداد پیش کی۔انہوں نے کہا:

"قرار پایا کہ غور وخوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔یعنی یہ کہ حد بندی کرنے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت رد وبدل کر کے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنادیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان بہ اعتبار تعداد اکثریت میں ہیں جیسے ہندوستان کے شمال ومغربی اور مشرقی منطقوں میں،اس طرح یکجا ہوجائیں کہ وہ ایسی خود مختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے اندرونی طور پر بااختیار اور خود مختار ہوں؛

یہ کہ ان واحدوں میں ان علاقوں میں اقلیتوں کے لئے مذہبی،ثقافتی،اقتصادی،سیاسی،انتظامی اور دوسرے حقوق ومفاد کے تحفظ کے لئے ان کے مشورے سے بقدرِ ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات ان کے دوسری اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی،اقتصادی،سیاسی،انتظامی اور دوسرے حقوق ومفاد کی حفاظت کیلئے ان کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ مزید اختیار دیتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق دستور کی ایک ایسی سکیم مرتب کرے،جس میں اس کا انتظام ہو کہ بالآخر یہ جداگانہ علاقے ایسے تمام اختیارات لے سکیں،جیسے دفاع،امور خارجیہ،رسل و رسائل کروڑ گیری (کسٹمز) اور دوسرے امور جو ضروری ہوں (قراردادِلاہور کا یہ متن اقبال پارک میں مینار پاکستان پر کندہ ہے)۔

قراردادِلاہور کی تائید:

شیرِ بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق کی پیش کردہ قرارداد کی تائید یوپی اسمبلی کے رکن چوہدری خلیق الزمان (م ۱۹۷۳ء) نے کی۔ان کے بعد یوپی کی نمائندگی کرتے ہوئے بیگم مولانا محمد علی (جوہر)،مولانا عبدالحامد بدایونی (م۱۹۷۰ء) اور سید ذاکر علی نے قرارداد کی تائید کی۔پنجاب کی نمائندگی مولانا ظفر علی خان (م۱۹۵۲ء) اور ڈاکٹر محمد عالم نے کی۔مسلمانانِ بمبئی کی نمائندگی کا حق اسمٰعیل ابراہیم چندریگر (م۱۹۶۰ء) نے ادا کیا اور صوبہ سرحد کی نمائندگی کا شرف سردار اورنگ زیب

خان کو حاصل ہوا۔ خان بہادر نواب محمد اسمٰعیل خان نے مسلمانانِ بہار کی جانب سے قرارداد کی تائید کی اور سی پی کی نمائندگی سید عبدالرؤف شاہ نے کی۔ قاضی محمد عیسٰی (م ۱۹۷۶ء) نے بلوچستان کے مسلمانوں کی طرف سے قرارداد کے حق میں تقریر کی۔ سندھ کے مسلمانوں کی طرف سے سر عبداللہ ہارون (م ۱۹۴۲ء) نے قرارداد کی تائید کی۔ اس طرح قریب قریب برِ عظیم کے تمام صوبوں کے نمائندوں نے قرارداد کے حق میں تقریریں کی اور اس دن کے بعد برِ عظیم کے مسلمان حصولِ پاکستان کے لئے میدان میں نکل آئے۔

ایک ریاست کا تصور:

قراردادِ لاہور میں برِ عظیم کے شمال مغرب اور مشرق میں مسلمانوں کی دو آزاد ریاستوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ قرارداد ورکنگ کمیٹی اور سبجکٹس کمیٹی میں بڑی عجلت کے ساتھ پاس ہوئی تھی۔ اس لئے اس وقت اور اس کے بعد بھی کسی نے دو ریاستوں کے تصور پر غور نہیں کیا۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے حسین شہید سہروردی (م ۱۹۶۳ء) کی تحریک پر دو ریاستوں کی بجائے ایک ریاست کا تصور پیش کیا۔ اس لئے جب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے اُبھرا تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے نام سے اس کے دو حصے دکھائے گئے تھے جو ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ بن گئے۔

ہندوؤں کا ردِ عمل:

اس زمانے میں برطانیہ یورپ کے مختلف محاذوں پر جرمنی کے خلاف نبرد آزما تھا۔ اس لئے برطانوی پریس کی تمام تر توجہ جنگ کی خبریں چھاپنے پر لگی ہوئی تھی اور یورپ کے کئی شاہی خانوادے اپنے ملک جرمنی کے سپرد کر کے انگلستان میں پناہ گزیں تھے۔ ان حالات میں برطانوی پریس نے قراردادِ لاہور کو اہمیت نہ دی۔

انگریزوں کے برخلاف ہندو صحافیوں نے قراردادِ لاہور کے خلاف ایک محاذ کھول دیا۔ بیگم مولانا محمد علی نے قراردادِ لاہور کو ''قراردادِ پاکستان'' کہا تھا اسی لئے ہندوؤں نے یہی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی۔

لاہور کے ہندو اخبارات میں سے ملاپ اور پرتاپ تو مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ انگریزی روزنامہ ٹریبون بھی ہندوؤں کی نمائندگی کرتا تھا۔ ان کے علاوہ امرت بازار پتریکا، ہندوستان ٹائمز اور سٹیٹسمین جیسے اخباروں نے ایک طوفان برپا کر دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے رُوزنامہ زمیندار اور رُوزنامہ احسان مدافعت کا حق ادا کر رہے تھے۔

ہندوؤں کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے لہٰذا وہ ناقابل تقسیم ہے۔ ثانیاً ہندوستان میں آباد مسلمانوں میں اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جن کے آباؤ اجداد ہندو تھے۔ اس لئے مذہب تبدیل کرنے سے قومیت نہیں

بدل جاتی۔اس طرح تمام ہندوستانی بلا تفریق مذہب ایک قوم ہیں۔ثالثاً پاکستان کے معاشی وسائل اتنے نہیں ہوں گے کہ وہ اپنی کفالت کر سکے۔ہندوؤں کا یہ بھی کہنا تھا کہ پنجاب کے علاوہ سندھ،سرحد اور بلوچستان خسارے کے صوبے ہیں اس لئے اگر پاکستان قائم بھی ہو گیا تو وہ اقتصادی طور پر بہت جلد ختم ہو کر دوبارہ ہندوستان میں مدغم ہو جائے گا۔

گاندھی جی نے تقسیم ہند کی قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھارت ماتا کو ایک وحدت سمجھتے ہیں۔بھارت کے ٹکڑے کرنا گئو ماتا کے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہوگا۔مدراس کے سابق وزیر اعلیٰ اور کانگریس کے رہنما راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم کی مثال ایسے ہے جیسے دو بھائیوں میں گائے کی ملکیت پر جھگڑا ہو جائے اور وہ گائے کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لیں۔مولانا ابوالکلام آزاد نے حسبِ معمول ہندوانہ ذہنیت سے سوچنے کے بعد کسی مہاسبھائی سے زبان مستعار لے کر یہ بیان جاری کیا:

''مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میرے حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔پاک اور ناپاک علاقوں کی تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے بلکہ اسلام سے انحراف ہے۔اسلام ایسی کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔''

کاش اس وقت کوئی مسلمان طالب علم بزعم خویش اسلامی علوم کے اس ''سب سے بڑے اسکالر'' کو یہ بتاتا کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات ہم نے نہیں گھڑیں۔یہ پاک اور ناپاک زمین کی تقسیم ہے جو ہمارے آئمہ کرام نے کی تھی اور فقہ میں ان کے مسائل الگ الگ ہیں۔

ایک کانگریسی لیڈر نے قراردادِ لاہور پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آج مسلمان الگ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔کل ہندوستان بھر کے ہیجڑے اپنے لئے الگ وطن کا ''ہیجڑستان'' کا مطالبہ کریں گے۔

جب کانگریس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسلمان پاکستان ضرور حاصل کر لیں گے اور انہوں نے اس کے حصول کی خاطر تن من اور دھن کی بازی لگا دی ہے تو انہوں نے سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں سے کہا کہ وہ پختونستان کا شوشہ چھوڑے اور انگریزوں سے مطالبہ کرے کہ صوبہ سرحد اور ضلع میانوالی کی تحصیل عیسٰی خیل میں پٹھانوں کی اکثریت ہے۔لہٰذا اس علاقے کو پاکستان میں شامل کرنے کی بجائے پختونستان کے نام سے آزاد مملکت بنا دے۔قصہ کوتاہ قراردادِ لاہور پاس ہونے کے بعد مجلس احرارِ اسلام،جمعیت العلماء ہند،سُرخپوش،قوم پرست مسلمان،یونینسٹ پارٹی،اکالی دَل،شیعہ پولیٹیکل کانفرنس اور جولاہوں کی نمائندہ جماعت'' مومن کانفرنس''بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی،کانگریس کی جانب جھک گئیں اور کانگریس نے بھی ان کے ساتھ ''ہمدردانہ روّیہ اختیار کیا۔''

ہندو سرمایہ داروں اور صنعت کاروں میں سے سیٹھ گھنشام داس برلا،رام کرشن ڈالمیا اور گوجرمل مودی جیسے کروڑ پتیوں نے قیامِ پاکستان کو روکنے کے لئے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں کو بڑی بڑی رقمیں

ملنےلگیں اور کانگریس کے ہمنوا مولویوں نے قائداعظم اور مسلم لیگ کے خلاف فتوؤں کے انبار لگا دیئے۔ ایسے ہی فتوے باز کانگریسی مولویوں کے لئے ''گاندھی کی پالیسی کا عربی ترجمہ'' کی اصطلاح وضع کی گئی۔ جناب شمس الحسن (م ۱۹۸۱ء) کی تصنیفِ دلپذیر ''پلین مسٹر جناح'' (Plain Mr. Jinnah) میں ''غلام مَردود'' اور ''مولانا ولدالزنا'' جیسی رکیک قسم کی اصطلاحات ملتی ہیں جو اس زمانے میں صحافیوں نے اپنالی تھیں۔

جادو وہ جُو سر چڑھ کر بُولے:

اسی زمانے میں ابُوالکلام آزاد کانگریس کے صدر اور ہندوؤں کے ترجمان تھے۔ اسی بنا پر قائداعظم انہیں ''شو بوائے آف کانگریس'' کہا کرتے تھے۔ آزاد نے اپنی تصنیف ''اِنڈیا وِنز فریڈم'' میں اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے کہ کانگریس نے مئی ۱۹۴۲ء میں یہ پلان تیار کیا کہ جونہی جاپانی افواج بنگال میں داخل ہوں اور انگریزوں کی فوج بہار کی جانب پسپائی اختیار کرے تو کانگریسی نیتا (لیڈر) بنگال میں داخل ہو کر انتظام حکومت سنبھال لیں (اور وہ پُورے ہندوستان کا حکمران ہونے کا دعویٰ کر کے محوریوں سے اپنی حکومت تسلیم کروالیں)۔

آزاد لکھتے ہیں کہ گاندھی جی اور ان کے رفقاء اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ جاپانی بَرِّعظیم میں ہندوستانیوں کے دشمن بن کر نہیں، بلکہ انگریزوں کے دشمن بن کر آرہے ہیں۔ کانگریسیوں کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر انگریز جاپانیوں کی آمد سے قبل بَرِّعظیم خالی کر گئے تو پھر جاپان بَرِّعظیم پر حملہ نہیں کرے گا۔ آزاد رقمطراز ہیں کہ گاندھی جی کا یہ خیال تھا کہ ان حالات میں برطانیہ ان سے استدعا کرے گا کہ وہ جاپانیوں کو بَرِّعظیم میں داخل ہونے سے رُوکنے کے لئے تحریک چلائیں۔ گاندھی جی یہ سمجھ رہے تھے کہ موجودہ حالات میں انگریز انہیں گرفتار نہیں کریں گے۔

''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' کی کامیابی کا تمام تر دارومدار جاپان کے بَرِّعظیم پر حملے، انگریزوں کی ہزیمت اور یہاں سے انخلا پر تھا اور اس بحران سے فائدہ اٹھانے کے لئے بقول ایچ جی راولنسن عدمِ تشدّد اور اہنسا کی علمبردار جماعت کانگریس نے ''غنڈوں'' کی ایک فوج تیار کر لی تھی۔ کانگریس یہ جانتی تھی کہ اگر آزادی جنگ کے خاتمے تک ملتوی کر دی جائے، جیسا کہ کرپس نے کہا تھا تو اس وقت تک تقسیم ہند یقینی ہو جائے گی اور پاکستان بن جائے گا، لہٰذا جو کچھ بھی لینا ہے وہ فی الفور لے لو۔

کانگریس پُورے بَرِّعظیم پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی لیکن امریکہ کی جنگ میں شمولیت کے بعد عالمی سیاست کا نقشہ ہی بدل گیا اور گاندھی جی کا بَرِّعظیم میں ہندو راج قائم کرنے کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ نیز مسلم لیگ اور کانگریس کی مخالف جماعتوں کے عدمِ تعاون کی بنا پر یہ تحریک خود بخود دب گئی۔

دوسری جانب مسلم لیگ نے گاندھی جی کے اقدام کی پُرزور مذمت کی اور مسلمانوں کو اس تحریک میں شامل ہونے سے روکا۔ قائداعظم نے گاندھی جی کی تحریک ''ہندوستان چھوڑ دو'' کے جواب میں انگریزوں سے کہا ''تقسیم کرو اور چلے جاؤ''

(Divide and Quit)۔

انگریزوں نے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے پوری سختی کے ساتھ تین چار ہفتوں کے اندر اس تحریک کو کچل کر رکھ دیا اور یوں مسلمان ہندوؤں کے غلام بن جانے سے رہ گئے۔'' (۲۷۱)

بنگال اور پنجاب کی تقسیم اور سلہٹ اور سرحد میں ریفرنڈم کے بعد ریڈکلف ایوارڈ کی صورت میں صاف کہنا چاہئے کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان نہیں، حقیقتاً پاکستان تقسیم ہوا ہے۔ کشمیر کی مسلم اکثریت اور پاکستان سے ملحق علاقے کو ہندو، انگریز گٹھ جوڑ نے دھاندلی کر کے گورداسپور بھارت میں بزور شامل کیا تا کہ بھارت کو کشمیر کیلئے راستہ دیا جا سکے، جونا گڑھ، مناور اور حیدر آباد ہڑپ کرنے کے مراحل تو اس کے بعد پیش آئے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی سیاسی زندگی کے مصنف ایک سائنس دان ڈاکٹر محمد سلیم نے تحقیق کے ماخذ کا آئینہ سامنے رکھ کر اُس سازش کو ایک جُملے میں سمیٹا ہے کہ

''ریڈکلف نے آخر کار پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سرحد کی لکیر وہیں کھینچ دی، جہاں انگریز ہندو، سازش سے ڈیڑھ سو سال پہلے ہی فیصلہ کر لیا گیا تھا۔'' (۲۷۲)

تاریخ کا سچ تو یہ ہے کہ برعظیم پاک و ہند کی ۱۹۴۷ء میں دو قومی نظریہ کے تحت تقسیم اور سرحدی تجسیم میں کانگرس کے ایما پر ریڈ کلف ایوارڈ میں ڈنڈی ماری گئی تو ۱۹۷۱ء میں بنگلا دیش کے قیام کی خاطر بھارت نے ننگی جارحیت کا ڈنڈہ مارا ہے جو پاکستان کے خلاف اس کے بغض و عناد کا کھلا نمونہ ہے۔ اور اسے کہتے ہیں کہ

کس صفائی سے کئے ہیں میرے دل کے ٹکڑے
درد دونوں کا سناتے ہوئے خوف آتا ہے

قیامِ پاکستان کی نظریاتی اساس

فرزندِ اقبالؒ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت ''اپنا گریباں چاک'' میں قیامِ پاکستان کے نظریاتی پس منظر کو اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ اور مطالعہ میں جس طرح سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے وہی اس پوری کتاب کا تتمہ ہے کہ انہوں نے اپنی فکری نوع کی نظریاتی لہریں پیش کی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

''اس فکری نوع کے دوران مجھ پر دو مزید راز کھلے۔ ایک تو یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں دو رو ئیں ایک دوسری کے ساتھ متصادم ہوتی رہیں' پہلی رو تو اسی مکتبہ فکر کی تھی جو ہندو مت میں اسلام کا ادغام عمل میں لانا چاہتا تھا۔ دوسری رو اس مکتبہ فکر سے ظاہر ہوئی جو مسلمانوں کی ملی تنظیم ہندوؤں سے علیحدہ رہ کر اسلام کی بنیادوں پر عمل میں لانے کی خواہش رکھتا تھا۔ قیامِ پاکستان سے ثابت ہے کہ اس تاریخی تصادم میں بالآخر کون سی رو غالب آئی۔

دوسرا راز جو مجھ پر افشا ہوا وہ یہ تھا کہ جب اسلام برصغیر میں وارد ہوا' روحِ اسلام اپنی نمو کی خاطر راہ

ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی، گذشتہ کئی صدیوں سے کبھی مشاہدے کے ذریعے اور کبھی کشف کے ذریعے اس کوشش کا اظہار کرنا چاہا، کبھی شہنشاہوں کے فرمان کی صورت اختیار کی، کبھی علماء کی وساطت سے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا، کبھی مجاہدین کی تلواروں کی راہ سے، کبھی جدید سیاست کے بھیس میں، کبھی اتحادِ اسلام کے داعی کی ہیت میں، کبھی ادب اور کبھی فلسفہ کی شکل میں۔ غرضیکہ اس نے مختلف ذرائع اختیار کیے حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں جا کر اسے واضح زبان نصیب ہوئی۔ جب وہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ڈھل گئی۔ اور بالآخر قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ہاتھوں پاکستان کے قیام کی صورت میں اس نے صدیوں کی جدوجہد کے بعد اس مقصد کو پالیا۔''(۲۷۳)

فی الجملہ یہ کہ قیام پاکستان فی الحقیقت صدیوں کا سفر ہے یہ ہندو اکثریت کے جمہوری تماشے میں مسلم اقلیت سے مسلم قوم تک کا سفر ہے۔ اس کی راہوں میں یقین محکم اور عمل پیہم کا زادِ راہ ہے۔ اور یہی تحریک قیامِ پاکستان اور بانی پاکستان قائداعظمؒ کا فرمان ہے جو محض جغرافیہ نہیں نظریہ ہے۔ جسے اقبال کے الفاظ میں اخوت کی جہانگیری بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہندو اکثریت میں مسلم اقلیت کا اکثریتی اور جمہوری فیصلہ ہے۔ اور اقلیت کا اکثریتی فیصلہ اٹل اور پائیدار ہوتا ہے دینی اصطلاح میں بات کریں تو برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے اجماعِ امت کے فیصلے کا دوسرا نام پاکستان ہے۔ جو تاریخ کے پہلے نظریہ کی بنیاد پر بنا ہوا ملک ہے۔ بلکہ نظریہ پہلے، نام پہلے اور ملک بعد میں وجود میں آیا ہے۔ جو جدید نظریہ قومیت اور جغرافیہ بلکہ تاریخ تینوں کے ابطال پر قائم نظریاتی وجود اور شہود ہے جسے کلام اقبالؒ میں

اے ارض پاک!

کہہ کر پکارا گیا ہے۔

یہ برعظیم پاک و ہند کے کروڑوں مسلمانوں کی آرزوں کا وطن ہے۔ یہ متحدہ قومیت کے ابطال اور دو قومی نظریہ کے جمال پر قائم ہوا ہے کہ مشرکین کے ساتھ مل کر ایک قوم نہیں بنائی جا سکتی، یہ مکہ سے ہجرت اور مملکت مدینہ کی بازیافت ہے اور دریافت ہے۔ جسے اب شرعی بت خانے سے نابود کرنے کے لیے ہنود اور یہود سے باقاعدہ مدد لے کر اسے بزور بندوق اپنی مرضی مسلّط کرنے کی مسلح دہشت گردی نام جہاد بتایا جا رہا ہے۔ تا کہ پاکستان کے شمال مغربی قبائلی علاقے میں ''امارت شرعیہ دیو بند'' قائم ہو سکے۔ مگر یہ ملک مدینہ طیبّہ کے پرتو میں ہے۔ اِسے نقصان پہنچانے والے، خود قہر خُداوندی کی زد میں آئیں گے۔ کیونکہ پاکستان کی روحانی طاقت دراصل کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا جلال و جمال ہے

یعنی عرف عام میں

پاکستان کا مطلب کیا؟

لا الہ الا اللہ

وما علینا الا البلاغ O ہمارے ذمہ تو پہنچانا ہی ہے۔ (القرآن)

حوالہ جات

(باب سوم)

1۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ، تہذیب و تقدیر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1987ء صفحہ 53

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

4۔ ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، ''اقبال صاحب حال''، فیصل آباد، ترتیب پبلی کیشنز، 2009، صفحہ 240، 242

5۔ ڈاکٹر منظور احمد' اقبال حالیہ فکری تناظر میں خطبہ بیاد اقبال' پنجاب یونیورسٹی لاہور 2003ء صفحہ 17

6۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ، تہذیب و تقدیر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1987ء صفحہ 53

7۔ محمد جہانگیر عالم، اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام، جھنگ صدر، کاشف پبلشیرز، 1983ء صفحہ 53

8۔ ایضاً صفحہ 51

9۔ ایضاً صفحہ 58

10۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبالؒ، کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1988، صفحہ 36

11۔ مولوی سعید احمد، آہنگ بازگشت، اسلام آباد، ادارہ تحقیق و تاریخ و ثقافت، 1989ء صفحہ 121

12۔ م ش کی ڈائری، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 12 دسمبر 1991ء

13۔ پروفیسر رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشتہ، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز 1976ء صفحات 255 تا 257

14۔ ہفت روزہ، حمایت اسلام، 4 اپریل 1940ء

15۔ ایضاً 6 مارچ 1941ء

16۔ ایم۔ایچ۔سید، محمد علی جناحؒ، لاہور، شیخ محمد اشرف، 1945ء صفحہ 499

17۔ ممتاز لیاقت، اقبالؒ اور مولانا حامد علی خان، ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ، لاہور، اپریل 1966ء

18۔ حکیم محمد حسن قرشی ہفت روزہ ایشیاء، لاہور 24 اپریل 1961ء

19۔ صادق قریشی، علامہ اسد کی یاد میں، روزنامہ نوائے وقت، لاہور (جمعہ میگزین) 13 نومبر 1992ء

20۔ علامہ محمد اسد، ''بندۂ صحرائی'' لاہور، دی ٹروتھ سوسائٹی، 2009، صفحات 81-82

21۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، چند یادیں، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور مارچ 1971

22۔ ڈاکٹر رفیق احمد (دیباچہ) یاران مکتب جلد دوم، لاہور، پاکستان سٹڈی سینٹر، پنجاب یونیورسٹی، 1992، صفحہ 3

23۔ میاں بشیر احمد، اقبالؒ میری نظر میں، ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ، لاہور اپریل 1964ء

24۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (دیباچہ) فیضان اقبالؒ از شورش کاشمیری) لاہور، مکتبہ چٹان، 1968ء صفحہ 19

25۔ مودودصابری ایک یادگار ملاقات، ماہنامہ سیارہ لاہور (اقبال نمبر) مئی 1963ء
26۔ شیخ بینالکھنوی، ملفوظات، لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1994ء صفحہ 53
27۔ پروفیسر طاہر فاروقی، سیرت اقبالؒ، لاہور، قومی کتب خانہ، 1978ء صفحات 120-121
28۔ پروفیسر محمد فرمان، اقبالؒ اور تصوف، لاہور، بزم اقبالؒ 1984 صفحہ 33
29۔ سید نذیر نیازی، مکتوبات اقبالؒ، لاہور اقبال اکادمی، 1977 صفحہ 181
30۔ بشیر احمد ڈار، انوار اقبالؒ، لاہور اقبالؒ اکادمی، 1977 صفحہ 10
31۔ ڈاکٹر نظیر صوفی، روزنامہ جنگ کراچی، (جمعہ ایڈیشن) 20 نومبر 1981ء
32۔ پروفیسر وارث میر، روزنامہ جنگ، لاہور، 20 مارچ 1986ء
33۔ پروفیسر اقبال جاوید، پروفیسر صوفی محبوب الٰہی کی یاد میں، ادبی مجلہ مہک گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ 1977ء صفحہ 137
34۔ ڈاکٹر نظیر صوفی، ہفت روزہ چٹان 24 جون 1974ء، صفحہ 16
35۔ مجموعہ وظائف مشائخ قادری و چشتی ''گلزار سروری و محبت النبیؐ'' دربار عالیہ بڑیلہ شریف، ضلع گجرات، صفحہ 161-162۔
36۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ (دیباچہ) فیضان اقبالؒ از شورش کاشمیری، لاہور، مکتبہ چٹان، 1968ء صفحہ 25
37۔ آغا شورش کاشمیری، فیضان اقبالؒ، لاہور، مکتبہ چٹان، 1968ء صفحہ 37
38۔ آغا شورش کاشمیری، فن خطابت، لاہور، مکتبہ چٹان، 1988ء صفحہ
39۔ علی میاں، نقوش اقبالؒ، کراچی مجلس نشریات اسلام، 1988ء صفحہ 21
40۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، ''کچھ اقبال کے بارے میں''، نقوش، لاہور، اقبالؒ نمبر 2 شمارہ 123، 1977ء صفحہ 52
41۔ حضرت علامہ اقبالؒ، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، لاہور، بزم اقبالؒ، 1984ء صفحہ 11
42۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ، تہذیب و تقدیر، لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1987 صفحہ 101
43۔ ڈاکٹر افضل اقبال، مولانا رومیؒ (حیات و افکار) لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1991ء صفحہ 21
44۔ سہ روزہ دعوت، دہلی، فکر و نظر، 4 مئی 2000
45۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تنقیحات، لاہور اسلامک پبلی کیشنز 1998ء صفحہ 20
46۔ حضرت خواجہ غلام فریدؒ، مقابیس المجالس، لاہور، الفیصل، سن ندارد، صفحات 796، 795
47۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تنقیحات، لاہور اسلامک پبلکیشنز، 1998ء، صفحہ 20
48۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، علماء میدان سیاست میں، کراچی، یونیورسٹی پریس، 1994ء صفحہ 281
49۔ ایضاً صفحہ 461
50۔ ایضاً صفحہ 463

51۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، موہن داس کرم چند گاندھی لسان العصر کی نظر میں لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز 1994، صفحہ 26
52۔ ایضاً
53۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی علماء میدان سیاست میں، حوالہ مذکور صفحہ 275
54۔ ایضاً صفحہ 278
55۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، لاہور، اقبال اکادمی 1981 صفحہ 282
56۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی علماء میدان سیاست میں، حوالہ مذکور صفحہ 280
57۔ ایضاً
58۔ ایضاً صفحہ 440
59۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام، موج کوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1992 صفحہ 259
60۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی علماء میدان سیاست میں، حوالہ مذکور صفحہ 287
61۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام، موج کوثر، لاہور، حوالہ مذکور صفحہ 279
62۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، حوالہ مذکور صفحہ 24
63۔ ایضاً صفحہ 26
64۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی علماء میدان سیاست میں، حوالہ مذکور صفحات 468-469
65۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تنقیحات حوالہ مذکور صفحہ 222
66۔ شیخ محمد اکرم، موج کوثر، حوالہ مذکور، صفحہ 1
67۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ تہذیب و تقدیر حوالہ مذکور صفحہ 171
68۔ ایضاً صفحہ 191
69۔ شیخ محمد اکرم موج کوثر، حوالہ مذکور، صفحہ 409
70۔ ایضاً صفحہ 63
71۔ پروفیسر محمد اسلم، ''تحریک پاکستان''، لاہور، ریاض برادرز، 1993، صفحات 75-78
72۔ ایضاً، صفحات 75-78
73۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، برعظیم کی ملت اسلامیہ کراچی، کراچی یونیورسٹی، 1987، صفحہ 156
74۔ ایضاً صفحہ 153
75۔ ایضاً صفحہ 275
76۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ تہذیب و تقدیر حوالہ مذکور صفحہ 111
77۔ ایضاً صفحہ 171

78۔ پشپال جین، رام راجیہ کا خاکہ، ماہنامہ انوبرت (ہندی) دہلی مئی 1982

79۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، لاہور، مطبوعات چٹان، 1988 صفحہ 115

80۔ ایضاً صفحہ 114

81۔ ایضاً

82۔ سہ روزہ، دعوت دہلی، یکم جولائی 2000ء

83۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ترجمان القرآن پٹھان کوٹ، جولائی 1940

84۔ قاضی محمد عدیل عباسی تحریک خلافت، نئی دہلی ترقی اُردو بیورہ، 1978 صفحات 79-80

85۔ ایضاً

86۔ ایضاً

87۔ ایضاً صفحہ 238

88۔ ایضاً صفحہ 118

89۔ ایضاً صفحہ 79

90۔ ایضاً صفحہ 20

91- چوہدری خلیق الزماں، ''شاہراہِ پاکستان''، کراچی، صفحات 628-632

92۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، برعظیم کی ملت اسلامیہ، حوالہ مذکور، صفحات 348-349

93۔ مولانا محمد علی جوہرؒ، خطبہ صدارت کوکانڈا 26 دسمبر 1932ء خطبات کانگرس، لاہور، ادبستان، 1947، صفحہ 454

94۔ ایضاً

95۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، برعظیم کی ملت اسلامیہ، حوالہ مذکور، صفحہ 371

96۔ سیتارامیہ، تاریخ کانگرس، بمبئی 1946ء (جلداول) صفحہ 298

97۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، 1981 صفحہ 55

98۔ پروفیسر محمد اسلم تحریک پاکستان، لاہور، ریاض برادرز، 2000 صفحہ 219

99۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جماعت اسلامی کے 29 سال، لاہور اسلامک پبلی کیشنز، 1997، صفحہ 8

100۔ مولانا مودودی ایضاً صفحہ 14

101۔ ایضاً

102۔ ایضاً صفحہ 18

103۔ ایضاً صفحہ 19

104۔ ایضاً صفحات 22۔23

105۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تحریک آزادی ہند اور مسلمان، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، 1981 صفحہ 55
106۔ ایضاً صفحہ 57
107۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، برعظیم کی ملت اسلامیہ حوالہ مذکور، صفحہ 563
108۔ روزنامہ ہمدرد، دہلی، 3 جنوری 1929
109۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، برعظیم کی ملت اسلامیہ حوالہ مذکور، صفحہ 378
110۔ ایضاً صفحہ 279
111۔ سراج نظامی، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور، دسمبر 1966
112۔ آغا شورش کاشمیری، فن خطابت، لاہور مطبوعات چٹان، 1988ء صفحہ 30
113۔ روزنامہ جسارت، کراچی، (اشاعت خصوصی) 9 نومبر 1999ء
114۔ ایضاً
115۔ ترجمہ سید نذیر نیازی، رسالہ صوفی، منڈی بہاؤالدین 14 اپریل 1931ء صفحہ 114
116۔ ایضاً صفحات 118-119
117۔ ایضاً صفحہ 137
118۔ خطبہ الہ آباد ترجمہ اقبال صدیقی، لاہور، اقبال اکادمی، 1999ء صفحہ 42
119۔ ایضاً صفحہ 45
120۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری تفسیر ضیاء القرآن (جلد اول) لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، 1995ء صفحہ 223
121۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی، لاہور اسلامک پبلی کیشنز، 1996ء صفحہ 181
122۔ سراج نظامی، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور دسمبر 1966
123۔ حرف اقبالؒ، لاہور المنار اکادمی، 1945ء صفحات 60-62
124۔ ایضاً صفحات 70-71
125۔ ایضاً صفحہ 76
126۔ طاہر فاروقی، سیرت اقبالؒ، حوالہ مذکور صفحہ 182
127۔ سید نذیر نیازی اقبالؒ کے حضور، حوالہ مذکور صفحہ 219
128۔ سراج نظامی، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور، دسمبر 1966
129۔ سید نذیر نیازی اقبالؒ کے حضور، حوالہ مذکور صفحہ 22
130۔ ایضاً صفحہ 192
131۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، حوالہ مذکور، صفحہ 155

132۔ دی پاکستان ٹائمز، لاہور، 19 نومبر 1972ء

133۔ آغا شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، لاہور مطبوعات چٹان، 1988، صفحہ 98

134۔ ایضاً صفحہ 452

135- Murti K.S., Indian Polities and Philosopy,London, 1967, P.105.

136۔ زیڈ اے سلہری، مسائل وافکار، روزنامہ جنگ، لاہور، 24 مئی 1991ء

137۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، یکم جنوری 1995

138۔ فقیر وحیدالدین، انجمن، کراچی، لائن آرٹ پریس 1966 صفحات 157-158

139۔ ابن الحسن، جملہ معترضہ، روزنامہ نوائے وقت لاہور 24 جنوری 1992ء

140۔ گوربچن سنگھ ہفت روزہ، چڑھدی کلا (گورمکھی) کینیڈا جولائی 1998

141۔ ماہنامہ، میثاق، لاہور دسمبر 1999ء صفحہ 40

142- Jawaherlal Nehru, An Autobiography, London, Jave Rane the Bodly Heal, 1936, P-73

143۔ عبدالوحید خان، مسلمانوں کا ایثار اور جنگ آزادی لاہور، مکتبہ کارواں 1982ء صفحہ 99

144۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ تہذیب وتقدیر، حوالہ مذکور، صفحہ 48

145۔ ایضاً صفحہ 21

146۔ ابن الحسن جملہ، معترضہ، روزنامہ نوائے وقت لاہور 24 جنوری 1992ء

147۔ مولانا سید ابوالاعلی مودودی، اسلامی تہذیب اور اسکے اصول ومبادی، حوالہ مذکور صفحات 321-322

148۔ مولانا عبدالحمید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1959، صفحہ 656

149- ایضاً

150۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ تہذیب وتقدیر، حوالہ مذکور، صفحہ 191

151۔ ڈاکٹر اقبال احمد صدیقی، شذرات اقبالؒ لاہور مجلس ادب، 1973ء صفحہ 83

152۔ حکیم آفتاب احمد قریشی، قائداعظمؒ سے ایک ملاقات روزنامہ نوائے وقت لاہور، 27 نومبر 1974

153۔ ابوالحسن اصفہانی، قائداعظم محمد جناح، لاہور آتش فشاں پبلی کیشنز، 1994، صفحات 215-216

154۔ ایضاً صفحہ 219

155۔ محمد جہانگیر عالم، اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام، جھنگ صدر، کاشف پبلیشرز، 1983، صفحات 48-51

156۔ روزنامہ مدینہ، بجنور (یوپی)، بھارت 21 اگست 1946ء

157۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ تہذیب وتقدیر، حوالہ مذکور صفحہ 111

158۔ اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام حوالہ مذکور صفحہ 56

159۔ مولانا ظفر احمد انصاری ماہنامہ چراغ راہ، کراچی، (نظریہ پاکستان نمبر) 1960، صفحہ 234

160۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، علماء میدان سیاست حوالہ مذکور، صفحہ 471

161۔ سید نذیر نیازی اقبالؒ کے حضور حوالہ مذکور صفحہ 40

162۔ ایضاً صفحہ 46

163۔ ایضاً صفحہ 47

164۔ ایضاً

165۔ ایضاً صفحہ 49

166۔ ایضاً صفحہ 50

167۔ ایضاً

168۔ ایضاً صفحہ 131

169۔ ایضاً صفحہ 336

170۔ ایضاً صفحہ 210

171۔ ایضاً صفحہ 291

172۔ ایضاً صفحہ 292

173۔ ایضاً صفحہ 293

174۔ ایضاً

175۔ ایضاً صفحہ 298

176۔ مولانا ابوالاعلیٰ مدودی تقریر یوم اقبالؒ 21 اپریل 1970 پنجاب یونیورسٹی ہال لاہور روزنامہ جسارت، کراچی 9 نومبر 1999ء

177۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی، ترجمان القرآن، 15 اگست 2000ء صفحہ 3

178۔ ایضاً

179۔ بدرالدین ہفت روزہ چٹان، لاہور 9 فروری 1970

180۔ ایم۔ایچ۔سید محمد علی جناح، لاہور شیخ محمد اشرف 1945 صفحہ 499

181۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جدوجہد پاکستان، کراچی، یونیورسٹی، 1987، صفحات 180-179

182۔ مولانا ابوالکلام آزاد، خطبہ رام گڑھ، مارچ 1940ء خطبات گانگریس لاہور، ادبستان، 1946 صفحات 41-42

183۔ عبداللہ شملوی روزنامہ نوائے وقت لاہور 30 نومبر 1976ء

184۔ مولانا ابوالکلام آزاد، خطبہ رام گڑھ، خطبات کانگرس، حوالہ مذکور صفحہ 42
185۔ ابوراشد فاروقی اقبالؒ و مودودیؒ، لاہور مکتبہ تعمیر انسانیت 1980 صفحہ 42
186۔ ماہنامہ، ترجمان القرآن، لاہور اپریل 1977ء
187۔ عبدالحمید کمالی، اقبالؒ ریویو، کراچی جنوری 1973ء صفحہ 278
188۔ ایضاً
189۔ ایضاً صفحہ 277
190۔ ایضاً صفحہ 374
191۔ سید نذیر نیازی اقبالؒ کے حضور حوالہ مذکور، صفحہ 317
192۔ ایضاً صفحہ 323
193۔ ایضاً صفحات 324-325
194۔ ایضاً صفحہ 335
195۔ ایضاً صفحہ 336
196۔ ایضاً
197۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ تہذیب و تقدیر حوالہ مذکور صفحہ 193
198۔ پروفیسر محمد اسلم تحریک پاکستان، حوالہ مذکور صفحہ 359
199۔ ڈاکٹر محمد سلیم، قائداعظم محمد علی جناح، لاہور قومی پبلیشرز، 1998 صفحہ 131
200۔ سراج منیر، ملت اسلامیہ تہذیب و تقدیر حوالہ مذکور صفحہ 196
201۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، حوالہ مذکور، صفحہ 269
202۔ پروفیسر محمد اسلم تحریک پاکستان، حوالہ مذکور صفحہ 395-396
203۔ ایضاً
204۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، حوالہ مذکور، صفحہ 269
205۔ ایضاً
206۔ آغا شورش کاشمیری بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل، حوالہ مذکور صفحات 254-255
207۔ ایضاً صفحہ 256
208۔ آغا شورش کاشمیری تحریک ختم نبوت، لاہور، مطبوعات چٹان 1980 صفحات 83
209۔ آغا شورش کاشمیری بوئے گل نالہ دل، دود چراغ محفل، حوالہ مذکور صفحات 257
210۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی ملتان اخوان پبلی کیشنز، 1976 صفحہ 6

211۔ پروفیسر محمد اسلم تحریک پاکستان، حوالہ مذکور صفحہ 327

212۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحریک پاکستان اور قائد اعظمؒ (نایاب دستاویزات کی روشنی میں) لاہور

213۔ پروفیسر محمد اسلم تحریک پاکستان، حوالہ مذکور، صفحہ 271 صفحات 410-411

214۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، حوالہ مذکور، صفحہ 271

215۔ آغا شورش کاشمیری بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل، حوالہ مذکور صفحہ 353-354

216۔ آغا شورش کاشمیری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، لاہور مطبوعات چٹان 1978 صفحہ 33

217۔ آغا شورش کاشمیری بوئے گل نالہ دور چراغ محفل حوالہ مذکور صفحہ 355

218۔ ایضاً صفحہ 356

219۔ ایضاً صفحہ 419

220۔ ایضاً صفحات 436-437

221۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، حوالہ مذکور، صفحات 264 تا 268

222۔ شورش کاشمیری بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل، حوالہ مذکور 451-455

223۔ پروفیسر محمد اسلم (دیباچہ) تحریک پاکستان اور مشائخ عظام، از محمد صادق قصوری، لاہور، ریاض برادرز، سن ندار، صفحہ 3

224۔ پروفیسر محمد اسلم تحریک پاکستان، حوالہ مذکور، صفحہ 428

225۔ پروفیسر محمد مسعود احمد، تحریک آزادی ہند اور سواد اعظم، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 1997، صفحہ 238

226۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تحریک آزادی ہند اور مسلمان، (جلد دوم) لاہور، اسلامک پبلی کیشنز

227۔ شورش کاشمیری، بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل، حوالہ مذکور صفحہ 261

228۔ منشی عبدالرحمٰن خان، تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، لاہور، ادارہ اسلامیات 1992 صفحہ 93

229۔ ایضاً صفحات 85-86

230۔ ایضاً صفحہ 78

231۔ شورش کاشمیری، بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل، حوالہ مذکور صفحہ 279

232۔ ایضاً صفحات 296-297

233۔ ایضاً صفحہ 359

234۔ ایضاً صفحات 361-364

235۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، حوالہ مذکور، صفحہ 281

236۔ ایضاً

237۔ ایضاً صفحات 282۔283

238۔ ایضاً صفحہ 284

239۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جدوجہد پاکستان، حوالہ مذکور، صفحہ 410

240۔ مولوی سعید احمد، آہنگ بازگشت، اسلام آباد، ادارہ تحقیق و تاریخ ثقافت 1989 صفحہ 162

241۔ ایضاً صفحہ 56

242۔ پروفیسر مرزا محمد منور (دیباچہ) مسلمانوں کا ایثار اور جنگ آزادی، مصنف عبدالوحید خان، حوالہ مذکور، صفحہ 421

243۔ ڈاکٹر وحید قریشی، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، لاہور، ایجوکیشنل ایمپوریم 1973 صفحہ 75

244۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، حوالہ مذکور صفحہ 287

245۔ ایضاً صفحہ 288

246۔ پروفیسر محمد اسلم، تحریک پاکستان، حوالہ مذکور، صفحات 443-444

247۔ ایضاً

248۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ہماری آزادی، نئی دہلی 1958 صفحہ 70

249۔ جسٹس (ر) جاوید اقبال، روزنامہ نوائے وقت لاہور، 12 اگست 1996

250۔ مولانا سید حسین احمد مدنی، نقش حیات (جلد دوم) کراچی بیت التوحید، سن ندارد، صفحہ 692

251۔ پروفیسر محمد اسلم (دیباچہ) تحریک پاکستان اور مشائخ عظام، حوالہ مذکور، صفحات 5-6

252۔ ایضاً

253. M.A.H. Isphani, Quaid-e-Azam Jinnah as I Knew Him, Elite Publishers (Pvt). LTD, 3rd Ed., 1973, P. 20.

254۔ ابوالحسن اصفہانی، قائداعظم محمد علی جناح، حوالہ مذکورہ، صفحہ 43-44

255۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، خطبہ صدارت جمعیت علمائے اسلام، پنجاب، لاہور، جنوری 1996

256- چوہدری خلیق الزمان، شاہراہِ پاکستان، کراچی 1961، صفحہ 634

257- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، اقبال اور ملا، لاہور، بزم اقبال صفحات 17-18

258- چوہدری خلیق الزمان، شاہراہِ پاکستان، صفحہ 634

259- مختار مسعود، ''آوازِ دوست''، فیروز سنز، لاہور، نومبر 2008

260- ایضاً، صفحہ 104

261- ایضاً، صفحہ 110

262۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، خطبۂ صدارت۔ حوالہ مذکورہ

263- مولانا ظفر احمد انصاری، ماہنامہ چراغ راہ، کراچی (نظریہ پاکستان) 1960 صفحہ 232

264۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (بھارت) 6 دسمبر 1958ء
265۔ ایضاً صفحات 557-575
266۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، حوالہ مذکور، صفحہ 220
267۔ ایضاً صفحہ 239
268۔ ایضاً صفحہ 89
269۔ سہ روزہ دعوت، 14 اگست، 2000ء
270۔ ڈاکٹر نذیر احمد، (تعارف) کلام بلھے شاہؒ، لاہور، پیکجز لیمیٹڈ 1976ء
271۔ جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال، خودنوشت سوانح ''گریبان چاک'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز 2003ء صفحات 78,79
272۔ محمد اسد، بندۂ صحرائی، لاہور، دی ٹروتھ سوسائٹی، ۲۰۰۹ء، صفحات ۸۱،۸۲
273۔ جسٹس (ر) جاوید اقبال، ''چاک گریبان'' حوالہ مذکورہ

مزید مطالعہ کیلئے:

ظہور پاکستان	چوہدری محمد علی
شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب
قائداعظمؒ	ڈاکٹر محمد سلیم
اقبال کے حضور	سید نذیر نیازی
بوئے گل نالہ دل	شورش کاشمیری
برعظیم کی ملت اسلامیہ	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

علامہ اقبالؒ خطبہ آلہ آباد 1930

اشاریہ

پاکستان کا ظہور

''پاکستان کا ظہور فی الحقیقت دین اور دل کی جیت ہے جب کہ اسے ناممکن اور ناکام بنانے کے ہندو ہتھکنڈے، عقلِ عیار کی ریت۔ اس معرکے میں گاندھی جی کا استدراج، پنڈت جواہر لعل نہرو کا استدلال اور مولانا ابوالکلام آزاد کا استدراک، تینوں عملاً اپنا سا منہ لیے رہ گئے اور پاکستان اللہ کے فضل سے قائم ہو کے رہا۔ گویا عقل پر عشق غالب آ گیا۔ یعنی

پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ

کی عملی تفسیر ہاتھ آ گئی۔ جس ملک کا نظریہ اور بانی دونوں کو پیش کرنے میں فقر و دین کے ترجمان حضرت علامہ اقبالؒ پیش پیش ہوں وہاں تعقل کی گمراہی اور عقل کی رسوائی کو مشیّتِ الٰہی کہنا ہی پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان کے غنیم اور نتیجۂ بھارت کے پہلے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تک بالآخر یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

''پاکستان بن گیا، یہی مشیّتِ الٰہی کو منظور تھا''

آخر ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یہ بھی فرمانِ اقبالؒ ہی تو ہے کہ پیکارِ عقل و دین میں

جیتا ہے رومیؒ، ہارا ہے رازی''